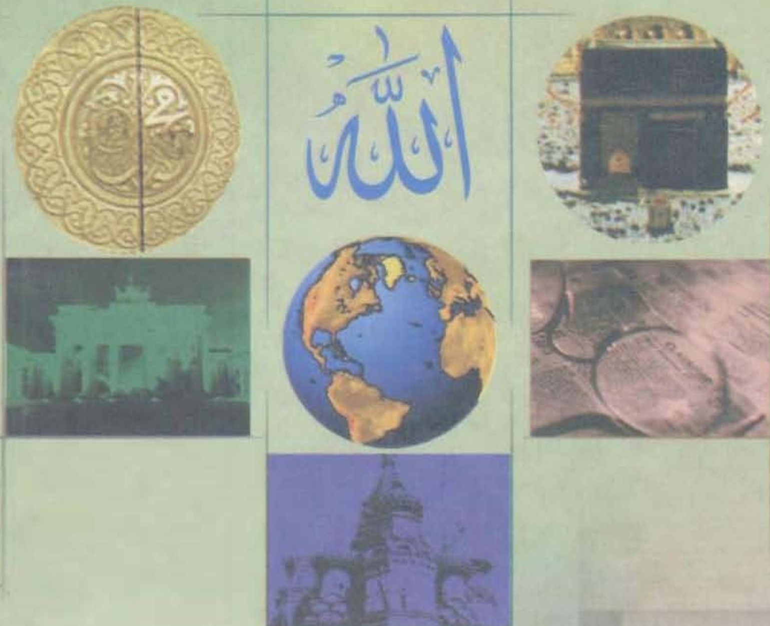
اسلام، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

اور مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر



ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

مرتب

آصف اکبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یامادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یادیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

اور

مستشرقین مغرب کا اندازِ فکر

(تحقیقی مقالہ، پی ایچ ڈی، جامعہ کراچی)

از

ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

مرتبہ ——— آصف اکبر

بیت الحکمت لاہور

۲۸ء ۲۹۷ — جیلانی، عبدالقادر، ڈاکٹر

ج ی ل ۔ م — اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر

لاہور: بیت الحکمت

۲۰۰۵ء

ص ۳۹۲

ا۔ اسلام اور مغرب، استشراق اور اسلام

ISBN 969-8773-36-3

کتاب: اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر

مصنف: ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

مرتب: [illegible]صف اکبر

اہتمام: بیت الحکمت، لاہور

مطبع: [illegible]ندوسیہ اسلامک پریس، لاہور

قیمت: ۲۵ روپے

ا۔ آصف اکبر، اسلام آباد 051-4444191

۲۔ لندن، عارف اکبر، 35 وال گیٹ اوینیو، کرکل روڈ،

فون: 44-79584866969

۳۔ بھارت، باندہ، ہتورہ، جناب نفیس اکبر اویس صاحب

فون 97-519-2237228

۴۔ سعودی عرب، جدہ، رئیس اکبر، فون: 966-5-7549243

۵۔ سعودی عرب، مدینہ منورہ، شفیق احمد جنجوعہ، مدینہ الیکٹرک سپلائی کالونی،

فون: 966-4-8391907

۶۔ دبئی، ظفر اکبر، فون: 971-4-2633645

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

اردو بازار، لاہور فون 7320318

ای میل: hikmat100@hotmail.com

کراچی میں ملنے کا پتہ

فضلی بک سپر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی ۰۲۱:۲۲۱۲۹۹۱

فہرستِ مضامین

ڈاکٹر سیّد عبدالقادر جیلانی مرحوم

عزم وعمل کی داستان

(آصف اکبر)

یہ کتاب، ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی مرحوم کے اس تحقیقی مقالہ پر مشتمل ہے جس پر انہیں ۱۹۸۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے اسلامی علوم میں پی ایچ ڈی کی سند عطا کی گئی تھی۔ مقالے کا موضوع مغربی دنیا کے ان صاحبانِ علم کا اندازِ فکر ہے، جنہیں مستشرقین (Orientalist) کہا جاتا ہے، اور جنہوں نے سترہویں صدی عیسوی سے لیکر انیسویں صدی عیسوی تک اسلام کے موضوع پر اختصاص کیا، اور اسلام کو نیچا دکھانے، جھوٹا، حقیر اور کمتر ثابت کرنے کے لیے، (بزعمِ خود) تحقیقی کتابیں لکھیں۔ میرا مقصد مقالے پر اظہار خیال کرنا نہیں ہے، کیونکہ یہ کام علماء اور فضلاء بہت بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ اس وقت مقصدِ تحریر صرف اپنے قابلِ فخر والد صاحب، ڈاکٹر جیلانی صاحب کی زندگی پر کچھ روشنی ڈالنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مقالہ انکی تحقیقی کاوشوں کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے۔ ان کا اصل کام توریت وانجیل، اور دیگر مذاہب کی مقدّس کتب میں پائی جانے والی بشارتوں کی روشنی میں مرتّب کی جانے والی رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیّبہ ہے۔ یہ کتاب ہنوز منتظرِ طباعت ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا کرے گا تو انشاء اللہ کسی وقت اسے بھی پیش کرنے کا بیڑہ اٹھاؤں گا۔

اس تحقیقی مقالے کے مصنف، عام محققین کے حالات کے برعکس، تدریسی شعبے سے متعلق نہیں تھے۔ انکا پیشہ مہندسی (Engineering) تھا، اور وہ ایک سرکاری ادارے سے جنرل مینیجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ایک تیکنیکی شعبے سے تعلّق رکھنے والا ایک بڑا عہدیدار، اسلامی علوم میں پی ایچ ڈی کرے، یہ ایک انہونی بات ہے۔ اور پھر موضوع بھی منفرد۔ یہ کیونکر ہوا، میری خواہش ہے کہ اس داستان میں، میں اس کتاب کے قارئین کو بھی شریک کروں، کیونکہ یہ حوصلے، عزم وعمل، انتھک جدّ و جہد، علمی پیاس، عشقِ رسول اللہ ﷺ، غیرتِ ایمانی، رکاوٹوں، حوصلہ شکنیوں، پیشہ ورانہ رقابتوں اور بے لوث کوششوں کی داستان ہے۔ ایسی داستانیں ہمارے زوال پذیر معاشرے میں روز روز جنم نہیں لیتیں۔

ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی مرحوم ۲٦ اپریل ۱۹۲٦ء کو ہسوہ، ضلع فتحپور، یوپی، بھارت کے ایک چھوٹے زمیندار، علمی، مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم سید عبدالحمید صاحب ایک دیندار، پڑھے لکھے، نیک طبع اور روشن خیال زمیندار تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے بڑے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں، جبکہ تین بھائی ان سے چھوٹے تھے۔ الحمدللہ انکے دو چھوٹے بھائی حیات ہیں، جبکہ دیگر بہن بھائی اپنے رب سے جا ملے ہیں۔ سب سے بڑے بھائی محمد اکبر صاحب مولوی نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا، سعید اکبر صاحب صوفی نے نظام ریلوے (حیدرآباد دکن) میں ملازمت کی، ان سے چھوٹے حفیظ اکبر الیاس صاحب نے کامرس میں گریجویشن کیا اور کراچی میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے اس وقت کے صدر اسکندر مرزا سے تمغہ حاصل کیا، ان سے چھوٹے نفیس اکبر اویس صاحب نے دیوبند سے سند حاصل کی اور مدرسی کا پیشہ اختیار کیا، جبکہ سب سے چھوٹے بھائی جلیل اکبر صاحب نے زمینیں سنبھالیں۔

یوپی کے کئی تعلیم یافتہ گھرانے ایسے تھے جن کی مستقل رہائش تو اپنے دیہی علاقوں میں تھی مگر کسبِ معاش کے سلسلے میں وہ ریاستوں وغیرہ میں ملازمت کرتے تھے۔ ہمارے گھرانے کے افراد ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر ریاست حیدرآباد، دکن جاتے تھے۔ یہ ایسا ہی سلسلہ ہے، جیسے آجکل پنجاب اور صوبہ سرحد کے بہت سے لوگ کراچی میں کام کرتے ہیں مگر انکی مستقل رہائش، اپنے آبائی علاقوں میں ہوتی ہے۔ جیلانی صاحب کے دادا، پردادا بھی ملازمت کے لیے حیدرآباد میں مقیم رہے تھے۔ گھر کی زمینوں کی آمدنی ناکافی ہونے کی وجہ سے انکے بڑے بھائی سعید اکبر صاحب نے، جو ان سے عمر میں تقریباً دس بارہ سال بڑے تھے، نوعمری میں ہی نظام ریلوے میں ملازمت کرلی تھی، جہاں وہ ریلوے گارڈ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ واضح رہے کہ اکبر ہمارا خاندانی نام ہے، جو ڈاکٹر صاحب کے پردادا کے نام پر چل رہا ہے، اور اس وقت ساری دنیا میں اس خاندان کے سو سے زیادہ خواتین و حضرات ایسے ہیں جن کے نام کا ایک حصہ اکبر ہے۔ جیلانی صاحب کا پیدائشی نام بھی 'معشوق اکبر' تھا، اور عرفیت جیلانی تھی مگر انہوں نے اسکول کے زمانے میں ہی اس نام کو نامناسب جانتے ہوئے اپنا نام، جیلانی کی مناسبت سے، عبدالقادر رکھ لیا تھا۔ اسی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ نوعمری سے ہی عزم و شعور کی دولت سے مالامال تھے۔

آٹھ دس سال کی عمر میں ہی وہ اپنے والدین کو چھوڑ کر اپنے بھائی کے پاس حیدرآباد دکن چلے گئے، جہاں انکی پرورش کی ساری ذمہ داری انکی بھابی 'سلمٰی خاتون' نے اٹھائی۔ اس کے لیے وہ ساری زندگی اپنے بھائی اور بھابی کے احسان مند رہے اور انہیں اپنے ماں باپ کی طرح سمجھتے رہے۔ اس طرح انکی ابتدائی تعلیم و تربیت حیدرآباد دکن میں ہوئی اور وہاں کے علمی ماحول نے انکے کردار کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔

اسکول کی تعلیم سترہ برس کی عمر میں مکمل کرنے کے بعد انہوں نے اپنا بوجھ خود اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ انکے والد کے اور بھائیوں کے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ کالج کی تعلیم کی عیاشی کر سکتے۔ سعید اکبر صاحب کے ذریعے انہوں نے نظام ریلوے میں اپرنٹس شپ حاصل کرلی، جو تین یا چار سال کا کورس تھا، لیکن دو تین سال

کے بعد ہی برصغیر کی تقسیم ہوگئی، جس کے بعد حیدرآباد دکن کے حالات دگرگوں ہوتے گئے، اور انکے لیے تعلیم جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔ حیدرآباد کے دفاع کے لیے ریاست کی فوج انتہائی ناکافی تھی۔ بھارت اسکو ہضم کرنے کے درپے تھا، اس لیے سیّد قاسم رضوی کی قیادت میں وہاں کے مسلمانوں نے رضاکار تحریک شروع کی۔ جیلانی صاحب بھی اس تحریک کے رضاکاروں میں شامل ہوگئے اور انہوں نے جیسی بھی میسّر تھی فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ اس سے پہلے بھی وہ اپنے آبائی گھر کے گاہے بگاہے قیام کے دوران حربی فنون بنوٹ وغیرہ سیکھتے رہے تھے، جنکی انہوں نے اچھی خاصی مشق بہم پہنچالی تھی۔

ستمبر ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کے انتقال کے دوسرے ہی دن بھارت نے ریاست حیدرآباد میں اپنے فوجی دستے داخل کر کے اس پر قبضہ کرلیا، اور اسکو بھارت کا ایک حصہ بنالیا۔ رضاکاروں نے حتی المقدور مزاحمت کی اور بے شمار شہید ہوئے۔ تمام رضاکار گردن زدنی قرار پائے، اور اندھا دھند پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ اب ڈاکٹر صاحب کا سابق ریاست میں کوئی مستقبل نہیں تھا۔ بھائی کو اپنی اور بچّوں کی جان کی سلامتی اور اپنی ملازمت خطرے میں نظر آرہی تھی۔ انکے مشورے سے ریل گاڑی کے جانوروں کے ڈبے میں چھپ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے، اور اپنے والد کے پاس پہنچے۔ ہفتہ دس دن میں کسی نے مخبری کردی اور مقامی پولیس انکو گرفتار کرنے کے درپے ہوئی۔ وہاں سے فرار ہوئے اور کراچی آکر دم لیا۔ جس وقت کراچی پہنچے تو انکے پاس پچاس روپے اور ایک کمبل، اور جسم پر کپڑوں کا ایک جوڑا تھا۔ یہاں ایک عزیز کے گھر عارضی قیام کیا اور کسی محکمے میں کلرکی کی نوکری کرلی۔

ایک ڈیڑھ سال کے بعد انہیں پتہ چلا کہ لاہور میں ریلوے کے محکمے میں کچھ ٹیکنیکل لوگوں کی ضرورت ہے۔ انکا نظام ریلوے کا ادھورا ڈپلومہ اس نوکری کے لیے کام آیا، اور ۱۹۵۰ء میں وہ مغلپورہ ریلوے ورکشاپ میں ملازم ہوگئے۔ ایک سال کے بعد اپنے والدین سے ملنے کے لیے ہسوہ گئے۔ اس موقع پر والدین نے انکی شادی حافظ سیّد حبیب الرحمٰن جعفری صاحب (جو ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے) کی بڑی بیٹی رضیہ سلطانہ سے کردی اور وہ اپنی بیوی کو لیکر لاہور آگئے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں عنایت کیں۔ ان میں سب سے بڑا میں ہوں اور میری پیدائش لاہور میں نومبر ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ مجھ سے دو سال چھوٹی بہن 'اصفیہ' بھی لاہور میں پیدا ہوئیں، جبکہ کراچی میں پیدا ہونے والے، عطیہ مجھ سے پانچ سال، عارف اکبر نو سال، توصیف اکبر گیارہ سال، احنف اکبر تقریباً انیس سال (جنہیں چھ ماہ کی عمر میں اللہ نے واپس لے لیا)، اور واصف اکبر بائیس سال چھوٹے ہیں۔

لاہور کے قیام کے بھی انکی زندگی پر دوررس اثرات مرتّب ہوئے۔ یہاں انکی زندگی میں تین اہم چیزیں داخل ہوئیں۔ ٹریڈ یونین ازم، علم و ادب اور برج کا کھیل۔ ٹریڈ یونین کے حوالے سے انکا سابقہ مشہور کمیونسٹ ٹریڈ یونین لیڈر مرزا ابراہیم سے بھی رہا اور کمیونزم بھی انکی زندگی میں گھس آیا۔ علم و ادب کے حوالے سے انکے قریبی دوستوں میں شوکت تھانوی، احسان دانش اور کرم فرماؤں میں جگر مرادآبادی شامل رہے۔

ان کے اس دور کے ایک ساتھی جناب عبدالحکیم وفا الحمدللہ بقیدِ حیات ہیں، اور لاہور میں ہی ہیں، اور ابھی حال ہی میں [۲۰۰۴ء] انکی شاعری کا ایک مجموعہ سامنے آیا ہے۔ جیلانی صاحب نے اس دور میں شاعری بھی کی اور اچھی شاعری کی۔ غزلیں بھی لکھیں، نظمیں بھی۔ انکی شاعری میں انقلابی اقدار ہمیشہ نمایاں رہیں۔ انکی ایک انقلابی نظم کا ایک نمائندہ مصرعہ پیش کرتا چلوں،

؎ 'بدلنے والے شعورِ انساں جو ہم نہ ہونگے تو کون ہوگا'

اس علمی ادبی ماحول نے انکو مطالعے کا ذوق فراہم کیا۔ اور لاہور کے سات سالہ قیام میں انہوں نے اردو/فارسی/انگریزی ادب، تاریخ، مذہب، فلسفہ، منطق، **انجینیرنگ**، وغیرہ پر تقریباً دو تین سو کتابیں پڑھ ڈالیں، جو ماہانہ تین/چار کتابوں کا اوسط بنتا ہے۔ اس کو مبالغہ نہ سمجھا جائے، جو کتابیں انہوں نے خرید کر پڑھیں، وہ کراچی بھی لیکر گئے اور میں نے کئی صندوق انکی کتابوں کے دیکھے ہیں اور ان سے کسی حد تک استفادہ بھی کیا ہے۔ زیادہ تر کتابیں انگریزی زبان کی تھیں۔ اس کے بعد کراچی کے قیام کے دوران بھی سو سے زائد خریدی ہوئی کتابیں انکی الماریوں کی زینت بنیں۔ کمیونزم سے انکے اس بے ضرر تعلق کی بازگشت ضیاالحق صاحب کے زمانے میں سنی گئی جب خفیہ پولیس کے ایک اہلکار تفتیش کرنے کے لیے ہمارے گھر آئے، اور یہ جان کر مطمئن ہوکر چلے گئے کہ جیلانی صاحب ایک مذہبی اسکالر بن چکے ہیں۔

کمیونسٹ لٹریچر کے حوالے سے ان کے مطالعے میں وہ اعتراضات بھی آئے جو اہلِ مغرب اسلام پر کرتے آئے ہیں۔ ان اعتراضات کو کمیونسٹ اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس دور میں جیلانی صاحب کا ذہن مذہبی نہیں تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہوں نے کبھی مذہب کی مخالفت کی ہو یا اسے غیر اہم جانا ہو۔ وہ اس دور میں بھی تمام مذہبی اور اخلاقی اقدار کی مکمل پاسداری کرتے تھے۔ ہاں مولویت سے وہ شروع سے بیزار تھے اور ہمیشہ رہے۔

۱۹۵۶ء میں انہیں کراچی شپ یارڈ میں ایک بہتر ملازمت مل گئی، اور وہ لاہور کو خیرباد کہہ کر کراچی منتقل ہوگئے۔ لاہور میں تو قریبی اعزہ کوئی نہیں تھے مگر کراچی میں بہت تھے۔ لاہور میں تو وہ سارا عرصہ کرائے کے مکان میں رہے مگر کراچی آنے کے ایک سال کے اندر انہوں نے لیاقت آباد میں ایک کمرے کا ایک مکان خرید لیا۔ اس کے بعد تقریباً پانچ سال کا عرصہ انہوں نے اس مکان کی تعمیرِ نو میں گزارا۔ اس عرصے میں ایوب خان کا مارشل لاء بھی گزرا، جس میں عوام کی سہولت کی خاطر بسوں میں کھڑے ہوکر سفر کرنے پر پابندیاں عائد کی گئیں، اور بس اسٹاپوں پر سہولت یافتہ عوام کی لمبی لمبی قطاریں لگ گئیں، جنہیں دفتر دیر سے پہنچنے کی پاداش میں سزائیں بھگتنی پڑتی تھیں۔ اس مسئلے کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ دفتر سائنکل پر جانا شروع کردیا، جو ایک دو سال تک جاری رہا۔ یہ یکطرفہ فاصلہ تقریباً نو [۹] میل یا پندرہ کلومیٹر کا بنتا تھا۔ دفتر سے واپس آ کر مکان کی تعمیر میں ایک مزدور کی حیثیت سے لگ جاتے تھے۔ اینٹیں تو مستری بناتے تھے، مگر انکی سینچائی کے لیے پانی کافی دور سے بالٹیوں میں بھر کر لاتے تھے اور سینچائی کرتے تھے۔ اسی طرح اینٹیں اٹھانا رکھنا، دیواروں اور چھت کی ترائی کرنا وغیرہ،

پھر مجھے اور دیگر بچّوں کو پڑھانا، اور پھر بھی وقت مل جائے تو کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ لینا، انکا معمول تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس زمانے میں انکا مطالعے کا مشغلہ کس حد تک جاری رہا، کیونکہ میرے سونے تک وہ کسی نہ کسی کام میں مشغول ہی رہتے تھے۔ اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ کام کرنا انکا نشہ تھا، اور وہ یہ نشہ ٹوٹنے نہیں دیتے تھے۔

۱۹۶۱ء میں ہمارے گھر بجلی آئی۔ یہ گلی کا، بلکہ اس محلّے کا پہلا گھر تھا جس میں بجلی آئی تھی۔ بجلی کی تقریباً مکمل وائرنگ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کی۔ اس کے بعد انہوں نے گھر پر سالانہ محفلِ میلاد کا سلسلہ شروع کیا، جسمیں خاندان کے مرد عورتیں جمع ہوتے تھے اور وہ خود میلاد پڑھتے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں گھر پر ماہانہ مشاعرے کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا جو تقریباً ۱۹۷۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۶۴ء میں کراچی شپ یارڈ نے اپنا پہلا جہاز 'وہمبرل' تیار کیا۔ اس کی افتتاحی تقریب میں غالباً صدر مملکت نے شرکت کی تھی۔ جیلانی صاحب نے اس موقع پر ایک خوبصورت نظم پڑھی جو بعض اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔

۱۹۶۵ء یا اس کے لگ بھگ، انہوں نے اپنے دفتر میں بھی سالانہ جلسۂ عید میلاد النبی کا سلسلہ شروع کروایا جس میں وہ خود بھی ایک مقرّر رہتے تھے۔ یہاں سے ان کے دینی مطالعے کا سلسلہ چلا۔ اس مطالعے کے ضمن میں ان کی نظر سے کچھ ایسے حوالے گزرے جن میں یہ کہا گیا تھا کہ قدیم آسمانی کتب میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں واضح بشارتیں دی گئی ہیں۔ اردو میں دستیاب توریت وانجیل میں تو بظاہر ایسی بشارتیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ انہوں نے انگریزی متن کا مطالعہ کیا اور متعلقہ کتابیں پڑھیں تو انہیں یہ اندازہ ہوا کہ ترجمہ کرتے وقت جب ایسی کوئی چیز سامنے آتی ہے تو مترجمین اسکا ترجمہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ حق چھپ جائے، جیسے اصل عبرانی متن میں لفظ 'محمّد' آیا ہے، تو اردو میں اسکا ترجمہ 'عشق انگیز' کیا گیا ہے۔ اس بات نے شوق کو انگیز کیا۔ انہوں نے پارسیوں، ہندوؤں، بدھوں، زرتشتیوں وغیرہ کی مذہبی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا اور عربی زبان بھی سیکھنی شروع کر دی۔ اس دوران قرآن، تفسیر، حدیث، تاریخ اسلام وغیرہ کا بھی مطالعہ جاری رکھا۔ ساتھ ساتھ 'ٹیچ یورسیلف' کتابوں کی مدد سے، جو انہوں نے یورپ سے منگوائی تھیں، عبرانی زبان کا بھی مطالعہ شروع کیا۔ جرمنی میں چھپی ہوئی ایک بائبل بھی منگوائی اور اسکا مطالعہ شروع کیا، جسکا متن عبرانی میں تھا، اور جسمیں بحرِ مردار سے تازہ دریافت شدہ مخطوطات کی مدد سے حاصل ہونے والی معلومات سے توریت اور انجیل کو مرتّب کیا گیا تھا، اور مخطوطاتی انجیل اور مروّجہ انجیل کا موازنہ کیا گیا تھا۔ کراچی میں انہیں عبرانی زبان کا جاننے والا کوئی نہیں مل سکا، جو اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتا۔ اس بائبل کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوا کہ بہت ساری بشارتوں کو دانستہ یا نادانستہ مسخ کر دیا گیا ہے۔

اب اسلام کی حقانیت انکے سامنے انتہائی واضح ہو کر آ گئی تھی۔ اس ایقان نے انکی زندگی کو مزید صالح بنا دیا۔ اب انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ غیروں کے پروپیگنڈہ نے لوگوں کے، خاص کر مغربی تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں میں جو شکوک وشبہات پیدا کر دیے ہیں، ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ لاہور کے قیام کے دوران انہیں جس قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا تھا، اس سے انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ الحاد اور تشکیک کی جڑیں کہاں

انہیں جس قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا تھا، اس سے انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ الحاد اور تشکیک کی جڑیں کہاں تک پھیل چکی ہیں۔

اس مطالعے کے لیے انہیں شدید محنت کرنی پڑی۔ بدقسمتی سے لاہور میں، کام کے دوران، کسی ساتھی کی لاپرواہی کے نتیجے میں آتشی بھٹی میں جھانکنے والی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا، جس میں جھانکنے سے انکی آنکھیں بھٹی کی آگ سے جھلس گئی تھیں۔ اس حادثے کے نتیجے میں کراچی آنے کے بعد ان کو موتیا ہو گیا۔ ایک سال کے وقفے سے دونوں آنکھوں کی جراحی کی گئی۔ اس زمانے میں یہ عمل بیحد صبر آزما ہوتا تھا۔ جراحی کے بعد ان کی آنکھوں پر بیحد موٹے عدسوں کے چشمے لگ گئے۔ پڑھنے کا چشمہ الگ، عام استعمال کا الگ تھا۔ رات کے وقت چلنا اچھا خاصا مشکل کام تھا۔ دن میں بھی دائیں بائیں دیکھنے کے لیے پوری گردن موڑنا پڑتی تھی۔ اس مجبوری کے نتیجے میں وہ سائکل، بائیک، کار وغیرہ، کچھ نہیں چلا سکتے تھے اور آنا جانا بسوں پر ہی کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس للکار کو بھی قبول کیا۔ دن بھر دفتر کی مشقت کے بعد شام میں وہ براہِ راست کتب خانوں میں چلے جاتے تھے۔ ان کے مطلب کی کتب نایاب تھیں۔ کچھ کتب بعض اہلِ علم جیسے خالد اسحٰق صاحب کے ذاتی کتب خانوں میں ہی تھیں۔ گھر لانے کی اجازت کوئی نہیں دیتا تھا۔ یہی مہربانی تھی کہ بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ فوٹو اسٹیٹ کا لفظ بھی اس زمانے میں کسی نے نہیں سنا تھا۔ صبح چھ بجے گھر سے نکل کر انکی گھر واپسی کبھی دس بجے رات اور کبھی بارہ بجے تک ہوتی تھی۔ کتابیں پڑھتے تھے اور انکے نوٹ اور حوالے ڈائریوں پر لکھتے جاتے تھے۔ چھٹی کا دن ان حوالوں کو مرتب کرنے میں استعمال ہوتا تھا یا پھر گھر کے ضروری کاموں میں، کیونکہ اسوقت تک ہم سب بھائی اسکول میں ہی تھے، اور خاطر خواہ انکا ہاتھ نہیں بٹا سکتے تھے۔ اس علم جوئی کے دوران انکی صحبتیں بہت سی محترم صاحبِ علم شخصیتوں سے رہیں جن میں مولانا ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری (اسلامک سینٹر نارتھ ناظم آباد والے) اور مولانا حامد حسن قادری صاحب کا نام مجھے یاد ہے۔ انہوں نے ان صاحبان سے بہت فیض اٹھایا۔

اسی دوران انہوں نے مشہور شاعر قتیل دہلوی کا ایک واقعہ کہیں پڑھا کہ وہ نائی کے پاس ڈاڑھی منڈوانے کے لیے گئے۔ نائی نے ان سے پوچھا ''آقا، شما ریش می تراشی؟'' یعنی آپ اور ڈاڑھی منڈواتے ہیں، انہوں نے بھنا کر جواب دیا ''بلی، ریشِ خود می تراشم، دلِ کسی رانمی تراشم''، ہاں، ڈاڑھی منڈواتا ہوں، کسی کا دل نہیں چھیلتا۔ اس نے آہستہ سے کہا، ''دلِ کسی نمی تراشی، الا دلِ رسول''، یعنی کسی کا دل نہیں چھیلتے سوائے رسول اللہ ﷺ کے دل کے۔ یہ عشق رسول ﷺ ہی تھا کہ اس دن کے بعد سے ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی صاحب نے باقاعدہ ڈاڑھی رکھ لی۔

اس عمیق مطالعے سے انہیں یہ اندازہ ہوا کہ قدیم کتبِ مقدسہ میں یہ بشارتیں اتنی کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ ان کی روشنی میں پوری سیرتِ طیبہ مرتب کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اب انہوں نے اپنا نصب العین ایک ایسی کتابِ سیرتِ رسول اللہ ﷺ کی تدوین کو بنا لیا جس میں ہر واقعے کا حوالہ کسی قدیم مقدس کتاب سے دیا گیا ہو۔ اس اہم کام میں تین سال سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔ اس دوران انہیں خیال آیا کہ کتاب کا آخری باب

اگر روضہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک، مسجد نبوی میں بیٹھ کر لکھنے کا موقع مل جائے تو کیا ہی بابرکت بات ہو۔ چنانچہ انہوں نے حج کی درخواست دی جو اللہ کے بے پایاں کرم سے قبول ہوگئی، اور ۱۹۷۲ء میں وہ پانی کے جہاز کے ذریعے حج کا مقدس فریضہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ اور اس طرح اس کتاب کا اختتامی باب انہوں نے مسجد حرام اور مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر لکھا۔

اسی اثناء میں جب یہ بات پھیلی کہ جیلانی صاحب ایک سیرت کی کتاب لکھ رہے ہیں تو کچھ اعزہ نے، جو بی-اے وغیرہ کی سند رکھتے تھے، ازراہِ طنز کہا کہ پڑھے لکھے تو ہیں نہیں، کتاب لکھنے چلے ہیں۔ یہ بات درست تھی کہ ان کے پاس اس وقت تک کسی تعلیمی بورڈ کی کوئی سند نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک حد درجہ غیور اور خود دار آدمی تھے۔ انہوں نے عملی جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً تیئس سال کے وقفے کے بعد، جس دور میں، میں کراچی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا، انہوں نے انٹر کے امتحان کے لیے پرائیویٹ رجسٹریشن کروائی، اور دونوں سالوں کا امتحان ایک ساتھ دیا۔ اس امتحان کو انہوں نے فرسٹ ڈویژن میں بڑی آسانی کے ساتھ پاس کرلیا۔ پھر بی-اے کے لیے رجسٹریشن کروائی، اسے بھی فرسٹ کلاس میں پاس کیا اور پھر اسلامی علوم میں ایم-اے بھی فرسٹ کلاس میں پاس کرلیا۔ اس طرح سے جس سال میں نے اپنا ایم-ایس-سی مکمل کیا، اسی سال انہوں نے بھی پچاس سال کی عمر میں، ایم-اے کی سند حاصل کی۔

اس درمیان میں انہوں نے اپنی کتابِ سیرت کی ٹائپنگ وغیرہ مکمل کرلی تھی اور اس کوشش میں تھے کہ کوئی ادارہ اسے چھاپنے پر تیار ہوجائے۔ یہ کتاب تقریباً ایک ہزار سے زائد ٹائپ کیے ہوئے صفحات پر مشتمل تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی دفعہ اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ اگر میں اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر اس کتاب کو اپنے اخراجات سے چھپوا بھی لوں تو اسکی اشاعت کون کرے گا۔ انکا خیال تھا کہ بڑے ادارے اس کی کماحقہ اشاعت کرسکیں گے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی پبلشرز سے رابطہ کیا۔ اندازہ یہ ہوا کہ پبلشرز صرف ان کتابوں کو چھاپنے میں دلچسپی رکھتے ہیں جو کسی معروف مصنف کی لکھی ہوئی ہوں، یا کسی مقبولِ عوام موضوع پر ہوں۔ یہ موضوع علمی اعتبار سے بہت اہم سہی، مگر تجارتی نقطۂ نظر سے اہم نہیں تھا۔ انہوں نے پھر یہ کوششیں کیں کہ کوئی سرکاری ادارہ ان کی کتاب شائع کرنے کو تیار ہوجائے۔ بھٹو دور کے وزیر مذہبی امور جناب کوثر نیازی کو بھی انہوں نے کئی خطوط لکھے، جنکے انکے عملے کے لوگوں نے نہایت مناسب دفتری زبان میں معذرت خواہانہ جوابات دیے۔ اب انہوں نے متعدد دیگر معروف شخصیات سے، جن میں حکیم محمد سعید شہید، ڈاکٹر اسرار احمد، اے کے بروہی، محمد طفیل مدیر نقوش، وغیرہ شامل ہیں، رابطہ کیا اور بالمشافہ ملاقاتیں کیں مگر کسی نے بھی اس بات کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا۔

اس مایوسی نے انہیں بددل تو ضرور کیا مگر وہ ہمت ہارنے والے آدمی نہیں تھے۔ اب انہوں نے پی-ایچ-ڈی کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۹۷۸ء میں جب انکی عمر باون سال کی تھی، انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے

صاحب نے خود ڈائریکٹر شپ قبول کی، اور مستشرقین کے اندازِ فکر پر کام کرنے کے لیے مقالۂ ہٰذا کا موضوع ان کے لیے منتخب کیا۔ اس دور میں انکی صحت مسلسل محنت سے کافی حد تک متاثر ہو چکی تھی۔ پیروں میں ورم، بے خوابی، تھکن وغیرہ معمول بن چکے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی صحت کی پرواہ نہیں کی اور اس مقالے کی تکمیل کے لیے دل و جان سے مصروف ہو گئے۔ پھر وہی شب و روز کی محنت تھی، وہی کتب خانوں کے چکر تھے۔ پھر کاتبوں اور ٹائپسٹوں سے بھی معاملات کرنے پڑے۔ دو تین سال کی مختصر مدت میں انہوں نے یہ مقالہ جنوری ۱۹۸۰ء میں حصول سند کے لیے جمع کروا دیا۔

لیکن اگلا مرحلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ جلد ہی انکے مقالے کے ڈائریکٹر جناب طاہر ملک صاحب کو نائجیریا میں ایک اچھی ملازمت مل گئی، اور وہ چھٹی لیکر وہاں چلے گئے۔ انکے جانشین کو پی۔ایچ۔ڈی کے اس مقالے کو سند دلوانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جیلانی صاحب کی باتوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ طاہر ملک صاحب سے انکے جانشین کی کوئی رقابت قسم کی چیز تھی۔ جس مقالے کو لکھنے میں دو تین سال کی مختصر مدت لگی، اسے سنڈیکیٹ پانچ سال میں بھی پرکھ نہیں سکی، حالانکہ مصنفین نے ایک سال کے اندر اپنی مثبت سفارشات بھجوادی تھیں۔

پانچ سال کے بعد جب طاہر ملک صاحب پاکستان واپس آئے اور دوبارہ انہوں نے صدرِ شعبہ کا منصب سنبھالا، تب انکی کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی صاحب کو اس مقالے پر ساٹھ سال کی عمر میں پی۔ایچ۔ڈی کی سند عطا کی گئی۔

اب انہوں نے کوشش کی کہ اس مقالے کو ہی کتاب کی شکل میں چھپوایا جائے۔ اس کے لیے بھی بہت بھاگ دوڑ کی۔ انکا خیال تھا کہ پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے، لوگ اسکے موضوع کو دیکھتے ہوئے اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے، مگر یہ خیالِ خام تھا۔ کسی نے بھی اس کی پذیرائی نہیں کی۔ بڑی کوششوں کے بعد تاج کمپنی والوں نے، کڑی شرائط پر، اسکی اشاعت پر رضامندی ظاہر کی۔ کتاب کی کتابت شروع ہوئی مگر ابھی دو تہائی سے کچھ زیادہ ہی کتابت مکمل ہوئی تھی کہ تاج کمپنی بھی اس دور کے سرمایہ کار کمپنیوں کے بحران کا شکار ہو گئی۔ یہ ۱۹۹۱ء کا دور تھا۔ کمپنی کی تالہ بندی ہوگئی اور منصوبہ ختم ہو گیا۔

۶ فروری ۱۹۹۲ء کو یہ نادرِ روزگار انسان اپنی آنکھوں میں اپنی کتابوں کی اشاعت کا خواب لیے اپنے رب سے جا ملا۔ دل کا دوسرا دورہ اس کا سبب بنا۔ پہلا شدید دورہ دسمبر ۱۹۸۴ء کی آخری تاریخ کو پڑا تھا۔ ان کی تدفین لیاقت آباد اور حسن اسکوائر کے درمیان واقع قبرستان میں کی گئی، اس موقع پر میرے پھوپھی زاد بھائی علی اکبر شاہد صاحب نے کچھ اجنبیوں کو جو کسی اور میت کی تدفین کے لیے آئے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کس کا جنازہ ہے، یہ کہتے سنا کہ یہ کسی ولی اللہ کا جنازہ لگ رہا ہے۔

ڈاکٹر جیلانی انتہائی خوددار انسان تھے۔ زندگی بھر کسی سے قرض نہیں مانگا۔ ان کی وفات کے بہت عرصے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ ضرورت مند لوگوں کو اکثر خاصی بڑی رقوم قرض دے دیا کرتے تھے۔

انکی روزمرّہ کی زبان، اپنے عالی خاندان کی مناسبت سے، انتہائی شریفانہ تھی۔ گھر میں، دوستوں میں، غصّے کے عالم میں، مایوسی میں، کبھی بھی ان کی زبان سے کوئی برہنہ حرف ادا نہیں ہوا۔ وعدے کے پابند تھے۔ بزرگوں کا ادب اور رشتوں کی پاسداری کرتے تھے، لیکن اگر کسی نے ان کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تو پھر ہمیشہ کے لیے اس سے بیگانہ ہوجاتے تھے۔ ریاکاری انہیں چھوکر بھی نہیں گئی تھی۔ عام لوگوں کی محفل میں ایسی گفتگو کبھی غلطی سے بھی نہیں کی جس سے علم کا رعب پڑے۔ یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ ساری زندگی کسب حلال میں گزاری اور کسی مشتبہ چیز میں بھی کبھی ملوث نہیں ہوئے۔ ان کے طرز زندگی سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسے عہدے پر فائز ہوں گے جس کے لیے لوگ تمنائیں کرتے ہیں۔

زندگی انہوں نے سادگی سے بسر کی۔ کبھی پلاٹوں یا آسائش زندگی کے پیچھے نہیں دوڑے۔ آخر عمر تک لیاقت آباد کے نوے گز کے اسی مکان میں مقیم رہے جو انہوں نے کراچی آنے کے بعد سترہ سو روپے میں خریدا تھا، اور انکے لواحقین اب بھی اسی مکان میں رہ رہے ہیں۔ حالانکہ اس دوران ان کے دوسرے ساتھی ناظم آباد اور گلشن اقبال وغیرہ میں بنگلے بنا چکے تھے۔

۱۹۸۲ء یا ۱۹۸۳ء میں جب وہ کراچی شپ یارڈ میں (مینیجر کے مساوی) اسٹور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر تھے، اور پروکیورمنٹ کا کام بھی اسی شعبے کے سپرد تھا، اس ادارے میں ایک (ریٹائرڈ) رئیر ایڈمرل، ایم ڈی بن کر آئے، اور جیسا کہ سب کرتے ہیں، پہلی میٹنگ میں انہوں نے تمام افسران کے لتّے لیے اور حسبِ استطاعت برا بھلا کہا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ میں سب کو ٹھیک کردوں گا۔ اس ضمن میں انہوں نے جیلانی صاحب کی طرف دیکھ کر کہا کہ مجھے سب پتہ ہے کہ اسٹور میں کیا ہورہا ہے اور اسٹور والے بھی سدھر جائیں۔

دوسرے ہی دن، مجھ سے مشورہ کرکے، جیلانی صاحب نے اپنا استعفیٰ ایم-ڈی کی خدمت میں پیش کردیا۔ وہ سٹپٹائے، معذرت بھی کی کہ میرا مطلب یہ نہیں تھا، مگر انہوں نے کہا کہ آپ نے سب کے سامنے الزام لگایا ہے، انہی کے سامنے معذرت بھی کریں۔ ایم-ڈی صاحب سے یہ نہ ہوا اور جیلانی صاحب نے اپنی ملازمت کو چھوڑ دیا۔ ان کے ساتھ ہی ان کے شعبہ کے چار پانچ دوسرے انجینیر وں نے بھی احتجاجاً ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔ جلد ہی ان سب لوگوں کو دوسرے اداروں میں بہتر ملازمتیں مل گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی بلوچستان وہیلز میں پہلے سے بہتر ملازمت مل گئی، مگر اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے انہیں روزانہ گھر سے ویسٹ وہارف جانا پڑتا تھا، اب روزانہ حب، بلوچستان جانا پڑا۔ دل کے دورے کے بعد، جو انہیں حب میں ہی پڑا تھا، انکی پوسٹنگ کراچی دفتر میں ہی ہوگئی۔ خودداری کے ایسے نمونے اب نایاب ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالقادر جیلانی صاحب مرحوم کا شجرۂ نسب، جو جناب ابوالقاسم عبدالسّلام حسینی ہسوی کی وقیع کتاب 'عربی النسل مسلمانوں کی دینی و علمی خدمات'، ۱۹۸۴ء، شائع کردہ مجلسِ اشاعتِ علومِ اسلامیہ، کراچی سے لیا گیا ہے، انکے احباب اور خصوصاً اہلِ خاندان کی دلچسپی کو مدّنظر رکھتے ہوئے، پیشِ خدمت ہے۔

عبدالقادر جیلانی، بن عبدالحمید (جھکّن میاں)، بن عبدالاحد، بن محمد اکبر کاظمی (مورثِ اعلیٰ خاندانِ اکبریہ)، بن صفدر حسین، بن اصغر علی، بن مقصود علی، بن یار محمد، بن ابومحمد، بن محمد وارث، بن غلام عالم، بن محمد صادق، بن محمد اکرم، بن شاہ محمد صادق، بن بندگی شاہ فرید، بن شاہ اشرف، بن محمد علی، بن محمود علی، بن نظام الدین، بن حسین (سیّد حسین مفتی الجن والانس)، بن ابوالقاسم، بن علاؤالدین، بن بہاء الدین، بن جلال الدین، بن عبدالحق، بن ابوالخیر (مورثِ اعلیٰ کڑہ)، بن قطب الدین موسوی، بن عبداللہ، بن محمد قاسم، بن محمد اسمٰعیل، بن ضیاالدین، بن علی قاسم، بن محمد ہاشم، بن ابوالقاسم، بن طاہر، بن طیّب، بن محمد، بن موسیٰ کاظم، بن جعفر صادق، بن محمد باقر، بن علی زین العابدین، بن حسینؓ، بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

مزید برآں: کتاب پریس میں جانے سے دوتین دن پہلے میری ملاقات لاہور میں والد صاحب مرحوم کے دیرینہ رفیق، اور سکّہ بند شاعر جناب عبدالحکیم وفا صاحب سے ہوئی، جنہیں میں نے یہ مضمون دکھا کر ان سے استدعا کی کہ اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہو یا کسی تصحیح کی ضرورت ہو تو وہ فرما دیں۔ انہوں نے دیر تک گفتگو کی اور کچھ اہم نکات کی نشاندہی کی۔ ساتھ ہی یہ عندیہ بھی دیا کہ وہ اپنی یادداشتیں مرتب کر رہے ہیں اور اس میں وہ ڈاکٹر جیلانی صاحب مرحوم کا تفصیلی تذکرہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ حیدرآباد دکن میں وہ جیلانی صاحب کے ساتھ ہی لالہ گوڑہ ریلوے ورکشاپ، سکندرآباد میں زیرِ تربیت تھے۔ اس ورکشاپ کے جنرل منیجر جناب معین الدین صاحب تھے۔ تقسیم ہند کے وقت ہندوستان سے مہاجرین کا ایک ریلہ حیدرآباد دکن بھی گیا تھا۔ ان مہاجرین کی دیکھ بھال میں جیلانی صاحب نے معین الدین صاحب کا بھرپور ساتھ دیا، اور انکے لیے راشن کارڈز وغیرہ بنوا کر انہیں اناج اور دیگر ضروریات کی فراہمی کے لیے بہت متحرک رہے۔

لاہور میں، جیلانی صاحب، وفا صاحب اور اختر رومانی صاحب مرحوم کا اپنا ایک ادبی حلقہ تھا، جہاں یہ لوگ انقلابی شاعری کرتے تھے۔ ان میں سے جیلانی صاحب اور رومانی صاحب جگر مرادآبادی صاحب کے باضابطہ شاگرد تھے۔ جگر صاحب نے ایک نشست میں ان دو حضرات کو سگریٹ کشی سے باز رہنے کی تلقین کی تھی، جس پر ان دونوں نے بہت عرصے تک عمل بھی کیا۔ اس کے نتیجے میں وفا صاحب نے بھی سگریٹ کشی ترک کردی، جس پر وہ آج تک عمل پیرا ہیں۔ جگر صاحب کے انتقال کے بعد جیلانی صاحب نے کسی وقت یہ کام دوبارہ شروع کر دیا۔

وفا صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر جیلانی بہت اعلیٰ معیار کی شاعری کرتے تھے، جبکہ اس دور کے اساتذہ مکھی پر مکھی مار رہے تھے۔ میں نے اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب کا ایک مصرعہ لکھا ہے۔ وفا صاحب نے مجھے اس غزل کے کئی اشعار سنا کر حیران کر دیا۔ انہیں اس کے علاوہ بھی ان کے کئی اشعار یاد ہیں۔

کچھ ضروری باتیں

مرتب کی طرف سے

یہ مقالہ بنیادی طور پر جامعہ کراچی کو پیش کیا گیا تھا، اور اس اعتبار سے اسکی زبان عام فہم بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ پھر کتابت کی بھی کئی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ کچھ جگہوں پر انگریزی عبارتوں کا اردو ترجمہ نہیں دیا گیا تھا اور کہیں کہیں کچھ حوالے رہ گئے تھے۔

اس کتاب کی ٹائپنگ، اسی سبب سے میں نے خود کی ہے تا کہ حسب ضرورت وضاحتیں، ترامیم اور اضافے کر سکوں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں پیش نظر رکھی جائیں۔

۱۔ جو عبارتیں [چوکور بریکٹ] کے اندر ہیں، وہ مرتب کا اضافہ ہیں۔

۲۔ جو نام غیر انگریزی ہیں جیسے رومن، یونانی، فرانسیسی وغیرہ، انکا تلفظ انکی اپنی زبان میں دیا گیا ہے، جیسے کانستنتائن، والتیئغ، وغیرہ

۳۔ اصل مقالے میں متعدد مقامات پر رسول اللہ ﷺ کے لیے 'بانی اسلام' کا لقب استعمال کیا گیا تھا۔ اگرچہ ذاتی طور پر مجھے اس لفظ کے استعمال میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی مگر کچھ اہل علم کی اس رائے کے پیش نظر کہ بانیِ اسلام کا لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے زیبا ہے، اس کو لفظ 'داعیِ اسلام' سے بدل دیا گیا ہے۔

۴۔ حوالے عبارتوں کے ساتھ ہی دیے گئے ہیں۔ اس میں کچھ لوگوں کو یقیناً الجھن تو محسوس ہوگی مگر موضوع کی نزاکت کے پیش نظر، میں نے یہی موزوں سمجھا۔ اردو متن میں انگریزی حوالے یا اصطلاحات شامل کرنا، ترتیب دہی کے حوالے سے اچھا خاصا مشکل کام ہے۔ انگریزی حوالے قوسین '( )' میں دیے گئے ہیں۔ ان کی ابتدا ')' سے ہوتی ہے۔ درمیان میں جہاں سطر بدلنے کی وجہ سے انقطاع ہوتا ہے وہاں '[' کی علامت دی گئی ہے، اور اگلی سطر میں ']' کی علامت سے تحریر پھر شروع ہوجاتی ہے۔ تحریر کا اختتام '(' پر ہوتا ہے۔ (Here the text line breaks]
[and here it continues) ۔ انگریزی اقتباسات اٹالک میں دیے گئے ہیں۔

۵۔ مقالے میں کئی مقامات پر ایسے حوالے ہیں، جہاں رسول اللہ ﷺ کی شان میں مستشرقین کی گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے۔ نقلِ کفر کفر نہ باشد کے مصداق، بادلِ ناخواستہ یہ حوالے شاملِ اشاعت

کیے جا رہے ہیں۔ میری پوری کوشش رہی ہے کہ ایسے تمام مقامات پر 'نعوذ باللہ' تحریر کیا جائے، لیکن ممکن ہے کہ کچھ مقامات پر نادانستگی میں رہ گیا ہو۔ فاضل مولّف بذاتِ خود بہت بڑے عاشق رسول تھے، اور انہوں نے موضوع کی مناسبت سے ضروری حوالے 'کتمانِ شہادت' سے بچنے کے لیے، دل پر پتھر رکھ کر، دیے تھے۔ اکثر انہوں نے ایسے مقامات پر حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی کے الفاظ حذف کر کے ان کی جگہ ... کے نقاط دے دیے ہیں۔ گو ایک تحقیقی مقالے میں اس احتیاط کی ضرورت نہیں تھی مگر اسے ان کے عشقِ رسول کا تقاضا سمجھا جائے۔

۶۔ کتاب کے آخر میں کتابیات کے باب میں ان تمام کتب کی فہرست دی گئی ہے جنکا حوالہ مصنف نے کتاب میں دیا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ یہ فہرست حوالے کے بین الاقوامی معیار کے مطابق نہیں ہے، لیکن میرے پاس یہی کچھ دستیاب تھا۔ اپنے طور پر میں نے اسے معیاری بنانے کی امکان بھر کوشش کی ہے۔

۷۔ ان سطور کی کمپیوٹر ٹائپنگ ان پیج میں کی گئی ہے۔ اردو۔ ورڈ پراسیسنگ ابھی زیرِ ارتقاء ہے، اس لیے بعض مقامات پر الفاظ کی نشست و برخواست میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ از راہِ کرم اس حوالے سے اس قسم کی خامیوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔

۸۔ اس کتاب کی طباعت کا مقصد اہلِ علم تک اس کو پہنچانا ہے۔ اس غرض سے کوشش یہ کی گئی ہے کہ کم سے کم قیمت پر یہ کتاب عوام تک پہنچائی جائے، ساتھ ہی ساتھ، کاغذ، جلد بندی اور طباعت کا معیار بھی اعلیٰ رکھا جائے۔ لاگت کم کرنے کے لیے اس کو درمیانے حروف میں طبع کیا جا رہا ہے، ورنہ بڑے سائز میں، اسکے صفحات سات سو سے تجاوز کر رہے تھے۔ میری تو خواہش یہ تھی کہ اس کی قیمت سو روپے رکھی جائے، مگر کاغذ کی گرانی، اور دیگر اخراجات کے پیشِ نظر دو سو پچاس روپے مقرر کی گئی ہے، جبکہ بازار میں اسی جسامت کی کتابیں پانچ سو روپے تک فروخت ہوتی ہیں۔

میں اس کتاب کی تدوین کے حوالے سے اپنے بیٹوں اور بھانجی ثنا انصار کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اسے پڑھ کر مجھے سنایا اور مجھے ٹائپ کرنے میں سہولت حاصل ہوئی۔ جناب علاّمہ قمر رعینی صاحب، جناب علاّمہ بشیر حسین ناظم صاحب اور جناب عزیز احسن صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کے مسودے کو بنظرِ غائر دیکھ کر غلطیوں کی نشان دہی کی۔ میں ڈاکٹر ابو الخیر کشفی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے، اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً مجھے میری ذمہ داری کا احساس دلایا۔ خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں جناب علاّمہ قمر رعینی صاحب کا جنہوں نے اس کتاب کے ایک حصے کو اپنے موقر ماہنامے، فیض الاسلام، راولپنڈی، میں قسط وار شائع کیا، اور کتابی شکل میں شائع کرنے میں میری عملی رہنمائی اور مدد کی۔ میں جناب جمال الدّین افغانی کا بھی شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔

میری والدۂ ماجدہ، میرے بھائی عارف اکبر، توصیف اکبر، واصف اکبر اور بہنیں اصفیہ اور عطیہ، میری بیوی لبنیٰ، یہ سب لوگ تحسین اور شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے اس کام میں میری عملی معاونت کی۔

پیش لفظ

از

ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی [مرحوم]

تہذیبیں گروہِ انسانی کی شدید محنت اور جاں فشانی کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ ہر گروہ کو اپنی تہذیب سے فطری وابستگی ہوتی ہے۔ جب تک اسکی تہذیب اسے تسکین عطا کرتی ہے، وہ دیگر تہذیبوں سے بے نیاز رہتا ہے۔ جب کوئی بیرونی تہذیب اس پر دباؤ ڈالنے لگتی ہے تو معاشرہ اپنی تہذیب کی مدافعت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور مخالف تہذیب کو اپنی تہذیب پر اثر انداز ہونے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مدافعت اکثر حربی ٹکراؤ کی صورت اختیار کرتی ہے، اور اگر حربی مدافعت کی قوت باقی نہیں رہ جاتی تو غالب معاشرے کے خلاف سرد جنگ شروع کی جاتی ہے۔ تا آنکہ دونوں میں سے کسی ایک کو قطعی برتری حاصل نہ ہو جائے۔ بصورتِ دیگر کوئی نئی تہذیب وجود میں آتی ہے جس میں متحارب معاشرے ضم ہو جاتے ہیں۔

پہلی صدی عیسوی تک بحرِ روم سے ملحق تمام علاقے رومن ایمپائر کے صوبے بن چکے تھے۔ اسلام سے قبل کرۂ ارض پر رومن ایمپائر کا کوئی مدِّ مقابل نہیں تھا۔ رومن ایمپائر کی پیشرو، گریک [یونانی] ایمپائر تھی، جس کے عظیم شہنشاہ، سکندرِ اعظم کی قلمرو میں مصر سے پنجاب تک کا پورا علاقہ شامل تھا۔ رومن خود کو یونانیوں کا جانشین سمجھتے تھے، اور اس اعتبار سے یونانی تہذیب کے وارث تھے۔ یہ مشترکہ معاشرہ، ہلینک سوسائٹی کہلاتا تھا۔ اس معاشرے نے مصری، آشوری، کلدانی، یہودی، فنیقی اور م لی تہذیبوں کو شکست دیکر اپنی برتری قائم کر لی تھی۔ ان قدیم تہذیبوں کے ورثے اپنے معاشرے میں منتقل کر لیے تھے۔ ان کا علم وفن اپنے بامِ عروج پر تھا۔ ایک ہزار سال سے دنیا پر رومن برتری مسلمہ تھی۔ روم کا نام عظمت اور سربلندی کی علامت بن گیا تھا۔ رومن خود کو دنیا کا متمدّن آقا تصوّر کرتا تھا، جسے، اور صرف جسے، دنیا پر حکومت کرنے کا حق حاصل تھا۔ باقی دنیا صرف اس لیے تھی کہ روم کی خدمت گزاری کرے۔

روم ثقافت میں یونان کا شاگرد تھا۔ یونانی فلسفہ اس کے لیے آخری حجت تھا۔ اس کی روشنی میں ہلینک معاشرہ یہ خامی محسوس کرتا تھا کہ اس کے مروجہ مذاہب [دیوتا پرستی]، افلاطون وارسطو کی فکر سے ہم آہنگ نہیں تھے۔

[سینٹ] پال رومی شہری ہونے کی بنا پر اس ضرورت سے آگاہ تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے [وصال کے] بعد اوّل تو خود اس نے عیسائیت کی ترویج اس انداز سے کی کہ ہلینک معاشرے کے لیے قابلِ قبول ہو، پھر اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ رومن معاشرے نے اس مذہب کو اپنے سانچے میں ڈھال کر پوری کر دی۔ جب عیسائیت کو اسنے اپنے قالب میں ڈھال لیا تو رومن شہنشاہ نے عیسائیت کو اپنے اقتدار کے بل بوتے پر رومن ایمپائر میں نافذ کر دیا۔ اس طرح یہ خامی بھی دور ہوگئی۔ اب رومن معاشرہ بخیالِ خویش عالمی اقتدار، عالمی فکر، عالمی سچائی اور عالمی برتری کا حامل تھا۔ رفتہ رفتہ اقتدار، فکر اور برتری کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ صرف عالمی سچائی [عیسائیت] کا بھرم باقی رہ گیا۔ پھر یہی بھرم سب سے بڑی قدر بن گیا، باقی قدریں ثانوی حیثیت اختیار کر گئیں۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں مغرب نے اسلام کو طلوع ہوتے دیکھا۔ (ملاحظہ ہو بابِ اوّل، مغرب کا پس منظر)۔ ساتویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں عرب، اسلام کا جھنڈا لیکر بیک وقت روم و ایران کی عظیم سلطنتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ سلطنتِ ایران کا وجود تو پچیس سال کے اندر اندر ختم ہو گیا، لیکن سلطنتِ روم اپنی بقا کی جنگ مسلسل لڑتی رہی۔ اس دور میں سلطنتِ روم دو حصوں میں منقسم تھی۔ مشرقی سلطنتِ روم (بازنطین) اصل اقتدار اور طاقت کی حامل تھی۔ اس وقت تک مغرب رومن ایمپائر کا جزو تھا۔ گو اسکی اپنی جداگانہ حیثیت نہ تھی، تاہم مغربی اور مشرقی عیسائیت میں رقابت پیدا ہو چکی تھی اور عیسائیت کو رومن شہریت پر تفوّق حاصل ہو چکا تھا۔

جب تک عرب بازنطین سے نبرد آزما رہے، مغرب ایک خاموش تماشائی تھا۔ [اس کے لیے] مشرقی سلطنتِ روم یا مشرقی عالمِ عیسائیت کی پسپائی ایک رقیب کی پسپائی تھی۔ بازنطین کی شکست گویا مشرقی کلیسا کی شکست تھی۔ لیکن جب ان شکستوں کے مختلف النوع اثرات ظاہر ہونے لگے، تو مغرب نے بھی اپنی حفاظت کی جدّ و جہد شروع کر دی۔ اس کا اوّلین ردِ عمل، کمزور بازنطین سے خود کو آزاد کرانے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بازنطین نے مغرب کی علیحدگی کو بادلِ ناخواستہ برداشت کیا اور اسے اپنے زیرِ اقتدار رکھنے کے لیے طاقت کے استعمال سے گریز کیا۔

مغرب خود کو عظیم رومن ایمپائر کا وارث تصوّر کرتا تھا۔ عرب جیسی ناقابلِ اعتناء قوم کے ہاتھوں رومن صوبوں کا نقصان اپنا نقصان سمجھ رہا تھا۔ انہیں پھر سے فتح کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ رومن نخوت کے لیے اسکے عظیم اقتدار اور دائمی برتری کا اس گمنام قوم کے ہاتھوں مجروح ہونا ناقابلِ برداشت تھا۔ آٹھویں صدی کی ابتداء میں عرب نہ صرف اسپین فتح کر چکے تھے، بلکہ سسلی سے اطالیہ پر حملے کر رہے تھے۔ نویں صدی میں دو بار روم کا محاصرہ کر چکے تھے۔ روم کو مغربی عالمِ عیسائیت میں حرم کا درجہ حاصل تھا اور روم پر حملوں کو کلیسا کبھی بھلا نہ سکتا تھا۔ آٹھویں صدی کے نصف سے مغربی سیاست کلیسا کے قبضے میں آ گئی، جس کے بعد کلیسا مغربی معاشرے پر مسلّط ہو گیا۔ اس نے کلیسائی قدروں کو معاشرتی قدریں بنا کر پورے معاشرے کو کلیسا کے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ کلیسا کے لیے سلطنتیں بننے لگیں، اور کلیسا پر سلطنتیں قربان کی جانے لگیں۔

کلیسا کا اقتدار مذہبی تھا۔ اس کا رقیب اگر ہو سکتا تھا تو صرف ایک دوسرا مذہب۔ عرب، سیل بے پناہ کی طرح عالم عیسائیت کو درہم برہم کر رہے تھے۔ انکی توانائی کا راز محض مذہب تھا۔ کلیسا نے نہ صرف عرب، بلکہ اسلام کو بھی اپنا دشمن قرار دیا، اور اسکے خلاف مختلف محاذ کھولے۔ حربی مقاصد کے لیے اس نے جنگجو جرمن اقوام کو استعمال کیا اور فکری محاذ خود سنبھالا۔

پروپیگنڈے کی قوت سے کلیسا اچھی طرح سے واقف تھا۔ کلیسا اسی پروپیگنڈے کے بل پر استوار ہوا تھا۔ پروپیگنڈے ہی کے بل پر چوتھی صدی عیسوی میں رومن ایمپائر کو کرسچین ایمپائر بنایا گیا تھا۔ اسی قوت سے کلیسا نے مغرب میں تمام رقیب مذاہب کا صفایا کیا تھا۔ اسی قوت سے جرمنوں کو قابو کیا تھا۔ کلیسا کے اختیار میں ویسے بھی صرف یہی ایک ہتھیار تھا، اور اس کی مدد سے وہ نہ صرف خود کو بلکہ مغربی معاشرے کو بھی [اسلام جیسے خطرناک] دشمن سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ کلیسا نے اسلام کے خلاف جنگی پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا۔

مغرب پر اگر صرف سیاسی دباؤ ہوتا تو شائد کلیسا کا پروپیگنڈہ اس قدر مقبول، موثر اور نتیجہ خیز نہ ہوتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عالمِ اسلام کا شدید دباؤ ہمہ جہتی تھا۔ سیاسی اعتبار سے بحرِ روم کا نصف رقبہ اور بحرِ روم کی اجارہ داری چھن چکی تھی۔ اس سے قبل رومی معاشرے نے کبھی، کسی کے ہاتھوں بھی، اس قدر شدید نقصانات نہیں اٹھائے تھے۔ ہزار سالہ بالادستی نے یہ عقیدہ راسخ کر دیا تھا کہ روم لافانی، ابدی اور لازوال ہے۔ عیسائیت نے اس عقیدے کو مذہبی رنگ عطا کر دیا، کہ یہ شہر خدا کا شہر ہے، اور قیامت تک کوئی طاقت اسے سرنگوں نہیں کر سکے گی۔ اگر کوئی اسے تباہ کرے گا تو وہ صرف 'دجّال' ہوگا۔ اس عقیدے نے مسلمانوں کو دجّال کی قوم باور کروایا، جو مغربی کلیسا اور عقیدۂ تثلیث کو ختم کرنے اٹھی تھی۔ عقیدۂ تثلیث بڑی خونریزی کے بعد رائج ہوا تھا۔ اسلام کے باعث اس معاشرے میں پھر وہی مسائل [جنہیں بمشکل کچلا گیا تھا] سر اٹھانے لگے تھے، جس کے باعث کلیسا کی بقاء خطرے میں پڑنے لگی تھی۔

سیاسی اور مذہبی دباؤ کے ساتھ ساتھ، علمی، معاشرتی اور ثقافتی دباؤ بھی پڑ رہا تھا۔ جہاں جہاں اسلام نے قدم رکھے، عیسائیت کے نقوش پھیکے پڑ گئے۔ عربی نے لاطینی کی جگہ لے لی۔ خود عیسائی عوام ثقافت و معاشرت میں عربوں کی پیروی کرنے لگے۔ اقتصادی دباؤ سب سے شدید تھا۔ بحرِ روم سے محرومی نے جہاز رانی مسدود کی۔ بحری تجارت بند ہوئی۔ بندرگاہیں اجڑیں۔ درآمد برآمد کے خاتمے نے بازار بند کیے۔ شاہی خزانہ درآمدی ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی، اور بازار ٹیکس سے محروم ہوا۔ صوبوں [مقبوضات] سے حاصل ہونے والی آمدنی جاتی رہی۔ غلاموں کی درآمد بند ہوئی۔ خزانہ اس قابل نہ رہا کہ حکومت کے اخراجات برداشت کر سکے۔ شاہی خدمت کے عوض زمین تقسیم ہونے لگی، یہاں تک کہ تقسیم کے لیے زمین باقی نہ رہ گئی۔ حکومت کے تمام ادارے ختم ہو گئے۔ شہر غائب ہونے لگے۔ زمین امراء کی ملکیت بن گئی اور غرباء زمین کے غلام ہو گئے۔

عالمِ اسلام کے ہمہ جہتی دباؤ نے ہر فرد کو سرگرداں کر رکھا تھا۔ (ملاحظہ ہو باب دوم، ریاستِ اسلامیہ کی توسیع اور عہد وسطیٰ کا مغرب) نجات کی کوئی امید تھی تو صرف کلیسا کے ادارے سے تھی۔

کلیسا کے نزدیک ان حالات کا واحد حل یہ تھا کہ سراسین (مغرب کی طرف سے مسلمانوں کو دی گئی عرفیت) کو اور انکے مذہب کو مکمل طور پر تباہ کر دیا جائے تا کہ بہتری کی کوئی شکل پیدا ہو۔

نفرت کا پروپیگنڈہ جذبات میں تلاطم پیدا کرتا رہا۔ تین صدیاں اضطراب میں گزریں اور جب عالم اسلام میں اضمحلال پیدا ہوا تو گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں عالم اسلام پر دھاوا بولا گیا۔ شام و فلسطین میں صلیبیوں نے اپنی چار لاطینی سلطنتیں قائم کر لیں۔ مصر و افریقہ کو بھی فتح کرنے کے لیے یورشیں ہونے لگیں۔ اسپین کو عملاً، مغرب نے اپنا باجگزار بنا لیا۔ مکمل دو صدیوں تک لاطینی تسلط مسلم ممالک پر قائم رہا۔ پھر جب یہ تسلط ختم ہوتا نظر آیا تو کلیسا نے صلیبی مقاصد منگولوں کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ منگول قہر الٰہی بن کر عالم اسلام پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے باوجود صلیبی سورماؤں کو بجز حسرت و یاس کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ تیرہویں صدی عیسوی کے اختتام تک [مشرق وسطیٰ میں قائم] صلیبی سلطنتوں کا نام و نشان تک مٹ گیا اور مغرب اپنی قدیم حدود میں واپس لوٹ آیا۔

جس دور میں صلیبی جنگوں میں عیسائی ناکام ہو رہے تھے، اسپین میں مسلمان قدم بقدم پسپا ہو رہے تھے۔ اسی دور میں ترکانِ عثمانی نے یورپ پر مشرق کی جانب سے پیش قدمی شروع کی۔ آٹھویں صدی عیسوی کی عرب فتوحات اتنی تشویشناک نہیں تھیں جتنی تشویشناک پندرہویں صدی عیسوی کی ترک فتوحات تھیں۔ چنانچہ مغرب نے سنجیدگی کے ساتھ اسلام کے خطرے سے نمٹنے کے طریقوں پر غور کرنا شروع کیا۔ ان سات صدیوں میں دشمنی اتنی راسخ ہو چکی تھی کہ ایک مفکر بھی ایسا نہیں ملتا جس نے مصالحت کی تجویز پیش کی ہو۔

ریمنڈ لل کے نزدیک اس کا واحد حل یہ تھا کہ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی جائے۔ راجر بیکن نے السنۂ مشرق کے مطالعے اور ان پر عبور پر زور دیا، تا کہ اسلام کے براہِ راست مطالعے کے ذریعے اس کی کمزوریوں کا پتہ چلایا جائے۔ ان پیچیدگیوں کو معلوم کیا جائے جن کی وجہ سے عالمِ اسلام دینِ مسیحی کو قبول نہیں کرتا یا نہیں کر سکتا۔ ان اسباب کا تجزیہ کیا جائے جن کے باعث مسلمانوں میں اپنے عقیدے سے وابستگی ختم نہیں ہوتی، اور ان کے ازالہ کے لیے دلیلیں فراہم کی جائیں۔

اس نے فلسفہ کی افادیت پر بھی زور دیا کہ فلسفہ بے دینوں [مسلمانوں] کا موثر ہتھیار ہے اور عیسائیوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ فلسفے پر عبور حاصل کریں اور مسلمانوں کے خلاف اسکا استعمال کریں۔ کلیسا نے ان تجاویز پر طویل عرصے تک غور و خوض کرنے کے بعد بالآخر انہیں عملی اقدام کے لیے منظور کر لیا۔

پندرہویں صدی عیسوی مغرب کے لیے شدید ہیجانی دور تھا۔ ۱۴۵۰ء سے ۱۴۶۰ء کے دوران یہ ہیجان نقطۂ عروج پر رہا۔ اس دوران ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے مشرقی سلطنتِ روم کا وجود مٹا دیا۔ مشرقی عالم عیسائیت نے مغرب کی بالادستی قبول کرنے پر ترکوں کی اطاعت کو ترجیح دی۔ اب عالم اسلام اور مغرب کے مابین کوئی شے حائل نہیں تھی۔ سرحدوں کا راست اتصال ایک مستقل خطرہ تھا۔ ان حالات میں مغرب خود کو بے یار و مددگار پا رہا تھا۔ ہر مکتب فکر اس خطرے سے متاثر تھا۔ متعدد مفکرین مغرب نے اس خطرے کے ازالے

کے لیے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز پر غور وفکر کے لیے کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ یہ تجاویز طریقۂ کار کے اعتبار سے مختلف تھیں لیکن سب کا مطمح نظر مشترک تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

جان آف سیگو دیہ قرآن کے دقیق مطالعے کے بعد اس میں خامیاں دریافت کر کے [مسلمانوں پر] یہ ثابت کرنے کا داعی تھا کہ یہ کلامِ ربانی نہیں ہے۔ وہ ہتھیاروں کے بجائے دلائل و براہین کے ذریعے اسلام کو شکست دینے کا حامی تھا۔ نکولاس آف کیوسہ اختلافی مسائل سمیٹ کر مجتمع کرنا چاہتا تھا اور اختلافی وجوہات ختم کر کے مسلمانوں کو دائرۂ عیسائیت میں داخل کرنے کا متمنی تھا۔ جین جرمین کے نزدیک اسلام کا علاج صرف تلوار تھا۔ اس نے مغرب کو متحد کر کے عالمِ اسلام کو تہہ و بالا کرنے کا پرچار کیا۔

انائیس سلوئیس مسلم حکمرانوں کو تحریص و ترغیب کے ذریعے عیسائی بنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے سلطان محمد فاتح کو بھی ایک خط لکھا۔ مذہبی مصلحین [لوتھر وغیرہ] کلیسا کی اصلاح اس لیے چاہتے تھے کہ کلیسا کے سبب عالمِ اسلام میں جو انتشار تھا وہ دور ہو سکے اور عالمِ عیسائیت متحد ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ کر سکے۔

بالآخر ایک مربوط لائحہ عمل مرتب ہوا۔ یونیورسٹیوں میں عربی شعبے قائم ہوئے۔ علومِ اسلام کا ترجمہ ہوا۔ مستشرقین کا گروہ وجود میں آیا اور کلیسا کے مقاصد کی تکمیل کرنے لگا۔ اس نے اسلامی مواد کو مغربی سانچے میں ڈھالا۔ یہ سانچے مستشرقین کو عہدِ وسطیٰ سے وراثت میں ملے تھے۔ عہدِ وسطیٰ سے ملنے والا [نام نہاد] علمی ورثہ مستشرقین کے ہاتھوں صیقل ہوا۔ اس پر ملمع چڑھایا گیا۔ اور مغربی ساکھ نے اسے دنیا میں عام کیا۔ جب دنیا مغرب کی اسیر ہوئی تو ہر فن میں مغرب کو سند تسلیم کیا جانے لگا۔

اسلام کے بارے میں بھی مستشرقین کی رائے کو عالمی اہمیت میسّر آئی، جس کے باعث عیسائی دنیا بدستور تعصب میں چُور، اسلام سے گریز کرتی رہی۔ غیر جانبدار دنیا نے بھی اسلام کو مغرب کی عینک سے دیکھا، جس کے سبب وہ نہ صرف اسلام کے صحیح خدّ و خال سے ناآشنا رہی بلکہ بڑی حد تک ان کی غیر جانبداری مغرب کی ہمنوائی میں تبدیل ہونے لگی۔ اسلامی معاشرے میں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جس نے اسلام کو مستشرقین کی عینک سے دیکھنا اور پرکھنا شروع کر دیا، جس کے زیرِ اثر مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

[اس مقالے میں مستشرقینِ مغرب کے اسی طرزِ عمل کو موضوع بنایا گیا ہے، تاکہ شکوک میں مبتلا اہلِ مغرب، مرعوبیت کے مارے مغربی تعلیم یافتہ مسلمان اور بیچارگی کے شکار مسلمان علماء پر مستشرقین کی سوچ، انکے مقصد اور طریقِ کار کو واضح کیا جا سکے اور یہ بات کھل کر سامنے آئے کہ مستشرقین کی تحریروں میں علم کی پیاس، حق کی تلاش اور پیشہ ورانہ دیانتداری کس حد تک عنقاء ہے، اور انکے پھیلائے ہوئے شکوک وشبہات کی اصل کیا ہے]۔ بابِ پنجم میں حسبِ توفیق ان اعتراضات پر بحث کی گئی ہے جو عام طور پر مغربی اہلِ قلم کا شیوہ ہیں۔ بحث میں شعوری طور پر اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ مسلم اہلِ قلم کے حوالے صرف بدرجۂ مجبوری ہی دیے جائیں، اور حتی الامکان وہی شہادتیں پیش کی جائیں جو خود مغرب کی [اور نتیجتاً انکے حساب سے مستند اور شبہ

سے بالاتر] ہوں، یا کم از کم مغرب کی نظر میں بھی مستند ہوں۔ تاریخی واقعات کے حوالے کم سے کم دیے گئے ہیں، [کیونکہ یہ مقالہ براہِ راست تاریخی مقالہ نہیں ہے،] اور یہ واقعات ہر مستند تاریخی کتاب میں ملتے ہیں۔

یہ شعوری کوشش بھی کی گئی ہے کہ قلم جذبات سے بچ کر چلے، تاہم میں نہ جذبات سے عاری ہوں، نہ عقیدتِ ختمی مرسنت سے بیگانہ۔ [میرے جذبات میری تحریر میں کہیں نہ کہیں چھلکیں گے]۔ انشا پردازی سے بھی ممکنہ گریز پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

احسان فراموشی ہوگی اگر میں اس مقالے کے ڈائریکٹر، مکرمی ڈاکٹر محمد طاہر ملک صاحب [مرحوم]، چیئر مین شعبۂ اسلامیات، جامعہ کراچی کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی پرخلوص معاونت و نگرانی کے بغیر یہ مقالہ تشنۂ تکمیل ہی رہ جاتا۔

عبدالقادر جیلانی

کراچی، نومبر ۱۹۸۰ء

باب اوّل

مغرب کا پس منظر

۱۔ رومن ایمپائر کا زوال اور طلوعِ مغرب

۲۔ باشندے

۳۔ چرچ

۴۔ دوہرا نظامِ اقتدار

رومن ایمپائر کا زوال اور طلوعِ مغرب

مغرب کی تعریف: مغرب سے مراد یورپ کا وہ علاقہ ہے جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے معاشرے پر مشتمل ہے۔ دوسرے الفاظ میں مغرب 'پاپا' کے روحانی اقتدار کا خطّہ ہے۔ [cf. Toynbee, A.J., A Study of History, Vol. I, p.29]۔ مغرب جن ممالک پر مشتمل ہے وہ تمام کے تمام بحرِ روم کے شمال میں واقع ہیں۔ ان میں پرتگال، اسپین، فرانس، اطالیہ، جرمنی اور ان سے ملحق چھوٹے چھوٹے ممالک، نیز جزائر برطانیہ، شامل ہیں۔

عیسائیت سے قبل رومن ایمپائر سیاسی اور انتظامی ضروریات کے پیشِ نظر مشرقی اور مغربی خطوں میں منقسم تھی۔ یہ خطّے مشرقی شہنشاہیت (Eastern Empire) اور مغربی شہنشاہیت (Western Empire) کہلاتے تھے۔ جب رومن ایمپائر میں عیسائیت رائج ہوئی تو ان ہی خطوں کے اعتبار سے منقسم ہوکر مشرقی عیسائیت (Eastern Christianity) اور مغربی عیسائیت (Western Christianity) کہلائی۔

مغرب کی تقسیم جغرافیائی اعتبار سے بھی کی جاسکتی ہے۔ بحرِ روم میں سسلی کے جنوب میں کیپ سوریلو (Cape Sorello) اور تیونس کی (Cape Bon) کیپ بون کے درمیان اندازاً سومیل [۱۶۰ کلومیٹر] عریض آبی گزرگاہ بن جاتی ہے جس کے سبب قدرتی طور پر اس کی تقسیم مشرقی اور مغربی سمندروں میں ہوجاتی ہے۔ مشرقی بحرِ روم کے کنارے واقع ممالک مشرقی یورپ اور مغربی بحرِ روم کے کنارے واقع ممالک مغربی یورپ یا صرف مغرب کہلاتے ہیں۔

مغربی تہذیب: ایامِ قدیم سے بحرِ روم کے یہ دونوں خطّے مشرقی یورپی تہذیب اور مغربی یورپی تہذیب کے گہوارے رہے ہیں۔ مشرق میں اگر یونانی تہذیب پروان چڑھی تو مغرب میں رومن تہذیب پھلی پھولی۔ موجودہ مغربی تہذیب نے خود کو رومی تہذیب کے آثار پر استوار کیا۔ رومن تہذیب کے بطن میں رومن چرچ نے پرورش پائی، اور رومۃ الکبریٰ کے زوال کے بعد یہی رومن چرچ رومی تہذیب کا وارث ہوا۔ چرچ نے مغرب میں ایک نئے معاشرے کو جنم دیا، جو مغربی معاشرہ کہلایا۔

رومن ایمپائر

روم کے معمار : رومی تہذیب کے اوّلین معمار ایشیائے کوچک کے باشندے 'اترسکن' (Etruscans) تھے۔ انہوں نے شمالی اطالیہ پر قبضہ کیا۔ صنعتی اور تجارتی شہر بسائے۔ عظیم بحری قوت قائم کی۔ یونان اور کارتھے جیہ کے علاقے فتح کر کے اطالیہ میں شامل کیے۔ ڈھائی سو سال حکمرانی کی اور ۴۷۴ء قبلِ مسیح میں پردۂ گمنامی میں چھپ گئے۔ (John Bowle, A New Outline of World History, p.184)۔ ہر چند روم کی تہذیب ان ہی کی مرہونِ منّت ہے مگر مغرب اترسکن دور کو اپنی تاریخ میں جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو، حوالہ بالا)

رومن ایمپائر کا قیام : اترسکن حکمرانوں کے بعد، روم نے پانچویں صدی ق م میں رومن ایمپائر کا سنگِ بنیاد رکھا۔ (Encyclopedia Britanica, Vol. 15, article 'Senate', p.1087)۔ تیسری صدی ق م تک رومن ایمپائر اس قدر مستحکم ہو چکی تھی کہ بیرونِ اطالیہ بسنے والی اقوام سے ٹکر لینے لگی۔ ۲۱۸ء ق م میں کارتھے جیہ کے ساتھ جنگیں شروع ہوئیں، جو پیونک وارز (Punic Wars) کہلاتی ہیں۔ (Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.10)۔ ان جنگوں کا اختتام ۱۴۶ء ق م میں کارتھے جیہ کی مکمل تباہی پر ہوا۔ کارتھے جی ایک عظیم سامی تہذیب تھی۔ یہ تجارتی اور صنعتی تہذیب، جس کا بحرِ روم پر راج تھا، اور جس کے عظیم الشان شہر آباد تھے، رومی بربریّت کے سیلاب میں غرق ہو گئی۔

رومن ایمپائر کی توسیع : کارتھے جیہ کی تباہی کے بعد روم، بحرِ روم کی عظیم ترین قوت بن گیا۔ یونان کی قوّت و اقتدار کو جیسے جیسے زوال آتا گیا، روم اس کی جگہ لیتا گیا۔ سسلی اور سارڈینیہ کا الحاق پیونک وارز سے قبل ۲۴۲ء ق م میں ہی ہو چکا تھا۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو حوالہ بالا)۔ اسپین کو ۲۰۲ء ق م میں رومن امپائر کا صوبہ بنایا گیا۔ آفریقیہ کو ۱۴۶ء ق م میں سقوطِ قرطاجنہ (کارتھے جیہ) کے بعد شاملِ سلطنت کیا گیا۔ مقدونیہ اور یونان بھی اسی سال روم کے زیرِ نگیں آئے۔ ایشیائے کوچک اور جنوبی گال ۱۱۸ء ق م میں فتح ہوئے۔ اسی سال شام پر فوج کشی کر کے اسے شاملِ سلطنت کیا گیا۔ ۶۶ء تا ۶۳ء ق م آرمینیہ کی فتوحات ہوئیں۔ ۵۸ء تا ۴۸ء ق م جولیس سیزر نے شمالی گال (فرانس) کو رومن ایمپائر کا حصہ بنایا۔ آگستس نے مصر اور دریائے ڈینیوب کے علاقوں کو شاملِ سلطنت کیا۔ آگستس کے عہد کے بعد اہم الحاق جزائرِ برطانیہ کا ہے جسے کلاڈیس نے ۴۳ء میں فتح کیا۔ ۹۹ء میں بالائی عراق کو فتح کر کے رومی سلطنت میں شامل کیا گیا۔ اس طرح پہلی صدی عیسوی کے اختتام تک رومن امپائر دنیا کی عظیم ترین سلطنت بن چکی تھی جو بحرِ روم سے ملحق تمام علاقوں پر مشتمل تھی۔

شہنشاہ کا انتخاب : شہنشاہ آگستس کا دورِ حکومت رومۃ الکبریٰ کے انتہائی عروج کا دور تھا۔ آئینی اعتبار سے شہنشاہِ روم کو عوام اور سینیٹ نے چند قانونی اختیارات دیے ہوئے تھے، مگر عملاً رومی شہنشاہ مطلق العنان حکمران ہوتا تھا۔ وہی رومن افواج کا سپہ سالار ہوتا تھا، اسی کے نمائندے تمام صوبوں پر حکومت کرتے تھے۔ قانونی معاملات میں بھی وہی مقتدرِ اعلیٰ تھا۔ سلطنت کا اعلیٰ ترین جج بھی وہی تھا اور مملکت کے تمام مالی ادارے اور خزانے اسی کے اختیار میں تھے۔

رومی شہنشاہیت موروثی نہیں تھی۔ شہنشاہ کا انتخاب رائے شماری کے ذریعے روم کی سینیٹ کرتی تھی۔ یہ انتخاب ہر شہنشاہ کے مرنے کے بعد ہوتا تھا۔ شہنشاہ آگستس کے جمہوری آئین (Republican Constitution) مجریہ ۲۷ ق م کی رو سے شہنشاہ کے انتخاب کا حق صرف سینیٹ کو تھا۔

(Encyclopedia Britanica; Vol.15, article 'Republic Restitute', p.1107)

(Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.12)

لیکن پہلی صدی عیسوی میں فوج کا اثر و اقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ خود سینیٹ فوج کے زیرِ اثر ہوگئی۔ چنانچہ شہنشاہ کلاڈیس (Cladius) (۱۴ء تا ۵۴ء) کی تخت نشینی کا اعلان فوج نے کیا اور سینیٹ نے اس اعلان کی توثیق کی۔ آہستہ آہستہ اس انتخاب نے وراثتی جانشینی کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ پہلی صدی عیسوی کے بیشتر شہنشاہ، آگستس کے گھرانے کے لوگ تھے۔

مسئلۂ جانشینی : شہنشاہ کی جانشینی ایک ایسا مسئلہ تھی جس کے باعث روم کو متعدد بار خانہ جنگیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے رومی شہنشاہوں نے اپنی حیات میں ہی اپنے جانشینوں کو اہم اختیارات تفویض کرنا شروع کر دیے، تاکہ ان کے آئندہ اقتدار سنبھالنے کی راہ ہموار ہو جائے۔ لیکن یہ طریقۂ کار بھی مفید ثابت نہیں ہوا۔ فوج اور سینیٹ اگر کسی شخصیت کے انتخاب پر متفق نہ ہوتیں تو مختلف سپہ سالار اپنی اپنی افواج سے اپنی شہنشاہیت کا اعلان کروا دیتے۔ چنانچہ شہنشاہ 'وسپاسین' ۶۹ء میں ایسی ہی ایک خانہ جنگی کے بعد فاتح کے طور پر ابھرا۔

۹۶ء میں جب نروا (نیرو) (Nerva) کو فوج اور سینیٹ نے شہنشاہ منتخب کیا تو اس نے یہ طریقۂ کار بنایا کہ ہر شہنشاہ اپنا جانشین سینیٹ سے منتخب کروا کر اسے اپنا بیٹا (متبنّیٰ) بنائے۔ (Chamber's Encyclopedia, Vol. IX, p. 746; & Vol. XI, p. 774)۔ گو یہ طریقِ کار تقریباً ایک سو سال تک رائج رہا، لیکن خانہ جنگیوں کا سلسلہ بدستور قائم رہا اور جانشینی کا اختیار دوبارہ فوج نے لے لیا۔

سلطنت کی مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم : ۲۸۴ء میں فوج نے دایو کلے تیان (Diocletian) کو شہنشاہ منتخب کیا۔ (حوالۂ بالا ثانی۔ صفحہ ۷۷۷)۔ اس نے سلطنت کے استحکام کی خاطر رومن ایمپائر کو دو انتظامی خطوں میں تقسیم کر دیا۔ اس میں سے ایک مشرقی سلطنتِ روم (Eastern Roman Empire) اور دوسرا خطہ مغربی سلطنتِ روم (Western Roman Empire) کہلایا۔

(Encyclopedia Britanica, Vol. 15, p.1128)۔ مشرقی سلطنتِ روم کا نظم ونسق اس نے خود سنبھالا اور مغربی سلطنت کی حکمرانی کے لیے میکسی مئین (Maximian) کو اپنا ہم منصب منتخب کروایا۔
(Jones A.H.M., The Decline of the Ancient World, p.29)
نیز ہر دو حکمرانوں کے ایک ایک معاون، جنہیں قیصر (Caesar) کہا جاتا تھا منتخب کروائے تاکہ یہ نہ صرف اپنے علاقے کے شہنشاہ کے معاون ہوں بلکہ ان کے جانشین بھی ہوں۔ یوں عملاً سلطنتِ روم دو حصوں میں بٹ گئی، اور اس پر دو شاہانِ کبیر اور دو شاہانِ صغیر بیک وقت حکمراں ہو گئے۔

دایوکلے تیان نے ۳۰۵ء میں تخت سے دستبرداری اختیار کی تو ہر طرف آگستس (شاہِ کبیر) اور قیصر (شاہِ صغیر) اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۳۰۶ء میں سات حکمرانوں کو آگستس ہونے کا دعویٰ تھا۔ شدید خانہ جنگی کے بعد ان میں سے قسطنطینِ اعظم (Constantine) شہنشاہ (آگستس)، اور لیسی نئیس (Licinius) نائب یا قیصر کی حیثیت سے ۳۱۳ء میں تخت نشین ہوئے۔ (حوالہ بالا)

پایۂ تخت کی منتقلی: ۳۲۴ء میں قسطنطین نے آبنائے باسفورس کے شمالی ساحل پر ایک نئے شہر قسطنطنیہ کی بنیاد رکھی، اور اسے اپنا پایۂ تخت بنایا۔ [Edward Gibbon; The Decline and Fall of Roman Empire, p.140]۔ رومن شہنشاہ کی روم سے قسطنطنیہ منتقلی، مرکزِ اقتدار کی منتقلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ آہستہ آہستہ سلطنت میں مشرقی اور یونانی اثرات بڑھنے اور رومی اثرات کم ہونے لگے۔ مغرب اس صورتِ حال کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، کیونکہ رومن فاتح اور حکمراں قوم تھے اور یونانی مفتوح اور محکوم۔ ملکی معاملات میں جب مغرب کا عمل دخل کم ہونے لگا تو مغرب نے اپنے معاملات میں خودمختاری اختیار کی اور مغربی شہنشاہ کا تقرر سینیٹ خود کرنے لگی۔

مغرب سے بے اعتنائی: چوتھی صدی عیسوی (۳۷۲ء) میں ہن قوم نے یورپ پر حملہ کیا۔ (Henry Pirenne, A History of Europe, p.26)۔ دریائے ڈینیسٹر (Deniester) کے سواحل پر جرمن قوم 'گوتھ' آباد تھی، جو مشرقی اور مغربی ساحلوں کی مناسبت سے 'آستروگاتھ' اور 'ویزی گاتھ' کہلاتی تھی۔ ہن کے خلاف تاب مقاومت نہ پاکر آستروگاتھ نے پسپا ہوکر مغربی ساحل کے علاقہ میں پناہ لی۔ آستروگاتھ کے دباؤ نے ویزی گاتھ کو اپنا علاقہ چھوڑنے اور دریائے ڈینیوب کو عبور کرکے مشرقی سلطنتِ روم کی حدود میں داخل ہونے پر مجبور کردیا۔ ویزی گاتھ حکمراں نے شہنشاہِ روم سے مملکتِ روم میں داخلے کا حق طلب کیا۔ یہ سب کچھ اس سرعت اور افراتفری کے عالم میں ہوا کہ شہنشاہ کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ داخلے کی اجازت دیدے۔ کیونکہ رومن افواج سلطنت کے دور دراز علاقوں میں بکھری ہوئی تھیں اور دریائے ڈینیوب کے علاقے میں متعین فوج کے لیے ویزی گاتھ سے مدافعت ممکن نہیں تھی۔ جلد ہی یہ جرمن قوم سلطنتِ روم کے لیے دردِ سر بن گئی۔ یہ لوگ نہ تو کسی شہر یا علاقے میں بسائے جاسکتے تھے اور نہ ہی ان کو منتشر کیا جاسکتا تھا۔ نہ یہ شہنشاہ کے احکام کے پابند تھے اور نہ ہی رومی تہذیب وتمدن سے آشنا۔ مذہباً پوری قوم بت پرست تھی اور فطرتاً جنگجو۔ شہنشاہ نے اس جرمن قوم کے

حکمراں کو 'رومن جنرل' کا خطاب بخشا تا کہ وہ اپنی قوم کا بادشاہ بھی رہ سکے اور شہنشاہ کے تابع بھی رہے۔ چھ سال نہ گزرے تھے کہ ۳۷۸ء میں اس بیرونی قوم نے اپنے لیے ایک پسندیدہ علاقے کا مطالبہ کرتے ہوئے بغاوت کر دی۔

اس زمانے میں آرکیدیئس (Arcadius) مشرقی سلطنت روم کا شہنشاہ تھا اور اس کا بھائی ہونوریئس (Honorius) مغربی سلطنت کا قیصر تھا۔ ان دونوں کے درمیان الا ئیرا (Illyra) کا علاقہ متنازعہ تھا اور اس پر مغربی سلطنت کا قبضہ تھا۔ شہنشاہ نے اپنے علاقے کو محفوظ رکھنے کے لیے اس مصیبت کا رخ مغربی سلطنت کی طرف پھیر دیا۔ گاتھ حکمراں کو اجازت دیدی کہ وہ الا ئیرا کے علاقے پر قبضہ کر لے۔

مغربی سلطنت روم کی تباہی : ویزی گاتھ نے الا ئیرا پر قبضہ کرنے کے بعد سرزمینِ اطالیہ کا رخ کیا۔ مغرب نے اپنی تمام افواج کو مجتمع کر کے ویزی گاتھ کو پے در پے شکستیں دیں۔ ان جنگوں کے باعث مغربی سلطنت کی سرحدیں دفاعی افواج سے خالی ہوگئیں۔ اتیلا (Attila) کی سرکردگی میں ہُن قوم کی یلغار جاری تھی، جس کے باعث مزید جرمن قبائل پسپا ہو کر مغربی سلطنتِ روم میں داخل ہونے لگے۔ ویندال قبائل نے گال (موجودہ جنوبی فرانس) کا پورا علاقہ پامال کر کے بحرِ روم تک قبضہ جما لیا۔ انہوں نے اسپین اور شمالی افریقہ کے علاقے بھی مغربی سلطنت سے چھین لیے۔ ویندال قبائل کی کامیابی نے برگندی قبائل کو شہہ دی۔ انہوں نے شمالی اسپین اور جنوبی فرانس کو آماجگاہ بنایا۔ اس طرح مغربی سلطنتِ روم اپنے صوبوں سے محروم ہو کر اطالیہ کی سرزمین تک محدود ہوگئی۔ خود اطالیہ پر ایک جرمن لیڈر 'راداگائیسس' (Radagaisus) نے ایک بھرپور حملہ کیا۔ گو اسے شکست ہوئی لیکن اس حملے کے سبب اطالوی قوتِ مدافعت بھی ختم ہوگئی۔

ویزی گاتھ قبائل اپنی ابتدائی شکستوں کے سبب خاموش تماشائی تھے لیکن اطالوی قوت کے کمزور ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پورے اطالیہ پر قبضہ کر لیا۔ مغربی شہنشاہ ہونوریئس کو محصور ہونا پڑا۔ ۴۱۰ء میں ویزی گاتھ حکمراں فاتحانہ شان سے روم میں داخل ہوا۔

مغربی سلطنت روم کا خاتمہ : ۴۱۰ء کے بعد اطالیہ پر عملاً ویزی گاتھ کی حکمرانی تھی لیکن نام کے لیے ہونوریئس بدستور شہنشاہ تھا۔ جرمن فاتحین وحشی تھے اور رومن تہذیب سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے حکمراں اتھاؤلف (Athaulf) نے رومن شہنشاہ کی بہن سے شادی کرنے میں فخر محسوس کیا، اور اس رشتے کے سبب ہونوریئس بدستور شہنشاہ رہا۔(for details see, Henry Pirenne; A History of Europe)۔

۴۵۳ء میں اتیلا نے اطالیہ کا رخ کیا، اور پورے شمالی علاقے کو روند ڈالا۔ اسی سال اتیلا کی موت واقع ہوگئی اور ہُن سلطنت جس تیزی کے ساتھ ابھری تھی اسی تیزی کے ساتھ بیٹھ بھی گئی۔ اتیلا کی موت کے دو سال بعد (۴۵۵ء) میں ویندال قوم نے اطالیہ کو تہہ و بالا کر ڈالا۔ اطالوی شہنشاہ اپنی تذلیل کا انتقام لینے سے قاصر تھا۔ رومن شہنشاہیت آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ صرف نام باقی تھا۔ یہ نام بھی اس وقت جاتا رہا جب آسترو گاتھ حکمراں 'تھیودورک' (Theodoric)، جسے اتیلا نے بے وطن کیا تھا، اطالیہ پر حملہ آور ہوا اور ۴۸۸ء میں اس

نے آخری ویزی گاتھ شہنشاہ کو کھلے میدان میں شکست دی اور ۴۹۳ء میں محصور شہر 'راوینا' سے صلح کے بہانے بلا کر اسے قتل کر ڈالا۔

(Fuller, J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p.37)

مغربی سلطنتِ روما کا چراغ آٹھ صدیوں تک ضوفشاں رہ کر بجھ گیا۔ مغرب کے حصے بخرے ہو گئے۔ مشرقی سلطنتِ روما 'بازنطین' کے نام سے پندرہویں صدی عیسوی تک قائم رہی، یہاں تک کہ، ترک فاتحین نے ۱۴۵۳ء میں اسے بھی ختم کر دیا۔(The Concise Encyclopedia of the Living Faiths)۔

مغربی ریاستوں کا قیام

مغرب کی علیحدگی : مغربی رومن ایمپائر کے اختتام کے بعد مغرب حسب ذیل چھ خودمختار سلطنتوں میں بٹ گیا۔

۱۔ برطانیہ ------------- اینگلو سیکسن سلطنت
۲۔ شمالی گال ------------- فرینک سلطنت
۳۔ پراونس ------------- برگنڈی سلطنت
۴۔ اکویتانیہ اور اسپین ---------- ویزی گاتھ سلطنت
۵۔ افریقہ اور جزائز بحرِ روم ------ وینڈال سلطنت
۶۔ اطالیہ ------------- آسٹروگاتھ سلطنت

(cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p.30)

یہ ساری کی ساری جرمن سلطنتیں تھیں۔ ان میں سے کسی سلطنت کے حکمراں نے نہ تو اپنی شہنشاہیت کا دعویٰ کیا اور نہ ہی بازنطینی شہنشاہ کے اقتدارِ اعلیٰ سے کوئی تعارض کیا۔ روم کا پوپ اب بھی شہنشاہِ بازنطین کو مغرب کا آئینی شہنشاہ تصور کرتا تھا۔ کلیسا کی دستاویزات پر شہنشاہِ بازنطین کے سنِ جلوس کی تاریخ درج ہوتی تھی۔ (حوالہ بالا)۔ تاہم عملاً مغرب کا کوئی شہنشاہ نہیں تھا۔

بازنطینی شہنشاہ جسٹینین (Justinian) (۵۲۷ء تا ۵۶۵ء) نے اپنے عہد میں مغربی سلطنت کے علاقوں کی بازیابی کا فیصلہ کیا۔ ۵۳۰ء سے ۵۵۳ء تک بازنطینی افواج نے ایسے تمام علاقے فتح کر لیے جو بحرِ روم سے متصل تھے۔ تاہم اسے فرینک سلطنت اور اینگلو سیکسن سلطنت کو فتح کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ جسٹینین کے عہد سے مشرقی رومن سلطنت کو بازنطین کہا جانے لگا تھا۔ گویا اس عہد کے بعد سلطنت روم (مغربی)

بازنطین کا ایک مفتوحہ علاقہ بن گئی۔ اس عہد سے قبل 'روم' مشرقی علاقے پر حکومت کرتا تھا، اب خود روم پر بازنطین کی حکومت قائم ہوگئی۔

یہ الحاق بھی عارضی ثابت ہوا۔ جسٹینین کی وفات کے بعد بازنطین ایمپائر پر روسی علاقے کی وحشی اقوام 'آوار' (Avar) اور 'سلاف' (Slav) نے دھاوا بول دیا۔ دوسری جانب ایشیا میں ایرانی سلطنت سے بھی جنگ چھڑ گئی۔ مغرب پر فوج کشی نے بازنطین کو اس قدر زیر بار کر دیا تھا کہ خزانہ مزید جنگی اخراجات کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہ گیا تھا۔ ان حالات نے بازنطین کو مدافعتی جنگ پر مجبور کر دیا اور مغرب کی طرف سے توجہ ہٹ گئی۔ بازنطین کی کمزوری سے ایک نئے جرمن قبیلے 'لومبارت' (Lombard) نے فائدہ اٹھایا۔ اس قبیلے نے گاتھ قبائل کے نقش قدم پر ترکِ وطن کیا اور شمالی اطالیہ پر قبضہ کر کے لومبارت سلطنت قائم کر لی۔ اس نئی سلطنت کے قیام کی بدولت فرینک سلطنت بازنطین کی دسترس سے باہر ہوگئی۔ ممکن ہے کہ آئندہ کسی موقع پر بازنطین مغربی علاقوں کی بازیابی میں کامیاب ہو جاتا، لیکن اس درمیان ظہورِ اسلام نے بازنطین کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی اور مغرب نے اپنے آپ کو بازنطین سے ہمیشہ کے لیے آزاد کرالیا۔

لومبارت اور فرینک ریاستوں کی پیروی کرتے ہوئے مغرب کے دیگر علاقوں نے بھی بازنطینی اقتدار کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا۔ اس طرح ساتویں صدی کے وسط میں اس سیاسی وحدت کا خاتمہ ہوگیا جسے تاریخ رومن ایمپائر کے نام سے یاد کرتی ہے۔

(Henry Pirenne; A History of Europe, p.41)

فاتحین مغرب اور کلیسا : جرمن فاتحین جنہوں نے مغربی رومن ایمپائر پر قبضہ کر لیا تھا، نیم وحشی تھے۔ انہیں تہذیب و تمدن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مذہباً وہ بت پرست تھے۔ دریائے ڈینیوب کے آس پاس کے کچھ قبائل اگرچہ عیسائیت قبول کر چکے تھے، مگر وہ رومن کیتھولک کے بجائے 'ایرین' (Arian) تھے۔ مغرب ایرین فرقے کو بدعتی تصور کرتا تھا اور بدعت مغرب کی نظر میں ناقابلِ معافی جرم تھا۔ جرمن فاتحین روم کی تہذیبی برتری کے قائل تھے، اور انہوں نے تیزی سے رومی تہذیب کو اپنانا شروع کر دیا، اور آہستہ آہستہ رومن (لاطینی) تہذیب میں رنگ گئے۔ انکے جرمن طور طریقے رومن اندازِ معاشرت میں گم ہوگئے۔

جرمنوں نے نہ صرف طرزِ حکومت، اصولِ سیاست اور انتظامِ مملکت کو قبول کر لیا بلکہ کلیسائے روم کی کوششوں سے انہوں نے 'رومن کیتھولک' مذہب بھی اختیار کر لیا۔ عیسائی ہونے کے بعد کیتھولک چرچ نے انہیں مغرب کے شہری تسلیم کر کے 'عیسائی دولتِ مشترکہ' (Christian Common Wealth) کا رکن بنا دیا۔

(Henry Pirenne; A History of Europe, p.32)

اس طرح یہ نیم وحشی جرمن جو بظاہر فاتح تھے، حقیقی فاتح نہ ثابت ہو سکے۔ ان کی تہذیبی موت جلد ہی واقع ہوگئی۔ حقیقی فاتح، رومن چرچ ثابت ہوا جس نے ان وحشیوں کو رام کر کے اپنا تابع فرمان بنا لیا۔

(Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. II, p.320)

مغرب میں کوئی شہنشاہ نہ تھا۔ بازنطینی شہنشاہ کا اقتدار برائے نام تھا۔ رومن دور کے قانون ساز ادارے 'سینیٹ' کو جرمن فاتحین نے نابود کر دیا تھا۔ اب تمام اقتدار حکمراں کی ذات میں مجتمع ہو گیا۔ مغربی ریاستوں کے سارے حکمراں عیسائی ہو چکے تھے، اور پوپ کو اپنا روحانی مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرتے تھے۔ پوپ کے پاس اسکی اپنی سینیٹ 'کیوریا' (Curia) موجود تھی۔ قریہ قریہ گرجا گھر تھے۔ ہر گرجے کے پادری کا عوام سے قریبی تعلق تھا۔ مذہبی سربراہ کی حیثیت سے پوپ کا حکم بادشاہ پر بھی چلتا تھا، جبکہ پوپ بادشاہ کے حکم کا پابند نہیں تھا۔ پوپ کا ادارہ 'کلیسا' مالی اعتبار سے خودکفیل، اور انتظامی معاملات میں خودمختار تھا۔ اس کے سارے کارکن تعلیم یافتہ، تربیت یافتہ، اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جبکہ حکمراں ان سہولتوں سے عاری تھے۔ رومن سول ایڈمنسٹریشن تباہ ہو چکا تھا۔ جرمن اسے بحال نہ کر سکے۔ عملاً حکومت کا ہر شعبہ ناکارہ ہو چکا تھا۔ نتیجتاً فاتحین نے بے بسی کے عالم میں کلیسا کی طرف دیکھا۔

ریاستی نظم و نسق پر چرچ کی بالادستی : کارولن جیئن (Carolingian) خاندان نے فرینک سلطنت کے نظم و نسق کی بحالی کے لیے کلیسا سے کارکن مستعار لیے، اور ایسے تمام عہدے جہاں نوشت و خواند، فہم و فراست، حکمت اور فیصلے کی ضرورت تھی، مجبوراً کلیسا کے حوالے کیے۔ کلیسا نے ان عہدوں کو قبول کر کے مغرب کی سیاست کو اپنے تابع کر لیا۔ (Henry Pirenne; A History of Europe, p. 57)۔

رومن کیتھولک چرچ، رومن ایمپائر میں سات صدیاں گزار چکا تھا۔ اس دوران اس نے انتظامی ڈھانچہ، زبان (لاطینی)، رسم الخط، قانون، رسم و رواج، غرض یہ کہ سب کچھ رومن ایمپائر سے اخذ کیا، اور ایمپائر کے زوال کے بعد، کلیسا نے یہ ساری قدریں محفوظ اور زندہ رکھیں۔ کارولن جیئن دور میں کلیسا نے ان تمام قدروں کو پھر سے حکومت کے لیے استعمال کر کے ان کا احیاء کیا۔ چونکہ نئے معاشرے کو یہ سب کلیسا کے توسط سے میسّر آئی تھیں، اس لیے کرسچین قدریں کہلائیں، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی قدر کرسچین نہ تھی، بلکہ سب کی سب مِن وعَن رومن تھیں۔

کارولن جیئن عہد سے قبل چرچ ریاست (State) کے ماتحت تھا۔ شہنشاہ کا حکم چرچ کے معاملات میں بھی حرفِ آخر تھا، جبکہ چرچ کو حکومت کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس عہد سے مغرب میں یہ کیفیت بالکل بدل گئی۔ اب اسٹیٹ کو چرچ کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا جبکہ چرچ اسٹیٹ کے ہر شعبے میں دخیل اور بالادست تھا۔ اس اقتدار اور بالادستی سے مشرقی چرچ بازنطین میں بالکل محروم تھا۔ بازنطینی شہنشاہ کے نزدیک پوپ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ دوسرے اسقفوں کی طرح پوپ بھی شہرِ روم کا اسقف تھا، جس کے تقرر اور تنزل کا اختیار شہنشاہ کو حاصل تھا۔

مغرب پر جیسے جیسے شہنشاہِ بازنطین کی گرفت کمزور ہوتی گئی، پوپ کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ پوپ نے شہنشاہ کی جگہ سنبھال لی۔ وہ مغرب کی عظیم ترین شخصیت بن گیا۔ وہی مغربی حکمرانوں کا رہنما تھا۔ اسی کے دم سے مغرب کا نظم و نسق قائم تھا۔ وہی قانون ساز تھا۔ وہ بوقتِ ضرورت سیاسی مدبّر کی حیثیت

سے معاہدات کرتا تھا۔ اس کے توسط سے حکمرانوں کے قضیے طے ہوتے۔ وہ حملہ آوروں سے صلح کی شرائط طے کرتا۔ علاقوں کی مدافعت کرتا اور بادشاہوں کے تنازعات طے کرتا۔

بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار کا خاتمہ : مغرب کے نئے معاشرے میں پوپ نائب عیسیٰ تھا، جس کے تقدس کی نظیر روئے زمین پر نہیں تھی۔ مغرب کے عوام و خواص سب پر ہی اسکا حکم چلتا تھا۔ ہر حکمراں پوپ کی قدم بوسی کو اپنی سعادت تصور کرتا تھا۔ ان حالات میں پوپ کے لیے یہ ممکن نہ رہ گیا تھا کہ بازنطینی شہنشاہ کا اقتدار مغرب میں باقی رہنے دیتا۔ پوپ اگر بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار کو باقی رہنے دیتا تو خود اسکا اقتدار مجروح ہوتا۔ چونکہ ابھی تک پوپ کے وسائل اتنے نہ تھے کہ شہنشاہ سے بغاوت کرکے اسکی دسترس سے محفوظ رہتا، لہٰذا وہ موقع کی تلاش میں تھا جو اسے جلد ہی مل گیا۔

مسلمہ بن عبدالملک نے ۷۱۶ء میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ دو سال شہر کا محاصرہ جاری رکھنے کے بعد ۷۱۸ء میں اس نے مراجعت اختیار کی۔ [Bury J. B.; History of the Later Roman Empire, Vol. II, p.405]۔ اس واقعے نے بازنطینی شہنشاہ 'لیو سوم' (Leo III) کے وقار کو عالمِ عیسائیت میں خاصا بلند کر دیا۔ [Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p. 241]۔ اس نے نہ صرف فوجی اور ملکی معاملات میں اصلاحات کیں بلکہ مذہبی معاملات میں بھی اصلاحات کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ چرچ کی قوت میں کمی کر سکے اور عوام کو کلیسا کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکے۔ (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. III, p.276) نیز (حوالہ بالا، صفحہ ۲۴۲)۔

چنانچہ ۷۲۶ء میں اس نے [غالباً اسلام سے متاثر ہو کر] شبیہہ پرستی (Incanoclasm) کی ممانعت کرتے ہوئے حکم دیا کہ کلیساؤں کو ہر قسم کی تصاویر اور مجسموں سے پاک کیا جائے۔ شہنشاہ کے اس حکم نے پوپ کو چراغ پا کر دیا اور اس نے شہنشاہ کو ملعون و مردود قرار دے دیا۔ (ملاحظہ کیجیے فلر حوالۂ بالا، صفحہ ۲۷۶ نیز (Henry Pirenne; A History of Europe, p.65)۔ پوپ کا یہ عمل آزمائشی تھا۔ اس سے قبل کسی کلیسا کے سربراہ نے شہنشاہ کے ساتھ اس قسم کی گستاخی کی جرأت نہیں کی تھی۔ شہنشاہِ بازنطین اس بے عزتی کو برداشت کرنے پر مجبور ہو گیا، کیونکہ مغرب پر اسکا اقتدار برائے نام تھا۔ اطالیہ اسکے قبضے سے نکل کر لومبارت حکمرانوں کے زیرِ تسلط تھا۔ (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. II, p.431)۔ فرینک حکمراں، اسپین کے مسلم حکمرانوں کا مقابلہ فرانس میں کامیابی سے کر رہے تھے۔ شہنشاہِ بازنطین کی بے بسی اور فرینک حکمرانوں کی روز افزوں قوت پوپ کے لیے حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔

مغرب خودمختاری کی جانب : ابتدائی آٹھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے اسپین کو فتح کرنا شروع کیا، اس وقت فرینک سلطنت پر جو خاندان حکمران تھا اسے میروونجین (Merovingian) گھرانا کہا جاتا ہے۔ ابتداً یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی، مگر مسلم حملے کے وقت تک اسکی حدود اسپین سے لیکر ڈینیوب تک وسیع ہو چکی تھیں۔ فرینک حکمراں اطالیہ پر یلغار کرکے قدم بقدم لومبارڈوں کو شکست دے رہے تھے۔ لیکن مسلم حملے نے

انکو جہاں تھے وہیں روک دیا۔ آہستہ آہستہ ان پر زوال آتا گیا۔ میرووِنجیئن بادشاہ آخر وقت میں بالکل بے دست و پا تھے۔ اصل قوّت شاہی محل کے حاجب (Mayor of the Palace)، پپاں (Pippin) کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ شخص ایک نیم جرمن۔ نیم رومن گھرانے 'کارولن جیئن' سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی کے دور میں اس کے بیٹے چارلس مارتل (Charles Martel) نے کئی جنگیں جیتیں۔ امیر عبدالرحمٰن الغافقی نے جب ۷۳۲ء میں اسپین سے فرانس میں پیش قدمی کی تو یہی چارلس ان سے 'طورس' (Tours) میں مدِ مقابل ہوا۔ حالات کی ستم ظریفی نے اس جنگ میں فتح کا سہرا چارلس کے سر پر باندھ دیا، جبکہ امیر کی شکست مسلم قبائل کی اندرونی رقابت کا نتیجہ تھی۔ [(Cesare Folingo; The Legacy of Rome, article 'The Transmission of the Legacy', pp.14-15)]۔ اس مفروضہ فتح نے چارلس کو پوری سلطنت کا ہیرو اور آقا بنادیا۔

چارلس کے بعد اسکا بیٹا 'پپاں دی شارٹ' (Pippin the Short) ۷۴۱ء میں جانشیں ہوا۔ اس نے اربابِ کلیسا سے تعلّقات پیدا کیے اور 'سینٹ بونی فیس' کے توسط سے اس نے پوپ تک رسائی حاصل کی۔ حالات ایسے تھے کہ پپاں اور پوپ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ پپاں عملاً حکمراں تھا جبکہ آئینی حکمراں میرووِنجن گھرانا تھا۔ اسے ایسے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو اسے آئینی حکمراں کی حیثیت دے سکے۔ وہ خود اتنی جرأت نہ رکھتا تھا کہ اپنی قوم کے قانونی تاجدار سے تاج چھین کر اپنے سر پر رکھ لے، اور پوپ میں اتنا یارا نہ تھا کہ قابلِ اعتماد دفاعی قوّت کے بغیر شہنشاہِ بازنطین کے اقتدارِ اعلیٰ سے منحرف ہو سکے۔ پپاں اس ہنگامے سے خوفزدہ تھا جو غاصبانہ تاجپوشی کے سبب قوم میں برپا ہوتا اور پوپ اس فوج سے لرزاں تھا جو شہنشاہ کے اقتدار سے تعارض کی صورت میں بازنطین سے اطالیہ پر نازل ہوتی۔ ہر دو کے مقاصد کی تکمیل ایک دوسرے سے ہوتی تھی اور دونوں نے ہی فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

انتقالِ اقتدار: جب راہ ہموار ہوگئی تو ۷۵۱ء میں پپاں نے پوپ کی خدمت میں ایک سفارت روانہ کی جس نے پوپ سے یہ درخواست کی کہ،

"کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ القابِ شاہی ایک ایسے شخص سے منسوب کیے جائیں جو حقیقی معنوں میں اقتدار کا حامل ہو اور عملاً اختیارات کو روبکار لاتا ہو، نہ کہ ایسے شخص سے (منسوب رہیں) جو صرف نام کا بادشاہ ہو۔"

(Henry Pirenne; A History of Europe, p.77)

اس درخواست پر پوپ نے نہایت ہمدردی سے غور کیا، اور چند ہفتوں کے بعد پپاں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کرکے قانونی بادشاہ کو اپنے باقی ماندہ ایام ایک خانقاہ میں گزارنے کے لیے روانہ کردیا۔ اس طرح پپاں یا کارولن جیئن گھرانے کو اقتدار منتقل کرکے پوپ نے مغرب کو بازنطینی حلقۂ اثر سے ہمیشہ کے لیے جدا کردیا اور مغرب کی ایک ایسی آزاد ریاست کا سنگِ بنیاد رکھ دیا جس کی تمام توانائیاں پوپ کی خدمت کے لیے وقف تھیں۔

ریاستِ کلیسا کا قیام : پپاں نے پوپ سے یہ عہد کیا کہ وہ اطالیہ کے لومبارت حکمرانوں پر فوج کشی کرے گا اور انہیں شکست دیکر وہ تمام علاقہ کلیسا کی نذر کرے گا جو مقدس شہر روم کے مضافات میں ہے۔ حسبِ وعدہ ۷۵۴ء میں لومبارت سلطنت پر فوج کشی کی گئی اور انہیں شکست دیکر شہرِ روم اور اسکے مضافات کا علاقہ پوپ کو بطورِ نذرانہ پیش کر دیا گیا۔ اس علاقے پر مشتمل ایک ریاست قائم کی گئی جسے چرچ اسٹیٹ (Church State) کا نام دیا گیا۔ (Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p.243)

قدیم رومن ایمپائر کا پایۂ تخت روم اب بلا شرکتِ غیرے پوپ کا پایۂ تخت بن گیا۔ اس ریاست کی حفاظت کی ذمہ داری بھی پپاں پر عائد ہوئی اور اسے اس ذمہ داری کا پابند بنانے کے لیے 'نائب قیصرِ روم' (Patricius Romanorum) کا خطاب بخشا گیا۔

اقتدار اور مذہبی تقدس : پپاں کی تاج پوشی کے موقع پر جو مذہبی رسوم ادا کی گئیں ان کا اس سے قبل کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ اس مذہبی عنصر کی شمولیت نے بادشاہ کے اقتدار کو ایک مذہبی تقدس بخشا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ وہ خدا اور اسکے نائب (پوپ) کا وفادار رہے گا۔ صلیب کو نشانِ سلطنت مقرر کیا گیا اور پپاں کو 'شاہ بفضلِ رب' (King by the Grace of God)/(Gratia Dei Rex) کا خطاب عطا ہوا۔ (Henry Pirenne; A History of Europe, p.78)۔ اور حکومت عیسائی ضابطۂ اخلاق یعنی کلیسا کے حکم کی پابند ہوئی۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۷۹)۔ یہ پابندی بعد کے حکمرانوں کو وراثت میں ملی اور اب مذہب ریاست کا لازمی جزو بن گیا۔ اب صرف عیسائی ہی مغربی معاشرے کے 'شہری' رہ گئے تھے، غیر عیسائی یا عیسائیت سے خارج کردہ، 'مردود' (Excommunicated)، لوگوں کی حیثیت باغیوں کی تھی، جنکی سرکوبی حکومت اور معاشرے کا فرض تھی۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۷۹)

مغرب شہنشاہیت کی جانب : ۷۲۶ء میں پوپ نے بازنطینی شہنشاہ کو مردود و ملعون قرار دیکر بازنطینی اقتدار کا مذاق اڑایا۔ پچّیس [۲۵] سال بعد ۷۵۱ء میں کلیسا کی کاسہ لیس حکومت قائم کر کے بازنطین کے متوازی ایک رقیب سلطنت کھڑی کر دی۔ اب اسکا مطمحِ نظر شہنشاہیت تھا۔ پپاں کے بعد اس کا بیٹا شارلمین تخت نشین ہوا۔ شارلمینِ اعظم کو جو شہرت میسّر آئی وہ اس سے قبل صرف رومن شہنشاہ 'سیزر' کو یا اسکے بعد 'نپولین' کو ہی مل سکی۔ ۷۶۸ء میں جب شارلمین تخت نشین ہوا تو مذہب اس معاشرے کی سب سے بڑی قدر بن چکا تھا۔

شارلمین کے عہد میں کلیسا کے احکامات کو ملکی قوانین کی حیثیت ملی۔ عیسائیت کو بزورِ شمشیر جرمن قوم سیکسن میں پھیلایا گیا۔ (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. II, p.167)۔ رومن کیتھولک معاشرے کی حدود دریائے ڈینیوب تک وسیع ہوئیں۔ ڈینیوب کے علاقے میں بسنے والی قوم 'آوار' (Avar) کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا گیا۔ پھر 'سلاف' (Slav) کی شامت آئی۔ انہیں بری طرح سے منتشر کیا گیا، اور اس کثرت سے غلام بنایا گیا کہ یورپ میں سلاو (Slave) کے معنی ہی غلام کے ہو گئے۔

شارلمین نے جس علاقے میں بھی فتح حاصل کی وہاں کے لوگوں پر رومن عیسائیت بزورِ شمشیر مسلّط کی گئی، اور ان لوگوں کے لیے جو عیسائیت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے موت کی سزا مقرر کی گئی۔

(Henry Pirenne; A History of Europe, p.80: also Bernard Shaw; Shaw on Religion, edited by Warner S. Smith, p.143)

شارلمین نے مسلم اسپین پر بھی حملہ کیا اور ابتدائی کامیابیوں کے بعد ناکامی کا داغ لیکر لوٹا۔ اسکی تمام مہمات کلیسا کے مفاد میں تھیں، خصوصاً لومبارت قوم پر حملے، اسپین کی مہم اور سیکسن (Saxon) قوم کی تباہی میں صرف کلیسا کا مفاد تھا۔ ان مہمات کے نتیجے میں پورا مغرب رومن کیتھولک چرچ کے حلقۂ اقتدار میں آ گیا اور یہی خدمات تھیں جن کے باعث کلیسا نے شارلمین کو شہرتِ دوام بخشی۔ یہ شارلمین ہی تھا جس نے مغرب کی سیاست کی باگ ڈور کلیسا کے ہاتھ میں دیدی۔

شارلمین کی خدمات ملک اور مذہب کے لیے کچھ کم نہیں تھیں، سونے پر سہاگہ، اس نے پوپ کی ذات پر بھی ایک احسان کیا۔ اپریل ۷۹۹ء میں پوپ 'لیو سوم' (Leo III) پر زنا کی تہمت لگائی گئی۔ نیز دروغ گوئی اور دروغ حلفی کے الزامات بھی عائد کیے گئے۔ [Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p.245] پوپ نے فرار ہو کر شارلمین کے دربار میں پناہ لی۔ شارلمین نے اسے دوبارہ تعینات کر کے روم واپس کیا۔ اس پر پوپ کے مخالفین مشتعل ہو گئے۔ چنانچہ ۸۰۰ء میں شارلمین اس قضیے کو نمٹانے خود روم پہنچا اور معاملات رفع دفع کیے۔ ۸۰۰ء میں ہی کرسمس کی عبادت میں شرکت کے لیے وہ سینٹ پیٹر کے گرجا گھر میں حاضر ہوا۔ ابھی وہ قربان گاہ پر دوزانو ہوا ہی تھا کہ 'لیو' نے قربان گاہ پر سے ایک تاج اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نعرہ بلند کیا،

"Hail to Charles, the Augustus Crown of God, the Great and the Peace Bringing Emperor of the Romans"

(Fuller J.F.C., The Decisive Battles of the Western World, p.245)

[''زندہ باد چارلس، مکرّم تاجِ خداوند، معظّم ۔ داعیِ امن، شہنشاہِ روم''۔]

تاج پوشی کے بعد 'لیو' نے ان آدابِ شاہی کے تحت اس کی شہنشاہیت کا اعلان کیا جو صرف بازنطینی شہنشاہ کے لیے ہی مختص تھے۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کا [مبینہ] یومِ پیدائش 'مغربی شہنشاہیت' کا یومِ تأسیس بن گیا۔ چونکہ یہ رومن شہنشاہیت سینٹ پیٹر کے مقدس جانشین کے ہاتھوں قائم ہوئی تھی اس لیے اس کا نام 'مقدس رومن سلطنتِ مغرب' (Holy Roman Empire of the West) رکھا گیا۔

(Sir Thomas Arnold; The Legacy of Islam, p.41)

اس طرح کلیسا نے مغرب کو بازنطینی سلطنت سے علیحدہ کیا، مغربی معاشرے کی نشو ونما اپنی نگرانی میں کی، اسے ایک شہنشاہیت کا درجہ دیا اور اسے رومن ایمپائر کا جانشین بنایا۔ یہ ایک ایمپائر تھی جسکا شہنشاہ پوپ کی

قدمبوسی کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ جو کلیسا کی حفاظت اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف تھی اور جسکی باگ ڈور پوپ کے ہاتھوں میں تھی۔

مغرب کا معاشرہ

مغربی معاشرہ مذہباً کیتھولک عیسائی تھا اور اس نے عیسائیت کو رومن دور میں قبول کیا تھا۔ لیکن یہ عیسائیت خالص رومن عیسائیت تھی، اور سرتاپا ہیلینک (Hellenic) اثرات کی حامل تھی۔

(Toynbee A.J.; 1956, A Study of History, 7th ed., London, Vol. I, p.95)

ہیلینک سوسائٹی دیویوں دیوتاؤں پر یقین رکھنے والی تھی۔ ہر دیوی اور دیوتا ایک 'انسان-خدا' (Man-God) تھا، جسے معاشرے نے الوہیت کے مقام پر فائز کر دیا تھا۔ یہ دیوتا کسی نہ کسی الٰہ کا فرزند ہوتا تھا۔ [انسان کی حیثیت سے] مرتا تھا اور پھر زندہ جاوید ہو جاتا تھا۔

صرف ہیلینک سوسائٹی ہی میں نہیں، بلکہ اس سے قبل 'مینوئی' (Minoan) معاشرے میں بھی یہی تصورات اور عقائد پائے جاتے تھے۔ مینوئی معاشرے کا مقدس نشان دوہری کلہاڑی تھی، اور اس کا دیوتا 'زیگریوس' (Zagrious) فرزندِ الٰہ تھا جو مر کر پھر زندہ ہوا۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۹۹)۔ مغربی معاشرے کے عیسائیت کا دامن تھام لینے کے بعد فرق صرف یہ پڑا کہ قدیم دیوتاؤں کی جگہ یسوع مسیح نے لے لی۔ [اور دوہری کلہاڑی صلیب بن گئی۔]

مغربی معاشرہ اپنے آپ کو مجموعی عیسائی دنیا کا ایک حصہ تو مانتا ہے مگر بقیہ عیسائی دنیا کو اپنے سے کمتر، اور ایک جداگانہ معاشرہ بھی تصور کرتا ہے۔ احساس برتری اس کے رگ و پے میں گردش کر رہا ہے۔ وہ خود کو نوعِ انسانی کا ممتاز و افضل ترین حصہ سمجھتا ہے۔ مختلف نوعیت کی فتوحات میسر آنے کے سبب ساری دنیا مغرب کے پیچ در پیچ جال میں پھنس گئی ہے۔ مغربی معاشرہ خود کو (Civilized Lord of the World) (متمدن آقائے عالم) کہتا ہے اور اب مغربی تہذیب کو عالمی تہذیب کہا جانے لگا ہے، حالانکہ یہ کیفیت سطحی، اور صرف معاشی اور سیاسی حد تک ہے۔ بقیہ دنیا کا حقیقی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی نقشہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا مغربی سوسائٹی کے معاشی اور سیاسی غلبے سے پہلے تھا۔ مغرب نے عالمی تہذیبوں کو ممکنہ حد تک پامال کیا، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ نیم مہذب معاشرے تک ان کے دباؤ میں آ کر فنا نہیں ہو سکے، اور آج بھی دنیا کے گوشے گوشے میں موجود ہیں۔

مغربی معاشرے کی نگاہ میں غیر مغربی معاشرے کے لیے کوئی احترام موجود نہیں ہے۔ رنگ و نسل کا جس قدر شدید امتیاز اس کے اندر پایا جاتا ہے، تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ہر غیر مغربی

انسان اس کی نظر میں جانور یا چلتا پھرتا درخت ہے، جو جذبات اور عقل وفہم سے عاری ہے۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۱۵۲)۔ مغرب کا مشہور مقولہ ہے، 'Niggers have no Souls'، یعنی 'نیگرو یا زنگی میں روح نہیں ہوتی'۔

اس معاشرے میں ہر غیر مغربی کے لیے، خواہ وہ مہذب ہو یا غیر مہذب، لفظ 'مقامی' (Native) استعمال ہوتا ہے۔ صرف اس ایک لفظ میں حقارت اور تذلیل سمٹ کر مجسم ہوگئی ہے۔ یہ تو مغربی معاشرے کی ذہنی کیفیت ہے۔ عملاً دنیا کی جس قوم سے بھی انکا سابقہ پڑا، انہوں نے مکروفریب، کشت وخون، تباہی وغارتگری، معاہدات وامداد، غرضیکہ کسی نہ کسی طور پر نہ صرف اسے محکوم کیا بلکہ اسے تباہیوں کی انتہا تک پہنچا کر ہی دم لیا، اور دنیا کے جن علاقوں کو اپنی رہائش کے لیے منتخب کیا، وہاں کے اصل باشندوں کا جینا حرام کر دیا، بلکہ بعض اقوام کا تو وجود ہی صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

مسولینی (Benito Mussolini, 1883-1945) کے ایک اطالوی سینیٹر کو نیوانگلینڈ یونیورسٹی کا پریزیڈنٹ، لائبریری کا معائنہ کروارہا تھا۔ اس لائبریری کی سب سے نادر کتاب بائبل کا وہ نسخہ تھا جو سترہویں صدی عیسوی میں ان 'سرخ ہندیوں' (Red Indians) کی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا تھا، جو کسی زمانے میں 'نیوانگلینڈ' کے اصل باشندے تھے۔ سینیٹر اس نسخے کو دیکھ کر بیحد مسرور ہوا۔ اس نے پوچھا کہ کیا یہ کتاب بیحد نایاب ہے؟ یونیورسٹی کے پریزیڈنٹ نے نہایت فخر سے جواب دیا کہ روئے زمین پر اب اس کے چھ نسخے بھی نہیں مل سکتے۔ سینیٹر نے یہ سن کر کہا کہ تب تو ریڈ انڈین اس کتاب کو نہ پڑھ سکتے ہونگے۔ پریزیڈنٹ نے روانی میں کہا کہ اب ریڈ انڈین ہی نہیں رہے تو پڑھے گا کون؟ اطالوی سینیٹر نے پوچھا کیوں؟ ریڈ انڈین کیا ہوگئے؟ پریزیڈنٹ سٹپٹا گیا۔ پھر سنبھلا اور کہنے لگا کہ بس ناپید ہوگئے۔

صرف ریڈ انڈین ہی نہیں، انگریز فاتحین نے شمالی امریکہ کے دیگر قدیم باشندوں کی بھی نسلیں کی نسلیں مٹا ڈالیں۔ اسپین کے فاتحین نے جزیرہ کیریبین (Caribbean) کے تمام کے تمام مقامی باشندوں کو نابود کر دیا۔ آسٹریلیا اور فلپائن کے اصلی باشندے آثارِ قدیمہ بن گئے۔ جنوبی افریقہ میں مقامی آبادی اپنے حشر سے دوچار ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ ساری دنیا اسی مغربی معاشرے کی جاگیر بنی۔ امریکہ (شمالی اور جنوبی)، افریقہ، آسٹریلیا، ایشیا، جہاں دیکھیے، صرف مغربی سوسائٹی کی یلغار اور یورش نظر آتی ہے۔ برطانیہ، فرانس، اسپین، جرمنی، اطالیہ، پرتگال اور ہالینڈ، یہی تو ہیں جنہوں نے اپنی ملکی حدود سے باہر کی دنیا کو غلامی کا تحفہ دیا۔ اور یہ سب کے سب مغربی سوسائٹی کے ارکان ہیں۔ اس دوڑ میں یورپ نے کسی غیر مغربی لٹیرے کے لیے کوئی گنجائش نہیں پیدا ہونے دی۔

مغرب اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کو عالمی روایات کا درجہ دیتا ہے جو صرف اسکی خوش فہمی ہے۔ اگر وہ اپنی تہذیب وتاریخ کے سوا باقی تہذیبوں اور تاریخوں کو عالمی کہے تو اس بات میں ضرور وزن پایا جائے گا۔

(Toynbee A.J.; 1956, A Study of History. 7th edition, London, Vol.I, p.156)

اپنی تہذیب کو دوسروں پر فوقیت دینا محض احساس برتری کا اظہار ہے، ورنہ دنیا کی زندہ تہذیبوں میں سے کون سی تہذیب ہے جو باعث افتخار نہیں ہے۔ ہر تہذیب اعلیٰ اور ارتقائی خطوط کی حامل ہے۔ مشرقی آرٹ، فلسفۂ چین، فکر اسلام اور حکمتِ ہند، سب اپنی اپنی تہذیبوں کے سربلند مینار ہیں۔ لیکن مغرب بیک جنبشِ لب ان سب کو لغویت قرار دیتا ہے۔ یونانی معاشرے کا احترام بھی انکی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے، حالانکہ مغرب کے لیے یونانی تہذیب عرصے تک سرمایۂ افتخار رہی ہے۔ مغرب اگر کسی غیر مغربی تہذیب کا ذکر کرتا ہے تو تمسخر کے ساتھ، اور اگر اپنی تہذیب پر آنچ آتے دیکھتا ہے تو دنیا کی دوسری اقوام کو تباہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

مغرب کی تمام اقوام ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں، جنہیں اگر ایک مشترک نام دیا جائے تو وہ 'نارڈک مین' (Nordic Man) کہے جا سکتے ہیں۔ نارڈک لوگ شمالی یورپ کے اصل باشندے تھے۔ بھورے بال اور نیلی آنکھیں۔ زمانہ قبل از تاریخ سے یہ لوگ اپنے نارڈک علاقے سے منتقل ہو ہو کر جنوب کی طرف آتے رہے۔ انہوں نے بحرِ روم کی کمزور اقوام پر اپنی حکومت قائم کی۔ قدیم رومی، قدیم یونانی، جرمن، فرینک، سب کے سب نارڈک تھے۔ یہ جسمانی ساخت اور زبان کے اعتبار سے ہندوستانیوں سے مشابہ ہیں، اس لیے انہیں 'ہند-اروپائی' (Indo-European) کہا گیا ہے۔

''چونکہ ہند-اروپائی فرزندوں نے فاتحین کی حیثیت سے مشرق و مغرب ہر طرف ساری دنیا کو زیرِ نگیں کیا تھا، اس پر حکمرانی کی تھی، اور یہی وہ نسل تھی جس نے زرتشت، مہاتما گوتم بدھ، سقراط، افلاطون، ارسطو جیسے مفکر پیدا کیے تھے، سکندر، دارا، سیزر اور آگسٹس جیسے فاتحین اس میں گزرے تھے، اسی نے رومۃ الکبریٰ کی سیاسی عظمت کی تشکیل کی تھی، اسی نسل کے طفیل دنیا کو سائنس اور صنعت ملی، اس لیے یہ نسلِ انسانی باقی تمام نوعِ انسان سے افضل ہے''۔ یہ تو ایسی تعریف تھی جس پر سارے یورپ کو اتفاق تھا لیکن جب قومیت کے جذبے نے جنم لیا تو مختلف اقوام نے اور خصوصاً جرمنوں نے شدت کے ساتھ اس میں جذباتیت بیدار کی۔ انڈو-اروپائی اصطلاح کو 'انڈو-جرمانک' اصطلاح بنا دیا۔ یکے بعد دیگرے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اس نظریے کی دیوانگی میں اضافہ کیا اور بالآخر پورا مغربی معاشرہ اس نسلی احساسِ برتری کا شکار ہو گیا۔

ہوسٹن اسٹوارٹ چیمبرلین (Houston Stuart Chamberlain) کی فعال قوتِ متخیلہ نے ہر عظیم تہذیب، ہر عظیم کارنامے اور ہر عظیم شخصیت کو 'نارڈک مین' سے منسوب کر ڈالا۔ وہ صرف شارلیمن اور دانتے کو نارڈک مین بنانے پر مطمئن نہ ہو سکا، بلکہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بھی اس میں شریک کر کے ہی دم لیا۔ (Toynbee, A.J.; A Study of History, 7th ed. Vol. I, p.219)۔ غرض یہ کہ نارڈک مین کا نظریہ ایسا پارس تھا جو ہر سفید آدمی کو کندن بنا دیتا ہے۔

نسلی برتری کا یہ تصور مغرب کو دیگر سفید فام اقوام پر کوئی خصوصی برتری نہیں دیتا تھا۔ اس نے انسان کو سفید فام اور رنگدار گروہوں میں تقسیم کر دیا اور تقسیم کا یہ نظریہ وسط انیسویں صدی میں عام ہوا۔ پندرہویں صدی تک مغرب میں انسان کی تقسیم ایک دوسرے انداز میں کی جاتی تھی۔ یہ تقسیم کرسچین اور بے دین

(Christians and Heathen) کی تھی۔ یہ قدیم تقسیم، جدید کے مقابلے میں قدرے بہتر تھی کہ اس میں دیگر نسلوں کو عیسائی ہونے کے طفیل کچھ نہ کچھ عزت میسر تھی۔ [اور کوئی بھی شخص بپتسمہ لیکر عیسائی بن سکتا تھا۔]

مغرب میں تقسیم کی یہ شراب دوآتشہ ہوگئی۔ نسلی تفاخر نے کردار، اخلاق اور مذہب کی قید اٹھا کر صرف رنگ کو معیارِ برتری بنا دیا۔ کیتھولک عیسائی کی قدیم شرط نے مغرب کو دیگر سفید فاموں پر اپنی برتری جتانے کا موقع دیا۔ قدیم عیسائیت کی نظر میں عالمِ عیسائیت کے سوا باقی دنیا بے دین اور گمراہ تھی، مگر ایسی نہ تھی جسے راہِ راست پر نہ لایا جا سکے۔ ایسی اچھوت نہ تھی جسے پوتّر نہ کیا جا سکے۔ ان گمراہوں کو راہ پر لانے کی امید اور توقع تھی، لیکن نسلی تفاخر نے بقیہ دنیا کو اچھوت سے بدتر بنا ڈالا۔ تاہم اس تفاخر میں فرانس وہ واحد نسل اور قوم ہے جس نے دیگر مغربی ممالک کا ساتھ نہ دیا۔ وہاں معیارِ تفاخر رنگ و نسل و مذہب کی جگہ صفاتِ انسانی کو تسلیم کیا گیا۔ فرانس میں انسانیت کی تقسیم صاحبِ صفات اور محرومِ صفات دو گروہوں میں کی جاتی ہے۔

(Taylor Griffith; 1927, Environment and Race, Oxford Univ. Press, p. 33)

رنگ صرف نارڈک مین کا معیار ہے جو اسے دنیا کے دیگر انسانوں سے ممیّز کرتا ہے۔ ورنہ دیگر معاشروں میں رنگ معیارِ مفاخرت نہیں۔ ہندوستان میں ذات پات معیارِ مفاخرت ہے۔ برہمن اور چھتری چاہے جس رنگ کے ہوں ممتاز ہیں۔ جاپان میں لوگوں کے رنگ زرد، سرخ، سفید ہر طرح کے ہیں مگر وہاں بھی رنگ معیارِ مفاخرت نہیں۔ نیز نسل بھی عالمی معیارِ افتخار نہیں۔ یہ معیار بھی بدلتا جاتا ہے۔ چین اور جاپان میں نسلی نجابت کا معیار جسمانی بال ہیں۔ جس کے جسم پر جتنے کم بال ہونگے وہ اتنا ہی نجیب تصور کیا جاتا ہے، اور بالوں کی زیادتی کمتر نسل کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک اور معیارِ تمیز انسانی جسم کی بو ہے۔ دورِ وحشت میں انسانی جسم سے شیر اور چیتوں جیسی بو آیا کرتی تھی۔ اس قسم کی بو کا ہونا بھی دورِ وحشت سے قربت کی دلیل ہے۔ مغربی افراد کے جسم کی یہ بو غیر مغربی انسان بہ آسانی محسوس کر لیتا ہے، جبکہ مغربی فرد خود اپنی یہ بو نہیں محسوس کر سکتا۔

غرض یہ کہ مغرب کی نسل پرستی میں جو بھونڈی، سنگدلانہ اور سستی خود پرستی پائی جاتی ہے وہ اس سے قبل کسی اور تہذیب میں نہیں پائی گئی۔ عصرِ حاضر نے اسکی مضرّت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی مذمّت شروع کر دی ہے۔ یونانیوں کو بھی نسلی برتری کا سہارا لینا پڑا تھا لیکن ان کے نسلی برتری کے فلسفے میں عقلیّت، اخلاق، مروّت اور بے تعصبی کی شان بھی پائی جاتی ہے۔

رنگ و نسل کے امتیاز کے ساتھ مغرب کو روم سے ایک عقیدۂ دوام بھی ملا۔ رومن دنیا، اپنی تہذیب، اپنے ملک و قوم نیز مذہب کو لافانی تصور کرتی تھی۔ قدیم شعراء، مثلاً تائبلس (Tibullus 54-18 B.C.) لافانی شہرِ روم کے قصائد پڑھتے چلے آئے ہیں، جبکہ ورجل نے کہا،

" I give you the Empire without end."

''میں تجھے سلطنتِ ابدی عطا کرتا ہوں''۔

(cited by Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. IV, p.4)

لیوی نے اسی یقین کے ساتھ روم کو ابدی شہر لکھا۔(The City founded for Eternity)۔ (حوالۂ بالا)۔ اس معاملے میں مسیحی اہلِ فکر بھی بت پرستوں سے پیچھے نہ تھے۔ وہ بھی روما کو لافانی تصوّر کرتے تھے۔ جب ۴۱۰ء میں روم کو شکستِ فاش ہوئی تو یہ لمحہ عیسائیت کے لیے نہایت اندوہناک تھا۔ اس شکست کی ذمہ داری بت پرستوں نے دینِ مسیحی پر ڈالی اور کلیسا نے اپنا پورا زورِ قلم اسکی تردید میں صرف کردیا۔ سینٹ آگستائن نے مشہور کتاب 'سٹی آف گاڈ' (City of God) تحریر کی جس میں روم کے سقوط کی یہ توضیح کی کہ روم کا مشرک دور ختم ہوگیا اور اب ایمان کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ اسے مسیحی شہر ہونے کا جو اعزاز میسر آیا ہے، وہ ابد تک قائم رہے گا۔ یہی وہ مفکر تھا، جس نے آسمانی بادشاہت کی تاویل چرچ سے کی۔ (Nick Earl; 1967, Culture and Creed, London)۔ گویا رومن ایمپائر کی جگہ چرچ نے لیکر انجیل کی آسمانی بادشاہت قائم کردی۔ اسی عقیدۂ دوام کا یہ اثر تھا کہ مغرب کی ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ سلطنتِ روما کے کھوئے ہوئے علاقوں کو ازسرِ نو عالمِ عیسائیت میں شامل کیا جائے۔ [Grunebaum, G.E.; 1953, Mediaeval Islam, Chicago, 2nd ed., p.6)]۔ صلیبی جنگیں، ہسپانیہ سے مسلمانوں کا اخراج، مسلم ممالک پر حملے، اور اس صدی میں ترکی پر یونان کی یورش، یہ سب واقعات اسی جذبے کی پیداوار ہیں۔

مغرب کے احساسِ برتری کے عناصر میں ایک عنصر مذہبی برتری کا بھی تھا۔ سلطنتِ روما کے خاتمے کے بعد نشاۃِ ثانیہ تک مغرب کی اہم ترین قدر انکا مذہب ہی تھا۔ اس دور میں پورا مغرب چرچ کی گرفت میں تھا۔ مغرب پر شمالی وحشی قبائل کی یلغار عہدِ وسطیٰ میں مسلسل جاری رہی، لیکن ان سب کو چرچ بتدریج عیسائیت میں ضم کرتا رہا۔

عیسائیت قبول کرنے کے بعد ان حملہ آوروں کو مغربی عیسائی دنیا کا شہری تسلیم کرلیا جاتا تھا۔ گویا نسل، وطن اور قومیت کا یہاں کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ سب عناصر مذہب کے آگے لایعنی تھے۔ صرف عیسائیت ہی وہ معیار تھا جس کی بناء پر مغرب کی شہریت مل سکتی تھی۔ مغرب میں عیسائیت کے قیام اور دیگر مذاہب کو ختم کرنے کی منظم کوشش کی گئی۔ رومن عہد میں جبری تبدیلیٔ مذہب کا لامتناہی سلسلہ ملتا ہے۔ بت پرستی کو چوتھی صدی عیسوی میں قسطنطین نے قانوناً ممنوع قرار دیا۔ ۴۱۵ء میں تھیودوسس نے پورے مغرب میں ہر قسم کے مشرکانہ مذاہب پر پابندی لگائی۔ تھیودوسس ثانی نے غیر عیسائیوں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کیا۔ لیو نے غیر عیسائیوں کے لیے قانون کا پیشہ ممنوع قرار دیا۔ جستینین نے تعلیم کے عہدے صرف عیسائیوں کے لیے مختص کیے، اور آخرش ۵۲۹ء میں اس نے یہ حکم جاری کیا کہ ہر مشرک یا تو بپتسمہ لے یا پھر اسکا مال و متاع ضبط کرکے اسے ملک بدر کردیا جائے۔

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں پوپ گریگوری نے اطالیہ اور سسلی میں کچھ غیر عیسائی اقلیتیں پائیں جو گورنروں کو اپنی مذہبی آزادی قائم رکھنے کے عوض باقاعدہ سالانہ جزیہ پیش کیا کرتی تھیں۔ (Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.323)۔ اسے مغربی مورخین (Doucouv)۔۔ کا نام دیتے ہیں۔

رومن عہد کے بعد مغربی عہد میں اس جبری تبدیلیِ مذہب میں مزید شدت نظر آتی ہے۔ شارلمین کے عہد میں غیر عیسائی کے لیے دو ہی صورتیں تھیں۔ عیسائیت یا موت۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۳۲۲)۔ اس جبری تبدیلی میں صرف حکومت ہی ملوث نہیں تھی بلکہ کلیسا بھی برابر کا شریک تھا۔ اسی کے ایماء پر حکومتوں نے یہ اقدامات کیے۔ پوپ گریگوری اوّل نے غیر عیسائیوں کو جنگ کے ذریعے عیسائی بنانے کے لیے تحریک چلائی۔

(Grunebaum, G.E., 1969, Islam, Oxford, p.129)

چرچ کے دورِ اقتدار میں کسی فرد کے لیے عیسائیت سے انکار، یا بپتسمہ لینے کے بعد کلیسا کے قانون سے گریز ممکن نہ تھا۔ ایسا کرنا نہ صرف کلیسا بلکہ حکومت اور معاشرے سے بغاوت کے مترادف تھا۔ کلیسا سے سرکشی کا نام بدعت تھا، اور بدعت اس دور کا سب سے بڑا جرم تھا۔ بدعت کا احاطہ نہایت وسیع تھا۔ اسکا اطلاق مذہب، فکر، رسم ورواج، علم وعمل ہر شے پر تھا۔

بدعت کے نام پر مغرب نے انسانی معاشرے پر جو مظالم کیے ہیں وہ عدم رواداری کی بدترین مثال ہیں۔ سیکسن قوم کا قتلِ عام صرف اس سبب سے ہوا کہ وہ عیسائی نہیں تھے۔ دو سو سال تک حروبِ صلیبی لڑی گئیں، جن میں لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ اناپٹسٹ (Anapabtist) فرقے کا قتلِ عام، پروٹسٹنٹ فرقے کا قتلِ عام، فرانس میں سینٹ بارتھولومیو (Saint Bartholomew) کا قتلِ عام، فرانس میں فرانسس اوّل کے دور سے آنرے چہارم کے دور تک ہونے والی چالیس سالہ خونریزی، اسی کا شاخسانہ تھے۔ اس پر مذہبی دار وگیر کے نام پر صدیوں لوگوں کو کلیسا کی [نام نہاد] عدالت نے قانونِ بدعت کی آڑ میں موت کے گھاٹ اتارا۔ بیس سال تک پوپ کے خلاف پوپ کے نزاع کے نتیجے میں خونریزی، نئی دنیا (شمالی اور جنوبی امریکہ) میں صلیب کے سائے تلے ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کا قتلِ عام، اسپین میں ایک ایسی قوم کا قتلِ عام جو وہاں آٹھ سو سال سے بس رہی تھی، جس نے ملک کی حالت ہی بدل دی تھی، جو عہدِ حاضر کی اوّلین معمار تھی اور جسکا قصور صرف یہ تھا کہ وہ عیسائی نہیں تھی۔

(H. Pirenne; 1967, A History of Europe, 9th Imp. London)

جرمنی میں کسانوں کا قتلِ عام، اور البی جینسس (Albigensis) یا کتھارس (Cathars) فرقے کا قتلِ عام، غرض کہ مذہب میں جبر وقوت کا استعمال ایک عام وطیرہ رہا ہے۔ [Bernard Shaw; Shaw on Religion, London, edited by Warner S. Smith, p.155)۔ پانچویں صدی سے لیکر سولہویں صدی تک عیسائیت کے عقائد کی ترویج اور حفاظت دونوں کے لیے قوت اور جبر کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ یہاں تک کہ مغرب میں سوائے رومن کیتھولک کے اور کوئی عقیدہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مغرب میں، جہاں کسی غیر کیتھولک کا وجود نہیں پایا جاتا تھا، رواداری کے عدم وجود کو اس دور کے بیشتر اصحابِ قلم تسلیم کرتے ہیں۔ اسپین کی تباہی اسی عدم رواداری کی داستان ہے۔ [Trend J.B.; 1960, Legacy of Islam, article 'Spain, Portugal', Oxford University Press, p.4)۔

مغرب کی خودستائی صرف تاریخ، معاشرت وتمدن کے شعبوں تک ہی محدود نہیں، بلکہ اس سے مذہب بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ ان کی نظر میں رومن کیتھولک ہی حقیقتِ عظمیٰ کا حامل ہے۔ مغرب سے باہر کے تمام مذاہب حقانیت سے بیگانہ، باطل اور جربہ ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انہیں مذہب کا شرارہ ایشیا کی سرزمین فلسطین سے ملا ہے۔ اسے بھی نہ صرف اپنی ہی تہذیب کا جزو تصور کرتے ہیں بلکہ ہر وہ حقیقت جو انکے دعوے کے منافی ہو اسے جھٹلاتے اور اس سے گریز کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا مجبوری تھی کہ مغرب نے عہد نامۂ قدیم کو اپنی دینی کتاب تسلیم کرلیا ورنہ عہد نامہ قدیم تو پورا کا پورا شامی تمدن ہے۔ اسکا ہر کردار، تمام مقامات اور سارا ماحول شامی ہے۔ اسکے تصورات، تعلیم اور اخلاق سب ہی کچھ غیر مغربی ہے۔

حیرت ہے کہ مغرب نے اپنی کوئی 'گاسپل' مدوّن نہیں کی۔ مغرب کے مروجہ کیتھولک مذاہب اور عیسائی مذہب میں کس قدر بعد ہے اسکا اندازہ اسی امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ مغرب صرف اپنی عیسائیت کو ہی عیسائیت تصور کرتا ہے اور دنیا کے دیگر عیسائیوں، مثلاً نسطوریوں، مونوفیزائٹ (Monophysites) اور آرتھوڈوکس کرسچیئن کو وہ بدعتی سمجھتا ہے۔

پس رنگ ونسل کے ساتھ، بدعتی ہونا ایک امتیاز ہے۔ دورِ جدید میں ان میں سب سے بڑی جو ایک اور قدر سرمایہ داری نظام نے پیدا کی ہے وہ قومیت ہے۔ قومیت نے عالمِ عیسائیت کو قومی خطوں میں بانٹ دیا۔ اب کرسچیئن کامن ویلتھ نام کی کوئی شے باقی نہیں رہ گئی ہے۔ قومیت کا تصور حال کی ہی پیداوار ہے جو ایک ہی نسل، ایک ہی رنگ اور ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں تفریق پیدا کر کے انہیں علاقائی وحدتوں میں بانٹ دیتا ہے۔ اس قومیت نے نہ صرف خطّے، زبان، اور آبادی کو ایک دوسرے سے جدا کیا بلکہ کلیسا کو بھی تقسیم کر کے مختلف چرچوں کی بنیاد ڈالی۔ اسی سبب مغرب کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا اور وہ جنگِ برادر کشی کے دور میں داخل ہوگیا۔

متذکرہ بالا اقسام کے احساس ہائے برتری کے سبب مغرب کی نظر میں دنیا کی کسی قوم کے لیے کوئی احترام نہیں پایا جاتا۔ اس نے دیگر اقوام کو کمتر قرار دینے کی حسبِ ذیل چار وجوہ مقرر کی ہیں۔ [Toynbee, A.J.; 1956, A Study of History, Oxford University Press, Vol. VI, p.226)۔

۱۔ بت پرست (Heathen)

۲۔ غیر مہذّب (Barbarian)

۳۔ مقامی (Native)

۴۔ کم نسل (Racially Inferior)

ان چاروں کی آڑ لیکر وہ دنیا کی ہر قوم کو کسی نہ کسی طرح کمتر قرار دے لیتا ہے، جبکہ انسانی حقوق سے اس طرح سے انکار کرنے سے انسانیت کی تمام اقدار مجروح ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ مغربی خصوصیات میں رنگ ونسل کا امتیاز، مغربی وطنیت، اور دیگر مذاہب کو برداشت نہ کرنا پوری شدّت کے ساتھ نمایاں ہیں۔ دورِ وسطیٰ میں چرچ کی بالادستی کے تحت ہر قدر سے زیادہ اہم مذہب تھا۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا مقصد صرف مذہب کے

تقاضوں کی تکمیل تھی۔ ریاست کی تعریف اس دور میں یہ تھی کہ حقیقی ریاست وہ ہے جہاں سچے مذہب کی تعلیم دی جاتی ہو اور عقائد کی حفاظت ہوتی ہو۔

'The Christian Fathers, and with special forcefulness Augustine, insisted that a Just State is one, in which the True Religion is taught, i.e. since the advent of Christianity, only a Christian State can be Just. The chief purpose of the government must be contributing to Human Salvation by preserving the Purity of the Faith.'

(Grunebaum, G.E.; 1969, Islam, Oxford University Press, p. 130)

اس طرح فرد، ریاست اور حکومت سب ہی صرف مذہب کے لیے وقف تھے، اور مذہب سے مراد آفاقی حقائق نہیں تھے بلکہ رومن کیتھولک عقیدہ تھا۔ مغرب اپنے مذہب کو سارے ادیانِ عالم سے برتر تصور کرتا تھا۔ صرف ان ہی کا مذہب حق تھا اور اسکے سوا سارے باطل۔ صرف اسی میں روحانیت تھی، جس کا شائبہ کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا تھا۔ صرف رومن کیتھولک ہی مذہبِ نجات تھا جو روحانی تزکیہ کرتا تھا، اور یہ خصوصیت کسی اور مذہب، یہاں تک کہ کسی اور کلیسا میں بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ مغرب سے باہر کی دنیا غیر متمدّن اور وحشی تھی جسکی کوئی قدر قابلِ احترام نہیں تھی۔

مغرب صرف ایک علاقہ اور معاشرہ ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب بھی ہے۔ اس کی تعمیر میں ماضی کی کئی تہذیبوں کا حصہ ہے۔ یہودی تہذیب سے مذہب لیا گیا۔ یونانی تہذیب سے معاشرتی اور فکری عناصر، رومۃ الکبریٰ سے نسلی تفاخر، سیاست و قانون اور فوجی نظام، اطالیہ سے عدمِ رواداری اور خونریزی، اور اسلام سے عہدِ حاضر کے سارے علوم کی بنیاد۔ ان تمام مستعار عناصر کے ساتھ مل کر تیکنیکی ترقی، سیاسی کامیابی اور عالمی استحصال نے مغرب کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام عطا کیا، جہاں پہنچ کر انسانیت کو اس نے اپنے سے حقیر اور کمتر تصوّر کیا، انسان کو غلام بنایا، اسکا قتلِ عام کیا۔ دوسروں کے اقتصادی ذرائع اپنے لیے وقف کیے، اور ساری دنیا کا استحصال کر کے صرف مغرب کی تعمیر کی۔ اپنی قدروں کو ارفع و اعلیٰ ثابت کرنے کے لیے دوسروں کی اقدار کی تذلیل کی۔

باشندے

بحرِ روم کے جنوبی ساحلوں سے تہذیبی دور شروع ہوا۔ عظیم سلطنتیں اور تہذیبیں ابھریں۔ آہستہ آہستہ انکا مرکز تبدیل ہوتا گیا۔ مصر سے بابل، وہاں سے سیریا (نینوا) منتقل ہوتا ہوا یونان پہنچا۔ پھر یونانی تہذیب کے کھنڈروں پر رومی تہذیب اور عظیم سلطنتِ روم قائم ہوئی، جس نے عملاً متذکرہ تہذیبوں کے وسیع علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنتِ روم میں بسنے والے باشندے مثلاً مصری، بربر، عراقی، فلسطینی، شامی، آرمینی، یونانی، اطالوی، جرمن اور ہسپانوی وغیرہ، سب کے سب ایک دوسرے سے مختلف تھے جن میں رنگ و نسل، بود و باش، تہذیب و ثقافت، فکری، لسانی اور مذہبی اختلافات موجود تھے۔ ان میں اگر کوئی قدرِ مشترک تھی تو صرف یہ کہ ان پر رومن شہنشاہ حکومت کرتا تھا، جس کے گورنر صوبوں پر حکومت کرتے تھے۔

ٹیکس : صوبائی باشندوں پر بھاری ٹیکس عائد تھے، جبکہ رومن شہری (اطالوی) ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے۔ سلطنت کی حدود میں داخل ہونے والے مال پر دوصد [۲۰۰] فی صد درآمدی ڈیوٹی لی جاتی تھی۔ اہم ترین ٹیکس، جو صوبائی باشندوں کو ادا کرنا پڑتا تھا وہ 'پول ٹیکس' (Poll Tax) تھا، جسکی شرح مختلف صوبوں میں مختلف ہوتی تھی۔ مصر میں یہ ٹیکس ہر وہ مرد ادا کرتا تھا جس کی عمر ۱۴ سال سے ۶۵ سال تک ہوتی تھی، جبکہ سیریا (شام) میں یہ مردوں اور عورتوں دونوں سے وصول کیا جاتا تھا۔

پول ٹیکس کے بعد دوسرا اہم ٹیکس لگان تھا۔ سیریا میں یہ زمین کی کل قیمت کا ایک فی صد [سالانہ] وصول کیا جاتا تھا۔ اسی طرح جائداد ٹیکس بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ [cf. Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, pp.21-22]۔ پول ٹیکس کی وصولی کے لیے باقاعدہ مردم شماری ہوا کرتی تھی اور ٹیکس دہندگان کے رجسٹر تیار رکھے جاتے تھے۔ رومن شہری (اطالوی) اگر کوئی ٹیکس ادا کرتے تھے تو وہ صرف وراثت ٹیکس تھا، جسکی شرح پانچ [۵] فی صد تھی۔ اس سے راست وارث، یعنی بیٹے بیٹیاں، مستثنیٰ تھے۔ صوبائی باشندوں پر جرائم کی پاداش میں بھاری جرمانے ہوتے تھے۔ قیدکی سزا کی صورت میں انہیں غلام بنا کر اطالیہ بھیج دیا جاتا تھا۔

جسٹینین کے عہد کے اعداد و شمار کے مطابق، مصر سے آٹھ لاکھ [۸،۰۰،۰۰۰] 'سولیدی' (Solidi) کا غلہ اور تقریباً اسی قدر زرِ مبادلہ ٹیکس کی صورت میں وصول ہوتا تھا۔ نومیدیا اور ماریطانیہ سے علی الترتیب [۸،۲۰۰ ،۷] اور [۶۰۰، ۴۱] سولیدی خراج وصول ہوا کرتا تھا، جبکہ دیگر نوے [۹۰] صوبوں کے اعداد و شمار کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۸)۔

سولیدی [تقریباً نصف تولے سونے کے وزن کا] طلائی سکہ تھا جسے جستینین نے [۷۲] سکے فی پونڈ سونے میں بنوایا تھا۔ اسکی قوت خرید کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ ایک فوجی کا مشاہرہ ۴ تا ۵ سولیدی سالانہ تھا، جبکہ ایک عام آدمی کا گھرانہ [۳] سولیدی سالانہ پر سال بھر گزر بسر کر سکتا تھا۔ [آجکل یعنی ۲۰۰۵ء کے حساب سے ایک سولیدی تقریباً پانچ ہزار روپے پاکستانی مالیت کا ہوتا تھا۔ آٹھ لاکھ سولیدی، جو مصر سے وصول کیا جاتا تھا، اس حساب سے تقریبا چار ارب [۴،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰] روپے کے برابر بنتا ہے، جبکہ انسانی آبادی آجکل کے مقابلے میں بیسواں حصہ بھی نہیں تھی۔]

شہریت: سلطنتِ روم میں انتظامی امور شہری کونسلروں کے ذمّے تھے۔ شہر اور اسکے آس پاس کے علاقے کی سڑکوں کی تعمیر، پانی کی فراہمی و نکاسی، منادر اور سرکاری عمارتوں کی تعمیر، کھیلوں اور مذہبی تقاریب کا انعقاد اور شہری دفاع، یہ سب شہری کونسل کی ذمہ داری تھی۔ کونسل سلطنت کے لیے اہم خدمات انجام دیتی تھی۔ ٹیکس کی وصولیابی، فوج کی بھرتی، سرکاری عہدیداروں کے قیام کے انتظامات، برید (ڈاک) کے لیے گھوڑوں کی فراہمی وغیرہ، ان کے فرائض میں شامل تھے۔

قانون سازی اور شہنشاہ کے انتخاب کا حق سینیٹ کو تھا۔ مملکت کے اہم مسائل بھی سینیٹ کے فیصلے کے مطابق طے ہوتے تھے۔ لیکن شہری کونسل ہو یا سینیٹ، اسکی رکنیت صرف رومن شہریوں کے لیے مخصوص تھی۔ رومن شہریت صوبۂ اطالیہ، ناربوں (جنوبی فرانس) اور اسپین کے باشندوں کو حاصل تھی۔ خود مغربی نومفتوحہ صوبوں مثلاً گال (بقیہ فرانس)، برطانیہ، پینونیہ اور موسیئیہ (شمالی بلقان) کو یہ شہریت میسّر نہیں تھی۔

رومی شہریت حاصل کرنے کی دو صورتیں تھیں۔ یا تو وہ فرد اطالوی نسل سے ہو، خواہ مقبوضہ صوبوں میں رہائش پذیر ہو، یا پھر کوئی ایسا فرد ہو جو نسلاً تو اطالوی نہ ہو لیکن ایسے صوبائی باشندے کی اولاد ہو جسے خصوصی رومی شہریت حاصل رہی ہو۔

فوجی خدمت اور سرکاری ملازمت کے لیے رومن شہری ہونا لازمی تھا۔ فوج دو قسم کی تھی۔ ایک 'لی جن' (Legion) یا مرکزی فوج، دوسری 'کوہورت' (Cohort) یعنی علاقائی فوج۔ مرکزی فوج ہر صوبے میں آتی جاتی اور قیام کرتی تھی، لیکن علاقائی فوج کا اطالیہ میں قیام ممنوع تھا۔

فوجیوں کو دورانِ ملازمت شادی کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن صوبوں میں قیام کے دوران وہ عام طور پر صوبائی عورتوں سے شادیاں کرلیتے تھے۔ ان کی اولاد کو شہریت صرف فوجی ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں دی جاتی تھی۔ تیسری صدی عیسوی میں صوبوں کے باشندوں کو بھی رومی شہری تسلیم کیا گیا، جس کے باعث قانوناً علاقائی تفاوت ختم ہوگیا، لیکن نسلی، لسانی، تہذیبی، مذہبی اور معاشرتی تفاوت برقرار رہا۔

یہ شہریت صرف آزاد افراد کو میسّر تھی، جبکہ غلام اس سے محروم تھے۔ خود روم میں غلاموں کی تعداد آزاد افراد سے کہیں زیادہ تھی۔ قانون کی نظر میں تمام شہری برابر تھے لیکن شہری طبقات میں تقسیم تھے اور انکا طبقاتی تفاوت قانون پر اثر انداز ہوتا تھا۔ بالائی طبقے کے فرد کو اگر کسی جرم کی پاداش میں سزا ملتی تو جرمانے یا کسی

غیر آباد جزیرے میں جبری قیام تک محدود ہوتی، جبکہ نچلے طبقے کے شہری کو جسمانی اذیت، عمر قید، گردن زدنی، کانوں میں جبری مشقت، زندہ جلانا، اور اکھاڑوں میں چیر پھاڑ کے لیے درندوں کے حوالے کرنا، سب کچھ شامل تھا۔

کلچر : مشرقی رومن ایمپائر کے باشندوں اور مغربی رومن ایمپائر کے باشندوں میں تمدّنی یکسانیت مفقود تھی۔ مشرق میں قبطی، سیریائی اور یونانی زبانوں کا رواج تھا، جبکہ مغرب میں لاطینی زبان رائج تھی۔ مشرق کا رجحان موسیقی، شعر و ادب، علم و حکمت اور صنعت و حرفت کی طرف تھا تو مغرب سپہ گری اور اکھاڑوں میں درندگی کا شائق تھا۔ مغرب علم کے میدان میں یونان کا شاگرد تھا۔ فنِ تعمیر میں اس نے یونان کی پیروی کی۔ لباس، غذا اور فرنیچر مین اس نے یونانی انداز اختیار کیے۔ طبقۂ امراء اپنی اولاد کے لیے یونانی انداز کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتا تھا۔

مذہب : ایمپائر کے مختلف علاقوں میں مختلف مذاہب رائج تھے۔ اطالیہ اور رومی نو آبادیات میں رومی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی۔ یونان اور ایشیائے کوچک میں یونانی دیوتا پوجے جاتے تھے۔ روم اگر ہلینک (رومی/یونانی) تہذیب اور شہنشاہیت کا وارث تھا تو اس نے یونان کے رسوم و عقائد، یہاں تک کہ خداؤں کو بھی اپنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ رومی اور یونانی دیو مالائیں تقریباً مشترک ہیں۔ صوبوں میں مقامی دیوی دیوتاؤں کی عبادت ہوتی تھی۔

قدرِ مشترک : رومن ایمپائر کے باشندوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے ایک ایسے عقیدے کی ضرورت تھی جس پر سب لوگ متفق ہو سکیں۔ مصر، بابل، نینوا، ایران میں شاہ پرستی عام تھی۔ یونان کے تمام دیوتا ان کے قومی مشاہیر تھے، جن کی پرستش زمانۂ قدیم سے ہوتی چلی آتی تھی۔ سکندر کے بعد اسکے جانشینوں کی پرستش کے ثبوت ملتے ہیں۔ (cf. Kirk G.S.; The Nature of Greek Myths, p.76)۔ چنانچہ مقامی مذاہب سے تعارض کیے بغیر رومن ایمپائر میں شاہ پرستی کے عقیدے کو عام کیا گیا۔

ہر صوبائی مستقر میں تقریبات منعقد ہوتیں۔ ان میں مذہبی رسومات برائے نام ہی ادا ہوتیں۔ رومن انداز کے اکھاڑوں اور کھیل تماشوں پر زیادہ زور ہوتا۔ روم کے مشاہیر پوپائی، سیزر اور آگسٹس کے مجسمے مندروں میں نصب کر کے انہیں الٰہ قرار دیا گیا۔ انہیں نجات دہندہ، خدا کا فرزند، خوش خبری دینے والا، باعثِ امن و شادابی، وغیرہ القاب [وہی سارے القاب جو مسیحی حضرت عیسیٰؑ کو دیتے ہیں] دیے گئے۔ [Earnest (Barker; Legacy of Rome, essay 'The Conception of Empire', pp.50-62]۔

رومی باشندوں نے اپنے شہنشاہوں کو الٰہ بنانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے وطن کو بھی دیوی کا درجہ دیا اور وطن پرستی کو بھی رائج کر دیا۔ شاہ پرستی کی ترویج ایک سیاسی ضرورت تھی جس نے کسی حد تک رومۃ الکبریٰ کے باشندوں میں ایک قدرِ مشترک کی کمی کو پورا کیا، لیکن جلد ہی شاہ پرستی پر زوال آ گیا۔ اس زوال کا سبب ایک طرف تو خود رومن شہنشاہوں کی بے راہ روی تھی، دوسری طرف فلسفۂ یونان نے بھی اس کی بیخ کنی کی۔

تیسری صدی قبلِ مسیح میں ایران میں زرتشتیت کو سرکاری مذہب کی حیثیت ملی، جس کے اقانیمِ ثلاثہ 'اہورہ مزدہ' (آقائے حکمت)، 'اہرمن' (آقائے تاریکی) اور 'متھرا' (آقائے نور) تھے۔ جلد ہی متھرائیت نے منفرد مذہب کی حیثیت اختیار کر لی۔ یزداں اور اہرمن پس منظر میں چلے گئے اور متھرا کو ربِّ اعلیٰ کی حیثیت ملی۔

اس مذہب نے ایران کی سرحدیں عبور کر کے رومن ایمپائر میں مقبولیت حاصل کی۔ رومن افواج کے لیے یہ مذہب نہایت دلکش تھا۔ فوجی اپنے ساتھ اس مذہب کو ایمپائر کے مختلف گوشوں میں لے گئے۔ تیسری صدی عیسوی تک متھرائیت رومی باشندوں کا مقبول مذہب بن گیا۔

اس مرحلے پر ایک نئی قدرِ مشترک کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ایک نیا مذہب شہنشاہوں کی کوششوں سے ابھرنے لگا۔ 'شمس پرستی' رومن باشندوں کا سرکاری مذہب قرار پایا۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۴۷)۔ اور شہنشائیت کے تمام باشندوں کو حکم دیا گیا کہ شہنشاہ کو 'ناقابلِ تسخیر سورج' کا نائب تسلیم کرلیں۔ یہ نیا مذہب اگرچہ متھرائیت نہ تھا تاہم متھرائیت سے بڑی حد تک مماثل تھا اور اصلاً یہ عقیدہ بھی شامی تھا۔ اس عقیدے کی بدولت شہنشاہ کی عوام پر گرفت ایک مرتبہ پھر مضبوط ہوگئی۔ سورج دیوتا کا نائب ہونے کی حیثیت سے شہنشاہ کو حکومت کرنے کا آسمانی حق مل گیا، جسے مشرق اور مغرب دونوں نے ہی قبول کیا۔ شہنشاہ کی ذات مقدس ہوگئی اور ہر فرد پر اسکا سجدہ واجب ہوگیا۔

<u>**عیسائیت**</u> : اسی دور میں، جب رومن ایمپائر کے باشندوں میں ایک قدرِ مشترک پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں، ایشیا کے گہوارۂ تہذیب سے ایک نیا مذہب 'عیسائیت' ابھرا۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک سرگرم داعی پال نے علمِ عیسائیت بلند کیا۔ یہ شخص نسلاً یہودی تھا اور علومِ متداولہ کا ماہر۔ [Encyclopedia Americano, essay 'Paul'] ۔ یونانی اور عبرانی زبانوں سے واقف تھا۔ اسے رومی شہریت بھی ملی ہوئی تھی۔ اس دور کے مروّجہ مذاہب اور مکاتبِ فکر سے پوری طرح واقف تھا۔ ابتداً اسے عیسائیت سے شدید نفرت بلکہ دشمنی تھی۔ (James M.R.; Apocryphal New Testament, p.20') ۔ لیکن بعد میں وہ پر جوش مبلغِ عیسائیت بن گیا۔ یہ پال تھا جس نے رومن ایمپائر کے باشندوں کے لیے ایک حقیقی قدرِ مشترک فراہم کی۔ پال کی کوششیں جودیہ (یہودیہ) [ارضِ فلسطین کی ایک یہودی ریاست] میں بارآور نہ ہوئیں کیونکہ وہاں یہودیوں کی اکثریت تھی اور وہ پال کے عقائد کو صحائفِ آسمانی (تورات و زبور) کی تعلیمات کے منافی قرار دیتے تھے۔ اس نے جودیہ کی رہائش ترک کی اور بحرِ روم کے جزائر، یونان کے ساحلی شہروں، ایشیائے کوچک اور روم کو اپنا مرجع بنایا۔ یہاں کے سکونت پذیر ایشیائی باشندوں، غلاموں اور نچلے طبقے کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا۔ جگہ جگہ چرچ قائم کیے۔ سلطنتِ روما کی انتظامیہ کی طرز پر چرچ کی انتظامیہ قائم کی۔ اسی نے انہیں بائبل دی اور اس کے مقاصد کی تشریح کی۔

رومن باشندوں نے اس نئے مذہب کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک پال نے انکے عقائد، انکے دیوتاؤں کا نعم البدل اور انکی رسوم کی گنجائش نہیں پیدا کر دی۔ [For details see Brandon, S.G.F.; Man and his destiny, p.202] ۔ جب یہ گنجائش پیدا ہوگئی اور تثلیث نے انکے سارے دیوتاؤں کو سمو لیا، صلیب نے ان کے نشان سورج کی جگہ لے لی، بپتسمہ، عشائے ربانی، کرسمس اور ایسٹر نے انکے تہواروں اور رسموں کی کمی پوری کر دی تو چوتھی صدی عیسوی تک شہنشاہیت کی جانب سے شدید مخالفت کے باوجود ایک تہائی باشندوں کا مذہب عیسائیت ہوگیا۔

اس مذہب کی مقبولیت کے پیشِ نظر چوتھی صدی عیسوی میں اسے سلطنتِ روم کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا، کیونکہ عیسائیت صحیح معنوں میں سلطنت کی قدرِ مشترک بن چکی تھی۔ مغرب جب بازنطین سے علیحدہ ہوا تو اسے اپنی شیرازہ بندی کے لیے نئی قوت کی ضرورت پڑی۔ یہ نئی قوت اسے مذہبی ادارے کلیسا کی صورت میں ملی۔ قسطنطین کے دور سے ہی کلیسا ہر اعتبار سے مستحکم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ علیحدگی کے وقت چرچ نہایت منظم اور خود مختار تھا۔ معاشی استحکام کے باعث سیاسی ابتری اسے متاثر نہ کر سکی۔

کلیسا نے اپنی تنظیم رومۃ الکبریٰ کی بیوروکریسی کے انداز پر کی تھی۔ پورے ملک میں اس کے نمائندے حکومتی عہدیداروں کی مانند موجود تھے، جس کے باعث ملک کے قریہ قریہ تک عوام سے اس کا راست رابطہ قائم تھا۔ عوام کو کلیسا پر پورا اعتماد تھا۔ کلیسا میں عوام کی رہنمائی اور انکے مسائل حل کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ مغرب کی علیحدگی اور سیاسی ابتری کے باعث جو انتظامی خلا پیدا ہوا، اسے کلیسا نے پر کیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کلیسا نے حکومت کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

کلیسا سے وابستگی: باشندوں کی وہ وفاداریاں جو رومن دور میں شہنشاہیت کے ساتھ وابستہ تھیں، کلیسا کی جانب منتقل ہو گئیں۔ شہنشاہ پرستی نے عوام میں شہنشاہ کے لیے جو تقدس، احترام اور وقار پیدا کیا تھا، وہ سب کچھ پوپ کے لیے مخصوص ہو گیا۔ شمس پرستی کے عقیدے نے شہنشاہ کو خدا کا نائب بنا دیا تھا اور اسے حکومت کا آسمانی استحقاق عطا کیا تھا، جب شمس پرستی کی جگہ عیسائیت نے لی اور شہنشاہ کی جگہ پوپ نے سنبھالی تو پوپ زمین پر خداوند یسوع مسیح کا نائب قرار پایا، اور حکومت کا حق خداوند کے نائب پوپ کو پہنچا۔

رومن باشندوں کی زندگی کا محور ریاست تھی۔ ریاست کے لیے جیتے تھے اور اسی کے لیے مرتے تھے۔ ریاست پر مرمٹنا، اسے عظیم تر بنانا، اسکی عظمت کو قائم رکھنا، اس کی حرمت پر آنچ نہ آنے دینا، رومن باشندوں کا عظیم ترین مقصد تھا۔ جب ریاست پر یونانی اثرات بڑھے اور اس کا نام رومن ایمپائر کی جگہ بازنطینی ایمپائر ہوا تو رومن باشندوں کی وابستگی ریاست سے کم ہونے لگی۔ عیسائیت نے ترکِ دنیا کی تعلیمات دیکر انہیں دنیا اور اسکے معاملات سے کنارہ کشی پر آمادہ کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ریاست و سلطنت سے بھی بیزاری اور نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ دیندار کیتھولک کے لیے دنیا کی خدمت گزاری گناہ کے مترادف ہو گئی۔ نجات کے تصور نے ایک ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ ریاست اور اسکی خدمت انہیں نجات نہ دلا سکتی تھی۔ نجات زندگی کا ماحصل تھی جو صرف کلیسا کے توسط سے میسر آ سکتی تھی۔ اس نظریہ کی بدولت آنے والی صدیوں، بلکہ کم و بیش ایک ہزار سال تک، مغربی باشندوں کا مطمحِ نظر مذہب اور صرف مذہب رہا۔ جس کے باعث ہر شعبۂ حیات کلیسا اور بالخصوص پوپ کے اختیار میں آ گیا۔ ریاست، شہنشاہ اور شہنشاہیت اب بھی تھے، مگر کلیسا اور پوپ ان سب سے افضل تھے۔ چرچ کو لوگوں کا اس قدر اعتماد و تعاون حاصل تھا کہ وہی مغرب کا اقتدارِ اعلیٰ تھا۔ ہر شے چرچ کے اختیار و اقتدار میں تھی۔ یہاں پوپ ہی شہنشاہی عطا کرتا تھا۔ شہنشاہوں کی شہنشاہی پوپ کی جنبشِ ابرو سے زیر و زبر ہو جاتی تھی۔ اس ہزار سالہ دورِ کلیسا میں جس مغربی طاقت نے بھی کلیسا سے ٹکر لی، عوام نے اسے پاش پاش کر ڈالا۔

چرچ

مغربی عیسائیت: مغربی چرچ کی بنیاد پال نے رکھی۔ ارضِ مقدس میں حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں اور دیگر صحبت یافتہ شاگردوں نے کلیسائے یروشلم قائم کر رکھا تھا۔ پال کی تبلیغ کو اس چرچ نے ناپسند کیا، جس کے سبب پال، جان اور برناباس نے ہلینک علاقے کو اپنی سرگرمیوں کے لیے منتخب کیا۔ پال کو ان علاقوں میں یہود سے مایوسی ہوئی تو اس نے یونان اور روم کے مشرکین کو اپنے عقائد پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ جان نے پال کو مشرکین روم میں تبلیغ کرنے سے باز رکھنا چاہا کہ متی کی انجیل میں اس کی واضح ممانعت موجود تھی۔

''غیر قوموں (Gentiles) کی طرف نہ جانا۔ سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔'' (میتھیو، ۱۰، ۵-۶)

یہاں سے جان نے بھی پال کا ساتھ چھوڑا۔ پال نے انطاکیہ میں ایک نئے چرچ کی بنیاد ڈالی۔ اسکی تبلیغ کے مخاطب غیر یہود و غیر عیسائی، یونانی اور رومی تھے۔ یونان اور روم کی اپنی رسوم، اپنے اعتقادات، اپنے علومِ الٰہیات (Theology)، اور اپنے فلسفیانہ نظریات تھے۔ انہوں نے پال کی تعلیمات کا موازنہ اپنی قدروں سے کیا اور جو اختلافات پائے، پال سے انکی وضاحت طلب کی۔ اگر پال قابلِ قبول وضاحت پیش نہ کرتا تو رومی اور یونانی اسے رد کر دیتے۔ لہٰذا اسے کتبِ مقدسہ کی تعلیمات سے ہٹ کر مغربی ذہن کی مناسبت سے عقائد کی تدوین کرنی پڑی۔ اس نے اپنے چرچ کو درپیش مسائل کے حل اپنے خطوط کے ذریعے بھیجے، جو بائبل کا جزوِ لاینفک بن گئے۔

پال کے ان خطوط سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اناجیلِ اربعہ اپنی پوری سادگی کے ساتھ اس کے دور میں رائج تھیں۔ اور ان ہی سادہ تحریروں کی روشنی میں پال موشگافیاں کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن عہدِ حاضر کے محققین یہ باور کرتے ہیں کہ اناجیلِ اربعہ پال کے وضع کردہ اعتقادات کی روشنی میں دورِ مابعد کی پیداوار ہیں۔

(Brandon S.G.F.; Man and his Destiny in the Great Religions, article 'Christianity')

اس نظریے کو تسلیم کرنے کے بعد کہ اناجیلِ اربعہ پال کی تعلیمات کی روشنی میں مدوّن ہوئیں، حقائق اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ مغرب میں عیسائیت کے نام پر ایک ایسے مذہب کو رائج کیا گیا جو مغربی دنیا

کے عقائد پر مشتمل تھا، اور جسے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات اور کردار سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ پال کے خطوط کے دقیق مطالعے سے اس نظریے کی تردید نہیں بلکہ تائید ہوتی ہے۔

پال کے خطوط، 'گلتیون کے نام' (باب-۱۰) اور 'کرنتھیون کے نام' (باب-۱۱، دوسرا خط) کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود پال کے اپنے چرچ میں کوئی مخالف اور متضاد تحریک چل رہی تھی۔ دوسری تحریک کسی مخالف گروہ یا شخص کی تھی اور دونوں میں نظریاتی کشمکش ہو رہی تھی۔ ہر دو تحریکیں چرچ سے وابستہ عیسائیوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان خطوط میں استعمال کردہ الفاظ، جیسے 'کوئی اور گاسپل'، 'دوسری گاسپل'، 'دوسرا یسوع' یہ واضح کرتے ہیں کہ تضاد نہایت شدید تھا۔ دونوں گروہ گاسپل (انجیل) کے نام پر متضاد کتب پیش کر رہے تھے، جو ایک دوسرے کے لیے ناقابلِ قبول تھیں۔ دونوں گروہ یسوع مسیح کی شخصیت اور سیرت کو اس طرح پیش کر رہے تھے کہ دو متضاد شخصیتیں نظر آنے لگی تھیں۔ پال کے خطوط سے مترشح ہے کہ دوسری گاسپل اور دوسرا یسوع پال کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ 'کرنتھیون کے نام' خط میں پال نے اس مخالف تحریک کو سانپ کی مکاری سے تشبیہ دی ہے۔

پال مخالفین کا نام نہیں لیتا۔ اس کے مخاطب اچھی طرح جانتے ہونگے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔ وہ لوگ جن کے خلاف پال [غصّے میں] کھول رہا تھا غیر عیسائی نہ رہے ہونگے، کہ انہیں چرچ کے عقائد، گاسپل اور سیرتِ عیسیٰؑ سے کیا مطلب ہوسکتا تھا۔ اوّل تو دشمنِ کلیسا کو ارباب کلیسا اہمیت کیوں دیتے، پھر اس باب میں پال سے رجوع کیوں کرتے۔ یہ گروہ یا شخص اتنا با اثر تھا کہ اسکا نام تک نہ لیا جاسکا۔

پال کے خطوط میں کئی ایسے مقامات ملتے ہیں جہاں پال نے کلیسائے یروشلم اور برادرِ خداوند (جیمس) کے بارے میں گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ یہ مخالفین کوئی اور نہیں بلکہ کلیسائے یروشلم اور جیمس کے نمائندے تھے، (cf. Nock A.D.; Saint Paul, pp.110-111)، جو چرچ کے بااختیار مبلّغین تھے۔ لہٰذا یہ باور کرنے کی پوری گنجائش ہے کہ پال مغربی کلیسا کو جو عقائد اور مذہب عیسائیت کے نام پر دے رہا تھا، جو اناجیل اور سیرتِ عیسوی وہ اپنے چرچ کو پیش کر رہا تھا وہ برادر جیمس کی نظر میں وضعی تھے اور وہ ان پر سختی سے معترض تھے، جن کے تقدّس اور حضرت عیسیٰؑ سے نسبت کے باعث وہ لب کشائی کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔

کلیسائے یروشلم نے کلیسائے مغرب کی کن نکات پر مذمت کی ہوگی، اس پر برینڈن اور دیگر اہل قلم نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اولاً یسوع صرف مسیح تھے۔ وہ ثانوی خداوند نہ تھے، کہ عہد نامۂ قدیم صرف یہواہ کی وحدانیت کی تعلیم دیتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ نے اسکے ہر لفظ کی تصدیق کی۔ اس سے نہ خود انحراف کیا اور نہ اپنے پیروؤں کو انحراف کی اجازت دی۔

مسیحا کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو قعرِ مذلت سے نکال کر قوت و عظمت عطا کرے۔ اُس قوت (رومۃ الکبریٰ) کو پاش پاش کرے جس نے بنی اسرائیل کو مغلوب کر رکھا تھا۔ [Brandon S.G.F.: Man and his Destiny in the Great Religions, article 'Christianity']

علمائے بائبل کو اعتراف ہے کہ مرقس (باب ۷، ۲۵-۲۷) میں مسیح نے غیر یہود، خصوصاً جینائل (رومیوں اور یونانیوں) کو کتوں سے مشابہت دیکر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ [Taylor; Gospel according to Mark, p.340)]۔ وہ [مسیح] اسرائیل کے نجات دہندہ اور اسرائیلی حکومت کے قیّم تھے۔

(Strecter B.N., The Four Gospels, p.221)

پس ایسا مسیح جو روم کا دشمن ہو، خدا نہ ہو صرف انسان ہو، بنی اسرائیل کو خدا کی منتخب قوم اور رومن کو کتا سمجھتا ہو، اسے رومی شہری کیونکر اپنا خداوند مان سکتا تھا۔ اس شخصیت کو رومیوں کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے اس میں رومی کردار پیدا کرنا ضروری تھا۔ یونان اور روم کے مشاہیر مافوق الفطرت ہوتے تھے۔ انہیں الوہیت میسّر ہوتی تھی۔ انکا کوئی مذہب بلا دیوتا کے نہیں ہوتا تھا اور یہ دیوتا ہمیشہ انسان کے قالب میں آیا کرتے تھے۔ پال نے حضرت عیسیٰؑ میں یہ ساری مطلوبہ صفات پیدا کر دیں۔

یہاں دقت یہ پیدا ہوئی کہ یسوع مسیح کا رومی اقتدار اور یہودی سازش کے سبب مصلوب ہونا بیان کیا جاتا تھا، جس کے باعث دیوتائی صفات اور المیہ صلیب میں کوئی مناسبت پیدا نہ ہو پاتی تھی۔ ان دونوں کیفیتوں کا تضاد دور کرنے کے لیے پال کی جولانی طبع نے اس [مبیّنہ] حادثے کو 'قربانی' قرار دیکر ایک مستقل نظریے اور عقیدے کی بنیاد ڈالی۔ یہ سارے نظریات پال کے اپنے تھے۔ پال جس انداز سے بائبل کا ذکر کرتا ہے اس سے یہ مترشح ہے کہ بائبل خود اسکی اپنی تصنیف تھی۔ اس نے لکھا،

''اے بھائیو، میں تمہیں جتائے دیتا ہوں کہ جو خوشخبری (گاسپل) میں نے سنائی وہ انسان کی سی نہیں، کیونکہ وہ مجھے کسی انسان کی طرف سے نہیں پہنچی اور نہ مجھے سکھائی گئی، بلکہ یسوع مسیح کی طرف سے مجھے اسکا مکاشفہ ہوا۔
(بائبل، گلتیون کے نام، پولس رسول کا خط، باب-۱، ۱۱-۱۴)

اس واضح اقرار کے بعد یہ امر بیان کرنے میں کوئی باک نہیں رہ جاتا کہ پال نے جو مذہب مغربی کلیسا کو دیا اس کا تعلّق اسکی اپنی فکر سے تھا۔ اسکے عقائد، اسکے دور کے مسلّمہ عیسائی عقائد کے منافی تھے۔ اس سے اسکے عقائد کی سند طلب کی گئی تو اس نے اپنی بے بنیاد تعلیم کے جواز میں مکاشفہ کا حوالہ دیا جس کی رو سے اسے غیر یہودی اقوام میں تبلیغ کا حق ملا، جس سے کہ خود یسوع مسیح نے اجتناب کیا تھا۔

اختلافی عقائد : پال نے ایسے بے شمار عقائد اپنے چرچ کو دیے، جو یروشلم کے کلیسا سے مختلف اور عہد نامۂ قدیم (تورات و زبور) کی تعلیم میں نہیں ملتے۔ انکی تفصیل کا محل نہیں لیکن اجمالاً چند کا ذکر ناگزیر ہے۔

تثلیث عہد نامۂ قدیم کی توحید کے منافی ہے۔

الوہیت مسیح انسان کی الوہیت کا تصوّر تک عہد نامۂ قدیم میں نہیں۔ وہاں یہواہ خدائے واحد ہے، کسی اور کی الوہیت کی گنجائش نہیں۔

مصلوبیت تورات کی رو سے مصلوبیت ایک لعنت تھی۔

(Gal, 2-13, *'Cursed is everyone that hangeth a tree*)

پال نے [مبینہ] مصلوبیت کو تاریخی سانحے سے بلند کر کے تقدیرِ ازل بنا دیا۔ بیٹے کی قربانی قبول کر کے آدم کے گناہ معاف کروا دیے۔

گناہِ آدم: توریت نے آدم کے گناہ کا ایک سادہ سا واقعہ بیان کیا کہ آدم اور حوّا نے سانپ کے بہکانے پر شجرِ ممنوعہ کو کھا لیا جس کے نتیجے میں،

"خداوند خدا نے کہا، دیکھو انسان نیک و بد کی تمیز میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت میں سے بھی کچھ لیکر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے، اس لیے خداوند خدا نے اس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا۔" (پیدائش، باب-۳، ۲۲-۲۳)

توریت کے اس بیان سے، "کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مۂ کامل نہ بن جائے" کا تاثر تو ضرور ملتا ہے، لیکن گناہ کی پاداش میں زمین پر بھیجے جانے کا تصوّر نہیں پایا جاتا۔ گناہ کی ایک سزا دی گئی تھی، کہ سانپ کو ملعون ٹھہرایا گیا اور پیٹ کے بل رینگنا مقدّر ہوا، (بائبل، پیدائش، باب-۳، ۱۴) عورت کو درِدزہ اور مرد کی ماتحتی کی سزا ملی، (بائبل، پیدائش، باب-۳، ۱۶)، اور آدم کے سبب زمین لعنتی ہوئی اور آدم کو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھانے کی سزا دی گئی، (بائبل، پیدائش، باب-۳، ۱۹)۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ بائبل کے مطابق آدم سے جس وقت گناہ سرزد ہوا، اسکی روح اپنے بدن میں موجود تھی۔ نیز یہ کہ اس گناہ کے سبب نہ تو وہ مطعون ہوا نہ اسکی پاداش میں زمین پر اتارا گیا، بلکہ وقوعِ گناہ سے پہلے ہی وہ زمین کے ایک حصّے، باغِ عدن میں موجود تھا۔

قبلِ عیسائیت الوہیت کے بارے میں مختلف تصوّرات تھے۔ عقل الوہیت کی معترف ہو چکی تھی تاہم مقامِ الوہیت کے تعیّن میں سرگرداں تھی۔ فکرِ یونان نے روحِ انسانی کو بھی شریکِ الوہیت کیا، جس کے سبب سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ روح جو پاک تھی، خالقِ اعظم کی روح کا جز تھی، جسم کی قید میں کیسے آ گئی؟ شر نے خیر کو گرفتار کیسے کر لیا؟ کیا شر زیادہ طاقتور تھا؟ مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔ پھر کوئی اور وجہ رہی ہوگی۔ شائد اپنی ہی کسی غلطی کی وجہ سے پھنس گئی ہوگی۔ (cf. Earl, Nick; Culture and Creed, p.66)۔

یہ تھا پال کے دور کا اندازِ فکر۔ وہ یونانی فلسفیوں سے اس نظریے پر بحث کرتا نظر آتا ہے۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۵۶)۔ جس طرح گوتم کو، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، اس کے گیان دھیان نے یہ نکتہ سجھایا کہ ساری دنیا کے مصائب کا سبب خواہش یا ہوس ہے اور اس نے، اس نکتے پر، اپنا فلسفۂ نروان استوار کیا، اسی طرح فکرِ یونان نے پال کو یہ نکتہ بہم پہنچایا کہ آدم کا ازلی گناہ ان تمام مصائب کی جڑ تھا۔ اس نکتے پر اس نے فلسفۂ نجات کی بنیاد رکھی۔ فکرِ یونان اور توریت کے قصّۂ آدم میں کوئی تعلق اور ربط نہیں تھا لیکن پال نے دونوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے فلسفہ اور مذہب میں ہم آہنگی پیدا کی۔

فکرِ یونان اس امر میں غلطاں تھی کہ روح کیسے قید ہوئی؟ قصّہ آدم کے مطابق گناہ اس وقت سرزد ہوا جب روح بدن میں پھنس چکی تھی۔ پال نے ان دونوں میں مطابقت یوں پیدا کی کہ بدن گناہ سے قبل پاک تھا۔ گناہ کے بعد جسم "شر" میں تبدیل ہو گیا۔

'' کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جسم (Soma)، روح (Sima) کا مقبرہ ہے۔ گویا دورانِ حیات روح کو دفن کر دیا گیا ہے..... میرا خیال ہے کہ یہ اصطلاح آرفیس کے متبعین نے اس مفہوم کے اظہار کے لیے استعمال کی ہے کہ روح اپنی مقرّرہ سزا بھگتنے کے لیے قید خانے میں بحفاظت بند ہے۔ لہٰذا جسم ایک حفاظت گاہ (Soma) ہے، جہاں روح اس وقت تک محبوس رہے گی جب تک مقرّرہ میعادِ سزا پوری نہ ہو۔''

(Quoted by Grutheric, W.K.C.; The Greeks and their Gods, p.113)

اس تصوّر نے خود آزاری اور دنیا سے بیزاری کی تعلیم دی۔ اسے عہد نامۂ قدیم کی بنیادی کتب، تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خالصتاً مغربی عقیدہ تھا جسے عیسائیت میں اس لیے شریک کیا گیا کہ مغرب کے لیے عیسائیت قابلِ قبول ہو سکے۔

کفّارہ : گناہِ آدم نے ایک گتھی سلجھائی کہ روح بدن میں کیونکر قید ہوئی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب اس کی رہائی کیسے ہو؟ پال نے یہاں کفارے کا عقیدہ وضع کیا۔ یہ نظریہ بھی یونانی عقائد سے ہم آہنگ تھا۔ قدیم یونانی گناہ کے کفارے میں جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پال نے کہا کہ

''اسے خدا نے اس کے خون کے باعث ایسا کفارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہو۔''

(رومیوں کے نام- پال کا خط، باب-۳، ۲۵)

گناہِ آدم اتنا بڑا تھا کہ اسکا کفارہ انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ انسان شر کے باعث ناپاک تھا۔ ناپاک قربانی قابلِ قبول نہ تھی۔ انسان بھٹکا ہوا تھا۔ وہ راہِ نجات تلاش کرنے کے قابل نہ تھا۔ اب تو صرف یہ صورت تھی کہ خدا خود آئے۔ خدا کا انسانی ہئیت میں آنا ہلینک سوسائٹی کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ خدا، خدا کے فرزند، انکی بیویاں، نہ صرف یونان، بلکہ ساحلِ روم کے ہر معاشرے میں انسانی ہئیت میں پیدا ہوتے، مرتے، پھر زندہ ہوتے اور اپنا مشن پورا کر کے آسمان پر چلے جاتے۔ جس طرح اور بہت سے آئے، اسی طرح یسوع مسیح، خداوند خدا کا بیٹا بھی زمین پر آیا، اپنی جان صلیب پر دیکر اس نے آدم کے ازلی گناہ کا کفارہ ادا کیا اور خالق نے اس کفارے کو قبول کر لیا۔ اب انسان کے لیے یسوع مسیح پر فقط ایمان لانے سے نجات میسّر ہو گئی۔

اس نظریے نے ایک طرف یسوع مسیح کی بیچارگی، بے بسی اور مسکینیت کی توضیح کی، دوسری طرف مغربی ذہن کو اس کے تصوّرات کے عین مطابق عقیدہ فراہم کیا۔ اس عظیم کفارے سے قبل انسان کو اپنے گناہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے مختلف مجاہدے کرنے پڑتے تھے، مگر اب صرف یسوع پر ایمان لانا ہی کافی تھا۔ صدیوں پرانی ذہنی کشمکش کو آخر ایک حل مل گیا۔ آسان، سادہ اور اطمینان بخش۔ نہ قدیم فکر سے گریز کی حاجت رہی اور نہ کسی مزید فکر کی حاجت۔

پال کے نظریۂ گناہ و کفارہ کو چوتھی صدی عیسوی میں اس طرح استوار کیا گیا کہ یہ نظریہ عیسائی ایمان وعقائد (Faith) کی بنیاد بن گیا۔ خدا اور بندے کے مقام اور حیثیت کا تعین ہوا۔ نجات (Salvation)،

فضل (Grace)، کفارہ وغیرہ جیسی اصطلاحات کی بسیط تعریفیں متعین ہوئیں۔ اس موضوع پر آگستائن کی تعلیمات تقریباً سات صدیوں تک ناقابلِ تنقید رہیں۔

(cf. Earl, Nick, Culture and Creed, p.56)

نظریۂ موت وحیات : پال نے موت وحیات کا اپنا نظریہ پیش کیا جس کی رو سے موت کا ذمہ دار بھی آدم ہی ٹھہرا۔ اس نے توجیہہ کی کہ ایک انسان کی بدولت زندگی میں گناہ داخل ہوا اور گناہ کی بدولت موت۔ اگر آدم گناہ نہ کرتا تو لازوال ہوتا۔ ایک دوسرا آدمی (یسوع) نیکی کی خاطر قربان ہوا۔ اس نے انسان کو گناہ سے نجات دلائی اور ابدی زندگی سے ہمکنار کیا۔ (بائبل، کرنتھیوں کے نام۔ پال کا پہلا خط، باب ۱۵، ۲۲)۔ اور آخرش یہی انسان (یسوع) موت کو بھی نابود کرے گا۔ بائبل، کرنتھیوں کے نام۔ پال کا پہلا خط، باب ۱۵، ۲۵)

انسان نے ہر دور میں موت وحیات کے مسئلہ پر غور وفکر کیا ہے۔ میسوپوٹامیہ (۱۴۰۰ ق م) میں یہ تصور تھا کہ دیوتاؤں نے ایک دیوتا کے خون سے مٹی گوندھ کر انسان کی تخلیق کی، مگر ان سے غلطی یہ ہوئی کہ جسے انہوں نے دیوتا سمجھ کر ذبح کیا تھا وہ درحقیقت راکھشش تھا۔ یہی تصور یونانی علم الاصنام میں منتقل ہوا۔ ان کے تصور کے مطابق 'زئیس' دیوتا کے فرزند 'زوگرس' (Zogris) کو ایک راکھشش 'تیتن' (Titon) نے نگل لیا۔ اس راکھشش کی راکھ سے انسان پیدا ہوا۔ 'مردوک' کے پرستاروں کا خیال تھا کہ انسان کو پیدا کرنے کے لیے مردوک نے اپنے خون سے مٹی کا خمیر کیا۔ (Brandon; Man and his Destiny, p.19)۔ پیدائش کے اس تصور میں خاک اور خون مشترک عناصر ہیں، جن میں گناہ کا تصور مستور ہے۔ پال نے خاک اور خون کی جگہ راست گناہ کا لفظ استعمال کیا اور اس طرح پیدائش کے مغربی نظریے کو تسکین پہنچائی۔

مصر میں موت ایک ایسی کیفیت تھی جو اعمال کے اعتبار سے خوشگوار یا کرب ناک ہوسکتی تھی۔ بابلی تہذیب میں موت نہایت خوفناک شے تھی جس کے بعد روحیں بھوت پریت کی شکل میں آوارہ پھرتی رہتی تھیں۔ مصر اپنے اسلاف کی روحوں سے تعلّق پیدا کرنے کا خواہاں تھا تو بابل ان سے خوفزدہ اور گریزاں تھا۔ یہودیت، بقولِ انجیل اس مسئلے پر خاموش تھی۔ اس کا خدا زندوں کا خدا تھا مردوں کا نہ تھا۔ (انجیل، مرقس، باب ۱۲-۲۷)۔ صدوقی قیامت کے منکر، پس سزا و جزا سے بیگانہ تھے۔ بزرگانِ اسرائیل صرف یہواہ کی خدمت کرتے نظر آتے تھے۔ عہد نامۂ قدیم اس بارے میں ساکت ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ آیا موت کے بعد یہواہ سے کوئی تعلّق ہوگا بھی کہ نہیں، گویا معاد اور نجات کا کوئی تصور نہ تھا۔ (cf. Brandon; Man and his Destiny, p.19)۔ قدیم تصور یہ تھا کہ موت کے بعد ارواح پاتال (Shest) میں پہنچ جاتی ہیں جہاں نیک وبد کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ دورِ مابعد میں پاتال کے تین حصّے کیے گئے، اور ان میں سے ایک کو جہنم کی حیثیت دی گئی۔ (Book of Enoch, xxii-9.13)۔ اور سزا وجزا کا تصور پیدا ہوا۔

حیات بعد الممات : گناہ کے نظریے نے قربانی اور کفارہ طلب کیا تو اس کے بعد نجات کا مسئلہ طے ہوا۔

بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتی تھی۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ پال نے مغرب کو یہ نظریہ کس انداز سے پیش کیا۔ غالباً ابتدا میں اس نے معاد کا ایسا تصوّر پیش کیا جس میں روح اور بدن دونوں کو حیات میسّر آتی تھی۔ غیر شعوری طور پر اس نے تھسلنیکیوں کے نام پہلے خط میں تحریر کیا کہ،

''اے بھائیو ہم نہیں چاہتے کہ جو سوتے ہیں (فوت ہو چکے ہیں) انکی بابت تم ناواقف رہو۔ کیونکہ جب ہمیں یہ یقین ہے کہ یسوع مر گیا اور جی اٹھا تو اسی طرح خدا ان کو بھی جو سو گئے ہیں، یسوع کے وسیلے سے اسی کے ساتھ لے آئے گا۔ چنانچہ ہم تم سے خداوند کے کلام کے مطابق کہتے ہیں کہ ہم جو زندہ ہیں اور خداوند کے آنے تک باقی رہیں گے، سوئے ہوؤں سے ہرگز نہ آگے بڑھیں گے۔'' (باب-۴، ۱۳-۱۵)

اس حوالے کے بارے میں مسیحی علماء اس امر کی توثیق کرتے ہیں کہ یہاں معاد مع بدن مراد ہے۔ **(Lake K.; Earlier Epistles of St. Paul, pp.91-93)**۔ اس مرحلے پر دقّت یہ پیش آئی کہ یونانی اس نظریے سے متفق نہ ہو سکے، کیونکہ آرفک **(Orphic)** اور فیثاغورث **(Pythagoras)** کے اس نظریے کے مطابق، جسے پچھلے صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے، یونانی اس بات کے قائل تھے کہ روح ایک ازلی، لافانی اور الٰہیاتی عنصر ہے، جو زندانِ بدن میں قید ہے۔ موت کے بعد اسے رہائی اور اتصالِ الٰہی میسّر آتے ہیں۔ اب اگر حیات بعد الممات میں پھر وہی جسم کا قفس موجود تھا تو کہاں کی نجات اور کیسا اتّصال؟ یہ تو ایک تضاد تھا جو کسی سے چھپا نہ رہ سکتا تھا۔

پال نے چونکہ خود بھی فلسفۂ گناہ میں اس نظریے کو تسلیم کر رکھا تھا اس لیے اس تضاد کی تشریح میں وہ خاصا محتاط نظر آتا ہے۔ یہودی اور یونانی نظریات میں بعد المشرقین تھا۔ اگر بدن کا تصوّر نہ ہو تو روحانی معاد بے معنی ہو جاتا ہے، کیونکہ موت تو بدن پر طاری ہوتی ہے، روح تو ویسے ہی لافانی ہے۔ پال کی فطانت نے یہاں بھی کام دیا۔ اس نے ایک ایسی تشریح کی جو دونوں نظریات کے بین بین تھی۔ اس نے جسم کی دو اقسام بیان کیں۔ ایک مادّی اور دوسرا روحانی۔ جسم کی تقسیم پال سے قبل ناپید تھی۔ اس نے کرنتھیوں کے نام پہلے خط میں بڑی تفصیل سے موت کے بعد جی اٹھنے کے عقیدے پر روشنی ڈالی اور آخر میں لکھا،

''اے نادان! تو خود جو کچھ بوتا ہے جب تک وہ نہ مرے زندہ نہیں کیا جاتا...... آسمانی بھی جسم ہیں اور زمینی بھی، مگر آسمانیوں کا جلال اور ہے زمینیوں کا اور...... مردوں کی قیامت بھی ایسی ہی ہے۔ جسم فنا کی حالت میں بویا جاتا ہے اور بقا کی حالت میں جی اٹھتا ہے۔...... نفسانی جسم بویا جاتا ہے اور روحانی جسم جی اٹھتا ہے۔ جب نفسانی جسم ہے تو روحانی جسم بھی ہے۔'' (باب-۱۵، ۳۶-۴۵)

یہ تبدیلی مغرب کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ اس کے مطابق مغرب کے مرّوجہ عقائد کو تسلیم کرنے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ روحانی اور جسمانی ثنویت کا اثبات ہوا۔ دین اور دنیا کے علاقے بٹے، زندگی کی تقسیم ہوئی۔ ہر شعبۂ حیات میں روحانی اور جسمانی تفاوت، آسمانی حکومت اور زمینی حکومت، مادّی اور روحانی دنیا، دنیا اور سیاست، خدا اور دنیا کی تفریق پیدا ہوئی۔ گوشہ نشینی، خود کشی، جنس اور ملک و ملت سے لاتعلقی

جیسی صفات کو سندِ قبولیت حاصل ہوئی۔ یہ تفریق، یہ گریز اور یہ صفات، ہلینک دنیا میں عیسائیت سے قبل بھی مستحسن نظروں سے دیکھی جاتی تھیں۔ ہیرودوتس نے ایسے تارک الدنیا لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

(cf. Toynbee A.J.; A Study of History, Vol II, p.28)

ثنویت اور متھرائیت : جس طرح ترکِ دنیا مقدس اور متبرک عمل تھا، خود آزاری کو عبادت کا درجہ حاصل تھا، اسی طرح ثنویت بھی ہلینک معاشرے کا پسندیدہ عقیدہ تھا۔ ثنویت اپنی پوری شدت کے ساتھ پارسی مذہب میں پائی جاتی ہے۔ جہاں انہوں نے نور اور تاریکی سے دو الٰہ متصف کیے ہوئے ہیں۔ پوری کائنات اسی نور اور تاریکی کے اعتبار سے دو حصوں میں بانٹ دی گئی ہے اور تمام اعمالِ انسانی نیکی/نور اور بدی/تاریکی کی مناسبت سے یزدانی اور اہرمنی/شیطانی میں منقسم کیے جاتے ہیں۔

ایران میں ثنویت کے اس عقیدے پر مبنی مذہب متھرائیت **(Mithraism)** استوار ہوا۔ قدیم زرتشتی مذہب میں اور اس نئے مذہب میں فرق یہ تھا کہ تاریکی اب ایسی شیطانی قوت نہ رہ گئی تھی جس نے فطرت کی توانائیوں پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہو بلکہ ایسی ناگزیر قوتِ تخریب بن گئی تھی جو ہر شے میں فطری ضعف، بوسیدگی اور موت پیدا کرتی ہے۔ گویا یہ قوت زمانے کی اس صفت کے مترادف ہوگئی جو ہر جاندار اور بے جان کو اس کے انجام تک پہنچاتی ہے۔ زمانے کے تعمیری اور تخریبی پہلوؤں کے امتزاج کی تجسیم کر کے اس کا نام متھرا رکھا گیا۔ متھراازم میں اہرمن کی پرستش کے شواہد ملتے ہیں، جبکہ زرتشت کے یہاں وہ مردود ہے۔

(Brandon, Man and his Destiny, p.292)

اس طرح متھرا کو معبودِ اعلیٰ تسلیم کر کے اہرمن و یزداں کی تفریق ختم کر دی گئی۔ تاہم وہ ثنویت جو اہرمن و یزداں سے متھرا کو ملی تھی بجنسہٖ باقی رہی۔ متھرا کی ذات میں نور و ظلمت دونوں ہی مجتمع ہوگئے تھے۔ متھرائیت جب ایران سے نکل کر ہلینک دنیا میں پہنچی تو یونان میں اس کے عقائد کو فلسفیانہ مباحث کا موضوع بنایا گیا۔ جبکہ روم نے اُسے بحیثیتِ مذہب قبول کیا۔ اس طرح ثنویت فکری اور نظری اعتبار سے پوری ہلینک دنیا میں عام تھی، جبکہ عبرانی مذہب اور اسکی شاخوں میں ثنویت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

عہد نامۂ عتیق میں روح اور بدن کا نام آدمی ہے۔ وہاں روحانی اور بدنی معاملات میں مکمل اشتراک ہے۔ محققینِ بائبل کو اعتراف ہے کہ ثنویت کا تصور قدیم اسرائیلی تعلیمات اور عقائد سے قطعاً مختلف ہے۔ عہد نامۂ قدیم میں صرف امثالِ سلیمان ایسی کتاب ہے جس میں جسم کو مقبرے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور یہ تشبیہ بھی محض یونانی اثرات کا نتیجہ تھی۔ یہودی مفکر 'فائلو' نسلاً یونانی تھا۔ اس نے فکرِ یونان کو یہودیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ پس پال کے لیے فائلو کے نقشِ قدم موجود تھے۔ اس نے ثنویت کو اپنے مذہب کا جزو بنا دیا۔ اب عیسائیت ہلینک دنیا میں مروجہ مذاہب، خصوصاً متھرائیت، کی ہم رنگ، ہم عقیدہ اور ہم خیال تھی۔ 'ہرمزد' کی جگہ 'گاڈ'، 'اہرمن' کی جگہ 'شیطان' اور 'متھرا' کی جگہ 'کرائسٹ' نے لے لی۔ متھرا کی طرح

کرائسٹ کی موت اور پھر سے جی اٹھنے کی حکایت، وہی روح و بدن کی ثنویّت، وہی قربانی اور رسوم اور قربانی کے عوض حیاتِ نو، جب عیسائیت میں ہر چیز موجود تھی تو متھرائیت نے اپنی جگہ عیسائیت کے لیے خالی کر دی۔

رسوم: عیسائیت کی مذہبی رسوم اور تہواروں کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ انہیں بھی حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ۲۵ دسمبر کا دن سورج کی پیدائش کا دن تصور ہوتا تھا۔ (Earnest Barker; Legacy of Rome, essay 'The Conception of Empire', p.77) اس دن کو کانسطن طینس (Constantius) نے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا دن متعیّن کیا، اور اس طرح سورج دیوتا کی پیدائش کے جشن کو کرسمس کا نام دیا گیا۔ سردیوں کے اس رومن جشن کو، عیسائیت سے پہلے، 'فیسٹیول آف دی ساترنابیا' (Festival of the Saturnabia) کہا جاتا تھا۔

(Cyril Bailey; Legacy of Rome, essay 'Religion and Philosophy')

اسی طرح عشائے ربّانی (Sacrament) کی رسم ہے، جس میں شرکاء یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ یسوع مسیح کے ہمراہ ضیافت میں شریک ہیں۔ اس ضیافت میں روٹی اور شراب کا استعمال کیا جاتا ہے جسے یسوع کا گوشت اور خون تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہ عیسائی رسم حقیقتاً بت پرست رومیوں کی ایک رسم تھی جو فوج میں بھرتی ہونے والے رنگروٹوں کی حلف برداری کے موقع پر ادا کی جاتی تھی۔

(cf, Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. VI, p.III)

بپتسمہ بھی بت پرست مغرب کی ایک مقدّس رسم تھی۔ متھراازم میں ہر رکن کو برادری میں شامل کرنے کے لیے بیل کے گرم خون سے بپتسمہ دیا جاتا تھا۔(Nick Earl; Culture and Creed, p.61)۔اس رسم کا بنی اسرائیل کے مذہب میں کوئی وجود نہیں ہے۔ بائبل میں ضرور تذکرہ ملتا ہے۔لیکن اناجیل کا تعلّق چونکہ پال کی تحریک سے ہے اس لیے شبہ ہے کہ اس رسم کی سند بہم پہنچانے کے لیے انجیل میں چند الفاظ داخل کر دیے گئے ہیں۔

اسی طرح ایسٹر کی رسم بھی عیسائیت سے قدیم تر رسم ہے جو موسمِ بہار کا جشن منانے کے لیے ادا کی جاتی تھی۔

صلیب: صلیب کو مذہبی نشان مقرّر کرنا سورج پرستوں کے غلبے کی واضح نشانی ہے۔ اس نشان کا وجود عہد نامۂ قدیم میں نہیں ملتا۔ یہ نشان عیسائیت سے قبل عہدِ قدیم میں مستعمل تھا اور سورج کی نمائندگی کرتا تھا۔ گویا یہ راست زندگی کا مظہر تھا۔ (Encyclopedia Britanica; Vol. 6, article 'Cross', p.812)۔

متھرا کو سورج دیوتا مانا جاتا تھا، اس لیے یہ متھرائیت کا مذہبی نشان تھا۔ قسطنطین نے اس نشان کو اپنے جھنڈے پر اس وقت جگہ دی جب وہ بت پرست تھا۔

(cf. Gibbon; The Decline and Fall of Roman Empire, Vol. II, Chap. XX)

سبت: عہد نامۂ قدیم کی رو سے سبت کا دن 'سنیچر' (Saturday) ہے، لیکن چونکہ مغرب سورج پرست تھا اور سورج کا دن 'اتوار' (Sunday) مقرر تھا، اس لیے عیسائیت میں سبت بھی اتوار کا دن مقرر ہوا۔

آلتار : قبلِ عیسائیت بھی مغرب کے صنم کدوں کا رخ مشرق کی سمت ہوتا تھا تاکہ سورج کی عبادت اس کے نکلتے وقت اس کیجانب رخ کرکے کی جاسکے۔عیسائیت نے بھی اپنی قربان گاہ یا الٹار کا رخ مشرق کی جانب برقرار رکھا۔

تثلیث : کئی مذاہب ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی تعلیمات کے مطابق معاشرے کو استوار کیا، اور ایسے بھی ہیں جو مستحکم معاشرے میں مقام پانے کے لیے معاشرے کے ذہن کے سانچے میں ڈھل گئے۔دور اور معاشرے کے ساتھ مصالحت کی سب سے بڑی مثال تثلیث ہے۔ پال، جو یہودی تھا اور توریت کی توحید کا دعویدار، جب ہلینک معاشرے کو دعوت دینے پہنچا تو یہ معاشرہ اپنی رسوم، رواج، عقائد اور دیوتاؤں کو ترک کرکے حضرت عیسیٰ کی توحید کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ یہ معاشرہ متمدّن دنیا کا آقا تھا۔اپنی مرضی تسلیم کروانے کا عادی۔ پال کو معلوم تھا کہ اس معاشرے کے ذہنی تقاضے کیا ہیں۔ پال نے اس معاشرے کو اپنے پاس بلایا اور جب یہ معاشرہ غیر متحرّک رہا تو وہ خود آگے بڑھ کر اس میں شامل ہوگیا۔

پال کے دور میں رومی باشندوں میں کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی۔ ہر علاقے کا مذہب جدا جدا، اور انکے دیوی دیوتا مختلف تھے،لیکن شعوری یا لاشعوری طور پر ہر جگہ کسی نہ کسی شکل میں تثلیث پائی جاتی تھی۔رومن ایمپائر کے ہر حصے میں کسی نہ کسی طرح سورج یا اسکے اوتار کی پرستش ہوتی تھی۔ان اوتاروں **(Incoronate Gods)** کے نام ضرور مختلف تھے لیکن کوائف اور کردار میں عجیب مماثلت پائی جاتی تھی۔تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے ایک اجمالی خاکہ بے محل نہ ہوگا۔

رومن ایمپائر کے دیوتا

ملک	دیوتا کا نام	دیوتا کی ماں	جنم دن	کوائف
ا۔فریجیا	اطس (Attes)	کنواری نانا	-	تثلیث: سورج، اطش اور نانا القاب: اکلوتا فرزندِ خدا، نجات دہندہ، ۲۴ مارچ کو مرنے کے بعد دوسرے دن زندہ ہوا۔
۲۔تموز (سیریا)	ادونس (Adonis)	کنواری مادرِ خداوند	-	تثلیث: خداوند، ادونس اور مادرِ خداوند؛ مرنے کے بعد جی اٹھا۔
۳۔یونان	بکس (Baccus)	کنواری دیمیتر	۲۵ دسمبر	تثلیث: جیوپیٹر، بکس، دیمیتر القاب: آقائے حیات، نجات دہندہ، مقتول، آزادکنندہ؛ مرنے کے بعد زندہ ہوا۔
۴۔بابل	بل یا بعل	مادرِ خداوند	-	تثلیث: سورج، بعل اور مادرِ خداوند؛ یسوع کے ساتھ مقدمے، مصلوبیت، موت کے وقت طوفان، دوبارہ زندہ ہونے کی تفصیلات میں حیرت انگیز مشابہت
۵۔مصر	اوسائرس (Osiris)	جگت کنواری (Virgin of the World)	دسمبر کے آخری ہفتے میں	تثلیث: ہورس، اوسائرس اور جگت کنواری القاب: آدم خدا (Man God) مرنے کے تین دن بعد زندہ ہوا
۶۔روم	متھرا (Mithra)	کنواری اناہیتا (Anaheta)	۲۵ دسمبر	تثلیث: یزداں، اہرمن اور متھرا القاب: ربِّ اعلیٰ، مقدس نجات دہندہ تہوار: کرسمس اور ایسٹر
۷۔اطالیہ	جیوپیٹر	مزدا	-	تثلیث: جیوپیٹر، مزدا، جونو

[ان مذاہب میں کنواری ماں سے مرادِ عموماً زمین ہوتی ہے، جسے مادرِ گیتی، دھرتی ماتا، یا مدر لینڈ کا خطاب دیا جاتا ہے، اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ سورج زمین کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔]

(For details see:

1. Frazer G. B. Sir; Golden Bough; 'Adonis, Attis, Isis, Osiris', Vol. I, pp. 6-12
2. Ansari F. R.; Islam and Christianity in the Modern World, chapter 'Christianity and Modern Religions'

For 'Trinity' in 'Italy',

cf. Asquith H.H.; Legacy of Rome, article 'Introduction')

نظریاتی تثلیث : مندرجہ بالا عقائدِ تثلیث کے علاوہ، ایک نظریاتی تثلیث یونان کے علمی حلقوں میں مسلمہ تھی۔ افلاطون نے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تین صدی قبل اپنی فکر کو الوہیت پر مرکوز کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ الوہیت کے تین اجزاء ہیں۔ علتِ اولیٰ (First Cause)، حکمت یا کلام (Logos or Reason)، اور روحِ کائنات (Spirit of the Universe)۔ اسکی طبعِ رسا نے ان تینوں اجزاء کی تجسیم کی بھی کوشش کی۔ ان کو اس نے تین قوتیں قرار دیا جو ایک دوسرے سے پراسرار طور پر متعلق تھیں۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ کچھ عرصے کے بعد اس کی فکر ایک عالمی مذہب کی بنیاد بننے والی ہے تو شائد وہ اپنی فلسفیانہ اصطلاحات کی مکمل تعریف کر جاتا تا کہ آئندہ اختلافات کی گنجائش نہ رہ جاتی۔

افلاطون کا یہ نظریہ ہلینک معاشرے میں نہایت مقبول تھا۔ مصر میں اسے شاہانِ بطلیموس کی سرپرستی حاصل تھی۔ مصر سے اسے یہود نے قبول کیا۔ پہلی صدی قبل مسیح میں اسے اتنا عروج دیا گیا کہ امثالِ سلیمان کے نام سے کتابِ مقدس کا جزو بنا دیا۔ [cf. Gibbon E.; The Decline and Fall of Roman Empire, Vol. II, p.337]۔ یہی وجہ ہے کہ پروٹسٹنٹ فرقے نے اسے صحیفۂ سماوی کی حیثیت سے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

افلاطون کے بیان کردہ تین الوہی اجزاء کے دوسرے جزو 'لوگس' یا 'کلام' کو حضرت عیسیٰؑ سے متصف کیا گیا۔ یوحنا کی انجیل کی ابتدا ہی اسی 'لوگس' یا 'کلام' کی تعریف سے ہوتی ہے اور یسوع کو کلام قرار دیتی ہے۔ [واضح رہے کہ قرآن میں بھی حضرت عیسیٰؑ کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔] اس طرح مغربی چرچ نے پال سے ایک ایسا مذہبی آمیزہ حاصل کیا جو کسی طور سے حضرت عیسیٰؑ کی ذات، انکی تعلیمات اور انکے عقائد سے تعلق نہ رکھتا تھا، بلکہ اس کی بنیاد اس دور کے مروجہ مذاہب، عقائد اور فلسفیانہ فکر پر تھی۔

اس آمیزے کے لیے اس نے بابل اور اسرائیل سے خالقِ کائنات کا تصور لیا، ایران سے ثنویت، بت پرستوں کے مرکر جی اٹھنے والے دیوتاؤں سے مافوق الفطرت پیدائش اور موت، فریجیا سے مادرِ اعظم [زمین] کی پرستش، یونان اور روم سے تثلیث کی نظریاتی بنیاد، مشرکوں رب پرستوں سے بپتسمہ، عشائے ربانی، کرسمس اور ایسٹر، قدیم مصر سے اقرارِ گناہ، متھرائیت اور یونانی دیومالا سے تصورِ کفارہ و قربانی، ہندومت

سے حلول، ہلینک دنیا سے جسم و روح کی دوئی، سورج پرستوں سے صلیب اور متبرک ایّام، بدھ مت، یہودیت اور فلسفۂ یونان سے الٰہیاتی بنیادیں حاصل کر کے ایک رومن عیسائیت ترتیب دی، جسے رومن کیتھولک کہا گیا۔

ان اجنبی عناصر کے لیے عہد نامۂ قدیم، یا یروشلم کی عیسائی بائبل میں گنجائش نہیں تھی۔ انہیں ضم کرنے کے لیے ایک نئی بائبل ترتیب دینا ضروری تھا۔ اس پر بھی کام نہ بن سکا تو پال نے اپنے فتووں سے کام لیا، اور جو کام حضرت عیسیٰؑ نے نہیں کیا تھا وہ کر ڈالا، یعنی بزعمِ خود شریعت (قانونِ موسوی) کو لعنت قرار دے کر منسوخ کر ڈالا۔

''اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہیگا۔ اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں..... مسیح جو ہمارے لیے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لیکر شریعت کی لعنت سے چھڑایا.....''۔ (بائبل، گلتیوں کے نام۔ پال کا خط، باب-۳، ۱۱ تا ۱۳)

اس نے توریت کی تعلیمات کو لعنت گردانا اور مسیح پر ایمان کو ذریعۂ نجات ٹھہرایا تاکہ اسکی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اس طرح پال کے رومن کیتھولک عقیدے کی روشنی میں اناجیل مدوّن ہوئیں۔ خود عیسائی محققین کو اعتراف ہے کہ مرقس، لوقا اور متی کی اناجیل علی الترتیب ۸۰ء، ۹۰ء اور ۱۰۰ء کے لگ بھگ تحریر کی گئیں۔ یوحنا کی انجیل دوسری صدی عیسوی کی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

(cf. James Westfall; History of Historical Writings, Vol. I, p.12)

اس میں شک نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے اس دنیا سے جانے کے سو سال کے اندر اندر عیسائیت ہلینک دنیا میں اپنے قدم جما چکی تھی۔ استحکام حاصل کرنے کے بعد، وہاں کی علمی فضاؤں میں عیسائیوں کو اپنی اناجیل تحریر کرنے کا خیال آیا۔

چرچ کی تنظیم

چرچ کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں۔ مثلاً چرچ آسمانی بادشاہت ہے۔ **(Nick Earl; Culture and Creed, p.88)**۔ چرچ کرائسٹ کا بدن ہے۔ چرچ کرائسٹ کی دلہن ہے۔ چرچ نیا اسرائیل ہے۔

(cf. Concise Encyclopedia of Living Faiths. p.19)

عام زبان میں چرچ ایک مذہبی ادارہ ہے جو عیسائیوں کے مذہبی معاملات کی نگرانی، رسوم کی ادائیگی، عبادت، روحانی رہبری، اور مقدس عمارتوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ روح اور بدن کی ثنویّت کے پیشِ نظر تمام روحانی معاملات چرچ سے اور تمام بدنی معاملات حکومت سے متعلق سمجھے جاتے ہیں۔

ابتدائی رومن دور میں جب شہنشاہ پرستی اور وطن پرستی کا رواج سلطنتِ روم میں عام تھا، ریاست نے چرچ کے فرائض بھی سنبھال لیے تھے۔

(cf. The Legacy of Rome; essay 'Conception of Empire', by Earnest Barker, p.65)

اس کی سول سروس کے عہدیدار ملک بھر کے مندروں کے نگراں اور منتظم تھے۔ جب مغربی چرچ قائم ہوا تو اس نے نہ صرف اپنی تنظیم رومن دور کی انتظامیہ کے انداز پر کی بلکہ اسکے طور طریقوں اور اسکی اصطلاحات کو بھی اپنایا۔

ذیلی جدول دونوں کے درمیان مماثلت کو اجاگر کرنے میں ممدّ و معاون ثابت ہوگا۔

چرچ کی تنظیم

شعبہ	رومن ایمپائر	رومن چرچ
عہدے اور مستقر		
سربراہ	ایمپرر	پوپ
سربراہ کا مستقر	روم	روم
نائب	صوبائی گورنر	پیٹری آرچ بشپ
نائب کا مستقر	صوبائی مرکز	صوبائی مرکز
عمّال	حکّام	پریسٹ
فوج		
نشان	کراس	کراس
رکنیت کی تقریب	حلف برداری	بپتسمہ
خلاف ورزی کی پاداش	سزا	کفارہ
غدّاری کی سزا	موت	موت
ادارے		
عوام کا نمائندہ ادارہ	چرچ (سیاسی ریاست)	چرچ (روحانی ریاست)
انتظامیہ	سول سروس	آرڈر
قانون سازی و انتخاب	سینیٹ	کیوریا

اجتماعی نمائندگی	جنرل اسمبلی	چرچ
سیاسی تنظیم	اکلیسیا (Ecclesia)	اکلیسیا (مذہبی تنظیم)
اصطلاحات		
رعایا (حلقۂ اثر)	لائٹی (Laity)	لائٹی
نظمِ وراثت واختیارات	ہیئر آرکی (Hierarchy)	ہیئر آرکی (چرچ کی تنظیم)
حکومتی موروثی عمال	کلرجی (Clergy)	کلرجی
منصب یافتہ لوگ	آرڈر (Order)	آرڈر
مالیہ کے نوشتے [رجسٹر]	اسکرپچر (Scripture)	اسکرپچر (مقدس تحریر)
قانونی ہدایات	ٹسٹامنٹ (Testament)	ٹسٹامنٹ
جسمانی ریاضت	ایسیٹک (Ascetic)	ایسیٹک - روحانی ریاضت
ایوانِ تجارت	کونونٹ (Convent)	کونونٹ (ایوانِ کلیسا)
رنگروٹ بھرتی کا جشن	سیکرامنٹ (Sacrament)	سیکرامنٹ - عشائے ربانی
عام سیاسی اجتماع	کمیونین (Communion)	کمیونین (مذہبی اجتماع)

(for details see Toynbee A.J., A Study of History, Vol VI, pp.65, 109-111)

چرچ کی مختصر تاریخ

بقا کی جدّ و جہد: کلیسا نے رومن ایمپائر میں اپنی تنظیم اس وقت کی جب اسے سرکاری حیثیت نہیں ملی تھی۔ ابتدائی مغربی چرچ نے اپنے اعتقادات اس انداز سے ڈھالے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہوں۔ یروشلم کے لاکھوں تارکین وطن بحرِ روم کے ساحلی شہروں میں آباد تھے۔ جب پال اور اسکے نمائندے انکے پاس عیسائیت کا پیغام لیکر پہنچے تو انطا کیہ، اسکندریہ، کورنتھ، اور روم کے تارکین نے عیسائیت قبول کی۔ ان کاوشوں سے دوسرے لوگ بھی متوجہ ہونے لگے۔ تاہم ابتدا میں جن لوگوں نے اس مذہب کو قبول کیا وہ زیادہ تر محنت کش طبقے کے لوگ اور غلام تھے۔ شہروں سے یہ مذہب دیہاتوں کی طرف بڑھا۔ اس کی توسیع باقاعدگی سے اور منظم طریقے پر ہونے لگی۔ ۳۰۰ء تک رومن ایمپائر کی ایک تہائی آبادی عیسائی ہو چکی تھی۔

(Kennith Neill; Humanity and Society, p.271)

ابتدائی تین صدیاں چرچ کے ابتلاء کا دور تھا۔ عیسائیت حضرت عیسیٰ سے موسوم تھی جو مسیحا تھے اور مسیحا کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ رومن ایمپائر کا خاتمہ کر کے عالمی یہودی حکومت قائم کریں گے۔ اوّلین عیسائی (تارکینِ وطن اور معاشرے کا نچلا طبقہ) رومی جارحیت کا شکار تھے۔ ان میں فطرتاً روم کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔ مزید برآں، ابتدائی عیسائی تعلیمات میں بھی روم کے خلاف مواد موجود تھا۔ عیسائیت کے نزدیک روم تاریکی کا فرزند تھا۔

۱۳۲ء میں یہود نے رومی اقتدار کا جوا اتار پھینکنے کے لیے ایک بار پھر مسلح جد و جہد کی تو عیسائی بھی اس میں شریک ہو گئے۔ ان حالات میں رومی حکمرانوں کو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ یہ نیا فرقہ مذہب کی آڑ میں ایک منظم سیاسی تحریک ہے جس کا مقصد رومن ایمپائر کا ختم کرنا ہے۔ حکومت کی طرف سے سختی شروع ہوئی۔ قید و بند اور دار و رسن کا سلسلہ شروع ہوا۔ مذہبی اجتماعات پر پابندیاں لگیں۔ گرجے اور جائدادیں ضبط ہوئیں۔ کتابیں جلائی گئیں۔ عیسائیت سے برأت کے حلف نامے لیے گئے۔ مقدمات سے صرف وہ لوگ محفوظ رہ سکتے تھے جو فرار ہو جاتے یا کسی نہ کسی طرح رومی حکومت سے یہ صداقت نامہ حاصل کر لیتے کہ یہ شخص ملکی قانون کا پابند ہے۔

(Gibbon E.; Decline and Fall of Roman Empire, Vol.II, pp. 106-107)

ان کارروائیوں سے بے چینی بڑھ جاتی۔ یہ بے چینی تحریک میں شدت پیدا کرتی، جس کا نتیجہ مزید تشدد ہوتا۔ یہ ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو صدیوں چلتا رہا۔ ۲۴۹ء میں سلطنتِ روم پر بیرونی حملہ ہوا تو عیسائیوں نے رومی افواج کے خلاف حصہ لیا۔ نصف صدی بعد سلطنت میں زوال کے آثار پیدا ہوئے تو عیسائیوں نے اس پر کاری ضرب لگائی، جس کی پاداش میں ہزاروں عیسائی تہہ تیغ کیے گئے۔ چرچ کی سربراہی میں شدید مظاہرے اور تخریبی کارروائیاں ہوئیں۔ اس وقت تک چرچ رومن ایمپائر میں مستحکم ہو چکا تھا اور ایک منظم و فعال قوت بن چکا تھا۔

استحکام اور ابتلاء: تیسری صدی کے اختتام تک عیسائیت ملک کے ہر خطے اور معاشرے کے ہر طبقے میں پہنچ چکی تھی۔ چرچ اور سلطنت میں کشمکش جاری تھی۔ غیر عیسائی رومن باشندے جن کی اب بھی اکثریت تھی، چرچ کو اپنے دیوتاؤں کا باغی قرار دیتے تھے۔ چرچ کے بارے میں ان میں شدید غلط فہمیاں تھیں۔ اسے انسانیت کا ظالم ترین ادارہ تصور کیا جاتا تھا۔ عام طور پر مشہور تھا کہ چرچ میں ہمیشہ [ہر عبادت کے موقع پر] ایک انسانی بچہ (Son of Man) ذبح کیا جاتا ہے۔ شرکاء اس کا خون پیتے ہیں۔ پھر ایک جشن بپا ہوتا ہے، جس کے دوران روشنیاں گل کر کے دادِ عشرت دی جاتی ہے۔

(Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.25)

ایک طرف عوام میں بدگمانی اور دوسری طرف حکومت کے مخالفانہ رویے نے چرچ کو اپنی بقا کی شدید جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا۔ عیسائی ہونا ہی ایک جرم تھا۔ اقبالِ جرم کی صورت میں لرزہ انگیز سزائیں ملتی تھیں۔ مظالم کی انتہا تو یہ ہوئی کہ جب قتل و خونریزی اور انسانیت سوز سزائیں انہیں مذہب سے برگشتہ نہ کر سکیں، جب جان دینا موجبِ وقار ہو گیا، تو روم نے انکے ساتھ 'مذہب یا عصمت' کا معاملہ کیا، کہ عصمت بچا لو

یا مذہب بچالو۔ یہ سلسلہ رومی نوجوانوں کے لیے نہایت دل خوش کن تھا۔ حد تو یہ ہے کہ نوجوان عیسائی مردوں کی عصمت دری کا فرض رومن خواتین نے ادا کیا۔

(Gibbon E.; Decline and Fall of Roman Empire, Vol. II, p.96)

ابتلاء کا یہ دور نیرو کے عہد سے لیکر دیوکلیتن کے عہد تک رہا۔ اس کے بعد چرچ کے نمائندوں کو دربار میں جگہ ملنے لگی۔ انہیں عوام میں عزت میسر آئی۔ اب چرچ کو امرائے دربار کے غلاموں، کنیزوں، داشتاؤں اور خادموں کی پناہ کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ چرچ کے عہدیدار حصولِ اقتدار میں کوشاں ہوئے۔ چرچ کے عہدے اتنے اہم ہو گئے کہ انکی خرید و فروخت ہونے لگی۔ چرچ کی بڑھتی ہوئی قوت کے سبب روم کے بت پرستوں کو اپنے مذہب کے بچاؤ کی فکر ہونے لگی۔

رومن فوج کو سلطنتِ روم میں ہمیشہ ایک خاص اہمیت اور عظمت حاصل رہی۔ سلطنت کے دورِ تنزل میں فوج بھی چرچ کی طرف مائل ہونے لگی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ فوج میں عیسائیوں کی تعداد، ملک کی آبادی میں عیسائیوں کے تناسب سے بھی بڑھ گئی۔ اس طرح فوج میں ایک ایسا عنصر بھی پیدا ہو گیا جس کے نزدیک پاپا کا حکم شہنشاہ کے حکم سے برتر تھا اور روم کا فوجی پرچم چرچ کے صلیبی پرچم سے کمتر تھا۔ اب فوج کی وفاداریاں حکومت اور چرچ میں تقسیم ہو گئیں۔ جگہ جگہ حکم عدولی اور بغاوت کے واقعات پیش آنے لگے۔ شہنشاہ گلیریئس (Glarius) نے فوج سے عیسائی عنصر خارج کیا۔ فوج میں بے چینی بڑھی۔ شہنشاہ نے چرچ ڈھانے اور ہر عیسائی کو قتل کرنے کا حکم جاری کیا۔ کتابِ مقدس قبضے میں رکھنا جرم قرار دیا گیا۔ جائدادیں ضبط ہوئیں۔ ایک سال تک یہ تشدد پوری قوت سے جاری رہا اور پھر اس شرط پر امان دی گئی کہ آئندہ ملکی قوانین کا پورا احترام کیا جائے گا۔ (حوالۂ بالا صفحہ ۲۶)

<u>**سرکاری سرپرستی**</u> : چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا چرچ کے لیے سرکاری سرپرستی کا پیغام لائی۔ اس دور میں شہنشاہیت کے دعویداروں میں شدید خانہ جنگی شروع ہوئی۔ قسطنطین فاتح کی حیثیت سے ابھرنے لگا۔ **۳۰۰ء** میں اس نے چرچ آف روم کو امان دی، جس کے سبب اسے افواج کی مکمل وفاداریاں میسر آگئیں۔ چرچ نے پوری سلطنت میں ففتھ کالم کا کردار ادا کیا۔ ہر عیسائی قسطنطین کے صلیبی پرچم کا شیدائی بنا، اور آخرکار آنے والے چند برسوں نے قسطنطین کو، بلا شرکتِ غیرے، سلطنتِ روم کا شہنشاہ بنا دیا۔

قسطنطین کی شخصیت متنازعہ ہے۔ چرچ اسے عیسائی شہنشاہ قرار دیتا ہے۔ مورخ اسے شہنشاہ تو تسلیم کرتا ہے لیکن عیسائیت سے لاتعلق قرار دیتا ہے۔ شہنشاہ خود عیسائی ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن چرچ کا پشت پناہ ضرور تھا۔ شہنشاہ نے چرچ کی عدیم المثال خدمات اور معاونت کے عوض اس پر مراعات کی انتہا کر دی۔ چرچ کو دولت، عزت اور عظمت بخشی، چرچ کی حفاظت مدلیہ کا فرض قرار پائی۔ رومن کیتھولک چرچ نے بھی شہنشاہ کے اعزازات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

اس سرپرستی نے چرچ کو ایک نہایت طاقتور، خودمختار ادارہ بنادیا، جسکا اپنا تخت تھا، اپنے جھنڈے، اپنے معاشی وسائل اور اپنا خزانہ، اپنے قوانین اور اپنی عدالت، اپنی پولیس اور اپنے قید خانے تھے۔ اس طرح چرچ، سلطنتِ روما کے اندر ایک متوازی سلطنت بن گیا جس کی حدود میں ملکی طاقت داخل نہیں ہوسکتی تھی اور جہاں دنیاوی قانون کا گزر نہیں تھا۔

چرچ اس قدر طاقتور ہوگیا کہ صرف شہنشاہ اور اسکے افرادِ خاندان اسکی دسترس سے باہر تھے، ورنہ ہر صاحبِ اقتدار اس کے رحم و کرم پر تھا۔ چرچ اگر کسی کو مذہب سے خارج کردیتا تو شہنشاہ بھی کچھ نہ کرسکتا تھا۔ چرچ کے مخالفین کی فہرست مشتہر ہوتی تو عوام اسکا جینا دوبھر کردیتے، یہاں تک کہ جنازے میں بھی کوئی شرکت نہ کرتا۔ چرچ کے اس آمرانہ تسلّط کے سبب ہر شخص اس کے آستانے پر سجدہ ریز ہونے پر مجبور ہوگیا۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۳۲۳)

پھر چرچ کا اقتدار بڑھتا ہی گیا۔ اس کی مسند کا وقار تختِ شاہی کے مرتبے سے بھی بڑھ گیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر سے شہنشاہیت چرچ کی کاسہ لیس بن گئی۔ چرچ شہنشاہی عطا کرتا، شہنشاہی چھین لیتا، علاقوں میں امن قائم کرتا اور امن ختم کرتا۔ ایک ملک کو دوسرے پر حملہ کرنے کا پروانہ عطا کرتا۔ شاہی دربار چرچ کے نمائندوں سے رونق پاتا، اور چرچ میں شاہانِ مغرب جبیں سائی کرتے۔ چرچ نے ہی مغربی معاشرہ قائم کیا تھا اور وہ وہاں مسیحی قانون داخلاقی نظام نافذ کرنے کا ذمّہ دار تھا۔ اگر معاشرتی امن وسکون کسی غیر عیسائی آواز سے ذرا سا مرتعش ہوتا تو چرچ مغرب کی ساری قوّت اس کے خلاف صف آرا کردیتا۔

چرچ میں فکری انتشار : جب عالمِ عیسائیت شہنشاہ قسطنطین کی پناہ میں آیا تو شہنشاہ کو عیسائی دنیا میں فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، کیونکہ مصری، شامی، یونانی اور رومن چرچ ایک دوسرے سے سنگین اختلافات رکھتے تھے۔ ہر چرچ کے اپنے اعتقادات تھے جو جزوِ ایمان بن چکے تھے۔ ان کو شعور سے جدا کردینا ممکن نہ تھا۔ ہر چرچ صرف خود کو مسیحی سمجھتا تھا اور باقی ساری دنیا کو کافر۔ اگر اتّفاق سے کسی اور چرچ کا کوئی گرجا قبضے میں آجاتا تھا تو اس کی تطہیر اس انداز سے کی جاتی تھی جیسے کوئی بتکدہ پاک کرکے گرجا بنایا جارہا ہو۔

اختلافات میں شدید ترین اختلاف، عقیدۂ تثلیث کی نوعیت اور عیسویت (Christology) پر تھا۔ یونان و مصر فلسفے کے گہوارے تھے، اور شام مذاہب کا مولد، جبکہ روم کا مزاج سپاہیانہ تھا جہاں فلسفہ تو کجا، فلسفی کا گزر نہیں تھا۔ ۱۶۱ ق م سے فلسفیوں کا روم میں قیام قانوناً ممنوع تھا۔

(Legacy of Rome; 'Introduction' by Asquith H.H.)

پس ہر چرچ کی فکر کے انداز جدا تھے۔ ہر علاقے میں فرقہ بندی تھی۔ 'ابیانی' (Ebionite) اور 'نزارینی' (Nazarenes) فرقے حضرت عیسیٰؑ کو صرف نبی مانتے تھے، ابن اللہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ناسٹک (Gnostic) فرقہ مسیح کی الوہیت کا سختی سے قائل تھا۔ دوسیٹی فرقے کا عقیدہ تھا کہ مسیح کسی کنواری ماں کے بطن سے پیدا ہونے کے بجائے آسمان سے اترے تھے۔ مصر کے مفکّر آریوس (Arius) نے تثلیث کا جو

عقیدہ دیا تھا چرچ آف روم اسے کسی قیمت پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ آریوس نے فرزند کو مخلوق کہا۔ سبیلیزم (Sabillianism) کے نزدیک فرزند اور خداوند پدر میں فرق تھا۔

سرکاری عقیدہ: اس ذہنی انتشار کو دور کرنے کے لیے قسطنطین نے عالمِ عیسائیت کے تمام بشپ طلب کیے اور بتھانیہ کے علاقے میں نیقہ (Nica) کے مقام پر ۳۲۵ء میں عظیم مذہبی اجلاس منعقد کیا۔ یہ اجلاس تقریباً دو ماہ جاری رہا۔ اکثر و بیشتر خود شہنشاہ اس اجلاس کی صدارت کرتا۔

جب اعتقادات زیرِ بحث آئے تو پتہ چلا کہ تثلیث کی تین اہم شکلیں تھیں، اور ہر ایک ناقص و نامکمل۔ فرسٹ کاز اور اسپرٹ آف یونیورس پر اختلاف اتنا شدید نہ تھا، جتنا لوگس (کلام، فرزند یا مسیح) کی نوعیت پر۔

۱۔ کلیسائے مصر کے مطابق لوگس قائم بالذات نہ تھا۔ کلام کی حیثیت سے مخلوق تھا۔ پس قائم بالغیر اور صرف اس وقت تک لافانی تھا جب تک پدر خالق کا منشاء ہو۔

(The Concise Encyclopedia of the Living Faiths, p.70)

۲۔ شامی چرچ کے مطابق فرسٹ کاز، اسپرٹ اور فرزند، سب کے سب لافانی، ازلی اور لامکانی تھے۔ ان میں یگانگت کی حد تک ہم آہنگی تھی، ورنہ ہر ایک اپنا اظہار جداگانہ کرسکتا تھا۔ اس نظریے نے تثلیث کے اقانیم کو ذات سے صفات میں بدل دیا۔ گویا پدر و فرزند ایک ہی ذات کے دو مظہر تھے۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۷۸)۔

۳۔ تیسرا نظریہ معربی اور یونانی چرچ کا تھا۔ جس کے مطابق لوگس میں الوہیت کی تمام صفات وراثتاً موجود تھیں۔ وہ کامل ازلی اور لاثانی تھا۔ تثلیث کے تمام اقانیم ہم رتبہ تھے۔ ان کے اجتماع سے الوہیت مکمل ہوتی تھی۔ ان کے اشتراک کا نام توحید رکھا گیا۔

قسطنطین نہ فلسفی تھا نہ تھیولوجین۔ وہ بنیادی طور پر ایک رومن جنرل تھا۔ اسے فلسفیانہ موشگافیوں، الٰہیاتی مباحث کی صحت اور علمِ کلام کی گہرائیوں سے زیادہ ملک کے امن و امان سے دلچسپی تھی۔ جب ان شدید اختلافات کے پیشِ نظر افہام و تفہیم کی توقع نہ رہ گئی تو رومن جنرل کا کردار ادا کرتے ہوئے اس نے رومن چرچ کے عقیدۂ تثلیث کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ عالمِ عیسائیت پر رومن جنرل نے رومن قوت کے ذریعے رومن عقیدہ مسلط کردیا۔ یہ حقیقت ہے کہ "شہنشاہ کا یہ فیصلہ پوری طرح چرچ آف روم کے اثرات اور دباؤ کا نتیجہ تھا"۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۷۱)۔

چرچ کا غلبہ: قسطنطین نے عقیدے کو قوت کے زور پر نافذ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ "وہ لوگ جو اس مقدس کونسل کے آسمانی فیصلے سے متفق نہ ہوں، جلاوطنی کے لیے فوراً تیار ہو جائیں"۔

(Gibbon E.; The Decline and Fall of Roman Empire, Vol II, p.356)

رومن چرچ اپنے رقیب کلیساؤں پر غالب ہوگیا۔ مخالفین کو سختی کے ساتھ کچلا گیا۔ غیر متفق بشپ معتوب ہوئے۔ آریوس جلاوطن ہوا جن مشکوک حالات میں اسکی موت واقع ہوئی اس سے شبہ ہوتا

ہے کہ اسے عمداً راہ سے ہٹایا گیا۔ قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا۔ قسطنطنیہ کی شاہراہوں پر مقتولین کی لاشوں کی نمائش کی گئی اور اس طرح رومن چرچ کے غلبے کی راہ ہموار کی گئی۔

چرچ کو جو قوت قسطنطین کے زمانے میں ملی تھی اس میں ہر روز اضافہ ہوتا گیا۔ جیسے جیسے سلطنتِ روما پر زوال آتا گیا، چرچ کا غلبہ اسی مناسبت سے بڑھتا گیا۔ چرچ کے مخالفین کو اس طرح ختم کیا گیا کہ اس کے خلاف ایک ہزار سال تک کوئی آواز اٹھانے والا نہ پیدا ہوسکا۔ روم کی تاریخی آزادیٔ گفتار یہاں آکر ناپید ہوگئی۔ ایک وقت آیا کہ چرچ اور سلطنت ایک دوسرے کے حریف ہوگئے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ سلطنت چرچ کی کنیز بن گئی۔ مغرب کے شہنشاہ چرچ کے بندۂ بے دام ہوئے۔ عہدِ وسطیٰ کے چرچ کے قبضے میں مغرب کا ہر شعبۂ حیات آگیا۔

آٹھویں صدی کے اواخر میں چرچ مغرب کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ وہ شہنشاہی عطا کرتا تھا اور چھین لیتا تھا۔ امن قائم کرتا اور امن کو برباد کرتا تھا۔ ملکوں کو تقسیم کرتا، ان پر حملوں کے پروانے جاری کرتا، سرکش شہنشاہوں کو قدموں میں جھکنے پر مجبور کرتا، قانون بناتا اور قانون کی دھجیاں اڑاتا تھا۔ مغرب چرچ کا قائم کردہ معاشرہ تھا۔ اگر وہاں کا معاشرتی سکوت کسی غیر عیسائی آواز سے ذرا بھی متاثر ہوتا تو چرچ مغرب کی ساری توانائیاں مجتمع کرکے اس کے خلاف صف آرا کردیتا تھا۔

فکر پر تسلّط : مغربی معاشرہ اپنے ابتدائی دور میں علم وفکر سے بے نیاز تھا۔ فیوڈل معاشرے میں علم کے میدان میں ترقی کے امکانات بہت کم تھے۔ 'اس دور میں مغربی معاشرے نے جو کچھ کیا وہ صرف ایشیا اور افریقہ کی نقالی تھا'۔ (cf. Christopher Hill; The Century of Revolution, p.76)

علم وفکر پر کلیسا کا تسلّط تھا۔ تاریخ نویسی صرف چرچ نے کی، جو اس کے اپنے نقطۂ نظر کی آئینہ دار تھی۔ فکر کا محور مذہب اور چرچ تھا۔ اس دور میں جس چیز کو فلسفہ کہا جاتا تھا وہ صرف الٰہیاتی مباحث (Theology) تھے۔ علوم سے مراد صرف کلیسا کی تعلیمات تھیں۔ ہر وہ علم جسکا سرچشمہ کلیسا نہ ہوتا ممنوع تھا۔ علوم پر چرچ کی اجارہ داری، نشاۃِ ثانیہ کے بعد بھی قائم رہی۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک مغرب کی تمام درسگاہیں، کالج اور یونیورسٹیاں چرچ کے زیرِ نگرانی رہیں۔ کوئی فرد کسی درسگاہ میں یا نجی طور پر چرچ کے لائسنس کے بغیر تعلیم نہیں دے سکتا تھا۔ (cf. Kenneth Neil Cameron; Humanity and Society, p.227)

کتابیں سختی کے ساتھ سنسر کی جاتی تھیں۔ سنسر شپ کا اختیار صرف چرچ کو تھا۔ [Christopher Hill; The Century of Revolution, p.76]۔ لوگوں کی فکر کا رخ چرچ متعین کرتا۔ وہ کیا سوچیں اور کیسے سوچیں، کسے اچھا کہیں اور کسے برا کہیں، یہ چرچ بتلاتا۔ ان حالات میں مغرب کا تعلیم یافتہ طبقہ، ذہنی اور فکری اعتبار سے چرچ کا نمائندہ تھا، جو غیر تعلیم یافتہ طبقے کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس تسلّط کا نتیجہ یہ تھا کہ پورے مغرب میں غیر کلیسائی فکر، کیتھولک علاقے میں پروٹسٹنٹ فکر اور پروٹسٹنٹ علاقے میں کیتھولک فکر کا وجود نہیں تھا۔

مغربی چرچ کی تقسیم: چرچ نے بڑی کاوشوں سے مغربی معاشرہ استوار کیا تھا۔ بڑی قربانیوں کے بعد مغربی خطے کو شمال اور مشرق کی جانب وسعت دی گئی تھی۔ ان میں فکری ہم آہنگی پیدا کی تھی۔ انہیں ایک صلیبی پرچم تلے مجتمع کیا تھا۔ انکی ہر میدان میں رہبری اور قیادت کی تھی۔ لیکن جب معاشرے نے چرچ کے قائم کردہ نظام کو ارتقائی تقاضوں کی تکمیل میں ممد نہ پایا تو اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ چرچ خود کو تنقید سے بالاتر تصور کرتا تھا۔ اس نے ان مطالبات اور مطالبات کرنے والوں کو سختی سے دبایا۔ اس سختی نے مذہبی اصلاح کی تحریکوں میں شدت پیدا کی۔

حقیقت یہ ہے کہ بدعنوانی چرچ کے ہر شعبے اور ہر طبقے میں پائی جاتی تھی۔ ان بدعنوانیوں کے پیشِ نظر مذہبی اصلاح سے زیادہ چرچ کی اصلاح پر زور دیا جانے لگا۔ جب چرچ نے اپنی اصلاح نہ کی تو مغرب میں ایک نیا پروٹسٹنٹ چرچ قائم ہوگیا، جس نے پاپا کے خطۂ اقتدار کو تقسیم کر ڈالا۔ اس تقسیم میں مختلف طبقوں مثلاً سرمایہ داروں، حکمرانوں، سیاستدانوں اور تاجروں کا بھی مفاد تھا کہ وہ اپنے اپنے میدانِ کار میں چرچ کی بالادستی اور گرفت سے نجات چاہتے تھے۔ ان طبقوں نے پروٹسٹنٹ چرچ کی پشت پناہی کی۔

نشاۃ ثانیہ (Renaissance) [چودہویں صدی عیسوی تا سترہویں صدی عیسوی] کے بعد مغربی معاشرے کا مطمحِ نظر تبدیل ہونے لگا۔ قومی نظریات ابھرنے لگے۔ قومی ریاستیں اور قومی چرچ قائم ہوئے۔ قدیم بین الاقوامی مسیحی تصور ختم ہونے لگا۔ یہی تصور تھا جس کے سبب عہدِ وسطیٰ میں مغرب کو مسیحی جمہوریہ مغرب (Western Republica Christiana) اور 'ہولی رومن ایمپائر' [cf. Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. II, p.341] کے نام دیے گئے اور اسی سبب سے مغرب کا ابتدائی قانون 'مسیحی قانون' (Christian Law) کہلاتا تھا۔ [cf. Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p.247]۔ اس تبدیلی نے چرچ کو سیاسی میدان سے خارج کر دیا۔

سائنس کی ترقی نے چرچ کو علم کے میدان سے بھی پسپا کر دیا۔ چرچ کا دائرۂ علم صرف بائبل کی حد تک سمٹ کر رہ گیا۔

چرچ نے معاشرے میں طبقاتی تفاوت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس نے خود بھی ایک استحصالی طبقے کی حیثیت اختیار کی۔ مظلوم طبقوں کو چرچ کے پروپیگنڈے کی بدولت یہ توقع تھی کہ چرچ کے اقتدار میں آنے کے بعد ان پر جبر و استبداد، اور استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا، لیکن غلاموں، کسانوں اور مزدوروں کے غول کے غول چرچ کے قبضے میں آئے تو بشپ یہ کہنے لگے کہ 'انکی آزادی کا زمانہ ابھی نہیں آیا، شائد یہ زمانہ صدیوں کے بعد آئے'۔

(cf. Gibbon E.; The Decline and Fall of Roman Empire, Bury J.B. edition, Vol. V, App. II by Bury, p. 526)

اب وہ اس مسئلے میں بائبل اور قدیم بزرگوں کے اقوال کا حوالہ دینے کی جگہ ارسطو، سسرو اور دیگر فلاسفہ کے حوالے سے یہ کہتے تھے کہ 'فطرت نے کچھ افراد کو حکمرانی کے لیے اور بقیہ کو فرمانبرداری کے لیے پیدا کیا ہے۔ جو لوگ حکمرانی نہ کر سکیں انہیں اطاعت کرنی چاہیئے'۔ (Dozy R.; Spanish Islam, p.225)۔

چرچ نے استحصالی نظام کو برقرار رکھا۔ اسکا جواز پیش کیا۔ خود بھی استحصال میں شریک ہوا۔ جب انیسویں صدی میں کارل مارکس اور اینگلز نے شدید طبقاتی جدّ وجہد شروع کی تو محنت کش طبقوں نے چرچ کو بھی اپنے دشمنوں میں شمار کیا۔ اس کی تعلیمات کو مکر وفریب قرار دیا اور اس سے بھی وہی سلوک کیا جو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور امرائے سلطنت سے روا رکھا۔

چرچ نے صدیوں تک فکرِ انسانی پر پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ نشاۃِ ثانیہ کے بعد آزادیِ فکر کے حامیوں نے چرچ پر شدید حملے کیے۔ پاسکل اور میکیاولی نے معاشرے کی تمام بدعنوانیوں کا ذمہ دار چرچ کو ٹھہرایا۔ چرچ کے عظیم ترین مفکّر تھامس اکوناس پر الزام عائد کیا کہ اس نے انسان کی آزادیٔ فکر کو بے معنی اور لغو بنا دیا ہے۔

(The Concise Encyclopedia of the Living Faiths; pp.156-157)

لاکس (Locks)، ہیوم (Hume)، والتاغ (Voltaire)، اور کانت (Kant) نے عقل وخرد کو کسوٹی بنا کر چرچ کے ازلی اقتدار پر اتنے سخت حملے کیے گویا اسے مٹا کر ہی دم لیں گے۔ دیگر مفکّرین نے مکاتبِ تشکیک قائم کیے، جن سے کیتھولک چرچ کے خلاف شکوک عام ہوئے۔

مور (Moore) اور ارسمس (Erusmus) نے چرچ کی ہر قدر پر کڑی تنقید کی۔ خانقاہی نظام، رہبانیت، تجرّد، تبرّکات کی پرستش، کلیسا، پوپ، عیسائی عقائد، غرضکہ سب ہی کچھ تنقید کی زد میں آیا۔ کلیسا کو یکسر تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ [Henry Pirenne; A History of Europe, p.542]۔ بالآخر ہابس (Hobbes) کے نظریات کے تحت سترہویں صدی میں چرچ کو سیاست سے جدا کیا گیا۔ (Christopher Hill; The Century of Revolution, p.181)۔

دوہرا نظامِ اقتدار

پوپ اور شہنشاہ

عالمِ عیسائیت کے بڑے چرچ اسکندریہ، انطاکیہ، قسطنطنیہ اور روم میں قائم تھے۔ اوّل الذکر تین کلیساؤں کے سربراہ اسقفِ اعظم (Patriarch) کہلاتے تھے۔ انکا تقرر شہنشاہِ روم کرتا تھا۔ جبکہ رومن چرچ کے سربراہ کو پوپ کہا جاتا تھا۔ اسکا تقرر انتخاب کے ذریعے خود چرچ آف روم کرتا تھا اور شہنشاہ اس تقرر کی رسمی منظوری عطا کرتا تھا۔ پوپ کو دیگر اساقفہ پر کوئی برتری حاصل نہیں تھی۔

پوپ کے اقتدار کی ابتداء : رومن تثلیث کے جبری نفاذ نے دیگر اساقفہ پر پوپ کو ایک برتری دلا دی کیونکہ اس کو منظور کروانے میں پوپ کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ [The Concise Encyclopedia of the Living Faiths, p.71]۔ تاہم ساتویں صدی کی ابتدا تک پوپ کا اقتدار برائے نام تھا، گو اسکا احترام بیحد تھا۔ جب گریگوری اعظم (۵۹۰ء تا ۶۰۴ء) پوپ ہوا، تو اس نے سیاسی اقتدار کے حصول کی جانب پہلا قدم بڑھایا۔ اس کے عہد میں اطالیہ پر لومبارڈوں نے حملہ کیا۔ شہنشاہ چونکہ شام اور ڈینیوب کی سرحدوں پر جنگوں میں الجھا ہوا تھا اور لومبارڈوں کی یلغار روکنے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے پوپ نے روم کے دفاع کی ذمہ داری سنبھالی اور اس سے بخوبی عہدہ برآ ہوا۔ گریگوری ایک زبردست منتظم تھا اور چرچ کا حصہ بننے سے قبل رومن ایمپائر کی سول سروسز کا رکن تھا۔ (cf. Toynbee A.J., A Study of History, Vol. VI, p.73)۔ اس نے نہ صرف چرچ کے نظم و نسق کو منظم کیا بلکہ چرچ میں ایک نئے عنصر کا اضافہ بھی کیا۔ یہ اضافہ راہبوں (Monks) کی چرچ میں شمولیت اور انکی خانقاہوں کا انضمام تھا۔ اس سے قبل راہبوں کی خانقاہیں نہ تو شیرازہ بند تھیں اور نہ ہی چرچ سے متعلق تھیں۔

راہب مخلص، دیندار اور تارک الدنیا لوگ تھے، جو انفرادی خانقاہوں میں گوشہ نشینی کی باعزت زندگی گزارتے تھے۔ انہیں معاشرے کے ہر طبقے میں وہ احترام اور تقدس میسر تھا جو کلیسا کے کارکنوں کو نصیب نہ تھا۔ ان کی شمولیت کے طفیل پوپ کو مذہبی کارکنوں کی ایک ایسی رضا کار فوج میسر آ گئی جو مالی اعتبار سے خود کفیل تھی، اور معاشرے میں ایک ممتاز مقام رکھتی تھی۔ گریگوری کے عہد میں ہی انگلستان نے رومن چرچ میں شمولیت اختیار کی۔ اس شمولیت نے پوپ کے حلقۂ اثر میں بڑی وسعت پیدا کی۔

آٹھویں صدی کی ابتدا میں (۷۱۶ء) جب مسلمان اسپین کو فتح کر رہے تھے، پوپ بونی فیس (Boniface) دریائے رائن (Rhine River) پار کے جرمنوں کو بھی رومن چرچ کا متبع بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس طرح، اس کے علاقے سے اگر اسپین کم ہوا تو اس کی کو شمال کی جانب وسعت نے پورا کر دیا۔ ان نئے عیسائیوں میں پوپ کا جو احترام تھا اسکی مثال روئے زمین پر نہ تھی۔ مغرب میں اس وقت جو عظمت پوپ کو میسر تھی وہ خود شہنشاہِ روم کو حاصل نہ تھی۔ عیسائیوں کے نزدیک شہنشاہ ایک فانی گناہگار تھا، اسکا حکم انسانی حکم تھا جبکہ پوپ خداوند کا نمائندہ تھا، اور اسکا حکم آسمانی حکم تھا۔ [cf. Warner Stark; The sociology of Religion, p.53]۔ حکمراں کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ چرچ کی حفاظت کرے اور پوپ کا کام یہ تھا کہ ان پر خدائی برکتیں نازل کرے۔(cf. Mourret F.; A History of the Catholic Church, p.374)

شہنشاہ کی ہمسری : آٹھویں صدی میں شہنشاہِ روم مسلمانوں سے مستقل شکست کھا رہا تھا۔ یہ شکستیں اس کے لیے باعثِ رسوائی تھیں، جبکہ پوپ بلا جنگ وجدال ان علاقوں پر اپنا اقتدار قائم رکھنے میں کامیاب تھا جنہوں نے کبھی رومن ایمپائر کا تسلّط برداشت نہیں کیا تھا۔ پوپ نے مغرب میں اعلیٰ ترین مقام حاصل کر لیا تھا اور اسے معاشرے میں ہمہ جہتی اختیار حاصل ہو چکا تھا۔(Michael Hill; The Sociology of Religion, p.54)۔

شہنشاہ کی اطاعت اب پوپ کے لیے موجبِ عار ہو چکی تھی۔ وہ رسمی برتری جو شہنشاہ کو پوپ پر حاصل تھی، اب جلد یا بدیر ختم ہونے والی تھی۔ جب ۷۲۶ء میں شہنشاہ 'لیو' سوم نے شبیہہ پرستی کی ممانعت کے احکامات جاری کیے، تو پوپ نے نہایت حقارت سے اسکے احکامات رد کر کے اس پر بدعت کا الزام لگایا، جبکہ دیگر اساقفہ نے حکم کی تعمیل کی ۔ [cf. Fuller; The Decisive Battles of Western World, p.241: & Toynbee A.J., A Study of History, Vol. II, p.430]۔

شہنشاہ کو بدعتی قرار دینے کے معنیٰ یہ تھے کہ پوپ نے شہنشاہ کو اپنے حلقۂ اقتدار سے بے دخل کر دیا تھا۔ شہنشاہ بے بس تھا۔ کڑوے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اب مغرب میں شہنشاہ کی جگہ پوپ نے لے لی۔

فوج : پوپ کے پاس روحانی تقدس، علاقہ، جائداد اور خزانہ سب کچھ تھا، لیکن مسلّح افواج نہیں تھیں، جس کی وجہ سے وہ شہنشاہ کی تادیبی کارروائی سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسری جانب ہسپانیہ کی جانب سے مسلمانوں کی پیش قدمی کے خطرے نے بھی فوج کی موجودگی کو ناگزیر بنا دیا۔ مغرب کے حکمراں بے دست و پا تھے۔ ان میں کسی طاقتور فوج کے اخراجات برداشت کرنے کی سکت نہیں تھی۔ بحرِ روم پر مسلمانوں کے قبضے نے مغرب کی اقتصادیات کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ معیشت کا دار و مدار زمین پر تھا۔ زمین بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی جو اس کے حکم سے فوجی خدمات کے عوض دی جاتی تھی۔ اس وقت تک ساری زمین اس طرح تقسیم ہو چکی تھی کہ بادشاہ کے پاس کسی فوجی خدمت کا معاوضہ ادا کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ان حالات میں پوپ نے فیصلہ کیا کہ بے بس حکمرانوں کو ہٹا کر کسی ایسے فرد کو مغرب کا حکمراں بنایا جائے جو معقول فوج قائم کر سکے۔ چنانچہ اس نے موروثی فرینکش بادشاہ کو معزول کر کے 'کارولن جئین' گھرانے کے

اقتدار کی بنیاد رکھی۔ اس طرح مغرب میں شہنشاہ کی جگہ عملاً پوپ نے لے لی اور مغرب کے حکمراں پوپ کے نمائندے ہو گئے۔

اس طرح آٹھویں صدی کے وسط سے مغرب میں دوہرا نظامِ اقتدار رائج ہوا۔ دونوں اقتدار نشاۃِ ثانیہ تک ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہے۔ اوّلاً ان متضاد قوّتوں میں کسی قدر توازن قائم رہا، لیکن جلد ہی ان میں شدید رسہ کشی ہونے لگی۔ کبھی کبھار شہنشاہ بھی پاپا کے اقتدار پر غالب آیا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو وہ شہنشاہیت ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی یا پھر اپنی بقا کے لیے شہنشاہیت کو اپنی پیٹھ پر پاپائیت کے کوڑے سہنے پڑے۔ (cf. Toynbee A.J.; Change and Habit, p.132)۔ یہ رسہ کشی اس وقت تک جاری رہی جب تک دونوں فریقین کے دائرۂ کار اور حدودِ اختیارات متعیّن نہ ہو گئے۔ تاہم پورے عہدِ وسطیٰ میں مغربی معاشرہ مکمل طور پر پوپ کی گرفت میں تھا اور کوئی حکمراں یا شہنشاہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں تھا۔ (حوالۂ بالا، صفحہ-۱۳۱)

پوپ اور مسیحی جمہوریہ مغرب: حالات جیسے جیسے پوپ کے قابو میں آتے گئے، اس کے عزائم ویسے ویسے بلند ہوتے گئے۔ مغربی بادشاہت کے قیام کا منصوبہ کامیاب ہو چکا تھا۔ اب پوپ نے اسے شہنشاہیت کا درجہ دیدیا۔ ۸۰۰ء کے کرسمس کے موقع پر پوپ 'لیو' نے شارلمین کے سر پر تاجِ شہنشاہی رکھا اور اس شہنشاہیت کا نام مسیحی جمہوریہ مغرب رکھا۔

اس نئی جمہوریہ کے پاس کوئی موثر انتظامی مشینری نہیں تھی۔ کلیسا نے اپنی تنظیم، سلطنت کے انتظامات سنبھالنے کے لیے مستعار دی۔ اس طرح مغربی ایمپائر، مغربی ایمپرر (Emperor)، مغربی انتظامیہ اور مغربی چرچ، سب کے سب پوپ کے تھے۔ اب سارے اختیارات پوپ کی ذات میں مجتمع تھے۔ وہ مغرب کا مقتدرِ اعلیٰ تھا۔ شہنشاہیت کا قیام پوپ کا عظیم کارنامہ تھا۔ یہ نئی شہنشاہیت تلوار کے بل پر نہیں بلکہ صرف پروپیگنڈے کے زور پر قائم ہوئی تھی۔

پوپ اور شہنشاہ: شارلمین کے عہد تک پوپ اور شہنشاہ کے مراسم نہایت خوشگوار رہے۔ شہنشاہ ملکی امور میں بڑی حد تک خودمختار رہا، لیکن اس کے جانشین اس خودمختاری کو قائم نہ رکھ سکے۔ وہ پوپ کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے۔ شارلمین کے تین بیٹے تھے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا 'لوئیس' شہنشاہ ہوا۔ جرمن دستور کے مطابق یہ تینوں سلطنت کے وارث تھے۔ سلطنت کو ان تینوں میں تقسیم ہونا چاہیے تھا، مگر رومن دستور اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ جانشینی کا مسئلہ نزاعی ہو گیا۔ دو متقابل گروہ بن گئے۔ ایک سلطنت کی تقسیم کے حق میں تھا، دوسرا مخالف۔ ان میں تقسیم کا خواہاں گروہ زیادہ طاقتور تھا۔ لوئیس کو تقسیم کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔ یہ فیصلہ پوپ کی مرضی کے خلاف تھا۔ ولی عہد لوتھر نے پوپ کی خدمت میں استغاثہ دائر کیا اور پوپ گریگوری چہارم ۸۳۳ء میں بذاتِ خود، ولی عہد کی افواج کے ہمراہ شہنشاہ کے خلاف نکلا۔ جنگ میں ولی عہد کو فتح ہوئی، جو حقیقتاً پوپ کی فتح تھی۔

(cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p.117)

پوپ نے شہنشاہ پر عالمِ عیسائیت کے امن کو برباد کرنے کے الزام میں کفارہ عائد کیا۔ اس موقع پر لوئیس جو خود شہنشاہ تھا اور عظیم شہنشاہ شارلیمین کا جانشین فرزند تھا، پوپ کے آگے محض ایک حقیر مجرم کی حیثیت رکھتا تھا۔ پاپائیت اور شہنشاہیت مغرب کی ایسی متضاد قوتیں جن میں توازن برقرار رہنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ ایک کی کمزوری دوسرے کی طاقت تھی۔ لہٰذا کشمکش ناگزیر تھی۔ لوئیس کے جانشینوں کو اپنی شہنشاہیت برقرار رکھنے کے لیے پوپ کی جنبشِ ابرو کا پابند ہونا پڑا۔

پوپ بحیثیت محتسب: ابھی شہنشاہیت کو قائم ہوئے صرف نصف صدی گزری تھی کہ پوپ 'نکولاس' (۸۵۸ء تا ۸۶۷ء) نے یہ دعویٰ کیا کہ پاپائی اقتدار کو شہنشاہی اقتدار پر وہی فوقیت حاصل ہے جو روح کو بدن پر ہے۔ (Warner Stark; The Sociology of Religion, p.54)۔ پوپ مقدس نائبِ خدا تھا اور شہنشاہ محض ایک گناہگار انسان۔ گناہگار کو سیدھے راستے پر گامزن رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ شہنشاہیت کی زمام پوپ کے مقدس ہاتھوں میں رہے۔ زمین پر نائبِ خدا کی حیثیت سے پوپ لوگوں کی ہدایت اور باز پرس کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتا تھا۔ ہر فرد خواہ بادشاہ ہو یا شہنشاہ، اس کے آگے جوابدہ تھا۔

گریگوری نے اگر منصف کے فرائض سر انجام دیتے ہوئے شہنشاہ لوئیس کو سزا دی تھی تو اسکے جانشینوں نے احتساب کے فرائض سنبھال لیے۔ پوپ نکولاس بے جھجھک اس راہ پر چلا۔ اور اسکی پیروی گریگوری ہفتم، الگزنڈر ثانی، اور انو سنٹ سوم و چہارم نے کی۔ جب مغرب پوری طرح پوپ کے تسلط میں آ گیا تو پوپ نکولاس نے کوشش کی کہ مشرقی کلیسا (یونان) کو بھی اپنی برتری تسلیم کرنے پر مجبور کر دے۔ قسطنطنیہ کے اسقفِ اعظم نے نکولاس کے احکام کی پرواہ نہ کی تو اس نے بے دریغ اسقفِ اعظم کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔

شہنشاہ کے جانشین کے تقرر کا حق: شہنشاہ لوئیس ثانی نے ۸۷۵ء میں وفات پائی۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنے ایک قریبی رشتہ دار 'کارلومان' (Carloman) کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ پاپائیت کو شہنشاہیت پر بالادستی کے اظہار کا ایک اور موقع میسر آیا۔ پوپ جان ہشتم (۸۷۲ء تا ۸۸۲ء) نے اس کی جانشینی کو مسترد کرتے ہوئے چارلس (Charles the Bald) کو روم طلب کر کے اس کی تاجپوشی کی۔

مغرب میں بادشاہت وراثتی نظام کے تحت تھی۔ بادشاہ کا بیٹا خودبخود بادشاہ ہو جاتا تھا۔ (حوالۂ بالا، صفحہ-۳۵)۔ لیکن پوپ نے شہنشاہ سے جانشین کے تقرر کا حق بھی چھین لیا۔ جانشینی ایک انتخابی کمیٹی کے ذمہ کی گئی، جس میں پوپ کے علاوہ متعدد بشپ اور علاقائی حکمراں شریک تھے۔

(cf. Henry Pirenne; A History of Europe, pp.455-456)

نویں صدی کا پوپ شہنشاہ گر تھا۔ اس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنا تک گناہ تھا۔ کسی فرینک حکمراں میں اتنی سکت نہ تھی کہ سرتابی کر سکے۔ اگرچہ پوپ کے پاس اپنی فوجی طاقت نہیں تھی لیکن اسکا اقتدار ہر جگہ سے افواج کو متحرک کر سکتا تھا۔ اگر کوئی سرکشی کرتا تو پوپ دیگر حکمرانوں کو اس کے خلاف کھڑا کر دیتا، اس لیے ہر حکمراں اس قسم کی حرکت کو خودکشی کے مترادف سمجھتا تھا۔

یہ کیفیت نویں صدی کے اختتام تک قائم رہی اور اس کے بعد شہنشاہیت کا ڈھونگ بھی ختم ہو گیا۔ نارمن حملوں، مسلم اسپین کے دباؤ، ہنگری کی شورشوں، ذاتی مفادات، سازشوں اور پوپ کی بالادستی نے شارلمین کی عظیم سلطنت کے تاروپُود ایک ہی صدی میں بکھیر دیے۔ اسکے جانشین خود کو شاہ کہتے یا شہنشاہ، سب کے سب بے دست و پا تھے۔ تاجِ شہنشاہی پوپ کے قبضے میں تھا، وہ جس کے سر پر تاج رکھ دے وہی شہنشاہ ہوتا تھا۔ وہ وقت بھی آیا کہ بعض من چلے پوپ کی رضا کا انتظار نہ کر سکے اور انہوں نے خود بڑھ کر پوپ کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کی تاج پوشی کرے۔ چنانچہ چارلس دی بالڈ کے بعد چارلس دی فیٹ (Charles the Fat)، ۸۸۱ء میں روم پر چڑھ دوڑا اور اس نے پوپ جان ہشتم کو مجبور کر دیا کہ وہ تاجِ شاہی اسکے سر پر رکھ دے۔

چارلس مذکور کے بعد شہنشاہیت کے دو دعویدار اٹھے۔ ان میں سے ہر ایک نے تاج کے لیے روم پر حملہ کیا اور تاجِ شاہی بزورِ شمشیر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۸۸۱ء تا ۸۹۶ء یہ تاج کم از کم پانچ حکمرانوں نے زیبِ سر کیا۔ چھٹے حکمران نے پوپ کی لاش پر سے گزر کر یہ تاج حاصل کیا۔ ۹۰۰ء میں شاہِ برگنڈی نے اس پر قبضہ کیا۔ پانچ سال بعد برنگر نے اسے شکست دیکر اسکی آنکھیں نکلوالیں۔ ۹۱۹ء میں یہی تاج جان دہم کے سر کی زینت بنا۔ اس طرح جیسے نویں صدی عیسوی میں پوپ نے شہنشاہوں کو رسوا کیا تھا، ویسے ہی دسویں صدی عیسوی میں شہنشاہیت کے دعویداروں نے پاپائیت کے قرضے چکائے۔

(حوالہ بالا صفحات ۱۲۰-۱۲۴)

پوپ سے بے نیاز شہنشاہ: دسویں صدی عیسوی میں مغرب میں سیکسن اقتدار قائم ہوا۔ ان کا حکمران 'اوتو' (Otto) شاہِ جرمنی کی حیثیت سے تاریخ میں ابھرا۔ جلد ہی اس نے جرمن اقتدار کو مستحکم کر لیا۔ ۹۵۵ء میں اس نے ہنگری کو شکست دی۔ اس کے نتیجے میں ہنگری بھی عیسائیت قبول کر کے مغربی مسیحی جمہوریہ کا رکن بن گیا۔ ۹۶۸ء میں پولینڈ اور ڈنمارک کو بھی عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ 'اوتو' نے سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر یہ منصوبہ تیار کیا کہ جنگجو قوموں کو عیسائی بنا کر سرحدی علاقوں میں آباد کیا جائے تاکہ ملک بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رہ سکے۔ اس مقصد کے لیے اسے پوپ سے رجوع کرنا پڑا تاہم وہ پوپ کے اندازِ تسلط سے پوری طرح آگاہ تھا لہٰذا محتاط رہا کہ پوپ اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکے۔

اوتو کے لیے یہ بے نیازی صرف اس لیے ممکن ہوئی کہ اس کا کوئی سیاسی حریف نہ تھا۔ ثانیاً اسکا اقتدار بھی پوپ کا رہینِ منت نہ تھا۔ نیز شہنشاہیت اور پوپ کی کشمکش نے اگر کارولن جیئن شہنشاہیت کو ناپید کر ڈالا تھا تو خود پوپ کا اقتدار بھی اتنا مجروح ہو چکا تھا کہ وہ اوتو کے خلاف بے بس تھا۔

اوتو نے پوپ کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی سلطنت میں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو کلیسا میں بشپ بنایا۔ انہیں بڑی بڑی جاگیریں دیکر اپنا ہمنوا بنایا۔ اس طرح اس نے چرچ کو سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اوتو کے ان اقدامات نے چرچ پر اسکی بالادستی قائم کر دی۔ پاپا کے احکامات پر اوتو کا حکم رائج ہوا۔

ایک موقع پر پوپ نے کیمبریا (Cambria) کے بشپ کو امنِ خداوندی کے نفاذ کا حکم دیا تو بشپ مذکور نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ امن عامہ کا تعلق امورِ مملکت سے ہے جس میں وہ (بشپ) مداخلت نہیں کر سکتا۔

اوتو کے مقابلہ میں پوپ بے بس تھا۔ اس پر برتری کا دعویٰ نہیں کر سکا۔ پوپ جان دوازدہم (John XII) اپنے باپ کے جوڑ توڑ کے طفیل صرف اٹھارہ سال کی عمر میں پوپ بن گیا تھا۔ اطالیہ میں اسکے طاقتور مخالفین موجود تھے۔ شہنشاہیت اور پاپائیت کے درمیان ہم آہنگی ختم ہو چکی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اطالوی حکمراں نے روم کا رخ کیا۔ پوپ کے لیے اوتو سے مدد طلب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے خود مدد کی درخواست کی اور جب معاملات طے ہو گئے تو پوپ نے شہنشاہ سے اپنی وفاداری کا اعلان کیا، اور اوتو کے سر پر تاجِ شاہی رکھا۔

(Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p.247)

پوپ جان کو جو توقعات اوتو سے تھیں جب وہ پوری نہیں ہوئیں تو اس نے اوتو کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ جس کے جواب میں اوتو روم پہنچا اور اس نے چرچ کونسل (Synod) کا اجلاس طلب کر کے نہ صرف پوپ کو برطرف کرا دیا بلکہ کونسل سے یہ حلف اٹھوایا کہ وہ کسی پوپ کا تقرر شہنشاہ کی توثیق کے بغیر نہیں کرے گی۔ اوتو نے اسی کونسل سے اپنے بیٹے 'لیو ہشتم' کو پوپ منتخب کروایا۔ اس جبری انتخاب نے کونسل میں بے چینی پیدا کی جسے رفع کرنے کے لیے اوتو کو کئی بار روم آنا پڑا۔ اوتو کے جانشینوں نے بھی اپنے بھائی بندوں کو پوپ بنوایا تاکہ اس کے اثر ورسوخ سے شہنشاہیت فائدہ اٹھا سکے۔

بحران کا اختتام : کلیسا پر شہنشاہ کی گرفت دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ اوتو کے جانشین شہنشاہیت کے وقار کو قائم نہیں رکھ سکے اور آخر کار پوپ کی برتری تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بحرانی دور میں کلیسا میں شدید تنزل پیدا ہو گیا تھا۔ پوپ کا انتخابی ادارہ حکومت کے زیر اثر آ چکا تھا۔ پوپ کے عہدے کی خرید و فروخت کے واقعات بھی ہوئے۔ تاجِ شہنشاہی بطور رشوت بھی پیش ہونے لگا۔ [cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p.165]۔ بیک وقت کئی کئی پوپ مقرر ہونے لگے۔ بااقتدار طبقے کی مرضی سے پوپ مسند نشین ہوتے، معزول ہوتے، قتل کیے جاتے، یا جیلوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں پوپ نے ایک زبردست تحریک چلائی جس کے ذریعے عام لوگوں کو مذہب کا والہ و شیدا بنایا گیا۔ چرچ کی ازسرِ نو تنظیم کی گئی۔ چرچ کے عہدیداروں کے لیے ضابطۂ اخلاق مرتب کیا گیا۔ ان کے لیے تجرد کو لازمی قرار دیا گیا۔ درویش صفت راہبوں کو چرچ کے بست و کشاد میں زیادہ سے زیادہ حصہ دیا گیا۔ یہ تحریک کلونِیَک (Cluniac) کہلائی اور اس تحریک کے نتیجے میں جو نیا طبقہ ابھرا اسے پاپائی (Papist) کہا گیا۔ اس تحریک نے پوپ اور اس کے ادارے کے مذہبی وقار کو بحال کر دیا۔

پوپ کے اقتدار کی بحالی : اوتو نے شہنشاہیت کو مقتدر کرنے کے لیے چرچ کو اپنے تحت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس اقتدار کو مستقل کرنے کے لیے اس نے پورے اطالیہ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا، مگر جنوب میں عربوں اور

بازنطین کی موجودگی سدِ راہ ثابت ہوئی۔ اوتو ثانی نے عربوں کو بیدخل کرنے کے لیے اقدام کیا، لیکن ۹۸۲ء میں روزانو (Rossano) کے مقام پر اس نے ایسی تباہ کن شکست کھائی کہ پھر کبھی ایسا منصوبہ بنانے کی جرأت نہ کر سکا۔ اگر عرب نہ ہوتے تو شاید مغرب کی تاریخ سے پوپ کے اقتدار کا وجود ختم ہو جاتا۔ اس شکست نے شہنشاہیت کے وقار کو سخت نقصان پہنچایا اور پوپ کے وقار کو بلند کیا۔

سسلی پر نارمن حکمرانوں نے قبضہ کیا تو سسلی کے قدیم حکمراں گھرانے نے پوپ کی خدمت میں اپنے حقِ حکومت کا دعویٰ کیا۔ پوپ 'لیو نہم' نے ۱۰۵۳ء میں جرمن فوجوں کو لیکر سسلی کے نارمن حکمرانوں پر چڑھائی کی اور شکست کھائی۔ سسلی کے معاملے میں مداخلت نے پوپ کے لیے ان علاقوں میں مداخلت کی راہ ہموار کر دی جو اسکے حلقۂ اقتدار سے باہر تھے۔ ۱۰۵۹ء میں پوپ نے ان علاقوں کی تقسیم کی جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، مثلاً رابرٹ گسکارٹ کو اپولیا، کلابریا اور سسلی کا علاقہ بخشا۔

جنگِ مسند نشینی: پوپ کے انتخاب کی توثیق کا حق شہنشاہ کو قدیم رومن دور سے حاصل تھا۔ مغربی شہنشاہیت کے قیام کے بعد اس حق کو اوتو کے سوا اور کوئی شہنشاہ استعمال نہ کر سکا تھا۔ ہنری کے دور میں چرچ کی ساکھ بحال ہو چکی تھی لیکن پوپ کا انتخاب سیاسی دباؤ سے آزاد نہیں ہو سکا تھا۔ شہنشاہ چاہتا تھا کہ اسے پوپ کے تقرر اور برطرفی کے اختیارات حاصل ہوں تاکہ پوپ کو اس کے خلاف کارروائی کی جرأت نہ ہو سکے۔ جبکہ پوپ کے نزدیک شہنشاہ کو اس عہدے پر تقرر کرنے یا تقرری کی توثیق کرنے کا کوئی حق نہ تھا، بلکہ پوپ کو یہ حق حاصل تھا کہ شہنشاہ کا تقرر کرے اور اسکی برطرفی عمل میں لائے۔

اس اصول کو منوانے کے لیے شہنشاہ اور پوپ کے درمیان ایک طویل جنگ ہوئی، جسے جنگِ مسند نشینی کہا جاتا ہے۔ پوپ نے ۱۰۵۹ء میں رچرد اور رابرٹ کو جو بیرونی علاقے بخشے تھے، اسکا مقصد یہ تھا کہ بوقتِ ضرورت ان علاقوں سے فرانس کے شہنشاہ ہنری کے خلاف مدد میسر آ سکے۔

ہنری نے چرچ کونسل سے پوپ کو برطرف کر دیا۔ یکے بعد دیگرے کئی پوپ منتخب کروائے۔ جب اس نے نکولاس ثانی کو پوپ منتخب کروایا تو اس پوپ کا ضمیر اس جانبدارانہ انتخاب سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے روم میں شاہی دباؤ سے آزاد از سرِ نو انتخاب کروایا۔ اس عمل کے باعث اسے زبردست اخلاقی تائید حاصل ہوئی۔ اس نے چرچ کی نئی پالیسی مرتب کی، اور چرچ کو ہر قسم کے سیاسی دباؤ سے آزاد کروانے کا فیصلہ کیا۔ پوپ کے انتخاب کا حق خفیہ رائے شماری کے ذریعے صرف کالج آف کارڈینلز (College of Cardinals) کے لیے مختص ہوا۔ آئینِ کلیسا میں بھی ضروری دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

ان اقدامات نے شہنشاہ کے لیے گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ پوپ کے انتخاب پر اثر انداز ہو سکے۔ چنانچہ نکولاس کے بعد جو انتخابات ہوئے وہ سیاسی دباؤ سے آزاد تھے۔ نکولاس کے بعد الیگزنڈر اور اس کے بعد گریگوری ہفتم نے بحیثیتِ پوپ تختِ پیٹر کو زینت بخشی تو گریگوری اور شہنشاہ ہنری کے درمیان گویا اعلانِ جنگ ہو گیا۔ گریگوری نے سختی کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا جو یا تو جنگ پر منتج ہو یا پھر شہنشاہ کو پوپ کی بالادستی تسلیم کرنے پر مجبور کرے۔

شہنشاہ سے پوپ کے تقرر کا اختیار چھن چکا تھا، لیکن بشپ کے تقرر کا اختیار اسی کے ہاتھ میں تھا۔ گریگوری بشپ کے تقرر کا اختیار بھی شہنشاہ سے واپس لینا چاہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں بشپ کی وفاداریاں شہنشاہ سے پوپ کی طرف منتقل ہو جاتیں۔ ہنری اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ گریگوری کو بھی اس حق کی منتقلی کے اثرات و نتائج کا پورا علم تھا، لیکن اسے شہنشاہ کی قوت و ضعف سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے صرف چرچ کا مفاد عزیز تھا۔ وہ ایک طاقتور بین الاقوامی پاپائیت کے قیام کا خواہاں تھا۔ [(cf. Michel Hill; The Sociology of Religion, p.55)]۔ اس کی اسی پالیسی کی بدولت اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے پوپ کی عظمت کی خاطر ریاست کو قربان کر ڈالا۔

گریگوری نے کلیسا کے کارکن حکومت سے واپس لے لیے، جس کے نتیجے میں شہنشاہ کی انتظامیہ مفلوج ہونے لگی۔ ہنری کھل کر پوپ کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ خود اس کے امراء اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔ اس کے لیے صرف یہی چارۂ کار رہ گیا تھا کہ چرچ کے اندر پوپ کے مخالفین سے کام لے۔ چنانچہ ملکی معاملات استوار کرنے کے بعد اس نے ایسے بشپوں کو وارم (Worm) میں جمع کیا، جو شہنشاہ کا دم بھرتے تھے اور پوپ سے مطمئن نہیں تھے۔ ۲۴ جنوری ۱۰۷۶ء کو اس نے انہیں یہ اعلان کرنے پر اکسایا کہ گریگوری پوپ کے منصب کا اہل نہیں تھا۔

شہنشاہ پوپ کے قدموں میں: بیس سال پہلے اسی طرح ایک پوپ برطرف کیا جا چکا تھا، مگر اب حالات شہنشاہ کے موافق نہیں تھے۔ پوپ شہنشاہ کو چرچ کا مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے جوابی کارروائی کے طور پر شہنشاہ کو مذہب سے خارج (Ex-Communiate) کرنے کا فرمان جاری کیا، اور اعلان کیا کہ ہنری چونکہ اب کرسچین نہیں رہ گیا تھا اس لیے وہ تمام افراد اور قوتیں جو ہنری سے وفاداری کی پابند تھیں، اب اپنے حلف اور ہنری کے اتباع سے آزاد تھیں۔

پوپ کے اعلان نے پورے ملک میں بے چینی پیدا کر دی، اور ایک عام بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ان حالات نے ہنری کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک مجرم کی حیثیت سے خود کو پوپ کے سامنے پیش کر کے معافی طلب کرے۔ ۲۸ جنوری ۱۰۷۷ء کو ہنری نے عاجزی کے ساتھ پوپ سے معافی طلب کی۔ (cf. Warner Stark; The Sociology of Religion, pp. 58-59) پوپ نے شہنشاہ کو معاف کر دیا، لیکن یہ حق بھی تسلیم کرا لیا کہ پوپ حسب ضرورت شہنشاہ اور دیگر حکمرانوں کے معاملات میں مداخلت کر سکتا ہے۔

بعض وجوہات کی بنا پر امرائے سلطنت ہنری کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے ایک اور شخص 'رودولف' (Rodolph) کو تختِ شاہی کے لیے پیش کر دیا۔ جب ہنری نے محسوس کیا کہ بے عزتی اور جبہہ سائی کے باوجود سلطنت جا رہی ہے تو اس نے پوپ کے خلاف دوبارہ کارروائی کا فیصلہ کیا اور ایک اور چرچ کونسل (Synod) کے ذریعے پوپ کو بے دخل کر کے راوینا (Ravenna) کے آرچ بشپ کو پوپ

منتخب کرادیا۔ جواب میں پوپ نے دوسرے سخت فتوے کے ذریعے ہنری کو ایک بار پھر مذہب سے خارج (Ex-Communulate) کردیا۔ ہنری نے اپنے حریف 'رودولف' کو شکست دے کر روم کا رخ کیا۔

شاہی افواج اس سے پہلے کبھی پوپ کو زیر کرنے میں ناکام نہیں ہوئی تھیں، مگر اس بار شارلمین کا جانشین، جرمن افواج کے ساتھ، اپنے ماتھے پر ناکامی کا ٹیکہ لگانے کے لیے روم میں داخل ہوا تھا۔ گریگوری قلعہ بند ہوگیا جو ناقابلِ تسخیر ثابت ہوا۔ اسی درمیان ایک اور شخص نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ نیز سسلی کی رومن افواج نے روم کی جانب پیش قدمی شروع کردی۔ ہنری بسرعت مراجعت پر مجبور ہوا۔ پوپ نے حالات کے پیشِ نظر روم کی سکونت ترک کرکے سسلی میں پناہ گزینی اختیار کی اور وہیں انتقال کیا۔ گریگوری جب تک زندہ رہا، عوام اسی کو پوپ تسلیم کرتے رہے۔ شہنشاہ کے مقرّر کردہ پوپ کو محض ایک نام نہاد پوپ کی حیثیت حاصل رہی۔

اب دو پوپ تھے۔ ایک وہ پوپ تھا جسے کلیسا کے کارڈینل کالج نے چنا تھا، اور دوسرا وہ تھا جسے شہنشاہ کے خیر خواہ بشپ نے منتخب کیا تھا۔ شاہی پوپ روم میں متمکّن تھا جبکہ کلیسا کا آئینی پوپ خانہ بدوش تھا۔ گریگوری کے بعد پوپ اربن دوم (Urban II) خانہ بدوش پوپ بنا جسکی ایک آواز پر پورا یورپ حروبِ صلیبی کے لیے ایشیا پر چڑھ دوڑا تھا۔

پوپ اگر ملک بدر ہوا تو شہنشاہ بھی چین سے نہ بیٹھ سکا۔ بغاوتوں، سرکشیوں اور خانہ جنگیوں نے اسے بھی خانہ خراب ہی رکھا۔ خود اسکے بیٹوں نے اسکے خلاف علم بغاوت بلند کیا، جن سے اسے لڑنا پڑا۔ آخری ایام میں اسے بھی ملک بدر ہوکر غریب الوطنی میں جان دینی پڑی۔

ہنری کے انتقال کے بعد بھی نام نہاد پوپ منتخب ہوتے رہے۔ لیکن حروبِ صلیبی کی ابتدائی کامیابیوں نے ۱۱۲۲ء میں یہ اصول تسلیم کروالیا کہ پوپ کو صرف کارڈینل کالج ہی منتخب کرے گا۔ شہنشاہ کو پوپ کے حقِ انتخاب سے دستبردار ہونا پڑا۔ یہی وہ تاریخ ہے جب مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

نئی کشمکش: پوپ اور شہنشاہ کی کشمکش بارہویں صدی میں پھر سے شروع ہوئی۔ تاجِ شاہی اب بھی پوپ کے اختیار میں تھا۔ کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ پوپ سے اسکا مطالبہ کرتا۔ ہاں اگر منتخب شہنشاہ پوپ کے معیار کا نہ ہوتا تو پوپ تاجِ شہنشاہی عطا کرنے سے انکار کرسکتا تھا۔ اس طرح اسکا انتخاب ہی کالعدم ہو جاتا تھا۔ پوپ کے حقِ تاج بخشی سے کسی کو انکار نہ تھا جبکہ شہنشاہ یہ چاہتا تھا کہ پوپ کے تقرر کا حق اسے ملنا چاہیے۔ ہنری کی ناکامی نے شہنشاہ کو اس حق سے محروم نہیں کیا تھا۔

جرمنی کے فریڈرک باربروسہ نے اقتدار میں آنے کے بعد توسیع سلطنت کے لیے ہر شے کا بے دریغ استعمال کیا۔ اس کے سر میں قدیم رومن ایمپرروں، سیزر اور آگسٹس کا ہمسر بننے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ اس نے اپنے مخالفین کی قوت توڑی۔ امراء کے مقابلہ میں طبقۂ اشرافیہ (Nobles) کو ابھارا۔ انہیں سیاسی آلۂ کار بنایا۔ روم پر قبضہ کرنے کے لیے شمالی اطالیہ کی جنگجو قوم لومبارت کو شکست دی۔ سرمایہ دار طبقہ پوپ کی حمایت کے طفیل، شہنشاہ سے آزاد تھا۔ فریڈرک نے اس طبقے کو بے دردی سے کچلا۔ ان کے شہر کے شہر تباہ کرڈالے۔

روم پہنچ کر فریڈرک نے بزورِ شمشیر پوپ سے تاجِ شاہی حاصل کیا۔ ۱۱۵۵ء میں شہنشاہ کی واپسی کے بعد اطالیہ میں بغاوت ہوگئی، جسے شہنشاہ نے بے دردی سے کچل دیا۔

پوپ 'ادرینَ' (Adrian) کے بعد کارڈینل کالج کسی ایک پوپ کے انتخاب پر متفق نہ ہوسکا۔ دو افراد 'الیگزنڈر سوم' اور 'وکٹر سوم' پاپائیت کے دعویدار تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مردود قرار دیا۔ شہنشاہ نے مذہبی اجتماع (Synod) طلب کیا جس میں 'وکٹر' پوپ منتخب ہوا۔ گویا شہنشاہ کو پوپ کے انتخاب کی توثیق کا حق مل گیا۔ لیکن انگلستان اور فرانس نے شہنشاہ کی اپیلوں کے باوجود، وکٹر کو پوپ تسلیم نہیں کیا۔ وکٹر کے بعد شہنشاہ نے پاسکل سوم کو پوپ بنوایا، اور اس طرح اپنی ہٹ کو طول دیتا رہا۔ 'پوپ الگزنڈر' فرار ہو کر فرانس پہنچا۔ اس کے حامیوں نے ۱۱۷۴ء میں شہنشاہ کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اور آخر مئی ۱۱۷۶ء میں ایک گھمسان کی جنگ کے بعد شہنشاہ کو عبرتناک شکست دی۔ اس طرح ایک بار پھر پاپائیت نے شہنشاہیت کو خاک میں ملا دیا۔ الیگزنڈر کو پوپ تسلیم کرلیا گیا، اور شہنشاہ فریڈرک نے اس کے سامنے دوزانو ہو کر اسکی قدم بوسی کی۔ بے عزتی اور ناکامی کا داغ دھونے کے لیے اس نے تیسری صلیبی جنگ میں حصہ لیا اور ۱۱۹۵ء میں گھوڑے سے گر کر جان دی۔ اسکا رومن ایمپائر کی ازسرِنو تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر ہی رہ گیا۔

پوپ کا مکمّل تسلّط: آٹھویں صدی عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی کے اختتام تک پوپ نے ہر شہنشاہ کو تاج پہنایا اور اسی نے ہر شہنشاہیت کو پارہ پارہ بھی کیا۔ تاہم پوپ کی اپنی ریاست اور ''شہنشاہیتِ کلیسا'' بلا شرکتِ غیرے قائم رہی۔ تیرہویں صدی عیسوی سے پوپ مغرب کی مقتدر ترین شخصیت بن گیا۔ اب سارے بشپ پوپ کے وفادار تھے۔ کوئی نیا مذہبی سلسلہ (Order) پوپ کی اجازت کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ تمام اہم معاملات کے فیصلے پوپ کی عدالت کرتی تھی۔ اس کے نمائندے پورے ملک میں نگرانی کرتے تھے کہ پوپ کے احکام کی کماحقہٗ تعمیل کی جارہی ہے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں الٰہیات کو عقل و خرد کی بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ جس کی روشنی میں مذہبی عقیدے میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ بندہ، خدا سے براہِ راست تعلق قائم کرسکتا تھا، لیکن اب عقیدہ یہ بنا کہ راست تعلق قائم نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے پوپ کا رابطہ یا توسط ضروری ہے۔ لوگوں نے راست کوشش ختم کردی۔ نجات حاصل کرنے کے لیے پوپ کا وسیلہ لازمی ہوگیا۔

(for theological development, see Warner Stark; The Sociology of Religion, pp.60-88)

اس تبدیلی نے پوپ کو روحوں کا آقا بنادیا۔ روح کی نجات کے لیے، ہر فرد کو خود کو اسکی خدمت میں پیش کرنا لازمی ہوگیا۔ یوں مغرب کا ہر فرد اور اسکی زندگی کا ہر شعبہ پوپ کے تابع ہوگیا۔ شادی بیاہ ہو یا موت و حیات، سیاسی جرائم ہوں کہ تجارتی بددیانتی، ہر مقدمہ پوپ کی عدالت میں پیش ہوتا تھا۔ اس طرح پورا معاشرہ

پوپ کے مکمل تسلّط میں آ گیا۔ علم وفکر، تحریر وتقریر، تالیف وتصنیف، درس وتدریس، تحقیق وتدوین، فقہ اور فلسفہ، ہر شعبہ پوپ کی پالیسی پر گامزن ہوا۔

پوپ کی مخالفت کا نتیجہ : شہنشاہیت پر فتح کے بعد پوپ کے اقتدار کا کسی شعبے میں کوئی مدِ مقابل نہیں رہ گیا۔ اسے اگر کسی مقاومت کا سامنا کرنا پڑا تو صرف چرچ کی اندرونی کشمکش تھی۔ اس اندرونی کشمکش کو 'بدعت' کا نام دیا گیا۔ صدیوں تک رومن کیتھولک دنیا میں ایمان وعقائد میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مغرب کی فلسفے سے بیگانگی تھی۔ اس کے علم کی انتہا کلیسا تھی۔ لیکن جب مغربی معاشرے کا تعلق گردوپیش کے معاشروں سے قائم ہوا، تو بیرونی اثرات نے تعلیم یافتہ طبقے میں بے چینی پیدا کی۔ نامعلوم ذرائع سے شمالی اطالیہ میں مانکیت کے اثرات پہنچنے لگے۔ وہاں سے فرانس اور اسکے بعد جرمنی پہنچے۔ ان اثرات کا اظہار اوّلاً فرانس کے علاقوں 'طولوس' اور 'البی' میں ہوا۔ اس مقام البی کی مناسبت سے ایک فرقہ البی جینسس (Albigensis) ابھرا۔ ان لوگوں کو کتھارس (Cathars) بھی کہا گیا۔ جہاں یہ لوگ نیکی کی تلقین کرتے، وہیں چرچ کی مخالفت اور پوپ سے دشمنی کی ترغیب بھی دیتے۔ ان کا یہ جرم اس قدر شدید متصوّر ہوا کہ پوپ انّوسنت سوم نے ان کے خلاف بھی 'جنگِ صلیبی' (Crusade) کی اپیل کی۔

جبر واستبداد کے ذریعے اس فرقے کو نابود تو کر دیا گیا لیکن اس کے نظریات رہ رہ کر کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتے رہے۔ اس کے بعد جتنے فرقے بدعتی قرار دیے گئے، مثلاً 'اپوستولکس' (Apostolics)، 'برادرز آف دی فری اسپرٹ' (Brothers of the Free Spirit)، 'بگارڈ' (Begard)، وغیرہ، سب میں کتھاری تصوّرات ونظریات شدّت کے ساتھ موجود تھے۔ کلیسا کی نظر میں بدعتی کا وجود کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ آسمانی حکومت کے غدّار تھے۔ روح کی آلودگی کے بعد جسم کا ختم کر دینا ضروری سمجھا گیا، اور جسم کو تباہ کرنے کی ذمہ داری حکومت کو سونپی گئی۔

روگردانی کی سزا : پوپ گریگوری نہم نے ۱۲۳۳ء میں چرچ کی پولیس فورس قائم کی۔ اس کی رسائی پورے عالمِ عیسائیت میں تھی اور اسکا اہم ترین فریضہ بدعتیوں کی تفتیش تھا۔ بدعتی صرف وہی نہیں تھا جو کج عقیدہ ہو بلکہ وہ بھی تھا جو پوپ کا ہمنوا نہ ہو۔

سسلی کے نارمن بادشاہ فریدرک ثانی کو پوپ سے عقیدت نہیں تھی۔ اس کی بڑھتی ہوئی قوت پوپ کے لیے خطرہ بن گئی اور پوپ نے اسے خطرناک دشمن قرار دیا۔ فریدرک نے پوپ کی پرواہ کیے بغیر اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ اطالیہ پر قبضے اور آئینی حکمرانی کے لیے پوپ کا اعلان ضروری تھا، پس اس نے شہنشاہی کا تاج وصول کرنے کے لیے پوپ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کیا، لیکن پوپ سے گریزاں ہی رہا۔ پوپ ہنوریس سوم نے تو تحمل سے کام لیا لیکن جب اسکی جگہ گریگوری نہم پوپ ہوا تو اس نے فریدرک سے حروبِ صلیبیہ میں حصہ لینے کا مطالبہ کیا۔ فریدرک جنگ میں حصہ لینے کے لیے روانہ تو ہوا مگر راستے ہی سے لوٹ آیا۔ پوپ نے اس پر بے دینی کا الزام لگا کر اسے عیسائیت سے خارج کر دیا۔ فریدرک نے حالات درست کرنے کے لیے ارضِ مقدّس

(فلسطین) کا رخ کیا اور سلطان ملک الکامل سے معاہدہ کر کے بلا کشت و خون ۱۲۲۶ء میں یروشلم میں داخل ہوا۔ لیکن پوپ کے طرزِ عمل میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ پوپ کا فتویٰ ہر اس قریے اور ہر اس شہر میں مشتہر کیا گیا جہاں جہاں فریدرک پہنچا۔

فریدرک کی عبادتوں کو مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کا سبب ٹھہرایا گیا۔ یروشلم میں فریدرک کو ایک بھی پادری میسر نہیں آیا جو اس کے سر پر یروشلم کی حکومت کا تاج رکھتا۔ اس کے عتاب میں پوپ نے لومباردوں سے سسلی پر حملہ کروایا۔ (cf. Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, pp.288-290)۔ فریدرک بسرعت لوٹا تاکہ پوپ کے اقدام کا مقابلہ کر سکے۔ آخر ۲۸ اگست ۱۲۳۰ء کو معاہدۂ صلح ترتیب پایا اور شہنشاہ کو پوپ کے آگے جھکنا پڑا، تب کہیں جا کر اسکی شہنشاہیت کی توثیق ہوئی۔ اس کے بعد فریدرک نے حملہ آور لومباردوں کی خبر لی۔ آہستہ آہستہ اس نے اطالیہ کو سرنگوں کرلیا۔ یہاں تک کہ سلطنتِ کلیسا بھی نرغے میں آ گئی۔ اس مرحلے پر پوپ نے ایک بار پھر فریدرک کو بے دین قرار دیکر اسے عیسائیت سے خارج کر دیا، لیکن موت نے پوپ کو مہلتِ انتقام نہیں دی۔

نئے پوپ انوسنت چہارم نے شہنشاہ کے مقدمے کو چرچ کونسل کے سامنے پیش کیا، جس نے نہ صرف فریدرک، بلکہ اس کے حالی موالی سب ہی کو، بے دینی کے الزام میں عیسائیت سے خارج کر دیا۔ فریدرک نے بہت ہاتھ پیر مارے، دیگر شہنشاہوں کی طرح چرچ کونسل (Cynod) کے ذریعے پوپ کو معزول کرنے کی بھی کوشش کی مگر پوپ کو شکست دینا اسکے بھی مقدر میں نہیں تھا۔ خود پوپ نے اطالوی قوتیں مجتمع کر کے ۱۳ دسمبر ۱۲۵۰ء کو فریدرک کو عبرتناک شکست دی، جسکے کچھ ہی عرصے کے بعد فریدرک راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ پوپ نے اسکی سلطنت فرانس کو بخش دی۔ (cf. Henry Pirenne; A History of Europe, pp.310-319)۔

اقلیت کا عدم وجود: پوپ اپنے روحانی خطے میں کسی غیر عیسائی اقلیت کو بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ساحل بالٹک پر ایک بت پرست قوم پرشین (Prussian) بستی تھی۔ یہاں چرچ کی تبلیغی کوششیں ناکام ہوئیں تو انہیں دشمنِ کرائسٹ اور دشمنِ دین قرار دے دیا گیا، حالانکہ وہ غریب ان دونوں الفاظ سے بھی ناواقف تھے۔ بس پھر کیا تھا، ۱۲۲۶ء میں ہنگری اور جرمنی کے تیوٹونک نائٹ (Teutonic Knights) (مذہبی جنگجو طبقہ جسے چرچ نے مقدس جنگوں کے لیے قائم کیا تھا)، اپنے بھاری اسلحہ کے ساتھ پرشیا پر ٹوٹ پڑے۔ پرشیا والے ٹہنیوں کی ڈھالوں اور کمانوں کے ساتھ ان کا کیسے مقابلہ کرتے۔ دیکھتے دیکھتے پوری قوم صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی، اور ان کی سرزمین پر کلیسائی فاتحین کی سلطنتیں قائم ہو گئیں، جو ہنسا (Hansa) اسٹیٹس کہلائیں، جن کی آئینی حیثیت کی توثیق پوپ نے کی۔ (حوالہ بالا صفحہ-۳۲۹)

بیرونی حملے کے خطرے کے پیشِ نظر مفتوحہ علاقوں کو ہر ایسے عنصر سے پاک کر دیا جاتا تھا جس کے بارے میں یہ امکان ہو سکتا تھا کہ دشمن کو اس سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ دشمن سلطنت کا نام و نشان مٹا دینا، اس کے تمام اداروں کو برباد کر ڈالنا، اسکی زبان اور مذہب کو ختم کر کے اپنی زبان اور مذہب کو رائج کر دینا، یہ طرزِ عمل مغرب

کا وطیرہ رہا ہے۔ (حوالۂ بالا، صفحہ-۳۳۱)، اور پوپ نے اس سے کوئی اعراض تک نہیں کیا۔ یہ عمل یونان نے کریت کے ساتھ کیا، روم نے قرطاجنہ کے ساتھ کیا، رومیوں نے یروشلم کے یہودیوں کے ساتھ کیا، صلیبیوں نے بیت المقدس کے مسلمانوں کے ساتھ کیا، پوپ نے کتھارسوں کے ساتھ کیا، جرمنوں نے پولینڈ، بالٹک اور روس کے صوبوں کے ساتھ کیا، اور ہسپانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ بیرونِ یورپ، امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا میں یہ عمل جاری وساری ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس عمل پر پوپ نے بھی ہمیشہ مہرِ توثیق ثبت کی ہے۔

پوپ کی سیاست سے پسپائی : فریدرک کی موت کے بعد پوپ اور شہنشاہ کی کشمکش کا باب ختم ہو گیا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں مغرب عہدِ وسطیٰ کی آخری منازل میں تھا، اور کچھ ہی عرصے کے بعد نشاۃِ ثانیہ کے دور میں داخل ہونے والا تھا۔ انگلستان میں 'میگنا کارٹا' نے پارلیمنٹ قائم کردی تھی۔ فرانس میں پارلیمان تو نہ تھی، تاہم بادشاہ نے عوامی مفاد و حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر رکھی تھی۔ قومی سلطنتیں قائم ہونے لگی تھیں۔ اسی دور میں انگلستان اور فرانس میں جنگ چھڑی۔ اخراجات پورے کرنے کے لیے ہر ممکن ذریعۂ آمدنی پر دباؤ بڑھا، یہاں تک کہ دونوں ممالک نے چارلس مارتل کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، اپنے اپنے علاقائی چرچوں کی جائدادوں پر ٹیکس عائد کیے۔ پوپ بونی فیس نے فوراً اس اقدام کے خلاف حکمِ امتناعی جاری کیا جو (The Bull Clericis Loicos) مجریہ ۲۵ فروری ۱۲۹۶ء کہلاتا ہے۔ اس میں سختی کے ساتھ یہ ممانعت کی گئی تھی کہ کسی حکمراں کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ پوپ کی منظوری کے بغیر کلیسا کی مملوکہ جائدادوں سے کوئی ٹیکس وصول کرے، اور ایسے تمام احکامات کو کالعدم قرار دیا، جن کے تحت یہ ٹیکس وصول کیے جارہے تھے، نیز یہ دھمکی بھی دی کہ ایسے افعال کے مرتکب شخص یا اشخاص کو عیسائیت سے نکال باہر کیا جائے گا۔

اس صدی سے قبل پوپ کا ہر حکم قابلِ تعظیم تھا مگر اب پوپ کا حکم قومی مفاد کی میزان میں تولا جانے لگا۔ دونوں قوموں کو اپنی اپنی سلامتی کا مسئلہ درپیش تھا۔ دونوں ممالک نے پوپ کے حکم کو عوام کے سامنے ان کے فیصلے کے لیے پیش کر دیا۔ اب اگر وہ پوپ کے فیصلے کی تائید کرتے تو اپنے اپنے ملک وقوم کو نقصان پہنچاتے۔ دونوں ممالک کے عوام نے پوپ کے اس فیصلے کو اپنے حق میں ناانصافی تصور کیا۔

انگلش پارلیمنٹ نے اس پاپائی بل کی سختی سے مخالفت کی اور 'اڈورڈ' نے اسے ناقابلِ توجیہہ قرار دیا۔ اس کشمکش کے دوران فرانسیسی قوم نے بھی پوری طرح اپنے شاہ کا ساتھ دیا۔

(cf. Toynbee A.J.; Change and Habit, p.132)۔

فرانس کے فلپ نے جوابی کارروائی کے طور پر خود پوپ کے مالیہ کو متاثر کرنے کی دھمکی دی۔ اس نے تمام سامان اور ہنڈیاں جو فرانس سے اطالیہ جایا کرتی تھیں، ممنوع قرار دے دیں۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ پوپ مختلف معاملات، مثلاً سسلی میں فوجی مداخلت اور 'کولونا' کی بغاوت میں الجھا ہوا تھا اور اخراجات کے لیے رقم کی شدید ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ خود اس کے علاقے میں بغاوت کا خطرہ تھا۔ فرانس اور انگلستان جیسی قوتوں کو چرچ کے دائرہ کار سے خارج بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان حالات میں فرانس کی مستقل آمدنی سے محرومی نے

پوپ کو ان دونوں کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنے بل کو واپس تو نہیں لیا لیکن ایسی ترمیم کر دی کہ اس حکم نامے کی عملی حیثیت ختم ہو گئی۔

یہ معاملہ ابھی دبا بھی نہ تھا کہ ایک نیا مرحلہ پیش آ گیا۔ پوپ بونی فیس ہشتم (Boniface VIII) نے ایک اور جنگِ صلیبی کے لیے مغرب کو متحد کرنا چاہا۔ اس مقصد کے لیے اس نے فرانس اور انگلستان میں صلح کے لیے اپنی ثالثی پیش کی۔ ساتھ ہی ایک بل اور جاری کیا جس میں امن قائم کرنے کا حکم بھی موجود تھا۔

دونوں ممالک نے اس بل کو شاہی اختیارات میں پوپ کی مداخلتِ بے جا قرار دیا۔ فلپس نے چرچ کے باغیوں کی کھلم کھلا مدد کی۔ باغیوں نے پوپ کو گرفتار کر لیا، لیکن عوامی ردِ عمل کے پیشِ نظر اسے رہا کرنا پڑا۔ ان ناکامیوں کے صدمے کو پوپ بونی فیس ہشتم برداشت نہ کر سکا اور ۱۳۰۳ء میں چل بسا۔

چودھویں صدی عیسوی میں پاپائیت اندرونی خلفشار کا شکار رہی۔ بیک وقت کئی کئی پوپ منتخب ہوتے۔ عوام ایک کو چنتے، کارڈینلز کسی دوسرے کو، اور مذہبی کونسل کسی تیسرے کو چنتی۔ ان میں باہم کشمکش رہتی۔ پاپائیت اخلاقی گراوٹ کا شکار بھی ہونے لگی۔ [cf. Henry Pirenne, A Study of Europe, pp. 550-552] جس کے باعث مذہبی اصلاحات کی تحریکوں نے جنم لیا۔ 'وے کلف' کی تحریک، پھر 'جان ہس' کی تحریک اٹھی، جس کے سبب جرمن چرچ کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ پھر شدید ترین تحریک لوتھر کی تھی جو کامیاب ہوئی، اور اسکی کامیابی نے پاپا کے خطّۂ اقتدار کو دو حصّوں میں تقسیم کر ڈالا۔ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط سے سولہویں صدی عیسوی کے وسط تک نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کا دور ہے۔ نشاۃِ ثانیہ نے پوپ اور کلیسا دونوں کو سیاست اور دیگر تمام سماجی شعبوں سے خارج کر کے انہیں مذہب تک محدود کر دیا۔

دوہرے نظامِ اقتدار نے بعض نہایت دوررس اثرات مرتب کیے۔ مغربی معاشرے پر آٹھویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک پاپائیت مسلط رہی۔ اس تمام عرصے میں اگر شہنشاہ پوپ سے متحارب ہوا تو اسکا مقصد صرف سیاسی اقتدار و اختیار کا حصول تھا۔ [cf. Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. X, p.131] دیگر تمام شعبہ ہائے حیات، خصوصاً اندازِ فکر و نظر، ہمیشہ پاپائیت کے رہینِ منّت رہے۔ اس کی تعمیر و ارتقاء میں کسی اور قوّت کا ذرا بھی دخل نہیں رہا۔ اسلام کے بارے میں پاپائیت نے جو نہج روزِ اوّل اختیار کی، صدیوں کے پروپیگنڈے نے اسے مغرب کا ایمان بنا ڈالا۔ مغرب کا ذہن نسلاً بعد نسلاً اس قدر مکدّر رہا کہ وہ آج بھی عہدِ وسطیٰ کی روایات سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔

باب دوم

ریاستِ اسلامیہ کی توسیع
اور
عہدِ وسطیٰ کا مغرب

۱۔ اسلام کا عالمِ عیسائیت میں نفوذ اور علاقائی نقصانات

۲۔ مغرب پر مسلم فتوحات کے دوررس اثرات

۳۔ نفوذِ اسلام کے معاشی نتائج اور معاشرتی اثرات

۴۔ اسلام کے ثقافتی اثرات

اسلام کا عالمِ عیسائیت میں نفوذ اور علاقائی نقصانات

ساتویں صدی عیسوی کی دنیا (ہند و چین سے قطعِ نظر) دو عظیم طاقتوں پر مشتمل تھی۔ بازنطین (رومن ایمپائر) اور پرشیا (ایران) جس میں موجودہ ایران، عراق، افغانستان اور بلوچستان شامل تھے۔

(cf. Sir John Glubb; The Lost Centuries, p.21: for details see Phillips K. Hitti; History of Arabs: and Nicholson R.; History of Arabs)

یہ دونوں طاقتیں مکمل تہذیبیں تھیں، جن کی اپنی ثقافت، اپنی تاریخ، اپنی زبان اور اپنی قدیم شہنشاہیت تھی۔

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے عہد حکومت (۶۳۲ء تا ۶۳۴ء) میں مسلمانوں نے بیرونِ عرب اقدام شروع کیا تو یہی دونوں طاقتیں مدِ مقابل ہوئیں۔ مسلمان ان دونوں سے بیک وقت نبرد آزما ہوئے اور جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں دو متوازی محاذ کھل گئے۔ مسلمانوں نے مشرقی محاذ پر ایرانیوں کو پے در پے شکستیں دیں اور حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت (۶۴۴ء تا ۶۵۶ء) میں ہی، صرف چوبیس [۲۴] سال کے اندر اندر پوری سلطنتِ ایران کو مملکتِ اسلامیہ کا جزو بنالیا گیا۔

سلطنتِ روم کے صوبوں کی فتح : مغربی محاذ پر رومن ایمپائر (بازنطین) یا عیسائی دنیا مسلمانوں کے مدِ مقابل تھی۔ ۶۳۲ء میں شام پر مسلمانوں کے حملوں کی ابتداء ہوئی۔ ۶۳۵ء میں شام کا صوبائی مستقر دمشق فتح ہوا۔ ۶۳۶ء میں رومن شہنشاہ ہرقل (Heraclius) نے بذاتِ خود اپنی باقاعدہ افواج کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف وسیع پیمانے پر اقدام کیا۔ یرموک کے مقام پر خونریز معرکہ ہوا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے رومیوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ سات سال کے مختصر عرصے میں پورا شام اور فلسطین رومیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ (حوالہ بالا، نکلسن)

مصر کی فتح : شام کے بعد عرب فاتحین نے مصر کی طرف رخ کیا۔ ۶۴۱ء میں حضرت عمروؓ ابن العاص نے مصر کے گورنر سائرس (Cyrus) کو بابلونیہ (Babylon) یا موجودہ قاہرہ کے گردونواح میں شکستِ فاش دی اور اس کے ساتھ ہی مصر کی بندرگاہ اسکندریہ پر قبضہ کرلیا۔ ان دونوں شہروں کے سقوط کے ساتھ ہی رومن ایمپائر صوبۂ مصر سے بھی محروم ہوگئی۔

شام کے سقوط نے اگر روم کی سیاسی عظمت کو نقصان پہنچایا تھا تو مصر سے محرومی سے اسے سخت معاشی دھچکا لگا، کیونکہ اس دور میں بازنطین کے غلّے کی درآمد کا انحصار مصر پر تھا۔

(Phillips K. Hitti; Islam and the West, p.25)۔

افریقہ کی فتح: فتوحات کا سلسلہ حضرت عثمانؓ کے آخری ایام میں عارضی طور پر رک گیا۔ انکی شہادت کے بعد خود عالمِ اسلام خانہ جنگیوں میں الجھ کر رہ گیا۔ لیکن جب اموی دور شروع ہوا تو فتوحات کا سلسلہ ایک بار پھر چل پڑا۔ حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں (۶۶۱ء تا ۶۸۰ء) نامور سپہ سالار عقبہ بن نافع نے شمالی افریقہ کی بربر ریاستوں کو فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر لیا، جس کے نتیجے میں رومن ایمپائر اپنی تمام افریقی نوآبادیوں سے محروم ہوگئی۔

ایک طرف رومن ایمپائر کے مقبوضہ جات یکے بعد دیگرے ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے، تو دوسری طرف اموی افواج رومن ایمپائر کے پایۂ تخت قسطنطنیہ کے دروازوں پر دو بار دستک دے آئی تھیں۔

[قسطنطنیہ پر پہلی بار فوج کشی، ۵۰ھ میں یزید بن معاویہؓ کی سربراہی میں کی گئی۔ اس لشکر کے شرکاء کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مغفرت کی بشارت کی وجہ سے نامور انصاری صحابی، میزبانِ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوایوبؓ نے بطورِ خاص، اس مہم میں شرکت کی تھی۔ اسی مہم میں انکا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے وصیت فرمائی کہ مجھے دشمن کے علاقے میں جتنی دور تک لے جا کر دفن کر سکو دفن کرنا، چنانچہ انہیں شہر قسطنطنیہ کی شہر پناہ کی دیوار کے ساتھ دفن کیا گیا۔ یزید نے رومیوں کو یہ پیغام بھجوایا کہ یہ ہمارے انتہائی محترم بزرگ کی قبر ہے، جو ہمارے نبی ﷺ کے ساتھی تھے، اگر اس قبر کی بے حرمتی کی گئی، تو پورے عالم اسلام میں کوئی گرجا سلامت نہیں رہنے دیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی لشکر کی واپسی کے بعد رومیوں نے اس قبر پر مستقل فوجی پہرا متعیّن کر دیا تھا، مبادا کسی ناسمجھ کی شرارت کی وجہ سے یزید کو اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانا نہ پڑ جائے۔ حضرت ابوایوبؓ انصاری کا مزارِ مبارک آج بھی استنبول (قسطنطنیہ) میں مرجعِ خاص و عام ہے۔ ان کے علاوہ اس لشکر میں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ بن خطاب اور حضرت حسینؓ بن علیؓ، اور حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ جیسے بزرگوں نے بھی شرکت فرمائی تھی۔

قسطنطنیہ پر دوسری بار فوج کشی، ۹۵ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت میں کی گئی۔ اس لشکر کے سپہ سالار خلیفہ کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک تھے۔ یہ لشکر تقریباً ایک سال تک شہر کا محاصرہ کرنے کے بعد لوٹ آیا، جس کے لیے مغربی مورخین بازنطینی شہنشاہ 'لیوسوم' کی تعریفوں کے پل باندھتے نہیں تھکتے۔]

اسپین کی فتح: فتوحات کا جو سلسلہ حضرت معاویہؓ نے شروع کیا تھا، وہ انکے جانشینوں عبدالملک بن مروانؒ اور ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت (۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) میں اپنی انتہائی عظمتوں تک پہنچا۔ ولید کے نامور گورنر موسیٰ بن نُصیر نے افریقہ سے ایک مختصر فوج طارق بن زیاد کی سرکردگی میں اسپین کی طرف روانہ کی۔

طارق ۷۱۱ء میں اسپین کی سرزمین پر اترے۔ ایک گھمسان کی جنگ میں انہوں نے اسپین کے شاہ رادرک (Roderic) کی فوج کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس شکست نے اسپین میں ویزی گاتھ سلطنت کا

چراغ بجھا دیا۔ جلد ہی موسیٰ بن نُصیر خود بھی اسپین پہنچ گئے اور صرف دو سال کے عرصے میں اندلس مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ ولید بن عبدالملک نے موسیٰ بن نُصیر کو مزید پیش قدمی کی اجازت نہیں دی، جس کے سبب ۷۱۴ء میں یورپ میں پیش قدمی کا سیلاب رک گیا۔

فرانس میں پیش قدمی : ولید بن عبدلملک نے ۷۱۵ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ۷۱۷ء-۷۱۸ء میں کوہِ پائیرینیز (Pyrenees) عبور کر کے فرانس میں پیش قدمی کی۔ انہوں نے ناغبون (Norbonn) پر قبضہ کرنے کے بعد باغدو (Bardeaux) کو فتح کیا۔

۷۳۱ء میں اسپین کے سرحدی گورنر عثمان بن ابی نبزہ نے فرینک حکمراں 'اودوٗ (Eudo) کے ساتھ معاہدہ کر کے علمِ بغاوت بلند کیا تو اسپین کے اموی حاکم امیر عبدالرحمٰن الغافقی نے اس باغی کی سرکوبی کی۔ اس کے بعد وہ، اس کے حلیف اودو کی خبر لینے کے لیے اکویتانیہ میں داخل ہوئے اور 'اودوٗ کا تعاقب کرتے ہوئے ۷۳۲ء میں طورس (Tours) (موجودہ پیرس کے نواح) تک اقدام کیا۔

'اودوٗ اور فرینک حکمراں 'چارلس' میں ناچاقی چلی آرہی تھی۔ پسپائی نے اودو کو چارلس مارتل سے صلح پر مجبور کیا۔ (چارلس اس زمانے میں میروونجن بادشاہ کا درباری تھا۔ اسی چارلس کا پوتا شارلمین تھا جو پوپ کی عیسائی سلطنت کا اوّلین شہنشاہ بنا۔) عبدالرحمٰن الغافقی کے مقابلے پر چارلس اپنی پیدل فوج لیکر آیا۔ کئی دنوں تک معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر امیر عبدالرحمٰن نے بھرپور حملہ کیا، جس میں ان کو کاری زخم آئے اور وہ جاں بر نہیں ہو سکے۔ اس سانحے کے باعث مسلم افواج اسی شب میدانِ جنگ سے واپس ہوگئیں۔

دوسرے دن چارلس مارتل نے میدانِ جنگ میں اپنی افواج کی صف بندی کی لیکن جب مسلم افواج مدِ مقابل نہیں آئیں تب اسے یہ پتہ چلا کہ مسلم افواج بلا جنگِ فیصل کیے لوٹ گئی ہیں۔

(cf. Gibbon, E.; The Decline and Fall of Roman Empire, Vol. IV, pp.14-15)

یہ تھی وہ جنگِ عظیم جسے مغرب کا ہر مورّخ مغرب کی عسکری تاریخ کا نہایت اہم باب قرار دیتا ہے۔

جنگِ طورس کے بارے میں فلر نے لکھا،

"جنگ کے بارے میں تفصیلات کا ہمیں بہت ہی کم علم ہے۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ جنگ کس مقام پر لڑی گئی۔ تاہم معلومہ تاریخ اکتوبر ۷۳۲ء ہے۔ طورس کے قریب فوجیں ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہوگئیں۔"

(Fuller, J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, pp. 236-238)

فلپس کے ہِتّی نے تحریر کیا،

"......کئی دنوں تک جھڑپیں جاری رہیں...... آخر عرب جنرل نے یورش کی اور کاری زخم کھایا۔ رات کے سناٹے میں اس کے آدمیوں نے اپنے خیمے تہہ کیے اور چوری چھپے لوٹ گئے۔ یہ تھی وہ فتح جسے مغربی مورّخ، عسکری تاریخ کی فیصلہ کن جنگ قرار دیتا ہے۔" **(Phillips K. Hitti; Islam and the West, p.65)**۔

حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ رومن ایمپائر اس وقت تک کسی جنگ میں مسلمانوں کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس غیر متوقع مراجعت کو مغرب نے متعدد مفروضات کی بنیاد پر اپنی فتح بنا ڈالا۔ وہ مفروضات ان اندیشوں پر مبنی ہیں [اور یقیناً بجا ہیں، کہ اگر امیر اس معرکے میں جاں بحق نہ ہو جاتے تو اغلباً] کہ اگر چارلس مسلمانوں کے قدم نہ روکتا تو کلیسا ختم تھا، مغربی تہذیب دم توڑ دیتی، ہیٹ کی جگہ فیز کا چلن ہوتا، بائیبل کی جگہ آکسفورڈ میں قرآن کا درس ہوتا۔ یہ وہ مفروضات ہیں جو طورس کی جنگ کی اہمیت بڑھانے کے لیے گبن نے بیان کیے، ورنہ طورس کا واقعہ ایک مقامی جھڑپ سے زیادہ کچھ نہیں۔

۷۳۲ء میں وصال نبوی ﷺ کی صدی پوری ہوئی۔ اس ایک صدی میں مسلمانوں نے ایک ایسی عظیم مملکت قائم کر دی تھی جو اسپین سے چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی عظیم مملکت سے تاریخ کے اوراق اس وقت تک ناواقف تھے۔

بحری فتوحات : حضرت عثمانؓ کے عہدِ حکومت میں حضرت امیر معاویہؓ نے اسلامی بحری قوت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ متعدد دار الصنع قائم کیے، اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بحری قوت کو اس قابل بنا دیا کہ ۶۵۲ء میں جب رومی بحری بیڑے نے اسکندریہ پر حملہ کیا تو اسے ناکام بنا دیا۔ صرف دو سال کے عرصے میں یہ بیڑہ اتنا طاقتور ہو گیا کہ ۶۵۴ء میں بصر بن ابی ارطاۃ کی سرکردگی میں اس نے عظیم رومی جنگی بحری بیڑے سے بحرِ روم میں ٹکر لی۔ یہ بحری جنگ فینکس یا فنیقہ (Phoenix/Finike) کے ساحل لیقیہ (Lician Coast) پر لڑی گئی۔ عرب تاریخوں میں اس جنگ کو ذوالسواری یا ذات السواری کہا جاتا ہے۔

شہنشاہ کانستنتائن (پسرِ ہرقل) بذاتِ خود رومی بیڑے کی کمان کر رہا تھا۔ عرب بحری بیڑے نے رومی بحری بیڑے کے پانچ سو جہاز تباہ کر ڈالے اور شہنشاہ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگا۔ یہ بحری معرکہ جنگِ یرموکِ ثانی ثابت ہوا۔ بازنطینی بحری قوت پاش پاش ہو گئی۔

(Phillips K. Hitti; History of Arabs, pp.167-194)

بحرِ روم پر رومیوں کا مکمل اقتدار قرطاجنہ کی تباہی (۱۴۶ ق م) کے بعد قائم ہوا تھا۔ ۶۵۴ء میں آٹھ سو سال کے بعد پہلی بار اس تسلط کو ختم کر دیا گیا۔

(Earnest Barker; The Legacy of Islam, article 'The Crusades', p.44)

جزائرِ بحرِ روم : فینکس کی شکست نے رومن دنیا کو بحرِ روم سے بھی محروم کر دیا۔ بحرِ روم کے تمام چھوٹے بڑے جزائر یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ جزیرہ قبرص حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں فتح کیا گیا۔

عباسی عہد میں کریت پر ۸۲۷ء تا ۹۶۱ء ایک عرب امارت قائم رہی۔ **(Gabrieli Francesco; 1960, [**

The Legacy of Islam, article 'Islam in the Mediterranean World' p.72)]۔

سسلی پر بنو اغلب نے ۸۲۷ء سے حملے شروع کیے اور ۸۷۸ء تک پورے جزیرے کو قبضے میں لے لیا۔

(حوالہ بالا، صفحہ ۷۴-۷۵)۔ اس جزیرے کو مستقر بنا کر مسلم افواج نے اطالیہ پر تاخت و تاراج کی۔ گیارہویں صدی

میں جنوبی اطالیہ کے علاقے اپولیا میں دو مسلم امارتیں مختصر عرصے کے لیے قائم ہوئیں۔ (حوالہ بالا)۔عرب حملوں کی زد میں نہ صرف جنوبی اطالیہ اور نیپلز تھے، بلکہ خود روم بھی ۸۴۶ء میں انکے نرغے میں آیا۔ بحرِ روم کے جزائر سارڈینیا اور کارسیکا پر بھی اسی دور میں قبضہ کیا گیا۔

موجودہ تحقیقات سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ خود یونان میں بھی مسلمان کافی عرصے تک مقیم رہ چکے ہیں۔ مائلز کی صبر آزما تحقیقات کے مطابق یونان کے مختلف شہروں مثلاً اتیکا(Attica)، کورنتھ (Corinth)، اور ایتھنز(Athens) میں عربوں کے مستقل قیام کے آثار ملتے ہیں۔ ایک مسجد کے آثار قسطنطنیہ کے قریب ساحلِ باسفورس پر بھی پائے گئے ہیں۔ [(Miles G. C.; The Circulation of Islamic Coinage from 8th to 12th Century in Greece, Vol II, pp.485-498)]

اس طرح دسویں صدی عیسوی تک عیسائی دنیا کا نصف رقبہ مسلم فاتحین کے قبضے میں جا چکا تھا۔ (Sir John Glubb; The Lost Centuries, p.483)۔ بحرِ روم جس پر ساتویں صدی عیسوی تک صرف رومی پرچم لہراتا تھا اب مسلمانوں کے زیرِ نگیں تھا۔

بحرِ روم پر مسلم برتری نے عیسائی دنیا کو سمندر سے بے دخل کر دیا۔ عیسائی طاقتوں کی بحری نقل وحرکت محض ساحلوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ (Henry Pirenne, A History of Europe, p.95)۔ مکمل تین صدیوں تک مغرب سمندری رابطوں سے محروم رہا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۹۶)

فتوحات کا دوسرا دور

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کی مسلم فتوحات سے عیسائی دنیا جس بحران سے دوچار ہوئی، دسویں صدی کے بعد اس سے سنبھلنے لگی تو اس نے اپنے علاقوں کی بازیابی کی کوشش شروع کی۔ ابھی طاقت کا توازن تبدیل نہیں ہوا تھا کہ عالمِ اسلام پر بحران طاری ہونے لگا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کے قبیلہ غز (Ghuzz) نے پورے ایران کو روند ڈالا۔ ۱۰۵۵ء میں انکے سردار طغرل بیگ سلجوقی نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔

سلجوقیوں کی قوت سے بازنطین بھی سراسیمہ ہونے لگا۔ شہنشاہِ بازنطین نے اس خطرے کو دور کرنے کے لیے ۱۰۷۱ء میں سلجوقی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے ملاذ گرد (Malaz Kirt) کے مقام پر شہنشاہِ بازنطین کو عبرتناک شکست دیکر عیسائی دنیا کو ایشیائے کوچک سے بھی محروم کر دیا۔ ایشیائے کوچک کے قبضے میں آنے کے بعد یونان کی سمت سے یورپ میں مسلمانوں کی پیش قدمی کے امکانات پیدا ہو گئے۔

جنگِ ملاذ گرد میں شکست نے مشرقی عیسائی دنیا کو ہراساں کر دیا۔ مجبوری کے عالم میں اس نے اپنے دیرینہ رقیب مغرب سے مدد طلب کی۔ شہنشاہِ بازنطین الیگ سیئس (Alexius) نے پوپ اربن سے اپیل کی۔

پوپ نے عالمِ عیسائیت کی بقا کے لیے ایشیائے کوچک کی بازیابی کو لازمی گردانا۔ اس سیاسی ضرورت میں اس نے مذہبی عنصر شامل کر کے حروبِ صلیبیہ کا اعلان کیا۔ حروبِ صلیبیہ نے یورپ میں مسلم پیش قدمی کئی صدیوں کے لیے ملتوی کر دی۔ (cf. Sir John Glubb; The Lost Centuries, p. 27)۔

سلطنتِ عثمانیہ اور یورپ

تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام پر مفتوحہ ایشیائے کوچک میں بازنطینی سرحدوں سے متصل اناطولیہ کے علاقے میں ترکوں نے ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی۔ اس ریاست کے بانی عثمان (۱۲۹۹ء تا ۱۳۲۶ء) تھے، جنکے نام سے موسوم یہ ریاست سلطنتِ عثمانیہ کہلائی۔

ترک اور بازنطین: چودھویں صدی میں بازنطین پر ترکوں کا دباؤ شدید ہونے لگا۔ بازنطین کے مختلف علاقوں پر ترکوں کا قبضہ ہونا شروع ہوا۔ ۱۳۲۶ء میں بروسا، ۱۳۳۰ء میں نکومیدیا اور نیقیہ ترکوں کے قبضے میں آیا۔ سلطان مراد نے ۱۳۵۲ء میں ادریانوپل فتح کیا۔ فلپو پولس [پلوفدیف] (Philippopolis)/[Plovdiv] کی تسخیر ۱۳۶۴ء میں ہوئی۔ ۱۳۷۱ء میں سرب قوم کو شکست دیکر انہیں مقدونیہ فرار ہونے پر مجبور کر دیا، اور ۱۳۸۱ء میں صوفیہ کو سرنگوں کیا۔

مراد کے بیٹے بجازت نے (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۳ء) میں بوسنیو، دلاشیو، بلغاریہ اور تھیسالیہ کو فتح کیا۔ اس طرح چودھویں صدی کے اختتام تک سارا بلقان ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔

(cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p.494)

صرف قسطنطنیہ باقی رہ گیا جو اپنی قلعہ بندی کے طفیل مزید نصف صدی تک فتح ہونے سے بچا رہا۔

اسی درمیان جب ترک ہنگری کی سرحدوں پر تھے، مغرب اپنے دفاع کے لیے اپنی قوتیں مجتمع کر رہا تھا اور پوپ بونی فیس نہم ترکوں کے خلاف صلیبی جنگ شروع کرنے کی مہم چلا رہا تھا، مغلوں نے عالمِ اسلام پر حملہ کیا۔ تیمور لنگ کی افواجِ قاہرہ، بے پناہ سیلاب کی طرح ایشیا اور مشرقی یورپ پر چھا گئیں۔ ترکوں کے یورپ میں بڑھتے ہوئے قدم تھم گئے۔ بجازت کو قسطنطنیہ کا محاصرہ چھوڑ کر ایشیائے کوچک پہنچنا پڑا تا کہ مغل افواج کی یلغار سے سلطنتِ عثمانیہ کو بچا سکے۔ ۱۴۰۳ء میں مغلوں اور ترکوں کا مقابلہ انگورہ میں ہوا جس میں بجازت کام آئے۔

تیمور نے ۱۴۰۵ء میں انتقال کیا اور پھر ترکوں نے اپنی قوت مجتمع کی۔

بازنطین کا خاتمہ: سلطان مراد ثانی (۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء) نے ازسرِ نو سالونیکا کو فتح کیا، اور جب بلقان پر دوبارہ قبضے کے لیے یورپ میں اقدام کیا تو وہاں یورپ کی اجتماعی قوت مقابلے کے لیے موجود تھی۔ سلطان نے ۱۴۴۴ء میں جنگِ ورنہ (Verna) میں اس اجتماعی قوت کو فیصلہ کن شکست دیکر بلقان پر بارِ دگر

قبضہ کیا۔ قسطنطنیہ کا سقوط آج اور کل کی بات تھی۔ شہنشاہ قسطنطین یازدہم (Constantine XI) عالمِ عیسائیت سے مدد حاصل کرنے کی خاطر کلیسائے یونان کو کلیسائے روم میں ضم کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس کے باوجود اسے مغرب سے خاطر خواہ امداد میسّر نہیں آئی، اور آخر کار سلطان محمد فاتح ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو فاتحانہ شان سے قسطنطنیہ میں داخل ہوئے اور اسطرح رومن ایمپائر کی آخری نشانی بھی نیست و نابود ہو گئی۔ شہنشاہ قسطنطین، کشتگانِ وطن کے ساتھ، خاک و خون ہو گیا اور سینٹ صوفیہ کے گرجا گھر سے تکبیر کی آواز گونج اٹھی۔

بحری اقتدار : مشرق میں ترک فتحیاب ہو رہے تھے تو مغرب میں اسپین میں عرب پسپا ہو رہے تھے۔ سقوطِ قسطنطنیہ کے چالیس سال بعد ۱۴۹۲ء میں اسپین میں غرناطہ کا سقوط ہوا اور مغربی یورپ سے مسلم اقتدار کا چراغ گل ہو گیا۔ الحمراء کے در و دیوار تکبیر کی گونج سے محروم ہو گئے۔ اسپین کے سقوط نے مغربی بحرِ روم سے مسلم برتری ختم کر دی۔ بحرِ روم سے مسلم برتری کا زوال گیارہویں صدی عیسوی سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ عیسائی بحریہ اس قدر مضبوط ہو چکی تھی کہ اس کے ذریعے افریقہ، مصر اور شام پر قبضے کی متعدد کوششیں ہو چکی تھیں۔

شام اور مصر پر صلیبی عہد میں ایک صدی تک عیسائی قبضہ اسی بحریہ کی قوّت کے طفیل برقرار رہا۔ ترکوں نے بحرِ روم پر بھی اپنا اقتدار مضبوط کیا، اور مشرقی بحرِ روم سے انہیں بیدخل ہونے پر مجبور کر دیا۔ تاہم مغربی بحرِ روم میں عیسائی بحری قوّت برقرار رہی۔

قپچاق سلطنت : روس کو چنگیز خاں کے پوتے، باتو خاں نے فتح کر کے وہاں ایک مضبوط سلطنت قائم کر لی تھی، جسے روس اور مغرب گولڈن ہورڈ (Golden Horde) کا نام دیتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں اس سلطنت کو قپچاق سلطنت کہا جاتا ہے۔ ابتدائی چودھویں صدی عیسوی میں ان منگول حکمرانوں نے اسلام قبول کر لیا، اس طرح پورے مشرقی عالمِ عیسائیت پر اسلام کا غلبہ ہو گیا۔ (Lewis Bernard; The Legacy of Islam, [1975 ed., article 'Politics and War')] بازنطین سلطنت پر قبضے اور قپچاق سلطنت میں اسلام کے غلبے کی بدولت رومن ایمپائر کا تین چوتھائی رقبہ عیسائیت کے قبضے سے نکل کر اسلام کی پناہ میں آ چکا تھا۔

(Henry Pirenne; A History of Europe, p. 48)

مغرب پر مسلم فتوحات کے دوررس اثرات

سیاسی اثرات

آٹھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے عیسائیوں کے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا، پندرہویں صدی عیسوی تک اس میں کوئی خاص تبدیلی نہ آسکی۔ درمیانی دور میں عارضی طور پر حدود آگے پیچھے ہوتی رہیں، لیکن مجموعی طور پر نقشے میں مستقل ردّوبدل نہیں ہوسکا۔ پندرہویں صدی میں عیسائیوں نے اسپین کی بازیابی کرلی تو اس کی جگہ اسپین سے کہیں بڑا رقبہ مشرقی یورپ سے نکل گیا۔

اس طرح مغربی معاشرہ کم وبیش ایک ہزار سال تک مسلم دنیا سے محصور رہا۔ اس دوران مغربی معاشرہ نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی طور پر دباؤ کا شکار رہا۔ محصور معاشرے کے لیے دو ہی طریقۂ کار رہ جاتے ہیں۔ یا تو وہ غالب فریق کے ساتھ مصالحت کرلے یا پھر اسکا اپنی پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے۔ مغربی معاشرہ جو رومن معاشرے کا وارث اور کیتھولک چرچ کا پروردہ تھا، ذہنی اعتبار سے رومن تھا۔ پس دباؤ، سیاسی ابتری اور اقتصادی بدحالی، سب کچھ برداشت کرگیا، لیکن مصالحت پر آمادہ نہیں ہوسکا۔ بحرِ روم اور اسکے اردگرد کے مقبوضہ جات سے محرومی، بجائے خود بہت بڑا سیاسی نقصان تھا۔ پندرہویں صدی میں بازنطین پر قبضے نے اس محرومی کو اپنی انتہا پر پہنچادیا۔ مغرب بقیہ دنیا سے کٹ گیا۔

رومن غرور کے لیے یہ امر ناقابلِ برداشت تھا کہ وہ ان لوگوں سے زچ ہورہا تھا جن پر اس نے ہزار سال حکومت کی تھی۔ عرب تو وہ بدو تھے جن پر انکے ماتحت نیم خودمختار حکمراں قابو رکھا کرتے تھے۔ وحشی اقوام کی متمدّن علاقوں پر یلغار کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن یہ ہمیشہ عارضی ہوتی تھی۔ اور مرورِ زمانہ کے ساتھ یہ وحشی فاتح، متمدّن ہوکر رومن ایمپائر میں ضم ہوجایا کرتے تھے۔ متمدّن دنیا کا آقا روم اور صرف روم ہوا کرتا تھا۔ لیکن یہ نئے فاتح نرالے تھے، ابدی آقا کو زیر کرنا چاہتے تھے۔

فتوحات کی پہلی لہر نے ابھی سنبھلنے بھی نہ دیا تھا کہ دوسری جانب سے ایک دوسری لہر اٹھی۔ یورپ کے نقشے پر ایک نظر ڈالنا ہی یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہوگا کہ سیاسی اعتبار سے دوسرا مسلم اقدام آٹھویں صدی کے اقدام کی بہ نسبت مغرب کے لیے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ ہسپانیہ ایک ایسی مسلم مملکت تھا جو مرکز سے جدا تھا۔ اسے پورے عالمِ اسلام کی حمایت حاصل نہ تھی۔ اسکے وسائل محدود تھے جو مغرب کے وسائل سے کسی طور بہتر نہیں تھے۔ لیکن مشرقی اقدام فروعی نہیں بلکہ عالمِ اسلام کا مرکزی اقدام تھا، جسکے وسائل محدود نہیں تھے۔

ترکان عثمانی کے قبضے میں مشرقی یورپ، ایشیائے کوچک، شام اور مصر تھے۔ شام اور مصر ایسے تاریخ ساز خطے تھے کہ جس کے قبضے میں آ گئے اسے عظمت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ رومن ایمپائر، بابل، یونان، ایران اور مملکت اسلامیہ، سب ہی کو اسی وقت عروج میسر آیا جب یہ دونوں علاقے ان کے قبضے میں آئے۔ اسپین کی فتح بھی اسی اسی دور میں ہوئی جب ان دونوں کے وسائل سلطنت اسلامیہ کو میسر تھے۔ جب ہسپانیہ جدا ہوا اور ان دونوں علاقوں کے وسائل سے محروم ہو گیا تو اسکی ساری کوشش یہ رہی کہ کسی طرح اپنے آزادانہ وجود کو برقرار رکھے۔ جو بالآخر ختم ہو گیا۔

۱۶۰۰ء میں ترکانِ عثمانی جرمنی کی سرحدوں پر کھڑے تھے۔ ان کے مزید اقدام کا خوف مغرب کو متوحش کیے دیتا تھا۔

(R.W.Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.12)

مغرب کی سیاسی ابتری: آٹھویں صدی کا مغرب رومن ایمپائر کا حصہ تھا، لیکن طوائف الملوکی کا شکار شہنشاہِ بازنطین نہ تو اس پر قبضہ برقرار رکھ سکا، نہ ہی مسلمانوں سے اسکا دفاع کر سکا۔ مصر و شام پر قبضے کے خاتمے اور بحرِ روم سے بیدخلی نے مغرب کی تجارت ختم کردی۔ مغرب بنیادی طور پر تجارتی معاشرہ تھا۔ (Kenith Neil Cameron; Humanity and Society, p.165)۔ حکومت کے مالیہ کا انحصار تجارت پر تھا۔ (Henry Pirenne; A History of Europe, p.69)۔ تجارت کے خاتمے کے باعث مغرب کے لیے سیاسی ادارے قائم رکھنا ناممکن ہو گیا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۷)۔ فوج، سینیٹ، عدلیہ، 'کیوریا'، 'سول سروس'، تعمیرات، رسل و رسائل اور بلدیہ، ہر ادارہ تحلیل ہو گیا۔ (حوالہ بالا، صفحات ۱۱۰ تا ۱۱۵)۔ یہ ایک ایسی سیاسی ابتری ہے جس کی نظیر کسی مہذب ملک میں نہیں پائی جاتی۔

صرف ایک غیر سیاسی ادارہ، کلیسا باقی رہ گیا، کیونکہ اس کے اپنے اقتصادی وسائل تھے۔ اس سیاسی خلا کو اسی ادارے نے پر کیا۔

سیاستِ کلیسا: ابتداً کلیسا نے سیاسی ادارے کی ذمہ داری رضا کارانہ طور پر سنبھالی۔ لیکن جب اقتدار اسکے قبضے میں آ گیا تو کسی صورت اس سے دستبردار ہونے پر رضامند نہیں ہوا۔ رومن دور میں مذہبی ادارے ہمیشہ ریاست کے تحت ہوا کرتے تھے۔ ریاست کے سرکاری مذہب کی منظوری قیصر دیتا تھا۔ جس مذہب کو سیاسی پشت پناہی حاصل ہوتی تھی وہ پروان چڑھتا، اور جسے سیاسی قوت نظر انداز کرتی وہ آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتا۔ خود عیسائیت بھی سیاسی قوت کے طفیل پروان چڑھی تھی۔ عیسائیت کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ملتی، جہاں ریاست کلیسا کے تحت رہی ہو۔ پس کلیسا سیاسی قوت کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے مغرب پر مسلم اقدام سے پیدا ہونے والے انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک زبردست تھیوکریسی قائم کردی، جس نے اسٹیٹ اور معاشرے کو پوری طرح اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔

رومن طرزِ حکومت کو اگر ہم قیصری پاپائیت کہیں تو مغربی طرزِ حکومت کو پاپائی قیصریت کہا جا سکتا ہے۔ پاپائی قیصریت نے مسلمانوں کی نظریاتی ریاست کی طرز پر مغرب میں ایک ایسی عیسائی نظریاتی ریاست کی تعمیر کا

منصوبہ بنایا جو قدیم رومن ایمپائر کے تمام علاقوں پر مشتمل ہو۔ [cf. Toynbee: A Study of History,] (Vol. II, p.347)۔ اسی منصوبے کے تحت شہنشاہ بازنطین سے علیحدگی اختیار کر کے مغربی جمہوریہ مسیحی (Western Republica Christiana) قائم کی گئی، جس نے شمالی یورپ میں ممکنہ حد تک اپنی حدود کو وسیع کیا، اور عیسائی دنیا کے قدیم علاقوں کی بازیابی کے لیے صدیوں عالم اسلام پر متواتر حملے کیے۔

سیاسی نظریات : عیسائیت کے مذہبی عقائد کی روشنی میں سیاست ملکی چرچ کے فرائض میں شامل نہیں تھی۔ عیسائیت کے ابتدائی دور میں ریاست کو دشمنِ عیسیٰ، قہر خداوندی جیسے خطابات سے نوازا جاتا تھا، اور اسکی تعظیم کی تعلیمات منفی وجوہات کی بنا پر دی جاتی تھیں۔ (cf. Nick Earl; Culture and Creed, p.65)۔ سیاست میں حصہ لینے یا سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی تعلیم کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ چرچ عملاً طور پر سیاست سے بیگانہ تھا، اسکا اپنا کوئی سیاسی نظریہ نہیں تھا۔

(The Concise Encyclopedia of the Living Faiths; p.166)

پاپائی قیصریت نے بوقتِ ضرورت، کلیسا کے مذہبی نظریات کو سیاسی نظریات کا نعم البدل بنا دیا۔ اگر کلیسا کے مذہبی نظریات اور سیاسی معاملات میں تضاد پایا گیا تو بلا جھجک ضروریات کے مطابق مذہبی جواز پیدا کیے گئے۔ اسٹیٹ اور معاشرے کا مقصد مذہب اور اسکی ترویج و توسیع قرار پایا۔ اسٹیٹ کی تعریف یہ کی گئی کہ ”صحیح اسٹیٹ وہی ہے جس میں سچے مذہب کا چلن ہو۔ چونکہ صرف دینِ مسیحی ہی سچا مذہب ہے لہذا مسیحی ریاست (Christian State) ہی حقیقی معنوں میں ریاست ہے، اور اس ریاست کی حکومت کا یہ فرض اولین ہے کہ مذہبی اخلاص (Purity of Faith) کی حفاظت کے ذریعے بنی نوع انسان کی نجات میں مدد و معاون ہو۔“

(G.E. Grunebaum; Islam, p.130)

کلیسا کی سیاسی بالادستی کے جواز میں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ ”کلیسا کا اور دنیا کا حقیقی شہنشاہ مسیح ہے۔“

(W.Stark; The Sociology of Religion, A Study of Christiandom, Vol. III, p.51)

”مسیح کے پیرو اس حقیقی بادشاہ کی بدولت بادشاہ ہیں۔“ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۵)

اس طرح چرچ نے دربار عیسوی کی حیثیت اختیار کی۔ سیاسی نظام سے دنیاوی بادشاہ کو بیدخل کر کے آسمانی بادشاہ کو اس کی جگہ دی گئی اور پوپ کو شاہوں کا شاہ (King of Kings) قرار دیا گیا۔

(J.C. Fuller; The Decisive Battles of the Western World, p.283)

اس تبدیلی نے فطری طور پر ارباب سیاست کو برہم کیا، اور ایک شدید سیاسی کشمکش پیدا ہوئی، جو صدیوں حکمرانوں اور پاپا کے درمیان جاری رہی، جس میں بالآخر پاپا کا پلہ بھاری رہا۔ پاپا نے شہنشاہ کو محض ایک گناہگار انسان قرار دیکر اسے سیدھا رکھنے کے لیے اس کی زمام اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اس پالیسی نے مغرب میں ایک جابر مذہبی ڈکٹیٹرشپ قائم کر دی۔

چرچ کی بنیادی پالیسی کیتھولک مذہب کی اشاعت، حفاظت اور توسیع تھی۔ عہدِ وسطیٰ کی پوری سیاسی تاریخ اس پالیسی کی آئینہ دار ہے۔ داخلی اور خارجی امورِ مملکت، سب کے سب، اسی پالیسی کے مطابق طے ہوئے۔

داخلی امور: ''چرچ نے مغربی معاشرے کے ہر فرد کی روح اور جسم کو اپنا غلام بنا لیا۔ اس عظیم غلامی کی مثال ماضی کے ظالم ترین حکمراں کے دور میں بھی نہیں ملتی۔'' (Toynbee; A Study of History, Vol. III, p.91)

ادنیٰ کسان سے لیکر شہنشاہ تک، سب ہی اس ظالم تھیوکریسی سے لرزاں و ترساں تھے۔ بے چینی ہر طبقے میں موجود تھی، جسکا اظہار مختلف مواقع پر سیاسی اور مذہبی تحریکوں کی صورت میں ہوتا جنہیں نہایت سختی سے کچلا جاتا۔ اس دور میں احتجاج ایک قبیح جرم تھا، اور کلیسا کی پالیسی سے انحراف کا نام ارتداد تھا، جسکی سزا موت تھی۔ شہنشاہ کو دم مارنے کا یارا نہ تھا۔ سلطنتیں اسی وقت تک مستحکم تھیں جب تک وہ تھیوکریسی کی پالیسی پر گامزن رہتیں۔ شہنشاہ اسی وقت تک شہنشاہ تھے جب تک وہ تھیوکریسی کے وفادار کمانڈر کا رول ادا کرتے۔

پاپائی قیصریت نے مغرب کے گرد ایک ایسا حصار قائم کر دیا تھا جس نے اسے صدیوں بیرونی دنیا سے منقطع رکھا۔ معاشرے پر ایک جمود طاری ہو گیا جو کہیں سترہویں صدی عیسوی میں جا کر ٹوٹ سکا۔ (cf. Christofer Hill; The Century of Revolution, p.171)۔ اس حصار کو توڑنے کے لیے مغربی معاشرے کو کلیسا کے خلاف شدید سیاسی اور مذہبی جد و جہد کرنی پڑی۔ اس کے بعد ہی مغربی دنیا کا بیرونی دنیا سے رابطہ قائم ہو سکا۔

یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ مغرب میں پاپائی ڈکٹیٹرشپ کا قیام اسلام کے اقدام کے سبب سے ہوا۔

خارجہ پالیسی: مغرب کی داخلہ پالیسی کو اگر ہم کلیسائی امن (Peace of the Church) کا نام دے سکتے ہیں، جس کے تحت صرف وہ فرد، گروہ یا قوم زندہ رہ سکتی ہے جو کلیسا کی وفادار ہو تو خارجہ پالیسی کو ایک لفظ سرد جنگ (Cold War) میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے اسپین میں داخلے (۷۱۱ء) سے لیکر، انکے اسپین سے اخراج (۱۴۹۲ء) تک کا عہد مغرب کا عہدِ وسطیٰ کہلاتا ہے۔ اس عہد کے متقدمین ہوں کہ متاخرین، سب ہی دشمنی اور نفرت کے داعی نظر آتے ہیں۔ مسلم دشمنی ایک عقیدہ اور قانونی فریضہ تھا۔

سینٹ برنارد نے بارہویں صدی میں حکم جاری کیا،

''ہم اس امر کی قطعاً ممانعت کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے کسی صورت میں اس وقت تک کوئی تعلق قائم کیا جائے، خواہ وہ مالی منفعت کے لیے ہو یا خراج حاصل کرنے کے لیے، جب تک خدا کی مدد سے ان کا دین یا ان کی قوم بالکل تباہ نہ ہو جائے۔'' (Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, p.252)

عیسائی دنیا میں مسلمانوں کا وجود ناقابلِ برداشت تھا۔ سسلی اور نیپلز کے حکمراں پوپ کے حلقۂ اقتدار سے باہر تھے۔ انکے سیاسی تعلقات مختلف عرب امارتوں کے ساتھ قائم تھے، اور وہ اپنی عرب رعایا کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتے تھے۔ پوپ جان ہشتم نے انہیں نہ صرف عربوں کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے کا

حکم دیا بلکہ ان کے علاقے میں موجود عربوں کو گرفتار کر کے روم روانہ کرنے کا حکم بھی دیا۔ (حوالہ بالا صفحہ-۷۶)۔ اس نے عربوں کو 'دشمنِ عیسائیت' اور 'فرزندانِ تاریکی' قرار دیا۔ اس نے ایسے منصوبے مرتب کرنے کے لیے بشپوں کو مدعو کیا، جن پر عملدرآمد کر کے اس 'نابکار قوم' کو اپنے علاقے سے نکالا جا سکے۔ (حوالہ بالا صفحہ-۷۷)۔ چرچ کی اسی پالیسی کے تحت سسلی، نیپلز اور اسپین میں مسلمانوں کے قتلِ عام ہوئے۔

مسلم سلطنتوں سے تعلّقات: مغربی جمہوریۂ مسیحی کے قیام سے قبل، مغربی سلطنتوں میں عربوں سے سیاسی تعلقات پیدا کرنے کی چند کوششوں کا ذکر ملتا ہے۔ نارمن ڈینئیل نے متعدد عرب سفارتوں کا تذکرہ کیا ہے جو پپاں، چارلس اور شارلمین کے درباروں میں پہنچیں۔ لیکن شارلمین کے عہد کے بعد سیاست پر کلیسا کی گرفت مضبوط ہوگئی، اور مسلم ریاستوں کو دشمن قرار دے دیا گیا، (حوالہ بالا صفحہ-۷۸)، تو مغرب نے سیاسی مصالحت کی جانب کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اگر کسی مسلم ملک نے کبھی ایسا کوئی اقدام کیا بھی تو کلیسا نے اس کوشش کو عمداً ناکام بنا دیا۔

اسپین کے عبدالرحمٰن الناصر نے سیاسی تعلقات پیدا کرنے کے لیے جرمن شہنشاہ اوتو کے دربار میں اپنے سفیر بھیجے۔ اوتو کے درباری پادریوں نے عبدالرحمٰن کے مراسلے کی نہایت شدّت سے مذمت کی اور عبدالرحمٰن پر الزام عائد کیا کہ اس نے کرائسٹ کی شان میں متعدد گستاخیوں (Blasphemies) کا ارتکاب کیا ہے۔ جوابی مراسلے میں انہوں نے نہ صرف خلیفہ الناصر کی، بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کی (نعوذ باللہ) اہانت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ (حوالہ بالا صفحات ۱۵۰-۱۵۲)

وہ تو خیر گزری کہ جو پادری جواب لیکر گیا تھا اس نے خوف یا مصلحت کے سبب اس جواب کو پیش کرنے کی جرأت نہیں کی۔ بہرحال الناصر کی یہ کوشش مغرب کی خارجہ پالیسی کے سبب کامیاب نہیں ہو سکی۔

(cf. Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, pp.65-67)

بازنطین سے تعلّقات: سرد جنگ کی پالیسی کے تحت صرف عالمِ اسلام سے ہی تعلقات کشیدہ نہ تھے بلکہ مشرقی عالمِ عیسائیت بھی اسی پالیسی کا شکار رہا۔ بازنطین نے بار بار تعلّقات استوار کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہ ہو سکی، کیونکہ ہر مرتبہ مغرب نے مشرقی عالمِ عیسائیت سے اپنی برتری تسلیم کروانے پر اصرار کیا۔ جس عہد میں خلیفہ الناصر کے سفیر اوتو کے دربار میں پہنچے، تقریباً اسی عہد میں اوتو کے سفیر بشپ لیوت پرانت (Liut Prand) نے بازنطینی شہنشاہ 'نائسفورس فوکاس' [Nicephorus Phocas] کے دربار میں حاضری دی۔ بشپ مذکور نے مشرقی کلیسا کے عہدہ داروں کی ہتک اور توہین میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، درباریوں سے تلخ کلامی کی اور شہنشاہ سے نہایت ہتک آمیز رویّہ اختیار کیا۔ **[For details confer Toynbee; A Study of History, Vol. VI)]**۔ اسی قسم کی ایک سفارت پوپ کی جانب سے ۱۰۵۴ء میں شہنشاہ بازنطین کے دربار میں پہنچی تا کہ نارمن خطرے کے خلاف مشترکہ دفاع کیا جا سکے۔ سفارتی وفد کے سربراہ کارڈینیل ہمفرت نے واضح طور پر قسطنطنیہ کے اسقفِ اعظم پر الزام تراشی کی۔ پوپ کا اسی دوران انتقال ہوگیا۔ بشپ مذکور نے متوفی پوپ سے منسوب ایک حکمنامہ قربان گاہ پر رکھ دیا جس کی رو سے اسقفِ اعظم اور اسکے پیروؤں کو

انکی بدعقیدگی کی بنا پر انکے عہدوں سے برطرف قرار دیا گیا۔ جواباً اسقفِ اعظم نے پوپ کے نمائندے کو جعلساز ٹھہرا کر مزید گفت وشنید سے انکار کر دیا۔

صلیبی جنگوں کے دوران مغربی اور مشرقی عالمِ عیسائیت میں کشیدگی اپنی انتہا پر پہنچ گئی۔ رومن کیتھولک چرچ نے مشرقی عالمِ عیسائیت کے خلاف بھی اتنا پروپیگنڈہ کیا تھا کہ مغربی افواج اس علاقے کو مسیحی نہیں بلکہ بے دینوں کا علاقہ تصور کرتی تھیں اور اس علاقے سے گزرتے ہوئے ایسی ہی کارروائیاں کرتیں، جیسی دشمن کے علاقے میں کرنے کا رواج تھا۔ صلیبی افواج کی اس بے راہ روی کے باعث شہنشاہ بازنطین کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ انہیں اپنے علاقے سے دور رکھا جائے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۹۴)

مغرب کی اس سیاسی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھی صلیبی جنگ، بجائے مسلمانوں کے، خود مشرقی مسیحی دنیا سے لڑی گئی۔ صلیبی افواج نے ۱۲۰۳ء میں قسطنطنیہ فتح کر ڈالا۔ اس کے علاقے ہتھیائے۔ قتل اور غارتگری کا طوفان برپا کیا، اور ۱۲۰۴ء میں بازنطینی شہنشاہیت کی جگہ لاطینی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔

(cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p.194)

سیاسی عزائم: مغرب کی آزادی کے بعد اس کے دو عظیم مقاصد تھے۔ اولاً یہ کہ مغرب کا کھویا ہوا علاقہ بازیاب کیا جائے۔ (cf. Grunebaum; Mediaeval Islam, p.6)۔ اور ثانیاً یہ کہ دنیا کو کیتھولک بنایا جائے۔

یہ دونوں عزائم بلا جارحیت اور تند و تیز پروپیگنڈے کے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے مغربی جارحیت کو مذہبی جواز عطا کیا گیا۔ (cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p.194)۔ عیسائیت میں خونریزی کی گنجائش نہیں تھی۔ کلیسا نے 'مقدس جنگ' کا نعرہ بلند کر کے جنگ کو مذہبی فریضہ بنایا۔ کلیسا کے اس نعرۂ جنگ نے رومن جارحیت اور جرمن اقوام کی فطری جنگجوئی کو ہوا دیکر شعلہ بنا دیا۔

توریت نے بنی اسرائیل میں احساسِ برتری پیدا کرنے کے لیے انہیں خدا کی محبوب قوم ٹھہرایا تھا۔ پوپ اربن نے مغربی نسل پرستی اور احساسِ برتری کو پناہ دینے کے لیے یہ لقب فرینک (Franc) قوم کو منتقل کر دیا، اور فرینکس کو مسیحی دنیا کی قیادت سونپتے ہوئے انہیں خدا کی پسندیدہ قوم (Chosen People) قرار دیا۔

(cf. Toynbee; A Study of History, Vol. I, p.212)

کھوئے ہوئے علاقوں پر استحقاق اور انکی بازیابی کی تڑپ زندہ رکھنے کے لیے ارضِ مقدس (فلسطین) کو بارگاہِ خداوندی (Terra Sua) کہا گیا۔ رومن کیوریا (Roman Curia) ہر اس خطہ کو جو کبھی عیسائیوں کے قبضے میں رہ چکا ہو سینٹ پیٹر کا علاقہ (St. Peter's Land) کہتا۔ سینٹ پیٹر کا مقبرہ چونکہ روم میں واقع ہے، لہٰذا اس کے حوالے سے یہ تمام علاقے مغرب کی ملکیت ٹھہرائے گئے۔

(cf. Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, p.115)

ان علاقوں کی بازیابی کو ہر عیسائی کے لیے مقدس فریضہ قرار دیا گیا۔ چونکہ ان علاقوں پر مسلمان قابض تھے لہٰذا وہ دشمنِ مسیح، دشمنِ عیسائیت یا سیاسی زبان میں دشمن قرار پائے۔ ان کو اور انکے دین کو تباہ کرنا قومی مقصد ٹھہرا (حوالہ بالا، صفحہ ۵۱) عیسائیوں کو مسلمانوں کے مکمل بائیکاٹ کا حکم دیا گیا۔

پوپ کلیمنٹ پنجم نے عیسائی حکمرانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے علاقوں میں اذان کی آواز نہ بلند ہونے دیں کیونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کا نامِ نامی بلند کیا جاتا ہے جسے عیسائی بھی سنتے ہیں۔ اسی پوپ کے نزدیک غرناطہ میں مسلمانوں کا وجود خالق کی توہین کے مترادف تھا۔ (حوالہ بالا صفحات ۲۵۲، ۲۵۵، ۲۵۶)

ابتداً سرد جنگ کی یہ پالیسی دفاعی مقصد کے لیے وضع کی گئی تھی، لیکن چونکہ سیاسی پالیسی کو مذہب کا رنگ دیا گیا تھا اور مذہب جس چیز کو ایکبار عقیدے کی حیثیت سے اپنا لے اسے ترک کرنا پھر ممکن نہیں رہ جاتا، لہٰذا سرد جنگ مغرب کی ناقابلِ تبدیل پالیسی بن گئی۔ اسی سرد جنگ کا شکار بازنطین بھی ہوا۔

مختصراً اسلامی اقدام کے باعث اوّلاً مغرب سخت سیاسی انتشار کا شکار ہوا۔ رومن ایمپائر ختم ہوئی، عیسائی دنیا اپنے بڑے حصے سے محروم ہوکر دھڑوں میں بٹ گئی اور اسے صدیوں سرد جنگ میں گرفتار رہنا پڑا۔

سرد جنگ کی بدولت اقتدار رومیوں سے جرمنوں کو منتقل ہوگیا۔ رومن معاشرے پر جمود طاری ہوگیا، اور وہ دورِ تہذیب سے دورِ بربریت میں لوٹ گیا۔ مغربی سیاست کے افق پر نیم وحشی اقوام، فرینک، جرمن، سیکسن، نارمن، برگندی اور ولندیزیوں کی سیادت قائم ہوگئی۔

مذہبی اثرات

قدیم رومن معاشرے کی اجتماعی عصبیت کا مرجع روم اور شہنشاہ تھے، جنکی پرستش ہوتی تھی۔ مذہب کے معاملے میں یہ معاشرہ روادار تھا اور ہر مذہب کو آزادی تھی۔ نئے عقائد اور نئے مذاہب کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

(cf. Cyril Bailey; The Legacy of Rome, article 'Religion and Philosophy')

عیسائیت کا بھی رومیوں نے حسبِ دستور خیر مقدم کیا۔ تاہم من وعن تسلیم کرنے کے بجائے اپنے قومی مزاج کے مطابق ڈھال کر، رومن کیتھولک کے نام سے قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت کو اپنے حلقۂ اثر کی توسیع میں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اگر مزاحمت تھی تو سیاسی تھی۔ جب کلیسا نے شہنشاہ سے سیاسی مصالحت کر لی تو یہ مزاحمت بھی ختم ہوگئی، اور عیسائیت کو ملک کے سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوئی۔

جب مغربی کلیسا نے کیتھولک اقتدار کے لیے رومن ایمپائر کو ختم کیا اور مغربی معاشرے کو از سرِ نو اپنے نظریاتی خطوط پر استوار کیا، (cf. Kenith Neil Cameron; Humanity and Society, p.271) تو کلیسا اچھی طرح جانتا تھا کہ رومن ایمپائر کی جگہ مسیحی مغرب کا قیام صرف نظریاتی قوت کی بدولت ممکن ہو سکا تھا۔ اس لیے ناقابلِ عبور نظریاتی خطوط پر سرحدوں کا قیام، اور انکی حفاظت کی اہمیت کلیسا کی نظروں سے مخفی نہیں تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے مذہبی رواداری ختم کی۔ وطن اور شہنشاہ سے وابستگی اور عصبیت کو مذہب

کی جانب منتقل کیا۔ انسان کی تقسیم صرف دو طبقات مسیحی اور غیر مسیحی میں کی ۔ [Hankle L.; Aristotle and the American Indians, p.IX] ۔ رنگ اور نسل کی برتری کو کیتھولک عقائد میں جگہ دی، جس کے باعث کیتھولک عیسائیوں کو دیگر عیسائیوں پر اور مغرب کو تمام نسلِ انسانی پر برتری کا تصوّر ملا۔

(Pollard G.E.; Objections to the Roman Catholicism, p.162)

نظریاتی سرحدوں کی حفاظت : کلیسا نے مغربی معاشرے کو رومن کیتھولک نظریات کا سختی سے پابند کیا۔ یہ نظریات بنیادی طور پر لاطینی تھے، جو مغرب کی حدود سے باہر خود عیسائی دنیا کے لیے اجنبی اور ناقابلِ قبول تھے۔ ان نظریات کیخلاف مصر اور شام میں وقتاً فوقتاً بڑی شدید قسم کی تحریکیں اٹھ چکی تھیں ۔ [For details, (Millman; Latin Christianity, Vol. I, Introduction)] ۔خود مغرب میں بے شمار فرقے ابھرے جو رومن کیتھولک نظریات سے متفق نہیں تھے، اور انہوں نے رومن کیتھولک نظریات کے خلاف تحریکیں چلائیں۔ مثلاً سوسائٹی آف جیسس (Society of Jesus)، جسے لویولا نے قائم کیا، تھیٹین تحریک [Theatines Movement] ، جسے ویرونا (Verona) نے رومی کلیسا کے خلاف چلایا، اناباپٹسٹ (Anabaptist)، سینٹ بارتھولومیو اور البی جینس تحریکیں، بوہیمیا میں ہُس کی تحریک، انگلستان میں وے کلف کی، اور بالآخر لوتھر کی تحریک، جن میں سے صرف لوتھر کی تحریک سازگار ماحول کے سبب بارآور ہوسکی، ورنہ ہر تحریک کو شعلۂ وشمشیر سے ختم کر دیا گیا۔ (Henry Pirenne; A History of Europe, pp.297, 404, 415, 561, 565)

یہ ساری کارروائی کلیسا کے نظریات کی حفاظت کے لیے کی گئی، کیونکہ نظریاتی اختلافات کے لیے مغربی کلیسا میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ (Mayer F.E.; The Religious Bodies of America, p.107)

نظریاتی اختلاف کلیسا سے بغاوت کے مترادف تھا۔ اس اختلاف کا نام بدعت (Heresy) رکھا گیا۔ یہ ایک ایسا لفظ تھا کہ اگر کسی فرد یا گروہ پر اسکا اطلاق ہوجاتا تھا تو زمین اس پر تنگ ہوجاتی۔ اسکا خون مباح ہوجاتا۔ بدعتی کو 'زمین کی پلیگ' (Land Plague) اور 'عوام پر وبال' (Public Nuisance) کہا جاتا۔ (W. Stark; The Sociology of Religion, Vol.III, p.328)۔

بدعتیوں کے محاسبے کے لیے صدیوں دارو گیر (Inquisition) جاری رہی، جس میں لاکھوں افراد کی روح کو مردود قرار دیکر چرچ نے حکومت کے حوالے کیا تاکہ انکا بدن تباہ کر دیا جائے۔

(Henry Pirenne; A History of Europe, p.298)

بدعت کے نام پر جن مسائل کا سامنا تھا وہ سب ایسے تھے جو مغرب میں نہ سہی لیکن مسیحی دنیا میں کہیں نہ کہیں مسلّمہ تھے۔ یہ مسائل ایسے تھے جن کو برداشت کر لینے سے مذہب پر تو کوئی آنچ نہیں آتی تھی، لیکن کلیسا ان کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا تھا۔ جب ان معمولی اختلافات پر قتل و غارتگری ہوسکتی تھی تو وہ عقائد جو اسلام پیش کر رہا تھا کیتھولک دنیا کی نظریاتی حدود میں کیسے برداشت کیے جاسکتے تھے۔

عیسائیت کو اسلام سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ یہ ان کے طاقتور دشمنوں کا مذہب تھا۔ ہلینک اور رومن معاشروں سے جداگانہ، سامی معاشرے سے ابھرا تھا، جو مسیحی تہذیب سے برسرِ پیکار تھا۔

اسلام اور عیسائیت کے متضاد عقائد

اسلام میں پیشہ ور مذہبی طبقے یا چرچ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہاں ہر فرد بلا کسی پنڈت، ربی، قسیس یا پادری کے اپنا تعلّق پروردگار سے قائم کر سکتا تھا۔ عالمِ اسلام کا ارتقاء اور معاشرتی امن یہ ثابت کر رہا تھا کہ معاشرہ بلا چرچ بھی قائم رہ سکتا ہے۔ رہبانیت بھی اسلامی عقائد سے یکسر خارج تھی۔ اسلام کے نزدیک ترکِ دنیا ذمہ داریوں سے گریز کا نام تھا۔ دنیا کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ دین کی خدمت کی جا سکتی تھی۔

اسلام کا یہ قوی تصوّر کہ انسان پروردگار سے راست تعلّق پیدا کر سکتا ہے، مغربی مفکّرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں ناکام نہیں رہا۔ عہدِ وسطیٰ میں اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ سسلی کے نارمن حکمراں فریڈرک ثانی نے مسلم اثرات کے سبب ہمیشہ پوپ سے ٹکر لی۔ فرانس کے ہنری نے پوپ کے خلاف بارہا اقدام کیا۔ مغرب میں کلیسا کے تسلّط کے خلاف بارہا بے چینی پھیلی۔ یورپ کے عوام نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ مذہب کلیسا کے اندر پیشہ ور گروہ (Clergy) کا قیدی بن گیا ہے۔ [The Concise Encyclopedia of the Living Faiths] ۔عوام میں ایک تحریک پیدا ہوئی جسے پائٹیزم (Pietism) کہا جاتا ہے، جس نے مذہبی زندگی کا مرکز کلیسا کو بنانے کے بجائے گھر کو بنا دیا۔

اسی قسم کی ایک تحریک انگلستان میں چلی جسے میتھوڈسٹ (Methodist) کہا گیا۔ یہ لوگ اپنے عبادتی اجتماعات گھروں یا کھلے میدانوں میں کرتے تھے۔ (حوالہ بالا، صفحہ-۲۱)۔ چرچ اور رہبانیت دونوں کی سلامتی کا تقاضہ تھا کہ اسلام کے مذہبی اثرات کے نفوذ کو ہر قیمت پر روکا جائے۔ یہی وہ خطرہ تھا جو گبن کے اس مشہور تبصرے میں جھلکتا ہے کہ جنگِ طورس میں اگر مسلمان جیت جاتے تو شائد آکسفورڈ کی درسگاہوں میں قرآن اور حدیث کا درس جاری ہوتا۔

(cf. Gibbon; The Decline and Fall of Roman Empire, Vol VI, p.15)

توحید : اسلام توحیدِ مطلق کا قائل تھا جسمیں تثلیث کی کسی شکل میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں کسی دیوی، دیوتا، خدا کے بیٹے یا آدم-خدا کا وجود نہیں تھا۔ توحید اسلام کا منفرد عقیدہ تھا، جسکی کوئی نظیر یہودیت یا عیسائیت میں نہیں ملتی تھی۔ یہودیت کا تصورِ الٰہ عیسائیت میں اور بھی مسخ ہو چکا تھا، جبکہ اسلام نے نہ صرف عیسائیت کے تصورِ الٰہ کی نفی کی بلکہ یہود کے تصورِ الٰہ کو بھی اپنی گرد بنا دیا۔(M. Watt; What is Islam, p.17)

عیسائی عقیدہ تثلیث صدیوں کی جدّ و جہد اور خونی کشمکش کے بعد پروان چڑھا تھا۔ لاکھوں انسانی جانوں کو قربان کر کے مسیح کی الوہیت استوار کی گئی تھی۔ اسلام نے توحید کا نعرہ لگا کر مسیح کو از سرِ نو محض انسان اور پیغمبر بنا دیا، جس کے باعث کلیسا کے لیے پھر سے وہی مسائل پیدا ہونے کا خطرہ سامنے آ گیا، جن سے وہ اپنی ابتدائی صدیوں میں دوچار ہو چکا تھا۔

توحید کے منفرد عقیدے نے ارباب فکر کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ایک ایسا عیسائی فرقہ بھی پیدا ہوا جس کے عقائد میں وحدت الوجود کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ فرقہ اپنے بانی المارک (Almaric) سے منسوب ہو کر المورین (Almaurian) کہلایا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ،

''خدا ہر شے میں ہے۔ پس ہر شے خیر ہے۔ لہذا گناہ کا وجود نہیں۔ پس انسان جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔''

(Warner Stark; The Sociology of Religion, Vol. III, p.318)

توحید اسلام کی ایک ایسی داخلی قوت تھی جو عیسائیت کے بنیادی عقائد سے متصادم تھی۔ توحید اور تثلیث کی کشمکش سے عیسائیت کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ ماضی میں اس طاقت نے عالم عیسائیت کے امن کو بارہا تہ و بالا کیا ہے۔ یہ مسئلہ اس لیے اور بھی سنگین ہو گیا کہ تورات کے احکامِ عشرہ کا اوّلین حکم توحید تھا۔ عیسائیت کے دل میں یہ ایسا کمزور مقام تھا، جہاں یہود کے تیر و نشتر داخل ہو کر عیسائیت کے ضمیر کو ہمیشہ مجروح کرتے تھے۔ (The Consice Encyclopedia of the Living Faiths, p.70)۔ چونکہ یہود عیسائی معاشرے کی ایک بے دست و پا اقلیت تھے، اس لیے انکی آواز کو دبا دینا مشکل کام نہ تھا۔ لیکن اسلام کے نعرۂ توحید کے آگے کلیسا بے بس تھا۔ یہ نہ کسی بدعتی کی آواز تھی کہ کلیسا کا حکم یا تلوار اسے خاموش کر دے، نہ یہ کسی مجبور اقلیت کی مذہبی حمیت کا اظہار۔ یہ ایک ایسی عظیم خارجی قوت تھی جسکی حمایت کے لیے عظیم ملتِ اسلامیہ اور اسکے جید علماء کی فکر موجود تھی۔ نہ یہ قابلِ قبول تھی نہ اسکے قوی اثرات کو روکا جا سکتا تھا۔ چارۂ کار صرف یہ تھا کہ اسلام سے لوگوں کو اسقدر متنفر کیا جائے کہ اس کا ہر عقیدہ اس نفرت کی نذر ہو جائے۔

ذاتِ عیسیٰؑ : توحید کے بعد دوسرا اختلافی مسئلہ حضرت عیسیٰؑ کی ذات کا تھا۔ یہود کی نگاہوں سے عیسائیت اور موسویت کا تعلق پوشیدہ نہ تھا۔ ان کے نزدیک عیسائیت، یہودیت کی ایک گمراہ شاخ تھی، جس نے ناجائز طور پر اپنی چند تحریریں انکی مقدس کتب کے ساتھ منسلک کر دی تھیں۔

انکی نگاہ میں ایک یہودی ربی (Rabbi) کی پرستش، جسے عیسائیت نے ابن اللہ بنا لیا تھا، جو بطنِ انسانی سے پیدا ہوا، انسان کی حیثیت سے زندہ رہا اور انسان ہی کی طرح اٹھ گیا، ایک ملحدانہ، بت پرستانہ اور کافرانہ عمل تھا۔ (Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. X, p.257)۔ یہود کے اندازِ فکر کو ختم نہ کیا جا سکا تھا کہ اس کی تائید اسلام سے ہونے لگی۔ گو اسلام نے یہود کے برخلاف حضرت مریم کے تقدس کا اقرار کیا تھا، حضرت عیسیٰؑ کو برگزیدہ ترین پیغمبروں میں شامل کر کے بلند ترین انسانی مرتبہ دیا تھا، انکی رفعت کا اقرار کیا تھا، لیکن انکی الوہیت اور انکی مصلوبیت کا انکار کیا تھا۔

ایک مصلوبیت سے انکار کی بنیاد پر ہی عیسائیت کے بے شمار عقائد پر ضرب پڑتی تھی۔ جب مصلوبیت نہیں تو دوبارہ جی اٹھنا، آدم کے ازلی گناہ کے کفارہ میں قربان ہونا، شفاعت کے عقاید وغیرہ، گویا سب کے سب رد ہو رہے تھے۔ الوہیت، مصلوبیت اور حیات ثانی وہ بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر عیسائیت قائم ہی نہیں رہ سکتی۔

(Toynbee A.J.; Change and Habit, p.179)

ذاتِ عیسیٰ کے بارے میں اسلامی عقائد عیسائیت کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ یہ عقائد مغربی کلیسا کے لیے سمِ قاتل تھے۔

ثنویت : اسلام ایک دین ہے۔ ایک مکمل نظامِ حیات جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ انسان کی روح اور اسکا بدن دونوں ایک وحدت کی حیثیت سے دین کے احکامات کے تحت آتے ہیں۔ اسلام نفس اور بدن دونوں کے حقوق تسلیم کرتا ہے۔ یہاں نہ قوت کی ممانعت ہے نہ اقتدار کی مخالفت۔ زندگی کی نعمتیں اور مسرتیں بھی ممنوع نہیں، بشرطیکہ یہ سب اللہ کی قائم کی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اسلام نے جنس کو فطری تقاضے کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے تزوج کو ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن عقیدۂ ثنویّت کے تحت عیسائیت ان تمام کیفیات میں اسلام سے قطعاً مختلف تھی۔ یہاں روح ناپاک بدن میں مقیّد تھی۔ روحانی معاملات پاک اور بدنی معاملات ناپاک اور قابلِ نفرت تھے۔ اسی اعتبار سے روحانی اور دنیاوی دائرے جدا جدا تھے۔ زندگی اور دنیا کے دو حقدار تھے، 'خدا' اور 'قیصر'۔ دین اور دنیا میں بُعد تھا۔ جسم کو فنا کرنا، خود آزاری، لذّتوں اور نعمتوں سے گریز، نہ صرف اپنی ذات بلکہ ساری دنیا سے نفرت، ترکِ دنیا، اور دنیاوی معاملات سے بے تعلّقی، یہ سب نیکی کے کام تھے۔

(cf. Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. VI, p.77-78)

یونانی نظریات کی رو سے بدن کی تذلیل، اور اسے ہر قسم کی آسائش سے محروم رکھنا تزکیۂ روح کے لیے ضروری تھا۔ (Montgomery Watt; What is Islam, p.230)۔ نیز اتفاقاً حضرت عیسیٰ مجرّد، محصور اور غیر متاہل تھے، لہٰذا جنس کو عیسائیت نے ہر صورت میں ایک سفلی جذبہ تصور کیا۔

(Radha Krishnan; Religion in a Changing World, pp.114-115)

اس نے تجرّد کی اہمیت میں اسقدر مبالغہ کیا کہ شادی کرنے، گھر بار سنبھالنے، اور بچّوں کی پرورش کو بھی پاکبازی کے خلاف قرار دیا۔

(Jones A.N.M.; The Decline of the Ancient World, p.121)

عیسائیت میں دنیاوی کاروبار کو بھی گناہ کا درجہ حاصل تھا۔ میدانِ جنگ میں دشمن کو مارنے والا سپاہی قاتل تھا۔ قتل کے مقدمے میں ملزم کی پیروی کرنے والا وکیل بھی قاتل گردانا جاتا تھا۔ بارہویں صدی میں ایک پوپ نے اعلان کیا کہ،

''یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے دنیاوی عہدے حاصل کیے ہیں، وہ گناہ سے بری نہیں ہو سکتے۔''

(The Consice Encyclopedia of the Ancient World, p.121)

ایرانی عقائد اور یونانی فکر کے سہارے کلیسا نے بڑی جدّ و جہد کے بعد معاشرے کو دو جداگانہ دائروں میں تقسیم کر کے انمیں سے ایک پر تسلّط حاصل کیا تھا۔ اسی ثنویت کے طفیل کلیسا کی روحانی حکومت قائم تھی۔ اس کا

دائرۂ اقتدار عوام، حکومت اور ریاست کی دسترس سے باہر تھا۔ اسی کے طفیل اسے ان سب پر برتری حاصل تھی۔ اسی ثنویت کو اسلام سے خطرہ تھا۔

گناہِ آدم اور نجات : اسلام میں گناہِ آدم ایک انفرادی فعل تھا جو مشیت ایزدی کے تحت انجام پایا۔ اس کے اثرات اس کے فاعل تک ہی محدود رہے، اور استغفار کرنے پر یہ گناہ بخش دیا گیا۔ اس سے نسلِ انسانی متاثر نہیں ہوئی۔ اسلام کے نزدیک انسان پیدائشی گناہگار نہیں بلکہ پیدائش کے وقت یہ بے گناہ اور معصوم ہوتا ہے۔ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اپنے اعمال کے مطابق یا تو نکوکار رہتا ہے یا گناہگار بنتا ہے۔

عیسائیت نے گناہِ آدم پر مبنی اپنا ہی ایک فلسفۂ نجات ترتیب دیا۔ اس کے نزدیک آدم کے گناہ کے سبب ہر انسان گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ زوالِ آدم نے انسانی فطرت کو اس طرح مسخ کر دیا تھا کہ اس سے سوائے گناہ کے کچھ اور سرزد ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس ازلی گناہ سے انسان کو بری کرنے کے لیے خدا نے پہلے تو ایک فرزند پیدا کیا، پھر اسکو زمین پر بھیجا تا کہ وہ صلیب پر چڑھ کر قربانی دے جو بنی آدم کے گناہوں کا مجموعی کفارہ بن سکے۔ پھر اس کفارے کے سبب انسان کو راہ نجات ملی۔

اسلام نے گناہِ آدم کو غیر موروثی قرار دیکر عیسائی نظریۂ نجات کے تار و پود بکھیر دیے۔ نہ انسان پیدائشی گناہگار رہا نہ اسکی مفروضہ آلودگی کے کفارے کی کوئی ضرورت رہ گئی۔ قربانی کا نظریہ ایک کہانی بن گیا، جو باعثِ نجات نہ بن سکتی تھی۔

اس مسیحی عقیدے کی رو سے نجات کا انحصار حضرت مسیحؑ کی الوہیت تسلیم کرنے پر تھا۔ جس نے انکی الوہیت تسلیم کی وہ بلا شرطِ عمل نجات کا مستحق بن گیا۔ (cf. G.E. Grunebaum; Islam, p.139)۔ جس نے روگردانی کی وہ نجات سے محروم ہوا۔ اسلام میں نجات کا انحصار ایمان لانے کے بعد نیک اعمال کرنے پر تھا یا پھر اللہ کی رحمت پہ کہ وہ اپنے فضل سے جسے چاہے بخشدے کہ وہ غفور الرحیم ہے۔

اسلام کا منطقی نظریۂ نجات مغرب کے لیے خاصا پرکشش تھا۔ اس نے مغربی مفکرین کو خاصا متاثر کیا۔ سولھویں صدی کے مفکرین مسئلۂ نجات پر بڑی سرگرمی سے بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ کلیسا کے قدیم عقیدۂ نجات میں وہ نیک اعمال اور خدا کی رحمت کی شمولیت کو بھی ضروری قرار دینے لگے۔

لوتھر (Martin Luther) کے مطابق نجات کا انحصار ایمان کے بعد رحمتِ خداوندی پر تھا۔ اس نے دعویٰ کیا،

''انسانی فطرت زوالِ آدم کے سبب اس قدر مسخ ہو چکی تھی کہ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہ تھا کہ انسان شر کے سوا کچھ اور کر سکے۔ لہٰذا نجات کے حصول کے لیے صرف یہی رہ گیا تھا کہ مسیح (کے کفارہ) کی بدولت نجات پر پختہ یقین رکھے۔ اور نہ صرف خود کو اپنے اعمالِ ناجیہ کے ساتھ خدا کے سپرد کر دے بلکہ یہ اعتراف بھی کرے کہ کسی انسان کے لیے اس معاملے میں عملی حصہ لینا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ پوری نوعِ انسانی مردود ہو چکی تھی اور

(The Consice Encyclopedia of the Living Faiths; p.154)

لوتھر کے اس نظریے سے کالون (John Calvin) متفق نہ ہوسکا۔ اس کے نزدیک نجات محض ایمان کی بدولت میسّر نہیں آسکتی تھی۔ اس کے لیے اعمالِ صالحہ ضروری تھے۔ اس نے اعلان کیا،

''کیا ہم یہ یقین کرسکتے ہیں کہ نجات نیک اعمال کیے بغیر محض ایمان کے سبب میسّر ہوجائے گی۔ یہ بات ناممکن ہے کیونکہ یسوع مسیح پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہم نے ویسا ہی قبول کیا جیسا اس نے خود کو پیش کیا۔ اب اس کا وعدہ صرف یہی نہیں کہ موت سے ہمیں چھڑائے گا اور اپنی معصومیت کے طفیل خداوند پدر کے سایۂ رحمت میں جگہ دیگا بلکہ یہ بھی ہے کہ مقدس زندگی گزارنے کے لیے ہمیں اپنی رحمت سے دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔''

(حوالہ بالا، صفحہ ۱۵۵)

لوتھر اور کالون دونوں کے ہی نظریات کیتھولک عقیدۂ نجات سے متعارض تھے۔ لوتھر کے نزدیک نجات رحمت پر اور کالون کے نزدیک عمل پر منحصر تھی۔ جبکہ کیتھولک عقیدے کی رو سے نجات کے لیے محض مسیح پر ایمان ہی کافی تھا۔ اس اختلافی مسئلے نے اس قدر اہمیت حاصل کی کہ اس پر غور اور حتمی فیصلہ کرنے کے لیے ۱۵۶۳ء میں اربابِ کلیسا نے کونسل آف ٹرائنٹ طلب کی، جس نے پھر وہی قدیم فیصلہ دیا کہ ''فطری اعمالِ خیر اور شریعتِ موسوی کی پابندی بجائے خود نجات نہیں دے سکتے۔ نجات صرف مسیح کے توسّط سے میسّر آسکتی ہے''۔

(حوالہ بالا، صفحہ ۱۵۵)

کونسل آف ٹرائنٹ (Council of Trient) کے مندرجہ بالا فیصلے نے مسئلے میں اور بھی تندی اور تیزی پیدا کردی۔ لوتھر ڈٹ کر کیتھولک کلیسا کے مقابلے میں آگیا۔ پروٹسٹنٹ کلیسا قائم ہوا اور مغرب مذہبی خانہ جنگی میں مبتلا ہوگیا۔

کتبِ سماوی : عیسائیت اناجیلِ اربعہ اور یہود کی کتب کو صحفِ سماوی تسلیم کرتی ہے اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی مدّعی ہے۔ جبکہ اسلام اس عقیدے کا حامل ہے کہ یہ کتب ادوارِ سابق کے لیے تھیں لیکن قرآن کے نازل ہونے کے بعد تمام قدیم کتبِ سماوی منسوخ ہوگئی ہیں۔ اب انہیں اس حد تک تو تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان ناموں کے صحائف کا نزول ضرور ہوا تھا، مگر رسالتِ محمدی سے قبل ہی کامل صحت کے ساتھ انکا کوئی نسخہ نہیں پایا جاتا تھا، اور تمام دستیاب نسخے تحریف وتصریف کا شکار تھے۔ اسلام کے مطابق ان ناموں کی کتب کا منزل من اللہ ہونا تو جزوِ ایمان تھا لیکن مروّجہ نام نہاد صحفِ سماوی پر عمل پیرا ہونا منشائے الٰہی کے خلاف تھا۔

عبادت : عیسائیت میں عقائد میں شدید اختلاف کی طرح طریقۂ عبادت میں بھی اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے کہ ہر فریق دوسرے فریق کی عبادت کو فعلِ عبث تصوّر کرتا ہے۔ اسلام میں بندے کا معبود سے راست تعلق ہوتا ہے جبکہ عیسائیت میں ایک درمیانی رابطے کے بغیر یہ تعلق ممکن نہیں ہوسکتا۔ اسلام میں عبادت کے لیے ساز وآہنگ ممنوع ہیں جبکہ عیسائیت میں انکا شمار عبادت کے لوازمات میں ہوتا ہے۔ اسلام میں شراب

ایسی نجاست ہے کہ اگر کپڑوں میں لگی ہو تو نماز نامقبول ہوتی ہے جبکہ عیسائیت میں شراب ایسی مقدس ہے کہ عشائے ربانی کی تکمیل بلاشراب کے نہیں ہوسکتی۔

شعار اور رسوم: عیسائیت کا مذہبی شعار صلیب ہے جبکہ اسلام کا کوئی شعار یا علامت نہیں ہے۔ عیسائیت میں ہفتے کا ایک دن سبت مقرر رہے، کیونکہ تخلیق سے تھک کر اس دن خالق کائنات نے (نعوذ باللہ) آرام کیا تھا۔ جبکہ اسلام خالق کائنات سے اس قسم کی کوئی کمزوری وابستہ نہیں کرتا۔ عیسائیت کے مذہبی تہواروں کو اسلام کوئی اہمیت نہیں دیتا، نہ ہی انکے ایام کے تقدس کا قائل ہے۔

عیسائیت میں ارباب کلیسا کو یہ اختیار ہے کہ وہ گناہگاروں کے گناہ معاف کر سکتے ہیں۔ اسلام اس قسم کا کوئی اختیار کسی کو نہیں دیتا ہے۔ گناہوں سے معافی کے لیے بندے کو صدق دل سے براہ راست اپنے رب کے حضور توبہ کرنی پڑتی ہے اور آئندہ گناہوں سے باز رہنے کا عہد کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ صرف توقع رکھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکی توبہ قبول کر کے اس کے گناہوں کو معاف فرما دیں گے۔

ان سب اختلافات سے بڑھ کر یہ کہ اسلام میں قانون کا سرچشمہ صرف اللہ اور اسکا رسول ﷺ ہیں۔ کسی فرد یا جماعت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون بنا سکے۔ لیکن عیسائیت میں پوپ اور اسکی مجلس کو قانون سازی کے مکمل اختیارات حاصل ہیں، اسکا حکم انسانی حکم نہیں بلکہ آسمانی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔

عقائد کے یہ اختلافات ارباب فکر کو موازنے کی دعوت دیتے رہے، جس کے باعث عیسائی معاشرے میں بے چینی پھیلتی رہی۔ ارس (Arrus) جیسے فرقے ابھرے جن کے نزدیک بپتسمہ بے فائدہ ہوتا ہے، نااہل پادریوں سے کوئی مقدس کام نہیں ہوسکتا، عشائے ربانی ایک فضول رسم ہے، آخر مسیح کا بدن کتنی روٹیوں میں تقسیم ہوسکتا ہے۔ گناہ کے اقرار سے گناہ کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ کلمات کا ورد فضول ہے، اصل اہمیت تو اعمال کی ہے۔ چرچ سوائے پتھروں کے ڈھیر کے کچھ بھی نہیں ہے۔ صلیب انسانی ہاتھوں کی صنعت کے سوا اور کیا ہے؟ نجات رسوم سے نہیں بلکہ صرف عمل کے ذریعے ہوگی۔ (W. Stark; the Sociology of Religion, p.322)۔

یہ تھے وہ مذہبی اثرات جنہوں نے عہد وسطیٰ میں مغربی معاشرے کو متلاطم رکھا۔ کلیسا کے لیے مسائل پر مسائل پیدا کیے۔ کلیسا کے خلاف تحریکوں میں شدت پیدا ہوئی۔ مذہبی اصلاحات کے مطالبات اٹھے۔ کالون اور لوتھر نے پوپ اور کیتھولک عقیدوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ لوتھر نے ۱۵۱۷ء میں پوپ کے معافی ناموں کی فروخت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وٹنبرگ (Wittenberg) کے چرچ کے دروازے پر پچانوے [۹۵] اعتراضات کی ایک دستاویز آویزاں کی۔

(cf. George Pearson; Towards One World, p.6)

چرچ نے اسے بدعتی قرار دیکر مذہب سے خارج قرار دیا۔ جب اصلاحات کے مطالبات باقتدار چرچ نے تسلیم نہیں کیے تو مصلحین کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا کہ جداگانہ حیثیت اختیار کر کے اپنے عقائد کی روشنی میں اپنی روش متعین کریں۔

لوتھر کے پروٹسٹنٹ چرچ کے قیام نے یہ واضح کر دیا کہ پوپ کا اقتدار جزوِ مذہب نہیں، اور عبادت بلا کسی مورت کے بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے لاطینی زبان کی بھی شرط نہیں۔ عقائد تبدیل ہو سکتے ہیں۔ گناہوں کی معافی کا اختیار اربابِ کلیسا کو نہیں ہے اور کفارے کے بغیر بھی توبہ ہو سکتی ہے۔

تحریکِ اصلاح میں اسلامی عقائد کے اثرات پوری طرح سے جھلکتے ہیں۔ اس تحریک کی وجہ سے پوپ کا اقتدار مجروح ہوا۔ پروٹسٹنٹ چرچ نے صحفِ سماوی کو من وعن تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں شامل کئی کتابوں کو (مثلاً مقابیوں کی پہلی اور دوسری کتاب) الحاقی [اضافی] کتب قرار دے کر انہیں عہد نامۂ قدیم سے خارج کیا۔ (The Concise Encyclopedia of the Living Faiths; p.118)

اس طرح اسلام کی وجہ سے مغربی معاشرے پر اس قدر شدید اندرونی اور بیرونی دباؤ پڑا کہ عہد وسطیٰ کے کیتھولک چرچ کے لیے اپنی بقا کی جنگ لڑنا ناگزیر ہو گیا۔

نفوذِ اسلام کے معاشی نتائج اور معاشرتی اثرات

مغرب کا تابناک ترین دور یا تو رومن ایمپائر کا زمانہ تھا یا دورِ حاضر ہے۔ رومن ایمپائر بنیادی طور پر ایک فوجی ریاست تھی، جس نے گرد و پیش کے علاقوں خصوصاً سامی تہذیب کے گہوارے پر قبضہ کر کے اسے بدترین استحصال کا شکار کر رکھا تھا۔ (Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. VI, p.202)۔

مقبوضہ صوبوں سے آمدنی: مقبوضہ صوبہ جات سے حاصل ہونے والے ٹیکسوں کے کچھ اعداد و شمار بابِ اول میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ اعادہ کرنا کافی ہوگا کہ مصر سے سولہ لاکھ [۱۶،۰۰،۰۰۰]، نومیڈیا سے اٹھتر ہزار [۷۸،۰۰۰] اور ماریطانیہ سے اکتالیس ہزار [۴۱،۰۰۰] سولیدی سالانہ ٹیکس وصول ہوتا تھا۔ (cf. Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.8)۔ دیگر ستانوے صوبوں کی آمدنی کے اعداد و شمار کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ان سترہ لاکھ سولیدی سے ساڑھے چار لاکھ فوج کی سالانہ تنخواہ ادا ہو سکتی تھی، تو بقیہ صوبوں، بشمول شام، عراق، فلسطین، اردن، لبنان، آرمینیا، ایشیائے کوچک وغیرہ کی آمدنی سے پوری رومن ایمپائر کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اطالیہ کے باشندے ہر قسم کے ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے۔

پوری ایمپائر میں باقاعدگی سے مردم شماری ہوتی تھی۔ ٹیکس دہندگان کے رجسٹر مرتب ہوتے تھے تاکہ کوئی شخص پول ٹیکس کی ادائیگی سے بچ نہ سکے۔ عیسائی روایات کے مطابق، حضرت عیسیٰ کی پیدائش اسی سال ہوئی جس سال رومن ایمپائر جودیہ میں مردم شماری کروا رہی تھی۔ اس مردم شماری میں حصہ لینے کے لیے انکی والدہ، مع دیگر افرادِ خاندان، بیتِ لحم (Betlehem) تشریف لے گئی تھیں، اور یہیں حضرت عیسیٰ کی پیدائش ایک غار میں ہوئی۔ (Fouard, Abbe Constant; The Christ The Son of God,pp.28-30)۔

دستور کے مطابق حضرت عیسیٰ کا اسمِ گرامی بھی اس مردم شماری یا اس کے بعد ہونے والی مردم شماری میں درج ہوا ہوگا۔ اور اگر انہوں نے بھی ٹیکس ادا کیا ہوگا تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رومن ٹیکس سے (نعوذ باللہ) فرزند خدا بھی مبرّا نہ تھا۔

پول ٹیکس سے زیادہ اہم ذریعہ آمدنی مال گزاری تھا۔ اگر مال گزاری کی شرح ہر صوبے میں یکساں تصور کر لی جائے، تو زمین کی تخمینی مالیت کا ایک فی صد سالانہ مال گزاری کی شکل میں وصول ہوتا تھا۔ زمین اور

نفوس کے علاوہ جائداد ٹیکس، تجارتی مال پر کسٹم اور بکری ٹیکس (Sales-Tax) بھی عائد تھے۔ ورثے میں منتقل ہونے والے اثاثوں پر پانچ فیصد وراثت ٹیکس لگتا تھا۔ [for details of taxes confer, Jones) (A.H.M.; The Decline of the Ancient World]۔ غرض یہ کہ رومن ایمپائر کے اخراجات کا بار ایشیائی اور افریقی مقبوضات پر تھا۔(Keith Neil Cameron; Humanity and Society, p.198)

غلّے کی درآمد : رومن نظم ونسق کے ذمہ دار محکموں میں ایک محکمہ (The Praefactus Annonee) کہلاتا تھا۔ اس محکمے کے ذمّے افریقہ اور مصر سے غلّے کا حصول، اسکی بار برداری، حمل ونقل اور روم میں اسکی تقسیم تھی۔ (Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World,p.17)۔ شہر قسطنطنیہ کی ضروریات کی تکمیل کا انحصار شام کے غلّے کی درآمد پر تھا۔ مغرب، بشمول یونان، غلّے میں خود کفیل نہیں تھا۔ قدرتی وسائل کی کمی کے سبب، پورا یورپ زیادہ سے زیادہ تجارت کی کوشش کرتا تھا۔ اسلامی دور میں مغرب غلّے کی درآمد سے اس وقت تک محروم رہا جب تک مصر سلطنتِ عثمانیہ کا صوبہ نہیں بن گیا۔ [Cook, M.A.; 1974 ed., Legacy of) (Islam, article 'Economic Development', p.225]

رومن معیشت اور غلام : رومن معیشت کا انحصار غلاموں کی جبری مشقت پر تھا۔ پیداواری لاگت کم کرنے کے لیے زمین پر آزاد کسانوں کے بجائے غلاموں سے مشقت لی جاتی تھی۔ رومن معیشت میں غلام ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ رومن فوج کے لیے ہتھیاروں کی تیاری، کانکنی، کچ دھاتوں کا نکالنا، اسے پگھلانا، گڑھنا اور ہتھیار بنانا، سب کچھ غلاموں کا کام تھا۔ مشہور رومی شاہراہیں، جن پر رومی افواج رواں دواں رہتی تھیں، ان ہی غلاموں کی تیار کردہ تھیں۔ روم کی تمام عمارتیں، اکھاڑے، غسل خانے، نہریں اور بدرویں، سب کی سب غلاموں کی محنت کا نتیجہ تھیں۔ روم کی تجارت میں بھی غلاموں کی محنت کو بڑا دخل تھا۔ سڑکوں پر قافلوں کا سامان غلام ہی لیکر چلتے تھے۔ بندرگاہوں میں حمل ونقل، باربرداری اور جہازوں کو کھینے کا کام غلام ہی کرتے تھے۔ لیکن چونکہ غلاموں کی نسل بڑھنے نہیں دی جاتی تھی، اس لیے ملک ان کی مستقل درآمد کا محتاج تھا۔ انکی درآمد زیادہ تر افریقہ اور ایشیا سے ہوتی تھی۔ غلاموں کی تجارت بھی روم کی اقتصادیات کا اہم جزو تھی۔ غلاموں کی بدولت ملک کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا تھا جو بغیر محنت کیے زندگی بسر کرتا تھا۔ امرائے سلطنت، سینیٹرز، ان کے اہلِ خانہ، فوج، فوجی گھرانے، افسران و ملازمینِ سرکار، کلیسا کے ارکان، دارالحکومت کے شہری، دلّال وغیرہ سب کے سب غلاموں کی محنت پر پلتے تھے۔ ہر میدان میں غلاموں کا تناسب آزاد شہریوں کے مقابلے میں نوّے فیصد تھا۔

(Keith Neil Cameron; Humanity and Society, p.187)

زراعت، صنعت اور تجارت : مغربی رومن ایمپائر میں قابلِ کاشت زمین کم تھی۔ جرمنی اور فرانس کا علاقہ محض جنگلات کا خطّہ تھا۔ ساحلِ بحرِ روم پر کاشت ہوتی تھی۔ یہ کاشت عام طور پر ان اشیاء کی ہوتی تھی، جو تجارت اور صنعت کے لیے درکار تھیں۔ انگور اور زیتون بنیادی پیداوار تھی، جو اطالیہ کی بندرگاہوں سے مقبوضات (Colonies) کو برآمد کی جاتی تھی جبکہ مقبوضہ جات سے غلّہ، کپڑا، دھاتیں، مصالحہ جات خوشبویات، روئی،

ریشم، شہد، انجیر، پنیر اور جانور وغیرہ درآمد کیے جاتے تھے۔ اس طرح مغرب کی تجارت خسارے کی تجارت تھی۔ لیکن یہ خسارہ مقبوضات کے ٹیکسوں سے پورا ہو جاتا تھا۔ اس تجارت نے ملک بھر میں سڑکوں کا جال بچھا دیا۔ جہاز رانی کو ترقی دی۔ بارونق بندرگاہیں، تجارتی شہر، کارخانے، بازار، گودام، صرّافہ اور ان سے متعلق دیگر عمارتوں کی تعمیر کروائی۔ صنعتوں میں اسلحہ سازی، پارچہ بافی، جہاز سازی، شراب سازی، تعمیرات، رنگریزی، اون اور چمڑے کی اشیاء کی صنعت، ظروف سازی، مجسّمہ سازی اور سنگ تراشی کو عروج حاصل تھا۔

اقتصادی دباؤ : رومن اقتصادیات کا انحصار استحصال پر تھا۔ اس استحصال کے تین اہم عنصر تھے۔ فوج، تاجر اور غلاموں کے آقا۔ فوج نے سامی تہذیب کو پنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اس کے بل پر رومن ایمپائر مقبوضات سے کمر توڑ ٹیکس وصول کرتی تھی۔ تاجر اس وصول کردہ مالیہ کو گردش دیتا تھا، اور سامی تہذیب کی پیداوار من مانے داموں پر خرید کر لاتا تھا۔ مغربی تاجر کے پاس تجارت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے شراب اور زیتون کے تیل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آقا اپنے غلاموں سے عمر بھر کام لیتا تھا، انہیں جانوروں کی طرح پابہ زنجیر رکھتا تھا اور ان کی نسل کو بڑھنے نہیں دیتا تھا، تاکہ وہ رومن معاشرے میں جذب ہو کر شہریت کا دعویٰ نہ کر سکیں۔ (cf. Cameron; Humanity and Society, p.176)۔ ایک ایک آقا کے پاس غلاموں کی ایک فوج ہوتی تھی، جس کی کمائی کے بل بوتے پر وہ زندہ رہتے تھے۔ ان غلاموں کے انسانی حقوق تو کجا، ان میں روح کی موجودگی کو بھی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ [("*Niggers have no Souls*", quoted by Toynbee

[A.J.; 'A study of History', Vol I, p. 152)

نفوذِ اسلام سے قبل سامی تہذیب نے ہیلا (Hella) کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی بارہا کوشش کی جو ہمیشہ ناکام ہوئی۔ اسلام نے سامی تہذیب کے علاقوں کی جانب فاتحانہ پیش قدمی کی تو سامی تہذیب نے اسے خوش آمدید کہا اور ہلینک غلامی کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا۔

سامی علاقوں کے گرفت سے نکلتے ہی ہلینک دنیا اپنے ہزار سالہ قدیم استحصالی وسائل سے محروم ہوگئی۔ فوج شکستیں کھا کر اپنے علاقے میں پسپا ہوگئی، جس کے سبب مقبوضات کے ٹیکس ختم ہو گئے۔ مصر و شام کے غلّے کے گودام رومن ایمپائر کے لیے بند ہو گئے۔ رومن ایمپائر کے پاس شراب اور زیتون کے سوا برآمد کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے شراب مسلمانوں کے لیے مفت بھی قابل قبول نہیں تھی۔ صرف زیتون نہ کسی ایمپائر کو قائم رکھنے کے قابل تھا نہ کسی تہذیب کی مدد کر سکتا تھا۔ نفوذِ اسلام کے بعد تجارت کی باگ سامی دنیا کے ہاتھ میں آ گئی۔ مغربی دنیا کا دوسرا رکن تاجر بھی مفلوج ہو گیا۔ ایک نسل کے بعد غلام بھی نایاب ہو گئے۔ مغرب کو اپنے اقتصادی وسائل پر ہی اکتفا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

مغرب کی اقتصادی بدحالی کی جو کیفیت خود مغرب بیان کرتا ہے، اس میں مبالغہ بھی مان لیا جائے تو بھی حقیقت سے بہت دور نہیں ہو سکتی۔ مسلم فتوحات کے نتیجے میں مغرب کی اقتصادی بدحالی کا نقشہ ہنری پائرین کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

''ساتویں صدی کی رومن ایمپائر کا معاشرہ بحرِ روم کا معاشرہ تھا۔ اسلام کے دباؤ کے نتیجے میں یہ معاشرہ بری طرح متاثر ہوا۔ بحرِ روم کا بیشتر علاقہ اس معاشرے کے قبضے سے نکل گیا۔ وہ سمندر جسے ہمارا سمندر کہا جاتا تھا، غیروں کا ہوگیا۔ اس سمندر کے ذریعے جو رابطہ مشرق و مغرب کے درمیان تھا، وہ منقطع ہوگیا۔ وہ برادری جواب تک قائم تھی برباد ہوگئی۔......

ساتویں صدی سے گیارہویں صدی تک اسلام بلاشرکتِ غیرے بحرِ روم کا مالک رہا۔......

عیسائی اقوام کی جہازرانی اطالیہ اور ادریانوپل کے درمیان ساحلی تجارت تک محدود ہوکر رہ گئی۔......

......اس بیدخلی کے باعث یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مغرب کو تہذیب کے دائرے سے خارج کردیا گیا ہو۔ کیونکہ ابتدائے تاریخ سے مہذب زندگی کے تمام عناصر اور معاشرتی ارتقاء کے تمام لوازم اسے مشرق ہی سے ملے تھے۔ بجا کہ اسپین اور افریقہ کے ساحل پر عربوں کی شکل میں مشرق اس کی دہلیز پر موجود تھا لیکن مادّی تعلّقات کے باوجود مذہبی اختلاف نے عیسائی دنیا اور مسلم مشرق میں اخلاقی ربط ضبط نہ پیدا ہونے دیا۔ رومن ایمپائر کے قیام کے بعد سے پہلی بار مغربی یورپ بقیہ دنیا سے منقطع ہوا تھا۔ بحرِ روم کے، جس کے توسّط سے اسکا تعلق مہذّب دنیا سے تھا، دروازے مغرب کے لیے بند ہوچکے تھے۔ مغربی عیسائیت کے لیے تاریخِ عالم کے واقعات میں اسلام کا نفوذ انتہائی اہم نتائج کا حامل تھا، کیونکہ اس کے سبب وہ قدیم راہیں مسدود ہوگئیں جن کے توسّط سے اسکا تعلّق بقیہ دنیا سے قائم تھا۔ مغرب بیرونی دنیا سے منقطع ہوکر صرف اپنے وسائل پر گزر بسر کرنے پر مجبور ہوگیا......

نصف ساتویں صدی کے بعد بحرِ روم کے مغربی ساحلوں پر تجارت قطعاً ختم ہوگئی۔ مارسیلز اپنے بحری بیڑے سے محروم ہوکر حالتِ نزع میں تھا۔ نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ جنوبی فرانس کا ہر شہر تباہی کی انتہا پر پہنچ گیا۔ سمندری راہوں کے مسدود ہوجانے سے پورے ملک میں تجارت قطعاً ختم ہوگئی۔ متوسّط طبقہ ناپید ہوگیا اور پیشہ ور تاجر کا وجود مٹ گیا۔ اشیائے فروخت کی گردش تھم گئی، جسکا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ شاہی خزانہ مارکیٹ کی آمدنی سے محروم ہوگیا۔ خزانہ خالی ہوا تو حکومت کے تمام محکمے اور ادارے درہم برہم ہوگئے۔''

(Henry Pirenne; A History of Europe, pp.50-52, 72)

تجارت کے زوال کے باعث ملکی معیشت کا سارا بوجھ زراعت اور زمینی پیداوار پر آ پڑا۔ ملک میں زمیندار اور جاگیردار کی اہمیّت اور اسکا اقتدار بڑھنے لگا۔ معاشرے میں مکمل اقتدار زمین کے مالکوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ اب جو طبقۂ امراء ابھرا وہ جاگیرداروں اور زمینداروں پر مشتمل تھا۔ زمین بادشاہ کی مرضی سے تقسیم ہوتی تھی، اور فوجی خدمات کے عوض عطا کی جاتی تھی۔ جب زمینیں ختم ہوگئیں تو بادشاہ کے پاس کچھ بھی نہ رہ گیا۔ جاگیردار زمین کے مالک بن گئے اور ان کے آگے بادشاہ بے بس ہوگیا۔ اس طرح مغرب میں فیوڈل سسٹم کی بنیاد پڑ گئی۔ اسلام کے فاتحانہ اقدام نے مغرب کو زمانۂ قدیم کے معاشی دور میں دھکیل دیا۔

معاشرتی دباؤ : اقتصادی دباؤ نے مغرب میں معاشرتی نکتۂ نظر سے جو اہم تبدیلی پیدا کی وہ شہروں کی تیزی سے تحلیل تھی۔ ہنری پائرین نے تو اس قدر غلو کیا کہ میرووِنجن عہد میں شہری آبادی کے وجود سے ہی انکار کردیا۔

(حوالہ بالا، صفحہ ۴۹)۔ رومن ایمپائر میں شہر ریاست کی بنیادی وحدت تھا۔ شہری بلدیہ اس علاقے کی سیاسی نمائندگی کرتی تھی۔ شہروں کی تحلیل نے اس انتظامی ڈھانچے کو ہلا دیا۔ علاقے کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ مغرب میں سرکاری دفاتر، قانونی ادارے، یہاں تک کہ درسگاہیں تک اجڑ گئیں۔ سرکاری ملازمت اور اداروں کی موروثی رکنیت، جو کسی زمانے میں باعثِ عزت تھی، آٹھویں صدی میں بے عزتی اور سزا کی صورت وحیثیت اختیار کرگئی۔ (Dozy R.; Spanish Islam, Book II, P.215)۔ لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر فرار ہونے لگے، کیونکہ ملکی معیشت شہری زندگی کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔

عوام تو عوام، خود میرو وِنجن بادشاہ خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے۔ معاشرے سے متعدد طبقات ناپید ہوگئے۔ صرف دو بڑے طبقے باقی رہ گئے۔ جاگیردار اور کسان (Serf)۔ جب تک مغرب کے قبضے میں ایشیائی اور افریقی مقبوضات باقی تھے، ہر بحران کو بہ آسانی محکوم صوبوں پر منتقل کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ بحران کہیں اور منتقل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مغربی معاشرے کو خود اس کا شکار ہونا پڑا۔

معاشرتی تبدیلی نے مزید اقتصادی مسائل پیدا کیے۔ کاشتکار اپنے ٹیکس اجناس کی شکل میں دینے لگا، کیونکہ اس کی پیداوار ہی صرف اجناس تھیں۔ لین دین صرف اشیاء کی شکل میں (Barter System) ہونے لگا۔ سکّہ ناپید ہوگیا۔ (John Bowl; A New Outline of World History, p.188)۔ محنت کی تقسیمِ کار معطّل ہوئی۔ پیداواری رشتے ختم ہوئے۔ خریدار کوئی نہ تھا اس لیے پیداوار گھٹ کر صرف اپنی ضروریات کی حد تک محدود ہوگئی۔ زمین سب کچھ ہوگئی۔ معاشرے میں جوع الارض پیدا ہوگئی۔ بڑے نے چھوٹے کو مزید نچلے طبقے میں دھکیلنا شروع کیا۔ کسان زمین سے قانوناً باندھ دیا گیا۔ کسان کا پیشہ موروثی ہوگیا۔ اگر کوئی زمین چھوڑ کر بھاگنا چاہتا تو اس کے لیے کسی اور جگہ زمین حاصل کرنا ناممکن ہوگیا، اس لیے کسان ہر حالت میں زمین سے چمٹا رہتا۔ زمین بکتی تو وہ بھی بک جاتا۔ اس کی قسمت مالک سے وابستہ ہوگئی۔ مالک اور کسان کے معاملات میں بادشاہ کی مداخلت کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ یہ نیا نظام فیوڈل سسٹم تھا۔ اس نئی اقتصادیات کو علمائے معاشیات نے 'فطری اقتصادی نظام' (Natural Economy System) کا خوبصورت نام دیا۔

اس نظام کے فطری نتائج یہ نکلے کہ فاضل پیداوار بے مصرف ہوگئی۔ فاضل پیداوار نہ ہونے کے باعث ترقیاتی منصوبے نہ بن سکے۔ معاشرہ جامد ہوگیا اور ارتقائے تہذیب تھم گیا۔ صنعتی انقلاب آنے تک مغربی معاشرہ اسی ڈگر پر چلتا رہا۔

اسلام کے ثقافتی اثرات

مغرب کی نمائندگی کلیسا کو حاصل تھی۔ اس کی تشویش گویا مغرب کی تشویش تھی۔ جہاں مسلم ثقافت نے مغرب کے لیے بیشمار مسائل کھڑے کیے، وہیں اسے بھرپور انداز میں متاثر بھی کیا، اور اس نے مغرب کے لیے موجودہ ارتقائی منازل طے کرنے کی راہ ہموار کی۔ موجودہ مغربی ثقافت کا ہر گوشہ مسلم ثقافت کا مرہونِ منت ہے۔ مسلم ثقافت نے اسے آزاد فکر اور غیر مستعار شعور عطا کیا۔ یہ فکر و شعور کلیسا کی نظر میں بغاوت تھا۔ اسی لیے کلیسا مستقلاً مسلم ثقافت کے اثرات سے برسرِ پیکار رہا۔ انہیں مغربی ذہن سے نکالنے کے لیے خود اپنے ہی معاشرے سے دست و گریباں ہوا۔ مغرب نے جب کلیسا کو اپنی راہ میں حائل دیکھا تو اسے پرے دھکیل کر اپنی موجودہ راہوں پر گامزن ہوا۔

زبان : اسلام جہاں جہاں پہنچا عربی زبان بھی وہاں پہنچی۔ عربی اس قدر توانا اور ہمہ گیر زبان ثابت ہوئی کہ اس نے مفتوحہ علاقوں کی مروّجہ زبانوں کے علوم کا صحت کے ساتھ احاطہ کر کے ان زبانوں کو بیدخل کر دیا۔ ایران میں اس نے فارسی کی جگہ سنبھالی۔ شام و فلسطین میں اس نے سریانی (Syriac) اور یونانی زبانوں کی جگہ لی۔ اسی طرح لاطینی مغرب میں جہاں جہاں اسلام پہنچا اس نے لاطینی زبان کو بھی بیدخل کیا۔ سریانی، یونانی اور لاطینی زبانیں عیسائیت کی علمی اور مذہبی زبانیں تھیں۔ جب تک یہ زبانیں مروّج تھیں، یہاں کی ثقافت عیسائی ثقافت تھی۔ علم ان زبانوں کے طفیل عیسائی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ان زبانوں کی بیدخلی نے علم کے شعبے سے عیسائیت کی اجارہ داری ختم کر دی۔ چند صدیوں میں یہاں سے عیسائی اعلیٰ تعلیم ناپید ہوگئی اور اسکی جگہ نئی اعلیٰ تعلیم نے لے لی جو بنیادی طور پر اسلامی تھی، اسکا ذریعۂ تعلیم عربی زبان تھی۔

(cf. Montgomery Watt; What is Islam?, p.181)۔

زبان کی تبدیلی نے ثقافتی ماحول تبدیل کر ڈالا۔ عرب لٹریچر سے وابستگی اور لاطینی سے بیگانگی، مسلم ممالک کے عیسائیوں میں عام ہونے لگی۔ اربابِ کلیسا کے لیے عربی زبان ایک خطرہ بن گئی۔

عہدِ وسطیٰ کے ایک پرجوش ہسپانوی عیسائی نے اس کیفیت کے بارے میں تحریر کیا،

"خود ہمارے عیسائی، عربی شاعری اور رومان کے دلدادہ ہیں۔ وہ مسلمان فقہاء اور فلاسفہ کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن اس لیے نہیں کہ انکا ازالہ کر سکیں، بلکہ اس لیے کہ صحیح عربی اسلوب کو اپنا سکیں۔ آج ڈھونڈے سے بھی ایسا عام آدمی نہیں ملتا جو مقدس اناجیل کے لاطینی تبصرے پڑھ سکے۔ کوئی نہیں جو بشارتوں اور رسولوں کو پڑھتا ہو۔ افسوس کہ عیسائی نوجوان جو اپنی ذہانت کے لیے ممتاز ہیں، سوائے عربی کے، کسی اور ادب سے

واقف نہیں۔ وہ نہایت ذوق وشوق سے عربی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اپنے کتب خانے انہوں نے زرِکثیر صرف کر کے ان کتب سے بھر رکھے ہیں۔ جگہ جگہ عربی علم وفضل کے ترانے گاتے ہیں۔ طرفہ یہ کہ اگر عیسائی کتب کا ذکر آ جائے تو وہ ناخوشگوار انداز میں احتجاجاً کہتے ہیں کہ یہ کتب انکی توجہ کے قابل نہیں ہیں۔ صدمہ تو یہ ہے کہ عیسائی خود اپنی زبان سے نابلد ہوگئے ہیں۔ مشکل سے ہزار میں ایک ایسا ملے گا جو معمولی لاطینی میں اپنے کسی دوست کو خط بھی لکھ سکے۔ لیکن اگر عربی کی بات ہو تو بے شمار ایسے ہیں جو اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہایت بلند پایہ انداز میں کر سکتے ہیں، بلکہ ایسے اشعار بھی کہہ لیتے ہیں جو صحت اور اسلوب میں خود عربوں کے اشعار سے بہتر ہوتے ہیں۔''

(Quoted by R. Dozy; Spanish Islam, Translated by F.G.Stokes, p.268)

کلیسا نے اس تشویش کو نفرت میں تبدیل کیا اور عربی کو ایک مرتد اور ذلیل نسل کی زبان قرار دیکر اس کی تکفیر (Anathematism) کی، اور کارڈینیل زیمینس نے غرناطہ میں اسّی ہزار عربی کتب سرِ عام جلوائیں۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۲۶۸)۔ بہرکیف کلیسا کی پالیسی کے سبب یورپ میں عربی زبان اور عربیت سے نفرت عام ہوگئی۔ (Legacy of Islam; 1974 ed., p.35)۔ لیکن عربی علوم کی ضرورت ختم نہ ہو سکی۔ اس پیچیدگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ علمی سرقے ہونے لگے۔ عربی زبانوں کے لاطینی اور دیگر زبانوں میں تراجم اصل مصنفین کی جگہ عیسائی پادریوں سے منسوب ہونے لگے۔ (Juan Vernet; Legacy of Islam, article 'Science', p.586)۔

مسلم ثقافت کا نفوذ : مسلم ثقافت مختلف سمتوں سے تاجروں، سیاحوں، علماء، طلباء اور خصوصاً ہسپانیہ اور سسلی کے عوام کے ذریعے مغرب پر اثر انداز ہونے لگی۔ مغرب میں مسلم ثقافت کے اثر ونفوذ کا اندازہ ان عربی الفاظ سے بخوبی ہو سکتا ہے جو لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ سائنس، فلکیات، ہندسہ (Geometry)، کیمیا، طب، عطّاری (Pharmacy)، ٹکنالوجی اور فلسفے میں عربی الفاظ اور اصطلاحات کی بکثرت موجودگی، اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ علمی اور ادبی سطح پر مسلم ثقافت نے بھرپور انداز میں مغرب کو متاثر کیا ہے۔

آداب پر اثر: ہسپانوی مورّخ کاسترو (A. Castro) نے بڑی تفصیل سے اپنے ملک پر مسلم اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے مطابق عوامی حمام سے لیکر غسلِ میّت، عورتوں کے نقاب سے لیکر فرش وقالین پر نشست کے آداب، شہسواری کی شائستہ روایات سے لیکر مہمان نوازی اور اپنے گھر کو مہمان کے حوالے کر دینے، خود بھوکا رہ کر اوروں کو کھلانے، دست بوسی کا اندازِ سوال، انکار کی صورت میں معذرت کے آداب، یہاں تک کہ مسلم لباس خصوصاً زنانہ لباس سے شدید رغبت، یہ سب کے سب وہ طور طریقے ہیں جو بلا شک وشبہ اسلامی ثقافت سے اخذ کیے گئے تھے، اور ہسپانوی عیسائیوں میں مسلمانوں کے بعد عرصے تک قائم رہے۔

(A. Castro; The Structure of Spanish History, p.128)

آرائش وزیبائش : صنعت وحرفت کے خاتمے نے مغرب کو مجبور کر دیا کہ وہ آرائش وزیبائش کے لیے مسلم ممالک سے ضروری اشیاء حاصل کرے۔ ان اشیاء میں قالین اور کپڑے سرِ فہرست تھے۔ عہدِ وسطیٰ میں قالین اس قدر مقبول تھا کہ سفراء قالینوں کو بادشاہوں اور پادریوں کی خدمت میں تحفتاً پیش کرتے تھے۔ شاہی درباروں سے

لیکر گرجا گھروں کی مقدس قربان گاہیں تک قالینوں سے مزیّن ہوتی تھیں۔ یورپ کا قدیم ترین قالین پندرہویں صدی عیسوی کا وہ قالین ہے جو شمالی سویڈن کے دیہات مارلی (Marly) کے گرجا گھر میں ہے۔

(Richard Ethinghausen; 1960 ed., The Legacy of Islam, article 'The Impact of Muslim Decoration on the Art of Europe', p.292)

شاہی اور مذہبی تقاریب میں استعمال ہونے والے لباسِ فاخرہ نہ صرف مسلم ممالک کے تیار کردہ ہوتے تھے بلکہ مسلم ثقافت کے غمّاز بھی ہوتے تھے۔ مقدّس رومن ایمپائر (Holy Roman Empire) کے شہنشاہ تخت نشینی کے وقت ایک روائتی عبا زیبِ تن کرتے تھے۔ یہ عبا سسلی کے حکمراں راجر ثانی کے لیے ۱۱۳۳ء میں پلرمو میں بنائی گئی تھی۔ اسے تخت نشینی کے موقع پر زیبِ تن کرنے کا رواج ۱۸۰۶ء تک جاری رہا۔ اس پر ایک شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی جو ایک اونٹ کو پھاڑ رہا تھا۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس عبا کا پورا حاشیہ عربی خطّاطی سے مزیّن تھا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۲۹۹)۔ اسی طرح جرمن شہنشاہوں کی عبائے شاہی بھی عربی خطّاطی سے مزیّن ہوتی تھی۔

یورپ کا سکّہ: حروبِ صلیبیہ میں کامیابی کے بعد مغرب کو سرزمینِ فلسطین میں اپنے سکّے کی ضرورت پڑی تاکہ عربوں سے تجارت کی جا سکے۔ مغرب کا یہ اوّلین سکّہ طلائی تھا۔ اسکا دلچسپ ترین پہلو یہ تھا کہ ۱۲۴۹ء تک یہ سکّہ عربی رسم الخط میں مضروب ہوتا رہا۔ اس پر قرآنی آیت اور حضور ﷺ کا اسمِ گرامی (غالباً کلمہ) منقّش تھا۔ تاریخِ اجراء سنِ ہجری میں دی جاتی تھی۔ یہ سکّہ پوپ انوسنت چہارم کے حکم سے منسوخ کیا گیا۔ اس قبیل کے سکّے تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر تک جنوبی فرانس میں رائج تھے۔

(Earnest Barker; 1960 ed., The Legacy of Islam, article 'The Crusade')

برٹش میوزیم میں مرشیا (Mercia) کے عیسائی بادشاہ 'اوفا' (Offa) کا ایک طلائی سکّہ مجریہ ۷۷۴ء محفوظ ہے۔(Museum, No. Pl-3, No. 1)۔ یہ سکّہ عربی دینار سے بیحد مشابہ ہے۔ عربی رسم الخط میں ایک جانب اوفا کا نام اور دوسری جانب کلمہ طیّبہ کندہ ہے۔

عجمیّہ کی مقبولیت: پندرہویں صدی میں دھات کے منقّش گنگا جمنی اور پچی کاری سے مزیّن طشت، قاب، پیالے، صندوقچے، مشعل دان اور دیگر ظروف وساز وسامان یورپ میں بیحد مقبول تھے۔ یہ صنعت یورپ میں ازیمینہ (Azzimina) کہلاتی تھی، اور یورپی صنعت تصوّر کی جاتی تھی۔ لیکن اب یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ لفظ 'ازیمینہ'، 'عجمیّہ' کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ (Richard Ethinghausen; The Legacy of Islam,]

[article 'Impact of Muslim Decoration on the Art of Europe', p.303)

علوم وفنون پر مسلم اثرات

مغرب عہدِ وسطیٰ میں علوم وفنون سے بے بہرہ تھا۔لکھنا پڑھنا صرف کلیسا کا کام تھا۔معاشرے کے دیگر طبقات کے لیے اسکی نہ اہمیّت تھی نہ ضرورت۔محنت کش اس سے بیگانہ تھے اور فیوڈل لارڈ قلم کو اپنے شایانِ شان نہ سمجھتے تھے، جبکہ تمام عالمِ اسلام علم وفن کی روشنی میں دمک رہا تھا۔مسلمانوں نے ساری دنیا سے علم وفن کے جواہر چن کر عربی کے خزانۂ علم میں جمع کردیے تھے۔

مروّجہ علوم کی دیگر زبانوں سے عربی زبان میں منتقلی کا کام، ابتدائی عباسی دور (نویں صدی عیسوی) میں مکمّل ہو چکا تھا۔منتقلی کے بعد انہیں جلا بخشنے اور ترقّی دینے کا کام صدیوں جاری رہا۔مسلم تہذیب وتمدّن میں ان علوم کا بڑا دخل تھا۔کلیسا ان علوم سے متنفر اور خائف تھا، انہیں جزوِ اسلام تصوّر کرکے اس نے علوم کو شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا تھا۔ممانعت اور پابندی کے باوجود یہ علوم آہستہ آہستہ روشنی اور خوشبو کی طرح اسپین اور سسلی میں سرایت کرنے لگے۔

پروفیسر الفریڈ گیلاؤم (Alfred Guillaum) نے یہ دعویٰ کیا کہ موجودہ یورپ کا معاشرہ دراصل یہود کا مرہونِ منّت ہے۔اور اس دعوے کی دلیل یہ پیش کی کہ اگر یہود صدیوں اسلامی علوم کا مغربی زبانوں میں ترجمہ نہ کرتے تو مغرب میں تیرہویں صدی کا احیائے علوم ہرگز ممکن نہ ہوتا۔اور احیائے علوم کے بغیر نشاۃِ ثانیہ کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ [cf. Alfred Guillaum; The Legacy of Israel, article 'The Jewish Factor in Medieval Thought')

پروفیسر گیلاؤم نے ان کتب کی ایک طویل فہرست فراہم کی ہے جنہیں یہودیوں نے عربی سے لاطینی میں منتقل کیا۔ان میں فلسفہ، سائنس، ریاضی (Mathematics)، نجوم (Astronomy)، فلکیات، جغرافیہ، طبّ اور قانون کی کتب بکثرت ہیں۔ریاضی، طب اور جغرافیہ جیسے علوم تو مغربی معاشرے کے لیے سودمند ثابت ہوئے لیکن فلسفے اور سائنس نے شدید پیچیدگی پیدا کی۔

جیسے جیسے اسپین اور سسلی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے، کلیسا کے دباؤ کے تحت مقامی آبادی کو جبراً عیسائیت قبول کرنی پڑی۔یہ نئے عیسائی اپنے علمی کام عربی میں جاری نہ رکھ سکے اور انہیں علمی زبان کی حیثیت سے لاطینی کو اپنانا پڑا۔اب یہ اصحابِ علم جو عربی مدرسوں کے شاگرد تھے، یورپ کے اساتذہ کی حیثیت سے ابھرے۔انہیں ان حکمرانوں کی سرپرستی حاصل ہونے لگی جو کلیسا کے دباؤ میں نہیں تھے۔ان میں فرانس اور سسلی کے حکمراں سرِفہرست تھے۔

<u>سائنس :</u> کلیسائے مقدّس کے نزدیک یہ علوم کالا جادو، شرمناک، ناپاک، شیطانی اور لعنتی تھے اور ان کو حاصل کرنے والے مردود تھے۔(Inge, W.R. Dean; The Church in the World, p.52)۔

یورپ کے سیکولر طالب علم جو چھپ چھپ کر ان علوم کو حاصل کر رہے تھے، جب ان علوم کی صحت وصداقت کے قائل ہوئے تو انکی صحت ثابت کرنے پر تل گئے۔ کلیسا نے انکے خلاف سخت کارروائی کی۔ یوں کلیسا اور سائنس کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی۔ اقتدار کلیسا کے ہاتھ میں تھا۔ علمائے سائنس پر وہ جانکاہ مظالم ہوئے جنکو تحریر کرتے ہوئے مورّخ کا قلم کانپتا ہے۔

(Hallam; Constitutional History of England, Vol. I, Chapter II, p.62)

چرچ اور سائنس میں اختلافی نکتہ یہ تھا کہ مذہب نے قدیم یونانی نظریاتِ سائنس کو عقائد کا مرتبہ دے دیا تھا۔ سائنس اپنے نظریات میں بہ آسانی ترمیم کرسکتی ہے لیکن مذہب کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ انسان کا وجود زمین پر لاکھوں سال سے ہے۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ زندگی ایک ارتقائی عمل ہے۔ علاج حکمت ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری باتیں اگر مذہب مان لیتا تو انجیلِ مقدّس کی تعلیمات پر ضرب پڑتی، جسکا ایک نظریہ اگر غلط مان لیا جاتا تو دوسرے عقائد اور نظریات پر سے بھی ایمان اٹھ جاتا۔ اس جنگ میں فتح آخرکار سائنس کی ہوئی۔ [بدقسمتی سے مسلمانوں میں مدرسے کے استادوں نے بھی کچھ اسی قسم کا وطیرہ اختیار کر کے سائنس کی مخالفت شروع کردی، جو اب بھی جاری ہے۔ انہوں نے بھی عیسائی اور یہودی نظریات کو اسلامی عقائد کی حیثیت دی ہوئی ہے۔]

فلسفہ : جس طرح سائنس نے مغربی معاشرے میں ایک خانہ جنگی برپا کی اسی طرح فلسفے نے خود کلیسا کی صفوں میں ایک فکری بے چینی کی لہر دوڑا دی۔ مسلم فلسفے کا وجود عیسائیت کے حق میں عطائے تو بہ لقائے تو کا معاملہ تھا۔ کیونکہ آٹھویں صدی عیسوی میں جب مسلم مملکت کی روزافزوں توسیع، استحکام اور مفتوحہ علاقوں میں بڑے پیمانے پر قبولِ اسلام نے اربابِ کلیسا کو خوف زدہ کیا تو انہوں نے طے کیا کہ اسلام کی بنیادوں پر حملے کیے جائیں۔

(Alfred Guillaum; The Legacy of Islam, article 'Philosophy and Theology)

فلسفۂ یونان نے کلیسا کے لیے بہت سارے مسائل پیدا کیے تھے۔ عیسائی کلیسا میں ان مسائل پر صدیوں بحث جاری رہی تھی۔ ان مسائل نے عیسائیت کو دھڑوں میں تقسیم کر ڈالا تھا۔ اربابِ کلیسا نے اس موقع پر ان مسائل کا رخ اطمینان سے اسلام کی طرف موڑ دیا۔ مسائلِ ذات وصفات، خالق ومخلوق کا تعلّق، جبر وقدر، خیر وشر وغیرہ۔ یہ مسائل مسلمانوں کے لیے اجنبی تھے۔ کلیسا کی توقّع کے عین مطابق ابتداً فلسفے نے عالمِ اسلام میں بھی انتشار پیدا کیا۔ خلقِ قرآن اور جبر وقدر کے مسائل اس شدّت سے ابھرے کہ ملّت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

ان مسائل کا عقائد سے گہرا تعلّق تھا۔ مسلم علماء نے ان پر بھرپور توجہ دی۔ فلسفے کے تخریبی پہلو پر قابو پا کر اسے تعمیری انداز عطا کیا۔ اب تک فلسفے کو کسوٹی تسلیم کر کے اس پر مذہب کو پرکھا جاتا تھا۔ اب وحیِ الٰہی کو کسوٹی بنا کر فلسفے کی فضائے بسیط میں پرواز شروع کی گئی۔ [قرآن کا اپنا فلسفۂ حیات وکائنات انتہائی مستحکم ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آئی]۔ فلسفے پر مذہب کی گیرائی ایک نیا عنصر تھا جو فکرِ یونانی سے خارج تھا۔ اب مسلمانوں نے فلسفے میں روحانیت شریک کر کے اسے نہ صرف نئی وسعتیں دیں، بلکہ فلسفے کو دین کا محافظ بنا دیا۔

یہ تھا وہ فلسفہ جو عالمِ اسلام سے مغرب کا رخ کر رہا تھا۔ فلسفے نے اپنی سادہ شکل میں ہی عیسائیت کو سرگرداں کر رکھا تھا۔ اب یہ دو آتشہ ہو کر حواس پر مسلّط ہونے لگا۔ اربابِ کلیسا کے لیے اس جانب توجہ دینا لازمی ہو گیا۔ عیسائی تھیولوجی کو تقویت دینے اور متبادل نظریات مرتّب کرنے کے لیے مسلم فلاسفہ کے کارناموں کو لاطینی میں منتقل کیا جانے لگا۔ غزالی، رازی اور ابن العربی کلیسا کے لیے مفید نہیں تھے، اس لیے انہیں عمداً نظر انداز کیا گیا۔ (Franz Rosinthal; 1974 ed., The Legacy of Islam, article 'Literature')

جبکہ الکندی، فارابی، ابنِ سینا اور ابن رشد کے افکار کو اہتمام کے ساتھ لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان میں ابنِ سینا اور ابنِ رشد وہ فلاسفہ تھے جنہوں نے صدیوں فکرِ مغرب کو مرہونِ منّت رکھا۔

ابنِ سینا : ابنِ سینا کے افکار میں اشراقیت، تصوّف، اور رہبانیت نے عیسائی علماء کو اپنی طرف متوجّہ کیا، تاکہ وہ سینٹ آگیسٹائن کی تعلیمات کے لیے فلسفیانہ بنیادیں حاصل کر سکیں۔ ان دونوں کی ہم آہنگی سے جو فکرِ نو وجود میں آئی اسے سینائی آگسٹزم (Avecenon Augustinism) کہا گیا۔

تیرہویں صدی کے عیسائی مفکّرین مثلاً ولیم آف آرگنا، الیگزنڈر آف ہیلز، جین لا روشیلی، سینٹ بوناونچر، فرانسسکن، رابرٹ گراسٹسٹ، جان پیکھم اور راجر بیکن سب کے سب ابنِ سینا سے متاثر نظر آتے ہیں۔ البرٹ میگنس نے روح کی تعریف ابنِ سینا سے مستعار لی، اور تھامس اکوناس بھی ابنِ سینا کے فکری نظریات اپنائے بنا نہ رہ سکا۔ غرض یہ کہ ان کے اثرات اتنے ہمہ گیر تھے کہ اربابِ کلیسا نے ۱۲۱۰ء میں ایک حکمنامہ کے ذریعے ان کے افکار کی درس و تدریس یونیورسٹیوں میں ممنوع قرار دیدی۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۳۸۴)

ابنِ رشد : عیسائیت کی بنیاد افلاطون کے نظریات پر تھی۔ افلاطون کے نظریۂ 'خیر' میں فطرتاً ایک مذہب کے استوار ہونے کی گنجائش تھی۔ رواقیت (Stoecism) نے اسے جِلا بخشی اور خیر کو مقصدِ حیات قرار دیکر راحت والم کے جذبات سے بے نیاز ہونے کی تعلیم دی۔ رواقیت کا مذہبِ فکر 'زینوٗ' نے چوتھی صدی قبلِ مسیح میں قائم کیا تھا۔ عیسائیت کی ابتدائی شکل اسی فلسفے پر مبنی تھی۔ (M. Watt; What is Islam?, p.189)۔

عیسائیت نے صرف لفظ گُڈ (Good) کو گاڈ (God) سے بدل دیا۔ (Nick Earl; Culture and Creed)

ارسطو مذہب اور سیاست میں بہت کم دلچسپی لیتا ہے۔ اس نے ہر اس شے کو 'خوب' قرار دیا جس کے نتائج خوب ہوں۔ اسکی فکر کا ہر موضوع خواہ وہ سائنس ہو یا ما بعد الطّبیعات، علل و نتائج کا تابع تھا۔ اس اعتبار سے ارسطو کی فکر عیسائیت کے لیے بے فائدہ تھی۔

ابنِ رشد کا تعلّق ارسطو کے مکتبِ فکر سے تھا، جس کے باعث اربابِ کلیسا ان کی فکر کو عیسائی نظریات کے استحکام کے لیے استعمال نہ کر سکتے تھے۔ پھر وہ اس جانب کیوں مائل ہوئے، اسکی توضیح نہیں ملتی۔ شائد اس لیے کہ ان کی فکر عالم اسلام میں غیر مقبول تھی اور خطرہ سمجھی جا رہی تھی۔ ان کے افکار کی تردید میں امام غزالی جیسی جلیل القدر شخصیت کو قلم اٹھانا پڑا تھا، شائد اس لیے انہیں اپنے مطلب کے لیے مفید سمجھا گیا ہو، یا شائد اس لیے کہ ان کے افکار میں رواقیت سے زیادہ کشش تھی۔

ابنِ رشد وہ واحد مسلم مفکّر ہیں جن کے افکار صدیوں مغرب پر ایک طلسم بن کر چھائے رہے۔ اطالیہ میں انکا اثر سولہویں صدی عیسوی تک رہا۔ موجودہ سائنسی دور تک، فلسفے پر انہیں سند تسلیم کیا جاتا رہا۔

(Alfred Guillaum; 1966 ed., The Legacy of Islam, article 'Philosophy and Theology)

ایک طرف تو ارسطوئیت کے نام سے وہ عیسائی چرچ کی تھیولوجی پر مسلّط ہوئے تو دوسری طرف چرچ کے مخالفین کو انکی ذات نے مستحکم قوتِ فکر و استدلال عطا کی۔

(Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. X, p.248)

مغربی معاشرے کو یہ قوّت نہ تو رومن تہذیب دے سکی تھی نہ عیسائی کلیسا۔ جلد ہی ابنِ رشد کلیسا کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن گئے۔ اربابِ قلم نے انکے اثرات زائل کرنے کی کوشش کی۔ ابنِ رشد سے فرضی نظریات منسوب کیے گئے۔ ان فرضی نظریات کا کلیسا اور یونیورسٹیوں نے سختی کے ساتھ احتساب کیا۔ نہ صرف نظریات کو رد کیا گیا، بلکہ ان کے سہارے ابنِ رشد کو بھی ملعون و مردود قرار دیا گیا۔ (Rdshdall; Universities, Vol. I, p.368)۔ پیرس یونیورسٹی نے ان کے افکار کی درس و تدریس پر پابندی لگائی۔ عیسائی دنیا کے عظیم ترین مسیحی عالم سینٹ تھامس اکویناس نے ابنِ رشد کے افکار کے بطلان اور ازالے کا بیڑہ اٹھایا اور مشہور کتاب 'سمّہ' (Summa) تحریر کی۔ سینٹ تھامس کو جو عظمت میسّر آئی، وہ اس لیے نہیں کہ اس نے ابنِ رشد سے کچھ سیکھا، بلکہ اس لیے کہ اس نے ابنِ رشد کے افکار کی تردید کی بلکہ انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کی۔

(Southern R.W.; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.73)

ابنِ رشد کلیسا کے اعصاب پر کس قدر چھائے ہوئے تھے، اسکا اندازہ چودھویں صدی کی ان تصاویر سے ہوتا ہے جنکا موضوع سینٹ تھامس کی ابنِ رشد پر فتح ہے۔ ان میں سب سے مشہور وہ پینٹنگ ہے جو چلسی میں واقع سینٹ کیتھرائن کے گرجا کی دیوار پر ۱۳۶۵ء میں بنائی گئی۔ اسکا فوٹو کتاب 'لیگیسی آف ازرائیل' (Legacy of Israel) اکسفورڈ ۱۹۵۳ء، میں شامل ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ،

''سینٹ تھامس کو علم و حکمت آسمان سے خداوند مسیح اور تمام عیسائی بزرگوں نیز یونانی فلسفیوں سے مل رہی ہے جس کی بدولت انکے قدموں میں ایک عرب مجل پڑا ہوا ہے۔''

یہ عرب کوئی اور نہیں ابنِ رشد ہیں۔ اس تصویر کا عنوان ہے،

'Saint Thomas Triumphs Over Averraes'

یہ تصویر ابنِ رشد کی ہمہ گیری کے ردِّ عمل [اور اعتراف] کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

اثراتِ مابعد

مسلم علوم کے ثقافتی اثرات نے مغربی معاشرے کو آزادانہ غور وفکر کا راستہ دکھایا، جبکہ کلیسا اسکی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مغرب نے ان ہی خطوط پر سوچنا شروع کردیا جن پر مسلمان سوچتے تھے۔ اس فکری تبدیلی کی بدولت مغربی معاشرے میں ایک ایسی سرد جنگ پرورش پانے لگی جس نے بالآخر انقلابی شکل اختیار کر کے قومی ریاستوں کو جنم دیا اور کیتھولک چرچ کو منقسم کیا، جس سے عیسائی چرچ کلیساؤں میں بٹ گیا۔ نہ نظریاتی عیسائی جمہوریہ رہی، نہ ہی یونیورسل چرچ باقی رہا۔ دوہرے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ چرچ ریاست سے دست بردار ہوکر گرجا کی چار دیواری میں پناہ گزیں ہوا، اور چرچ سے تعلّق فرد کا انفرادی معاملہ بن گیا۔

باب سوم

مغرب کا ردِّ عمل

۱۔ اسلامی اثرات کے خلاف اقدامات

۲۔ چرچ کا کردار

۳۔ نظریاتی محاذ

۴۔ انیسویں صدی عیسوی اور نظریاتی حملے

اسلامی اثرات کے خلاف اقدامات

اسلام کے باعث مغرب پر جو سیاسی، مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی دباؤ پڑا اس نے شدید ردِ عمل پیدا کیا۔ زرتشتیت، بدھ مت اور دیگر مذاہب کو اسقدر تہمتوں اور ملامتوں کا ہدف کبھی بھی نہیں بنایا گیا جتنا اسلام کو۔ دیگر مذاہب سے مغرب کو نہ تو مسابقت کا سامنا کرنا پڑا نہ ہی کبھی وہ عہد وسطیٰ کے مغرب کے لیے خطرہ بنے۔ لٰہذا اولاً خوف، اور پھر دشمنی اور تعصب وہ عناصر تھے جنہوں نے مغربی تصورِ اسلام میں رنگ بھرے اور طرزِ عمل کا تعین کیا۔ اسلامی عقائد دشمن کے عقائد تھے پس غلط نہ بھی تھے تو مشکوک ضرور تھے۔

(Phillips K. Hitti; Islam and the West, p.49)

ابتدائی میرودنجین عہد تک یہ ردِ عمل اس قدر شدید نہیں تھا۔ چنانچہ کارونجین عہد کی تحریروں میں مغرب کی روایتی تلخی اور نفرت کا وجود نہیں پایا جاتا۔ **(Southern R.W.; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.18)** ۔ جب آلِ اغلب نے سسلی کو فتح کر کے (۸۲۷ء تا ۸۳۱ء) اطالیہ پر حملے شروع کیے، وہاں اپنی امارتیں قائم کیں، ۸۴۶ء میں عیسائیوں کے مقدس شہر روم کو نرغے میں لیا اور اسکے نزدیک ایک پہاڑی قلعے گاری گلیانو **(Gari Giliano)** کو اپنا مستقر بنالیا تو اربابِ کلیسا میں شدید بے چینی پیدا ہوئی۔ ۸۷۵ء میں جب عربوں نے دوسری بار روم پر حملہ کیا تو حقیقی معنوں میں اسلام دشمنی شروع ہوئی۔ **(Norman Daniel; The Arabs and the Mediaeval Europe, pp.57-58)**۔ کلیسا نے دانستہ اور ارادی طور پر اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا آغاز کیا۔ ابتداً یہ مہم دفاعی نوعیت کی تھی لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی اس میں جارحیت پیدا ہوگئی۔

پروپیگنڈہ: عیسائیت ایک تبلیغی مذہب ہے۔ جس دور میں اسلام مہذب اور متمدن علاقوں کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا، اسی دور میں عیسائیت غیر متمدن نیم وحشی جرمن اقوام کو حلقہ بگوش کر رہی تھی۔ یہ اقوام علم وفکر سے بیگانہ تھیں۔ جس سرعت کے ساتھ انہوں نے اپنی آبائی بت پرستی ترک کر کے کیتھولک مذہب کو قبول کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پروپیگنڈے سے بہ آسانی متاثر ہو سکتی تھیں۔

پروپیگنڈے کی طاقت سے رومن کلیسا ناواقف نہ تھا۔ اس لیے کہ پروپیگنڈے کے موجد یہی مذہبی مبلغین تھے۔ **(Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. II, p.216)**۔ یہ پروپیگنڈہ ہی تھا جس نے بابلی اور آشوری فوجی تہذیبوں کو نیست و نابود کیا تھا، (حوالہ بالا)۔ خود عیسائی معاشرے کا قیام اور مغرب کا وجود پروپیگنڈے کا مرہونِ منت تھا۔ پروپیگنڈہ ایک جنگی ہتھیار ہے جو کمزور اور محصور معاشروں کو

ثقافتی شعور عطا کر کے ان میں قوت اور مقاومت پیدا کرتا ہے۔ کلیسا نے اس ہتھیار کا استعمال نہایت موثر انداز میں کیا۔ مغربی ذہن کو اس انداز سے متاثر کیا کہ آئندہ ہزار سال اس سے اسلام کی مخالفت دور نہ ہو سکی۔ اس کا نعرہ تھا کہ ''بیرونِ کلیسا نجات نہیں'' ۔(EXTRA ECCLISIAM NULLA SULAS)۔

(Montgommery Watt; What is Islam, p.198)

نجات کو کلیسا سے مختص کر کے کلیسا نے دیگر ادیانِ عالم کو بیک جنبشِ قلم اس صفتِ عالیہ سے محروم گردانا، جن میں اسلام بھی شامل تھا۔ انہوں نے باور کرایا کہ کائنات میں حق و باطل کا وجود ہے، جس میں حق عیسائیت تھی اور باطل اسلام تھا۔ جس طرح حق و باطل کا میل نہیں اسی طرح عیسائیت کسی اور مذہب کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی۔(Norman Daniel; The Arabs and the Mediaeval Europe, p.46)۔

کلیسا نے اسلام کو بے دینی اور دشمنِ عیسائیت قرار دیا۔ مسلمانوں کی کامیابی کو حضرت عیسیٰ کی بے حرمتی اور عیسائیوں کی کامیابی کو انکی سربلندی سے تعبیر کیا۔ (حوالہ بالا)۔ اسلام کے فرضی اصنام گھڑے۔ بے شمار ایسے مقدس پادریوں کا فرضی قتل مسلمانوں سے منسوب کیا، جنکا [مبینہ] جرم یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کے بت توڑ ڈالے تھے۔ (cf. Southern R. W.; Western Views of Islam, pp.23-24)۔ جوشِ بیان میں ایسے پادری بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل کرا دیے جو طلوعِ اسلام سے صدیوں پیشتر گزرے تھے۔

(Norman Daniel; The Arabs and the Mediaeval Europe, p. 59)

انہوں نے بانیِ اسلام کے اسمِ گرامی کا تلفظ اس طرح بدلا کہ اس کے اعداد کا مجموعہ کسی طرح سے [۶۶۶] بن جائے۔ یہ عدد دانیال نبی کے خواب کے اس درندے (Beast of Revealation) کے تھے، جسے دشمنِ عیسیٰ یعنی دجّال (Anti-Christ) تصوّر کیا جاتا تھا۔ [Henry Stubb; Rise and Fall of Muhammetanism, p.143)]۔ مسلمانوں کے لیے نفرت انگیز الفاظ مثلاً پیگن (Pagan)، انفڈل (Infidel)، فرزندانِ تاریکی، شیطان، شیطان کے پجاری، وحشی، دشمنِ عیسیٰ و عیسائیت، ناپاک جہنمی، وغیرہ استعمال کیے۔ شدّت جذبات میں پوپ جیسی مقدس ہستی کی زبان سے ان کے لیے 'ولد الحرام' (Sons of fornication) کے الفاظ ادا ہوئے۔ [Attributed to Pope John VIII, by Norman Daniel in 'The Arabs and the Mediaeval Europe', p.76)

پروپیگنڈے نے جو شدید نفرت پیدا کی اس کا اندازہ اس مقولے سے ہو سکتا ہے کہ ''صرف ایک مردہ سراسن [مراد مسلمان]، ہی ایک اچھا سراسن ہے''۔ (The only good Saracen is a dead Saracen)۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۹۶)۔ اسلام اور داعیِ اسلام سے متعلق عہد وسطیٰ کی تحریروں کا جائزہ آنے والے ابواب میں تفصیلاً لیا جا رہا ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ پروپیگنڈے کی اس مہم میں پوپ اور سپاہی، شاہ و گدا، فلسفی اور گپ باز، مورّخ اور افسانہ نویس، اساتذہ اور مبلّغین، غرضکہ ہر کہہ ومہہ نے حسبِ توفیق حصّہ لیا۔ یہ ایک ایسا سیلِ رواں تھا جو تمام اقدارِ عالیہ کو بہا لے گیا۔ اس مہم میں صحت وصداقت یا علمی دیانت نام کی کسی چیز کو کوئی دخل نہیں تھا۔

یہ حقیقتاً صرف جنگی پروپیگنڈہ تھا، جس کے ذریعے مغربی معاشرے کے گرتے ہوئے حوصلوں کو نفرت کے سہارے بحال کیا گیا۔ اس میں دفاعی قوت پیدا کی گئی، اور اسی پروپیگنڈے کی بدولت مغرب کو جارحیت کی راہ پر گامزن کیا گیا۔ اور اس جارحیت کے لیے مغربی عقائد میں دور رس تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔

عقائد و الٰہیات میں ترامیم : ثنویت کے زیرِ اثر کلیسا اور ریاست دو جداگانہ ادارے تھے۔ حکومت کے عہدے قبول کرنا، فوج میں شامل ہونا، معاشرتی ذمہ داریاں اٹھانا، بال بچوں کی پرورش، یہاں تک کہ خود اپنی ذات کی فلاح و بہبود، یہ سب ناپسندیدہ اور ممنوعہ امور تھے۔ نویں صدی عیسوی میں خود کلیسائے مقدس ان امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ حکومت کے ہر شعبے پر کلیسا کے کارکن قابض ہوئے۔ عیسائیت کے ظہور کے بعد آٹھ سو سال تک نظریاتی ریاست کا تصور تک پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن اب نویں صدی میں اسلام کی نظریاتی مملکت کی پیروی میں ''مغربی جمہوریہ مسیحیہ'' کا قیام عمل میں آیا۔

عیسائیت عدم تشدد کا مذہب تھا۔ جارحیت اسکی تعلیم کے منافی تھی۔ ایک رخسار پر تھپڑ مارنے والے کو دوسرا رخسار پیش کرنے کا حکم تھا۔ جنگ کا تعلق صرف دنیادار سے تھا۔ دیندار کے نزدیک یہ ایک گناہِ عظیم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ روم پر عربوں کے دوسرے حملے کے بعد جب پوپ جان ہشتم نے ۸۷۷ء میں اپنے حلیفوں سے کلیسا اور عیسائیت کی حفاظت کے لیے فوجی مدد طلب کی، تو خود کلیسا کے بشپ متردد ہوئے۔ اور انہوں نے پوپ سے ان لوگوں کے حشر کے بارے میں سوال کیا جو ''خدا کے مقدس چرچ، عیسائی مذہب اور دولتِ مشترکہ'' کے دفاع میں کام آ جائیں۔ پوپ نے جواب دیا کہ،

''اسے یقین ہے کہ وہ لوگ جو بت پرستوں اور بے دینوں سے کیتھولک مذہب کے لیے شدید جدّ وجہد کرتے ہوئے مارے جائیں گے، انہیں ابدی سکون میسّر ہوگا۔'' (حوالہ بالا، صفحہ ۷۸)

عقیدے میں یہ تبدیلی ''مقدس جنگ'' کے لیے پہلا زینہ تھی۔ یہیں سے عیسائی الٰہیات میں مقدس جنگوں کا باب کھلا۔ تاہم پوپ جان کا فتویٰ ہمہ گیر نہ تھا۔ یہ صرف ان افراد تک محدود تھا جو اس فوج میں شریک تھے، جسے پوپ کے حلیفوں نے دفاعی مقصد کے لیے کلیسا کو فراہم کیا تھا۔ جان کے جانشینوں نے اس چنگاری کو ایک شعلۂ جوالہ بنا دیا۔ سسلی اور اسپین میں عیسائی کامیابیوں نے یہ توقع پیدا کردی کہ عیسائی دنیا اگر کوشش کرے تو عالمِ اسلام سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس حاصل کرسکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی درکار تھی۔ مغربی اقتصادیات ان جنگوں کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتی تھی، لہٰذا رضا کار فوج کا منصوبہ بنایا گیا، جس کے لیے ایک معقول نظریے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کلیسا نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مذہبی جنگ کا نظریہ وضع کیا۔ مختلف عناصر کو آہستہ آہستہ یوں ترتیب دیا کہ عدم تشدد کی جگہ تشدد و جارحیت عیسائیت کا عقیدہ بن گئے۔

جنگی عقیدہ : عہد نامۂ قدیم کے مطابق یہوا (خدائے جنگ) صرف اسرائیل کا خدا تھا۔ (Exodus, Chapter 15)۔ اور اسرائیل اسکی پسندیدہ قوم تھی۔ اسی قوم کے ذریعے یہوا عمل پیرا ہوتا تھا۔

ارضِ مقدس (فلسطین) یہوا کی پائیگاہ تھی، جسکی فتح اور بعد ازاں دفاع کے لیے خود یہوا ''ربّ الافواج'' کی حیثیت سے اسرائیل کے ہمراہ شریکِ جنگ ہوتا تھا۔

یہوا، ارضِ مقدس میں سوائے اسرائیل کے کسی اور قوم کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ارضِ مقدس کو غیروں کے وجود سے پاک رکھنا، اور یہوا کے دشمنوں سے انتقام لینا بنی اسرائیل پر فرض تھا۔ یہوا کی منتقم مزاجی کا یہ عالم تھا کہ اگر اسکی محبوب قوم اسرائیل بھی اسکے احکام کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوتی تو اسے بھی تباہ کر ڈالتا۔ اسرائیل کے گناہوں کی سزا شکست اور تباہی تھی۔

یہ سارے عقائد آہستہ آہستہ عیسائیت میں بھی عام ہو گئے۔ رہی سہی کسر پوپ اربن نے پوری کر دی۔ اس نے بنی اسرائیل کی جگہ فرینکش قوم کو ''خدا کی قوم'' (People of God) بنا دیا۔

(cf. Norman Daniel; The Arabs and the Mediaeval Europe, p.112)

''خدا کی قوم'' کا نظریہ فرینکش قوم کی فطری جنگجوئی کے عین مطابق تھا۔ اس نظریہ نے عام آدمی اور کلیسا کے کارکنوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی پیدا کر دی۔ خداوند یسوع مسیح بھی، یہوا کی طرح، جنگوں میں حصہ لینے لگے۔ یہاں تک کہ مریم اپنی حریموں کے ہمراہ مسلح افواج کو نیست و نابود کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ (حوالہ بالا، تفصیلات کے لیے باب چہارم)۔ بنی اسرائیل کی طرح فرینکش قوم کا بھی یہی فرض ہوا کہ اپنی توانائیاں خدا کی بادشاہی کی وسعت کے لیے وقف کر دیں۔ ارضِ مقدس کو خداوند یسوع مسیح کی پائیگاہ (Terra sua) کی حیثیت حاصل ہوئی، جسکا فتح کرنا اور وہاں عیسائی حکومت قائم کرنا فرینک قوم کے لیے فرض ٹھہرا۔ (حوالہ بالا، صفحہ 111)۔ اور خدا کے دشمنوں کو تباہ کرنا مذہبی فریضہ قرار پایا۔

شکست و فتح : بنی اسرائیل کی شکست و فتح کا عقیدہ بھی عیسائیت نے من و عن اپنایا۔ چونکہ خدا خود شریکِ جنگ ہوتا تھا اس لیے فتح تو اسکی خوشنودی کی علامت تھی۔ لیکن اس شرکت کے باوجود اگر شکست ہوتی تو اس شکست کی توضیح اسرائیلی انداز میں یہی کی گئی کہ یہ شامتِ اعمال کا نتیجہ تھی۔ جسے خداوند نے شکست کی صورت میں ان پر مسلط کیا۔

غرضیکہ کہ کلیسا نے مغرب کو ایک موثر نظریۂ جنگ عطا کیا، جس کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ اسپین میں مغلوب عیسائیوں کی جنونی تحریک چلی اور گیارھویں صدی میں پوپ کی ایک آواز پر صلیبی پرچم کے سائے تلے ایک قیامتِ صغریٰ مشرق پر ٹوٹ پڑی۔ صلیب کے بادل چھٹے ہی تھے کہ منگول طوفان نے عالمِ اسلام کو تہہ و بالا کر ڈالا۔ اس طوفان کی انگیخت میں پوپ کی مساعی کو بھی دخل تھا۔

اسپین کی تحریکِ منافرت

علوم کا بپتسمہ: مغرب میں اسپین وہ سرزمین ہے جہاں مسلمانوں کا دور حکومت طویل ترین رہا۔ یہاں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جسمیں اسلامی اور عیسائی ثقافتیں آٹھ صدیوں تک پہلو بہ پہلو قائم رہیں۔ یہ معاشرہ چار گروہوں میں منقسم تھا۔

۱۔ مسلم سلطنت کے مسلم باشندے

۲۔ مسلم سلطنت کے عیسائی باشندے، جنہیں موزارب (Mozarabs) کہا جاتا تھا۔

(عربی لفظ مستعرب)

۳۔ عیسائی سلطنت کے عیسائی باشندے

۴۔ عیسائی سلطنت کے مسلم باشندے جنہیں مداجر (Mudejares) کہا جاتا تھا۔

[عربی لفظ المدجن، ماخوذ بہ دجن]

ان میں سے ہر گروہ کی ایک جداگانہ تاریخ ہے۔ مسلم سلطنت کے مسلمانوں کی ساری توانائیاں اپنی بقا کی جدّ وجہد میں صرف ہوتی تھیں۔ جبکہ عیسائی سلطنت کے عیسائی باشندوں کا مطمحِ نظر ہمیشہ یہی رہا کہ اسپین سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کر دیں۔ چنانچہ عہدِ وسطیٰ کا قومی ہیرو وہی تصور رہوتا تھا جس نے کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے وجود کو نقصان پہنچایا ہو۔ ان کی خاطر خواہ مثالیں سد (El Cid)، رولینڈ، شارلمین، الفانسو، فردینیند اور ازابیلا ہیں۔

عیسائی سلطنت کے مسلم باشندے ان حالات میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے جن میں انکی ثقافت کی جداگانہ حیثیت ختم ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں مسلم ریاست کے عیسائی باشندوں کو ہمیشہ ہر قسم کی آزادی اور سہولت میسّر رہی، جس کے باعث وہ ہمیشہ مطمئن رہے۔ ان کے اطمینان کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں کسی وقت اور کسی جگہ موزارب کی بغاوت کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ (cf. R. Dozy; Spanish Islam, p. 235)۔ مسلم سلطنت میں عیسائیوں کو مکمل مذہبی، معاشی اور معاشرتی آزادی حاصل تھی۔ اس کے باوجود ۸۵۰ء میں ایک شدید تحریک منافرت چلائی گئی۔ پوری تحریک کا غائر مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی بنیاد صرف تعصب، نفرت اور کلیسائی پروپیگنڈے پر تھی۔

اس تحریک کی ابتدا دو ایسے عیسائیوں سے ہوئی جن کے رویّے نے مسلمانوں میں بے چینی پیدا کی۔ ان افراد کو قانون کے حوالہ کیا گیا اور قانون نے انکو سزا دی۔ کلیسا نے اسی سزا کو بہانہ بنا کر یہ شدید تحریکِ منافرت پیدا کی۔

پہلا شخص ایک عیسائی راہب پرفیکتس (Perfectus) تھا، جس سے قرطبہ میں کسی بے فکرے نے از راہِ تفنن یا تجسس یہ دریافت کیا کہ کیتھولک حضرت عیسیٰ اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں کیا عقیدہ

رکھتے ہیں۔ اس نے حضرت عیسیٰ کی الوہیت کا اعلان کیا اور حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا۔ اس نے بائبل کا حوالہ دیا کہ ''...... بہت سے جھوٹے نبی میرے بعد آئیں گے۔'' اور پھر یہ کہا کہ ''ان میں سب سے بڑے کذاب...... تھے۔''

بے فکروں نے تحمل کا ثبوت دیا اور اس راہب سے درگزر کیا۔ یہ بات رفتہ رفتہ عوام میں پھیل گئی۔ دوسری بار جب راہب بازار آیا تو عام بے چینی پھیل گئی۔ لوگوں نے اسے قاضی کی عدالت میں پیش کر دیا۔ وہاں بھی اس نے دل کھول کر سب وشتم سے کام لیا، جس کے نتیجے میں اسے سرِ عام پھانسی دی گئی۔ تختۂ دار پر بھی آخری دم تک سب وشتم کا سلسلہ جاری رہا۔

دوسرا شخص ایک عیسائی تاجر جان تھا۔ یہ شخص سودا فروخت کرتے ہوئے کثرت سے حضور ﷺ کے نام کی قسمیں کھایا کرتا تھا۔ موقع بے موقع اس میں ذم کے پہلو بھی ہوتے تھے۔ جس کے سبب اسے بھی قاضی کے روبرو پیش کیا گیا، جہاں اسے تازیانوں اور گدھے پر شہر گشت کی سزا دی گئی۔

پادری آئزک: ان دو واقعات کو حیلہ بنا کر عیسائیوں نے تحریک شہیداں (Martyr's Movement) شروع کر دی۔ حکومت کا ایک سابق کاتب آئزک، جس نے نواحِ شہر کی ایک خانقاہ میں رہبانیت اختیار کر رکھی تھی، یکا یک بھڑک اٹھا۔ عدالت میں پہنچ کر اس نے قاضی سے کہا کہ میں آپ کا دین اختیار کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ اس کی حقانیت مجھ پر واضح کریں۔ قاضی نے کچھ کہا ہی تھا کہ آئزک پھٹ پڑا۔ بھری عدالت میں اس نے ہر ممکن دریدہ دہنی سے کام لیا۔ قاضی نے اسے قید کر کے معاملہ امیر عبدالرحمٰن ثانی کی خدمت میں پیش کیا، جہاں سے اس کے لیے سزائے موت کا حکم صادر ہوا۔

تحریک کے سرغنہ: آئزک کے بعد اس تحریک کے روح رواں، دو افراد 'اولوجیس' اور 'الوارو' بن گئے۔ اولوجیس جو ابتداً ایک راہب تھا پھر قرطبہ کا بشپ بنا، اسلام سے نفرت اور عیسائیت سے وابستگی کا نشان بن گیا۔ تعصب اسے ورثے میں ملا تھا۔ اس کے دادا کے کان میں جب اذان کی آواز پڑتی تو سینے پر صلیب کا نشان بناتا اور کہتا، ''اے خدا خاموش نہ رہ۔ اے خدا چپ چاپ نہ ہو اور خاموشی اختیار نہ کر۔ کیونکہ دیکھ تیرے دشمن ادھم مچاتے ہیں، اور تجھ سے عداوت رکھنے والوں نے سر اٹھایا ہے''۔ (زبور ۸۳، ۱ تا ۲)

(Norman Daniel; The Arabs and the Mediaeval Europe, p.31)

اولوجیس ایک ایسے ایبٹ (Abbot) کا معتقد تھا جو اسلام کا شدید مخالف تھا۔ ایبٹ کے حلقے میں اس کی ملاقات الوارو سے ہوئی۔ یہ شخص دنیادار تھا، مگر ایبٹ مذکور کا زبردست حامی تھا۔ اسی حلقے کا ایک سرگرم رکن پرفیکٹس بھی تھا۔ اولوجیس اپنی اسلام دشمنی کے باعث عیسائی مذہبی حلقوں میں بیحد مقبول تھا۔ جب وہ پادری بنا تو اس نے بلا استثنا تمام راہبوں اور پادریوں کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ اولوجیس اور الوارو نے اپنے معتقدین کو بڑے زور و شور سے اس تحریک میں حصہ لینے کے لیے ابھارا۔ اپنے ایک معتقد سنکو (Sanco) کو بھیجی جس نے سب وشتم کر کے اپنی جان دی۔ پھر چھ راہب بیک وقت قاضی کی عدالت میں رونما ہوئے اور انہوں نے دریدہ دہنی

کر کے اپنے سر قلم کروائے۔ دریدہ دہنی جاری رہی اور سر قلم ہوتے رہے۔ دو ماہ میں گیارہ افراد نے دریدہ دہنی کر کے خود کو موت کے حوالے کیا۔ اس جنونی تحریک کے باعث عام عیسائیوں کی روزمرہ زندگی متاثر ہونے لگی۔ خود قرطبہ کے عیسائیوں نے اس تحریک کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں نے کہا کہ جس موت کو یہ گستاخ بزعم خود شہادت تصور کرتے ہیں وہ حقیقتاً خودکشی ہے۔

امیر عبدالرحمن نے اس تحریک پر غور و خوض کرنے کے لیے عیسائیوں کی مذہبی کونسل طلب کی۔ اس کونسل نے یہ قرارداد منظور کی کہ عیسائی اس قسم کی موت سے باز رہیں۔

اولوجیئس نے کونسل کا مذاق اڑایا۔ اس کی قرارداد کے بارے میں کہا کہ اس میں شہادت کی مذمت نہیں کی گئی۔ نیز یہ کہ اس قسم کی قرارداد شہادت کے تاج سے کسی عیسائی کو محروم نہیں کر سکتی۔ اس نے لوگوں کو تحریک میں مزید شدت پیدا کرنے کے لیے ابھارا، جس کے نتیجے میں تحریک کے قائدین کو گرفتار کیا جانے لگا۔ دوسروں کو جان دینے پر اکسانے والا اولوجیئس اپنی باری آنے پر جان بچا کر بھاگا۔ بھیس بدل بدل کر ٹھکانے تبدیل کر کر کے گرفتاری سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ جب گرفتار ہو کر زنداں پہنچا تو وہاں ایک مسلمان لڑکی فلورا اور ایک عیسائی لڑکی میری بھی تھی۔ ان لڑکیوں کو ارتداد اور جنونی تحریک کے جرم میں قید کیا گیا تھا۔ قاضی کے حکم سے انہیں زنداں میں رکھا گیا تھا کہ شائد وہ تائب ہو جائیں۔ زنداں کے شب و روز نے انکے ارادے متزلزل کر دیے تھے مگر اولوجیئس نے انہیں بھی تختۂ دار تک پہنچا کر دم لیا۔

یہ تحریک منافرت ۸۵۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ ۸۵۲ء میں اسکی یہ کیفیت ہوگئی کہ راہب مسجدِ قرطبہ میں در آتے اور چیخ چیخ کر ہذیانی انداز میں سب و شتم کرتے، اور کیفرِ کردار کو پہنچتے۔

(For details see, R. Dozy: Spanish Islam)

اولوجیئس نے اپنی تمام زندگی عیسائیوں میں اسلام کے خلاف نفرت کی مہم چلانے میں گزار دی۔ ۸۵۹ء میں ایک اور مسلمان لڑکی جو مرتد ہو چکی تھی، اولوجیئس کے گھر سے برآمد ہوئی۔ اس کے ساتھ اولوجیئس کو بھی گرفتار کیا گیا۔ مقدمے کے دوران اس نے کارروائی میں حصہ لینے کے بجائے صرف ہرزہ سرائی اور دریدہ دہنی کی۔ قاضی نے اسے سلطان کے دربار میں پیش کیا۔ وہاں بھی وہ ہرزہ سرائی سے باز نہ آیا۔ آخر اس کا سر بھی قلم کیا گیا۔

موت کے بعد اولوجیئس عیسائی دنیا کا ہیرو بن گیا۔ اسکی ہڈیاں تبرکات میں شمار ہوئیں۔ اسکی آتشیں تحریریں مغرب کے لیے مشعلِ راہ بن گئیں۔

عالم اسلام کا انتشار: اسپین کی تحریک منافرت، مغلوب عیسائیوں کی نفرت اور دشمنی کا اظہار تھی، جس میں جذبات کی شدت نے خودکشی کی شکل اختیار کی۔ بقیہ مغرب کمزور ضرور تھا لیکن مغلوب نہیں تھا۔ وہاں بھی اسپین کی طرح تحریک کے روح رواں کلیسا کے ہی ارکان تھے۔ مغرب میں بھی نفرت اور دشمنی اسی عروج پر تھی۔ اسکا اظہار جارحیت کی شکل میں ہوا۔ جب تک عالمِ اسلام میں کمزوری کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے، یہ منافرت سرد جنگ کی شکل میں تھی۔ لیکن دسویں صدی عیسوی کے اختتام کے ساتھ ساتھ عالم اسلام میں کمزوری پیدا ہونے لگی۔

اس صدی میں عالمِ اسلام تین حریف خلافتوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایشیا میں عباسی خلافت تھی، جسکا اقتدار برائے نام رہ گیا تھا۔ ورنہ اصل طاقت سلجوقیوں کے ہاتھ میں تھی۔ فلسطین، مصر، افریقیہ اور سسلی، فاطمی خلافت کے ماتحت تھے۔ اسپین میں اموی حکمران عبدالرحمن الناصر نے بھی اپنی مملکت کو خلافت قرار دیدیا تھا۔

گیارھویں صدی عالمِ اسلام کے لیے ابتری کا پیام لائی۔ اسپین کی اموی خلافت ۱۰۳۱ء میں ختم ہوکر، چھوٹی چھوٹی عرب اور بربر ریاستوں میں بٹ گئی، جو ایک دوسرے سے متحارب تھیں۔ ان حالات میں اسپین کی عیسائی ریاستوں 'لیون' (Leon)، اور 'قسطالیہ' (Castilla) نے [اس علاقے کو مشترکہ طور پر (Castilla-Leon) کہا جاتا ہے]، الفانسو کی سرکردگی میں ان چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں کو ہضم کرنا شروع کر دیا۔

گیارھویں صدی کے اواخر میں مسلم اسپین عملاً عیسائیوں کا باجگزار بن گیا۔ اسی دور میں سسلی پر نارمنوں نے حملہ کیا اور ۱۰۷۱ء میں اس کے پایۂ تخت 'پلرمو' پر قبضہ کر کے ۱۰۸۱ء تک پورا سسلی فاطمیوں سے چھین لیا۔ بارھویں صدی عیسوی میں نارمن حملے افریقہ پر بھی ہونے لگے۔ سسلی کی نارمن بحریہ نے بحرِ روم میں طاقت کا توازن درہم برہم کر ڈالا۔ بارھویں صدی میں بحرِ روم پر نارمنوں اور اطالویوں کی برتری قائم ہوگئی۔ انہوں نے تیونس سے تریپولی تک افریقی ساحل پر قبضہ کر کے مشرقی اور مغربی مسلمانوں کا بحری رابطہ منقطع کر دیا۔

خلافتِ عباسیہ : ابھی قوت کا توازن بحرِ روم میں تبدیل نہیں ہوا تھا کہ مشرقی عالمِ اسلام میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ تاتاریوں نے ۱۰۲۹ء میں شمالی ایران پر حملہ کر دیا۔ قبیلہ غز نے پورا ملک روند ڈالا۔ ۱۰۵۵ء میں طغرل بیگ سلجوقی نے بغداد پر قبضہ کرلیا۔ سلجوقی قوت سے بازنطین اور فاطمی سلطنت دونوں ہی ہراساں تھے۔ مشترکہ خوف نے دونوں کو آپس میں دفاعی معاہدہ کرنے پر مجبور کیا۔ یہ معاہدہ ۱۰۷۱ء میں کیا گیا۔ اسی سال سلجوقیوں نے شام اور فلسطین کو فتح کرلیا، جس کے سبب فاطمی خلافت مصر تک محدود ہوکر رہ گئی، اور بازنطین سے اسکا بری رابطہ منقطع ہوگیا۔

بازنطینی حملہ : سلطنتِ عباسیہ کے انتشار، اور سلجوقیوں اور فاطمیوں کی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بازنطینی شہنشاہ الیگزیئس کامنینس (Alexius Comninus) نے مسلم آرمینیا پر حملہ کر دیا۔ سلطان الپ ارسلان نے ۱۰۷۱ء میں بازنطینی افواج کو ملاذی گرد (منزی کرت) کے مقام پر شرمناک شکست دی۔ اس شکست نے بازنطین کو ایشیائے کوچک سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا۔ ۱۰۸۱ء میں خود قسطنطنیہ پر حملہ ہوا اور بازنطین نے عالمِ یاس میں مغرب کو مدد کے لیے پکارا۔

فوجی کارروائیاں

عالمِ اسلام کا شدید انتشار، اسپین اور سسلی میں عیسائی غلبہ، افریقہ میں فتوحات، بحرِ روم میں توازنِ طاقت میں تبدیلیاں، عباسیوں اور فاطمیوں کی سلجوقیوں کے ہاتھوں شکست، یہ سب ایسی تبدیلیاں تھیں جو مغرب کے لیے خوش آئند تھیں۔ بازنطینی پیش قدمیوں کو بھی مغرب نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن بازنطین کی مکمل اور فیصلہ کن شکست اور ایشیائے کوچک سے اسکی محرومی ایک سانحہ تھی۔ مغرب نے ترکوں کی اس فتح کو عالمِ عیسائیت کی توہین اور مغرب کے لیے خطرہ قرار دیا جسے نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔

(J.F.C. Fuller; The Decisive Battles of the Western World, p. 281)

مغرب میں عالمِ اسلام کے خلاف صدیوں سے ایک اضطراب پل رہا تھا، اور اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ مغرب کو دفاعی حیثیت اختیار کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے عالمِ اسلام پر ایک شدید ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

شہنشاہ الیگزیئس سلجوقیوں کے خلاف بار بار پوپ سے اپیل کر رہا تھا۔ پوپ کی نظر میں عالمِ اسلام اور بازنطین دونوں ہی دشمن تھے۔ انکی کشمکش کو وہ فطری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ہر دو فریق کی تباہی اس کے لیے باعثِ اطمینان تھی۔ "اس میں شک نہیں کہ مغرب کی رقابت نے بھی مشرقی ایمپائر (بازنطین) کی تباہی میں خاصا اہم کردار ادا کیا"۔ (حوالہ بالا)۔ جب بازنطین بے دم ہو گیا اور اس نے مایوسی میں پاپا سے مدد کی اپیل کی، جو مغرب کی برتری کو تسلیم کرنے کے مترادف تھی تو ۱۰۹۵ء میں پوپ اربن ثانی (Pope Urban II) نے اپنا مشہور خطبۂ جنگ دیا۔ (Phillips K. Hitti; Islam and the West, p. 73)۔ اس خطبے نے پورے مغرب میں اک آگ لگا دی۔ الیگزیئس مغرب کی مدد سے اک دفاعی حصار تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ پوپ نے اس سیاسی ضرورت کو مذہبی بنا دیا۔

صلیبی نظریہ: صلیبی نظریہ خود رو نہ تھا۔ اسے صدیوں کی کاوش سے دلنشیں کیا گیا تھا۔ اسلام کو عیسائیت کا دشمن باور کرایا جا چکا تھا۔ اسکا وجود ایک خطرہ تھا۔ انکے پروپیگنڈے کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کو فتح کرنا ضروری تھا۔ پوپ نے فرینکش قوم کو "قومِ خداوندی" قرار دیکر صلیب کے لیے بازوئے شمشیر زن فراہم کر دیا۔ سلجوقیوں کی فتح عیسائیت کی توہین قرار دی جا چکی تھی۔ مسلمان پہلے ہی سے ارضِ مقدس اور یروشلم پر قابض تھے۔ "ارضِ مقدس عیسائی سرزمین تھی، لہٰذا وحشیوں سے اسکی بازیابی لازم تھی۔ اگر فرینک عیسائیوں کے فطری قائد تھے تو یروشلم کو فتح کرنا فرینک قوم کا فریضہ تھا"۔

(Norman Daniel; The Arabs ånd Mediaeval Europe, p.115)

پوپ کی اپیل کیا تھی جنگل کی آگ تھی۔ پورا معاشرہ دیوانہ وار اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر فرد جنگِ صلیبی کی تبلیغ کرنے لگا۔

''پیش پیش بشپ تھے۔ انکے پیچھے دنیا۔ باپ مسرّت کے ساتھ اپنے بیٹوں کو، بیویاں شوہروں کو رخصت کر رہی تھیں۔ جو لوگ نہ جا سکے وہ حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ راہب چھپ چھپ کر، جنگ میں شرکت کرنے کے لیے فرار ہونے لگے۔ لوگ تھے کہ اپنے سینوں پر گرم لوہے سے صلیب کا نشان داغ رہے تھے۔ ایک سرسامی کیفیت تھی جو انگلستان سے پھیلتی ہوئی فرانس، وہاں سے گسکانی (Gascony) ہوتی ہوئی اطالیہ کی بندرگاہوں تک پہنچی، جہاں صلیبیوں کو لے جانے کے لیے جہاز تیار ہو رہے تھے۔ ۱۰۹۵ء میں ہر طرف آسمانی معجزے دیکھے جانے لگے، جو عموماً اشتعال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لوگوں نے اونے پونے اپنی جائیدادیں فروخت کیں۔ بچے گھروں سے بھاگ نکلے۔ جس شہر میں پہنچتے وہاں پوچھتے کیا یروشلم یہی ہے۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے آگے آگے رواں تھے تاکہ جنگی افراد کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنی جان نچھاور کر دیں۔...... لوگوں نے اپنی انا اور عزت کو خاک گردانا۔ اپنے بیوی بچوں کو خس و خاشاک کی طرح جھٹک کر الگ ہوئے۔ جنہوں نے ابتداً اس اشتعال کا مذاق اڑایا وہ بھی بعد میں شریکِ حال ہوئے۔ راہب پیٹر کی تقاریر نے اس اشتعال کو اور ہوا دی۔ لوگ ذمہ داریاں ترک کر کے ٹڈی دل کی طرح دوڑ پڑے۔ انہوں نے اپنا وطن، اپنا گھر بار، اپنا خاندان، قلعے، کھیت کھلیان اور زندگی کی ہر آسائش سے منہ موڑا۔ چور اچکوں نے اس موقع کو اپنی بخشش اور مغفرت کے لیے ایک نادر موقع جانا اور گناہوں کے کفارے کے لیے شریکِ جنگ ہوئے۔''

(حوالہ بالا، صفحات ۱۲۱-۱۲۲)

پہلی صلیبی جنگ کی کامیابیاں : فیوڈل سسٹم نے معاشرے کو نیم فوجی بنا دیا تھا۔ خطے کی توانائیاں آپس کی خونریزی میں ضائع ہو رہی تھیں۔ امن و امان کی کوششیں بیکار ثابت ہو چکی تھیں۔

(Earnest Barker; 1966, Legacy of Islam, article 'The Crusades', p.46)

صلیبی جنگ کے اعلان نے اس معاشرے کو طالع آزمائی کے لیے بیرونِ مغرب میدانِ جنگ فراہم کر دیا۔ مذہبی اعتقاد کے لیے شہرِ مسیح (یروشلم) کی بازیابی، افلاس کے لیے مال و زر، جنگی فطرت کے لیے فتح و نصرت، فیوڈل ازم کے لیے نئی نئی لاطینی مملکتوں کا قیام، تجارت کے لیے منڈیاں اور کلیسا کے لیے اسلام کی تباہی، غرضکہ ہر طبقے کے لیے صلیبی جنگ میں خاصی کشش موجود تھی۔ اعلان کر دیا گیا کہ،

"This is altogether forbidden that for any reason they should not enter into any alliance with the Muslims, neither for money nor for tribute, until with the help of God, either their religion or their nation has been destroyed."

(St. Bernard's Book of Praise of the New-Army, quoted by Norman Dan[illegible] The Arabs and Mediaeval Europe, p.225)

[صورتحال خواہ کچھ بھی ہو، اس بات کی سختی سے ممانعت کی جاتی ہے کہ (صلیبی افواج) مسلمانوں کے ساتھ نہ تو مال کے لیے نہ ہی خراج کے لیے، کسی قسم کا کوئی معاہدہ کریں، جب تک خدائی مدد سے یا تو انکی قوم یا انکا مذہب تباہ نہ ہو جائے۔]

مقدس پوپ نے مغربی خوں آشامی کو پرچم صلیب عطا کر کے عالم اسلام پر کھلا چھوڑ دیا۔ ۱۰۹۷ء میں صلیبیوں نے ایشیائے کوچک سے جنوب کی طرف پیش قدمی کی، اور یروشلم کا پورا علاقہ روند ڈالا۔ ۱۵ جولائی ۱۰۹۹ء کو فاطمی افواج نے ایک ماہ کے مقابلے کے بعد بیت المقدس کو صلیبیوں کے حوالے کر دیا۔

یہ پہلی صلیبی جنگ نتائج کے اعتبار سے، کلیسا اور مغرب کے لیے، خاصی کامیاب رہی۔ نہ صرف یروشلم قبضے میں آ گیا، بلکہ ایشیا کے رومی ساحل پر مندرجہ ذیل چار لاطینی ریاستیں قائم ہو گئیں۔

۱۔سلطنتِ یروشلم ۲۔سلطنتِ تریپولی ۳۔سلطنتِ انطاکیہ ۴۔سلطنتِ ادیسیہ

اس کامیابی نے مغرب کی بیشتر محرومیاں دور کر دیں۔ بحر روم پر برتری قائم ہوئی۔ تجارتی راہیں کھلیں۔ شام و فلسطین کے غلّہ گودام قبضے میں آئے۔ لاطینی عیسائیت کو وسعت کے مواقع میسر آئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دشمن کا دین اور اسکی ملت تباہی سے دوچار ہوئے۔

اس جنگ میں دشمن کی تباہی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ قتل و خونریزی، آتش زنی، لوٹ مار، عصمت دری، مقاماتِ مقدسہ کی بےحرمتی، یہ سب تو جیسے صلیبیوں کے ضابطۂ اخلاق میں سے تھے۔ اس دور کے مغربی اہلِ قلم ان واقعات کو بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ بہیمیت کا اندازہ صلیبی جنگوں پر مستند ترین کتاب ''گستا'' (Gesta) کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔

گلبرت، گستا کا مصنف، خود صلیبی تھا۔ اسکے بیانات کو عینی شہادت کا مرتبہ حاصل ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جو بیشتر صلیبی تاریخوں کا ماخذ ہے۔ اسکے چند اقتباسات نارمن ڈینئیل کے حوالے سے ملاحظہ ہوں۔

(Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe)

''انطاکیہ میں انہوں نے جس ترک یا سراسن کو پایا، قتل کر دیا۔ کوئی شخص کسی راستے پر، لاشوں پر گزرے بغیر چل نہ سکتا تھا۔''

''البارہ میں کاؤنٹ سینٹ گلز (St. Gilles) نے ہر عرب مرد عورت، چھوٹے بڑے کو تہِ تیغ کیا۔ اور پھر اس شہر کو دینِ مسیحی میں داخل کیا''۔ ''مارہ (Maarra) میں انہوں نے ہر فرد کو خواہ مرد ہو یا عورت، جہاں پایا قتل کر دیا۔''

''بوہیمنڈ نے جنگی قیدی تک قتل کر دیے''۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۳۶)

یروشلم کا قتلِ عام تاریخ کا بدترین قتلِ عام ہے، جہاں مغربی فاتحین کے گھوڑوں کے گھٹنے خون میں ڈوبے بیان کیے جاتے ہیں۔ خون کے تالابوں میں لاشیں تیرتی پھرتی تھیں۔

اسکے ایک اور عینی شاہد ریمند نے تحریر کیا۔

''آخرکار جب بت پرستوں کو شکست ہوئی تو ہمارے آدمیوں نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو مندر (مسجدِ اقصیٰ) سے گرفتار کیا۔ جنہیں مناسب سمجھا انہیں قتل کیا اور کچھ کو زندہ رہنے دیا۔ ہمارے لوگ پورے شہر پر سونا چاندی، گھوڑے خچر حاصل کرنے اور بھرے گھروں پر قبضہ کرنے دوڑ پڑے۔ یہ لوگ جب لوٹے تو خوشی سے دیوانے

ہو رہے تھے۔ بعض تو وفورِ مسرت سے رو رہے تھے کہ انہیں ہمارے نجات دہندہ مسیح کے مقبرے پر عبادت کی سعادت میسر ہوئی اور اس کے حضور جو سوگند کھائی تھی، انہوں نے اسے پورا کر دکھایا۔" (صفحہ ۱۳۵)

فتح کے جوش میں پہلے دن کی کارروائی کو اگر جذباتی حرکت کا نام دے بھی دیا جائے تو دوسرے دن کی کارروائی تو یقیناً ایک غیر جذباتی کارروائی ہی تھی۔ اول شب شہر کے کچھ باشندوں نے مسجدِ صخرا کی چھت پر پناہ لی تھی۔ انکے قتل کی کیفیت ریمند نے یوں بیان کی۔

"دوسرے دن وہ لوگ احتیاط کے ساتھ مندر کی چھت پر چڑھے اور مسلمان مردوں اور عورتوں پر حملہ کیا۔ شمشیرِ برہنہ سے انکے سر تن سے جدا کیے۔ دوسرے مسلمانوں نے یہ دیکھ کر خود ہی اپنے آپ کو سر کے بل گرا لیا۔ (صفحہ ۱۳۵)

زندوں کے ساتھ جو ہوا سو ہوا، لیکن مرنے والوں کے ساتھ جو سلوک ہوا، انسانیت کے لیے اسکا تصور بھی شرمناک ہے۔ مغربی فاتح "عیسائیت کے قائد" "خدا کی قوم" فرینک لاشوں کو چاک کر رہے تھے، کیونکہ انہیں مُردوں کے پیٹ سے سنہرے سکے ملنے کی توقع تھی۔ (صفحہ ۱۳۵)

ان سکوں کی تلاش نے بناتِ آدم کا دامن حیا تار تار کیا۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنی بہیمیت کا ذمہ دار بھی ان ہی کو ٹھہرایا۔ فلچر نے تحریر کیا۔

"عورتیں سکے اپنی اندام نہانی میں چھپا لیتی تھیں۔ یہ مقام چیزیں چھپانے کے لیے کس قدر قبیح تھا۔ اور اس سے کہیں زیادہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں بیان کروں۔" (صفحہ ۱۳۵)

انسانیت یہ دیکھ کر انگشت بدنداں ہے کہ مقدس صلیب کے پرچم تلے اُس کے علم بردار "مسیح" کے پیرو، خود مسیح کے شہر میں مُردوں کی لاشیں چیر پھاڑ رہے تھے تاکہ پیٹ میں چھپے سکے حاصل کر سکیں۔ کچھ لوگ انسانی گوشت کے پارچے تراش رہے تھے تاکہ بھون کر کھا سکیں۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۳۵)

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ محض مغرب کی جبلّی بہیمیت و بربریت تھی یا اس میں اسلام کے خلاف اس پروپیگنڈے کا اثر بھی شامل تھا جو اہلِ مغرب کے اعصاب پر صدیوں سے سوار تھا، کیونکہ اہلِ مغرب کی آپس کی جنگوں میں اس قسم کے واقعات کہیں لکھے نظر نہیں آتے۔"

حروبِ صلیبی کی ناکامی اور مشترکہ دفاعی کوششیں

شام و فلسطین میں لاطینی حکومتوں کے قیام کے ساتھ ہی مسلمانوں میں اسکا شدید ردِ عمل شروع ہو گیا۔ ۱۱۲۷ء میں موصل کے سلطان اتابک زنگی تاریخ کے صفحات پر ابھرے۔ انہوں نے ۱۱۴۴ء میں ادیسہ فتح کر کے صلیبی شکستوں کی بنیاد رکھی۔ انکے جانشین نور الدین زنگی ہوئے جو روزِ اوّل سے صلیبیوں کو بزورِ شمشیر علاقہ بدر کرنے پر تلے بیٹھے ہوئے تھے۔ انکے عہد میں یروشلم کے صلیبی حکمراں نے ۱۱۶۳ء میں مصر پر قبضہ کرنے کی

مہم چلائی۔ سلطان نورالدین نے مصر پر سے صلیبی دباؤ کم کرنے کے لیے صلیبی ریاستوں انطاکیہ اور تریپولی پر حملہ کیا، لیکن اس سال خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ مصر میں صلیبی کامیابیوں کو روکنے کے لیے انہوں نے اپنے سپہ سالار شیرکوہ کو مصر روانہ کیا۔ صلیبی جنگوں کے بطلِ اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی کا ذکر تاریخ میں پہلی بار اسی مہم میں آتا ہے۔ شیرکوہ کو مصر میں اس سال کامیابی نہ ہو سکی لیکن سلطان نورالدین نے دوسری صلیبی سلطنت انطاکیہ کو اگست ۱۱۶۴ء میں تباہ کن شکست دی۔

مصر میں دوسرا صلیبی اقدام ہوا تو شیرکوہ اور صلاح الدین ایک بار پھر ۱۱۶۷ء میں مصر میں داخل ہوئے۔ اس بار وہ صلیبی افواج کو اپنے تعاقب میں لگا کر نیل کے کنارے کنارے تقریباً تین سو میل (پانچ سو کلومیٹر) اندرونِ ملک لے آئے اور بابین کے مقام پر صلیبی افواج کو ایسی شکست دی کہ وہ قاہرہ سے رخصت ہونے پر مجبور ہو گئیں۔

مصر کی خلافتِ فاطمیہ کے وزیر شاور کی ریشہ دوانیوں کے سبب مصر میں صلیبی حملہ آوروں اور سلطان کی افواج کے درمیان رسہ کشی ہونے لگی۔ یہ شخص سلطان کی افواج کے خلاف صلیبیوں سے اور صلیبیوں کے خلاف سلطان سے کام لیتا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ۱۱۷۱ء میں سلطان نے خلافتِ فاطمی کو ہی ختم کر دیا۔ نورالدین زنگی کے بعد ۱۱۷۴ء میں سلطان صلاح الدین انکے جانشین ہوئے۔

<u>بازنطینی اقدام :</u> ملازی گرد یا منزی کرت کی شکست کے بعد صلیبی حملے نے بازنطین کو ایک بار پھر سنبھلنے کا موقع دیا۔ نورالدین زنگی کے آخری ایام میں بازنطین اسقدر طاقتور ہو چکا تھا کہ ایشیائے کوچک، مصر و شام، سربیا اور ہنگری پر حملے کر رہا تھا۔ ۱۱۷۶ء میں اس نے سلطان قلیج ارسلان کے پایۂ تخت اکونیہ پر حملہ کر دیا تاکہ ایشیائے کوچک سے ترکوں کو نکال باہر کرے۔ سلطان قلیج ارسلان نے مائریوسیفالون (Myrio Ciphalon) کی جنگ میں شہنشاہِ بازنطین مینوئل کو ویسی ہی شکست دی جیسی اس کے بزرگوں نے ایک صدی قبل ملازی گرد میں دی تھی۔ شہنشاہ کی پوری فوج کام آئی، اور خود شہنشاہ سلطان کی امان میں یاس و حرماں کی زندگی گزارنے قسطنطنیہ پہنچا۔

جنگِ ملازی گرد کے باعث صلیبی طوفان اٹھا تھا، تو جنگ مائریوسیفالون صلیبی ناکامیوں کا پیغام لائی۔ بازنطینی قوت کے بل پر صلیبی سلطنتیں محفوظ و مامون تھیں۔ اسکی شکست نے صلیبی سلطنتوں کا پیمانۂ عمر لبریز کر دیا۔

<u>دوسری اور تیسری صلیبی جنگیں</u>

سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۳ء تک مصر و شام کو متحد کر کے انکی اندرونی رقابتوں کا خاتمہ کر دیا۔ پھر وہ پوری یکسوئی سے صلیبیوں کی طرف متوجہ ہوئے جنکی دست درازیاں حد سے گزر رہی تھیں۔ مسلم علاقوں پر تنگ وتاز صلیبیوں کا معمول بن گیا تھا۔ دمشق تک انکی دسترس میں تھا۔ مدینے کے نواح تک

انکے قزاق پہنچنے لگے تھے۔ مزید برآں اس قسم کی ناہنجار افواہ بھی گشت کرنے لگی کہ ریناند (Renand) نے قسم کھائی تھی کہ (عیاذاً باللہ) وہ مدفن نبوی سے جسد کو برآمد کر کے نذرِ آتش کرے گا۔

(Sir John Glubb; The Lost Centuries, p.93)

جنگ حطین: جب فرینک وجود مسلمانوں کی جان و مال سے بڑھ کر عزت و آبرو کے لیے خطرہ بن گیا تو سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۳ء میں صلیبی علاقوں پر شدید حملہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں فریقین میں ۱۱۸۵ء کا صلح نامہ ہوا۔ ۱۱۸۷ء میں صلیبیوں نے قاہرہ سے دمشق جانے والے ایک کاروان کو گرفتار کر کے صلح کو ختم کر ڈالا۔ جس پر سلطان نے صلیبی علاقوں پر حملے کیے اور حطین کے بے آب و گیاہ میدان میں صلیبی قوت کو پاش پاش کر ڈالا۔ سوائے چند سرداروں کے یہاں سے کوئی بچ کر نہ نکل سکا۔ قیدیوں میں دریدہ دہن ریناند بھی شامل تھا جسے سلطان نے بدست خود کیفرِ کردار تک پہنچایا۔

یروشلم کی بازیابی: حطین میں صلیبی شکست کے بعد یکے بعد دیگرے تمام اہم شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آتے چلے گئے۔ سلطان کے بھائی ملک العادل نے مصر سے طوفانی یلغار کی۔ حافہ، سدون اور بیروت کو زیرِ نگیں کیا، اور ۲۰ ستمبر ۱۱۸۷ء کو سلطان صلاح الدین ایوبی نے نوے سال کے بعد بیت المقدس کو صلیبی قبضہ سے آزاد کرانے کا شرف حاصل کیا۔

مشترکہ مغربی یلغار: سقوطِ یروشلم نے مغرب میں ایک ہیجان برپا کر دیا۔ پوپ نے تیسری صلیبی جنگ کی اپیل کی۔ اس بار مغربی حکمرانوں نے اس اپیل پر لبیک کہا۔ یورپ کے متعدد حکمراں اپنی اپنی افواج لیکر عکرہ پہنچے۔ ۱۱۸۹ء تک یہ افواج دفاعی جنگ کرتی رہیں، لیکن جب انکی طاقت مجتمع ہوگئی، تو اکتوبر ۱۱۸۹ء میں انہوں نے اجتماعی حملہ کیا، جس میں صلیبیوں کو شکست ہوئی۔ پوپ کی اپیل پر ۱۱۹۱ء میں فرانس اور انگلستان بھی جنگ میں شریک ہوگئے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے پاس بحری قوت نہیں تھی، جس کے باعث مغرب کی کمک روکی نہیں جا سکتی تھی۔ انہوں نے یعقوب المنصور، خلیفۂ مراکش سے بحری امداد طلب کی جو انہیں نہیں مل سکی۔ مغرب کی مشترکہ قوت کے آگے زیادہ دنوں تک عکرہ کا دفاع نہیں کیا جا سکا۔ سلطان کو معاہدۂ صلح کر کے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ معاہدۂ صلح کے باوجود رچرڈ نے تمام مسلم سپاہ کو تہہ تیغ کر ڈالا۔ اس اجتماعی جارحیت سے صلیبیوں نے کچھ ساحلی علاقے ضرور بازیاب کر لیے تاہم بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ برقرار رہا۔ یہ جنگ ایک علیحدہ صلح نامہ پر منتج ہوئی، جس کے بعد سارے مغربی حکمراں لوٹ گئے۔

چوتھی صلیبی جنگ کے لیے جو فوج جمع ہوئی اسکا ہدف عالمِ اسلام کے بجائے مشرقی عالمِ عیسائیت بنا۔ صلیبیوں نے ۱۲۰۴ء میں قسطنطنیہ پر حملہ کر کے اسے پامال کر ڈالا۔

پانچویں صلیبی جنگ: پانچویں صلیبی جنگ جسے مغرب عام طور پر نظر انداز کرتا ہے مصر میں لڑی گئی۔ چوتھی جنگ نے پوپ کو یہ سبق دیا تھا کہ صلیبی افواج کی کمان اپنے ہاتھ میں ہی رکھے۔ چنانچہ اسکا ایک نائب اس فوج کی سربراہی کر رہا تھا۔ ابتداً صلیبیوں کو اس جنگ سے بہت خوش آئند توقعات وابستہ تھیں، مگر اسکا حشر بھی

دوسری جنگوں سے مختلف نہیں ہوا۔ ۱۲۲۱ء میں اس فوج کے سربراہ نے پوپ ہونوریوس تھیچی اس کی بنیاد پر یہ توقع پیدا ہوگئی تھی کہ منگول حملوں کے نتیجے میں عالم اسلام اسقدر نڈھال ہوجائے گا کہ مغرب کے لیے اس پر حملہ کرنا آسان ہوجائے گا۔

(cf. Southern R.W.; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.45)

تیرھویں صدی عیسوی صلیبی جنگوں سے پرے جو یروشلم کے سوا ہر جگہ لڑی گئیں۔ اس صدی کے نصف میں مصر سے ایک نئی قوت 'مملوک' ابھری۔ انکے حکمرانوں نے ۱۲۶۸ء میں انطاکیہ، ۱۲۸۹ء میں طرابلس اور ۱۲۹۱ء میں آخری صلیبی مورچے عکرہ کو فتح کرکے حروب صلیبیہ کا باب بند کردیا۔

تباہ کاری کا نیا منصوبہ، مغرب اور منگول

تیرہویں صدی عیسوی میں جب صلیبی سلطنتوں پر نزع کا عالم طاری تھا، عالم اسلام پر منگول یلغار شروع ہوئی۔ اوّلاً مغرب نے انکو بھی مسلمان تصور کر کے خطرے کی علامت قرار دیا۔ چنانچہ اس دور کے راہبوں نے انہیں 'بنو اسمٰعیل' تحریر کیا۔ (cf. Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, p.315) لیکن کچھ عرصے کے بعد جب انہیں پتہ چلا کہ منگولوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں کے دشمن تھے اور انکی سرپرستی میں عیسائی نسطوریت پروان چڑھ رہی تھی، تو مغرب کے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی کہ کیوں نہ انکو عیسائی بنالیا جائے اور پھر صلیبی جنگوں کے بنیادی مقاصد ایسے عظیم پیمانے پر حاصل کیے جائیں جنکا اس سے قبل خواب بھی نہ دیکھا گیا ہو۔ (Earnest Barker; 1960 ed., Legacy of Islam, essay 'The Crusades', p.48) اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے وفود کا سلسلہ جاری ہوا۔

(for details of mission, see, W.Budges; The Monks of Kublai Khan, pp. 174-197)

۱۔ ۱۲۴۵ء میں پوپ انوسنٹ چہارم نے جان آف پلینو کارپنو کی سربراہی میں ایک وفد روانہ کیا، جو دو سال بعد واپس لوٹا۔

۲۔ جان کی واپسی کے بعد دوسرا وفد سائمن آف تورنائے کی قیادت میں روانہ کیا گیا۔ اسی دوران منگولوں کا وفد لوئیس نہم کے پاس آیا۔

۳۔ پوپ نے اندریو کی سربراہی میں ایک تبلیغی وفد روانہ کیا۔

۴۔ لوئی کا ایلچی روبرک ۱۲۵۳ء میں روانہ ہوا۔

۵۔ وفود کا سلسلہ تیرہویں صدی عیسوی کے اختتام تک جاری رہا، جس کی آخری کڑی مشہور سیاح مارکو پولو (دورِ سیاحت ۱۲۷۱ء تا ۱۲۹۵ء) ہے۔ گو مارکو پولو کا مقصدِ سیاحت تجارت اور ذاتی منفعت بتلایا جاتا ہے۔ لیکن یہ امر توجہ طلب ہے کہ اس سیاح کے ذریعے بھی پوپ کے پیغامات قبلائی خان تک پہنچے۔

۶۔ ۱۲۸۶ء میں منگول لیڈر پوپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ان وفود کے مقاصد تجارتی، سیاسی اور مذہبی بتائے جاتے ہیں، لیکن اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ یہ سارے وفود تیرہویں صدی کے نصف آخر میں آئے گئے، اور اس کے بعد اس قسم کے وفود کا سلسلہ ختم ہونے لگا، یہ شبہ قوی تر ہو جاتا ہے کہ ان کے مقاصد تجارتی نہیں تھے۔ ممکن ہے کہ وفود نے نجی طور پر تجارتی فوائد بھی حاصل کیے ہوں لیکن اس مقصد کے لیے پوپ اور بادشاہوں کی سرپرستی بے محل نظر آتی ہے۔ لہٰذا یہ وفود محض سیاسی اور مذہبی نوعیت کے ہی حامل رہے ہوں گے، جن کی غرض یہ تھی کہ صلیبی جنگوں کے متعینہ مقاصد منگولوں اور تاتاریوں کے ذریعے سے حاصل کیے جائیں۔ اس شبہ کی تصدیق نہ صرف اس دور کی تحریروں سے، بلکہ دورِ مابعد کے مفکرین کے تبصروں سے بھی ہوتی ہے۔

۱۲۹۱ء میں جب سقوطِ عکرہ کی خبر اطالیہ پہنچی تو ریمنڈلل نے جو مشہور مبلغِ عیسائیت تھا تحریر کیا،

''اگر نسطوریوں (منگول عیسائیوں) کو اپنا لیا جائے تو سارے سرا سن بآسانی تباہ کیے جا سکتے ہیں۔''

(Raymond Lull, 'Opera Latina', quoted by R.W.Southern; 'Western Views of Islam in the Middle Ages', p.68)

۱۳۲۱ء میں آرچ بشپ آف ترائر (Trier) کے نام پوپ نے تحریر کیا،

''محترم برادر پلچینیس، بشپ آف الپانو نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ کنگ ڈیوڈ، جسے جہلاء پرسٹر جان کہتے ہیں، جو ایک کیتھولک اور خدا ترس (عیسائی) ہے، فارس میں ایک طاقتور فوج کے ساتھ داخل ہو چکا ہے۔ اس نے سلطانِ فارس کو ایک گھمسان کی جنگ میں شکست دے دی ہے۔ وہ بیس دن کی مسافت کے بقدر اسکی مملکت میں اقدام کر کے اس پر قبضہ کر چکا ہے۔ اب اسکے زیرِ نگیں بہت سے شہر اور قلعے ہیں۔ اسکی فوج اب بغداد سے صرف دس دن کی مسافت پر ہے۔ یہ شہر خلیفہ کا مستقر ہے، جسے سرا سن اپنا روحانی پیشوا اور بشپ کہتے ہیں۔ ان واقعات کی ہیبت نے سلطانِ حلب کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی اس قوت کا رخ، جس سے وہ دمیتیہ (مصر کی بندرگاہ) کی عیسائی افواج پر حملہ کرنا چاہتا تھا، اس کنگ (ڈیوڈ) کی طرف موڑ دے۔ ہمارے نائب اور سفیر نے بہر حال جارجیا والوں کو جو خود بھی کیتھولک اور قوی شمشیر زن ہیں، ایک پیغام کے ذریعے یہ دعوت دی اور استدعا کی ہے کہ وہ اپنی سمت سے سرا سن سے جنگ شروع کر دیں، جس کے باعث ہمیں امید ہے کہ اگر ہماری فوج کو دمیتیہ میں کمک پہنچ گئی، جس کی توقع اس سال کے موسمِ گرما تک کی جاتی ہے، تو خداوند کی مدد سے ہم بآسانی سرزمینِ مصر پر قبضہ کر لیں گے، جبکہ مسلم افواج جو مصر کے دفاع کے لیے چہار جانب سے جمع ہو چکی ہیں، اپنے علاقے کے دفاع کے لیے سرحدوں پر منتشر ہو چکی ہوں گی۔'' (حوالہ بالا صفحہ ۴-۶)

اسی قبیل کا ایک خط ایک صلیبی نے میدانِ جنگ سے تحریر کیا۔ اس میں بھی تقریباً وہی اطلاعات ہیں جو پوپ نے دی تھیں۔ صرف اسقدر اضافہ ہے کہ،

''کنگ ڈیوڈ تقریباً چار لاکھ افراد، جس میں ایک لاکھ بتیس ہزار کرسچین نائٹ... فارس- پامال... سقوطِ بغداد عنقریب متوقع......''۔ (حوالہ بالا)

اس میں صحت اس قدر تھی کہ منگول بڑھ رہے تھے اور بغداد کا سقوط ہونے والا تھا۔ لیکن یہ خدا ترس کنگ ڈیوڈ، چنگیز خان تھا، جو بغداد فتح کیے بغیر ہی مر گیا۔ اور سارے کرسچین شہسوار مغربی دماغ کی اپج تھے۔ چنگیز کے بعد منگول تھم سے گئے۔ پوپ نے اس سیلِ بلا کو متحرک کرنے کے لیے اپنے ہرکارے دوڑائے۔ ۱۲۵۲ء کے وفد نے جسکا سربراہ ولیم آف روبرک تھا، غالباً کسی نہ کسی طرح خانِ اعظم کو ہموار کر ہی لیا، جسکا نتیجہ ۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

روبرک کی سفارت کے بارے میں ولیم آف فلر نے تبصرہ کیا کہ،

''سینٹ لوئیس نے ولیم آف روبرک کو خانِ اعظم کی خدمت میں اس توقع کے ساتھ روانہ کیا کہ اگر منگولین ایمپائر ایک بار عیسائی بنالی گئی تو وہ ترکوں پر عقب پر سے پیشقدمی کرکے فلسطین میں عیسائیوں کی مدد کر سکے گی۔''

(J.C. Filler; The Decisive Battles of the Western World,)

پروفیسر ٹوئن بی نے مغربی معاشرے اور عالمِ اسلام کی کشمکش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا،

''دور، مشرقِ بعید میں ایک عظیم منگول ایمپائر قائم ہو چکی تھی۔ مغربی خوش فہم عیسائیوں نے اس عالمی قوت کے حکمرانوں کو اپنے مذہب میں داخل کر کے اسلام کو عقب سے آ دبوچنے کا خواب دیکھا۔ پاپا کے وفود قراقرم کا طول طویل سفر طے کر چکے تھے۔ مارکو پولو جلد ہی قبلائی خان کے دربار کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ یہ خواب خواب ہی رہ گیا۔ قبلائی خان کرسچین تو نہ ہوا، ہاں مشرق میں رومن ایمپائر کا خاتمہ ضرور ہو گیا''۔

(Toynbee; A Study of History, Vol VI, pp. 190-191)

سینٹ لوئیس نے ولیم آف روبرک کو دوسرے مشن پر بھیجا۔ یہ وفود خاصے متحرک رہے اور چین تک پہنچے، لیکن سب خواب خواب ہی رہے اور کلیسا کو مسلمانوں کے خلاف کہیں سے مدد نہیں مل سکی۔

(Earnest Barker; 1960 Ed., Legacy of Islam, essay 'The Crusades', p.49)

سدرن نے ان وفود کی آمد و رفت کا مقصد عالمِ اسلام پر مشترکہ جارحیت کی تیاری بتایا ہے۔

(R. W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, p. 65)

غرض یہ کہ تیرہویں صدی عیسوی کے اختتام تک یورپ اس خوش فہمی میں نظر آتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ اسلام کو ختم کر دیگا۔ اس نے نہ صرف اپنی پوری توانائیاں صرف کیں، بلکہ اس مقصد کے لیے اس نے دیگر وحشی اقوام سے کام لینے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ اس مشترکہ یلغار کے بعد بھی عالمِ اسلام کی بقا ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔

چرچ کا کردار

مغرب کا تابناک ترین دور یا تو رومن ایمپائر کا زمانہ تھا یا دورِ حاضر ہے۔ رومن ایمپائر بنیادی طور پر ایک فوجی ریاست تھی، جس نے گرد و پیش کے علاقوں خصوصاً سامی تہذیب کے گہوارے پر قبضہ کر کے اسے بدترین استحصال کا شکار کر رکھا تھا۔(Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. VI, p. 202)۔

صلیبی جنگوں کی ابتدائی کامیابیوں نے پوپ کی آسمانی ہدایت کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کی۔ لیکن بازنطینی اقدامات اور منگول غارتگری کے باوجود مغرب کو اپنی قدیم حدود میں لوٹ آنا پڑا۔ صلیبی جنگوں نے اسلام کے بارے میں مغرب کو بہت ساری درست معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ اربابِ حکومت، ان کے عمال، انکے مخبر، ان کے سپاہی، عام زائر، ارکانِ کلیسا اور راہب، سب کے سب عالمِ اسلام کو بچشمِ خود دیکھ چکے تھے۔ تاہم مغرب کا عام آدمی اسلام سے اب بھی بے خبر تھا۔ اسے تو کلیسا کے توسط سے اسلام کا ایک نفرت انگیز تصور ملا تھا۔ یہ تصور ان کے دلوں پر اس طرح نقش ہو چکا تھا کہ مٹائے نہیں مٹ سکتا تھا۔ اسکی تسکین صرف اس طرح ہو سکتی تھی کہ اس نقش میں مزید گہرائی پیدا ہو۔ مزید گہرے رنگ بھرے جائیں۔ مغربی اہلِ قلم اس عوامی ضرورت کی تکمیل کر رہے تھے۔ تاہم اربابِ کلیسا کو یہ احساس تھا کہ اس طرح ہوا میں تیر چلانے سے مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ اسلام کے علاج کے لیے اسلام کی حقیقی نوعیت اور اسکی کمزوریوں کو سمجھنا ضروری ہوگا۔ اس طرح اسلام کی دو مختلف تصویریں بننے لگیں۔

بامقصد مطالعہ: پیٹر۔ وینیریبل (Peter the Venerable) نے بامقصد مطالعہ کی طرف پیشقدمی کی۔ اس نے اس مقصد کے لیے ایک جماعت (Order) قائم کر کے دینی کتب کے تراجم کا کام شروع کرایا۔ قرآنِ پاک کا لاطینی ترجمہ ۱۱۴۱ء میں ہوا۔(cf. Phillips K.Hitti; Islam and the West, p.52)۔ اسی جماعت کے ایک انگریز رابرٹ نے ۱۱۴۳ء میں قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ کیا۔ [cf. Robert of Kitton; Translation of Koran, Islamic Quarterly, II, 1955, pp. 309-312)]۔

اس جماعت نے متعدد کتب کا ترجمہ کیا جو کلونی تحریرات (Cluniac Corpus) کہلائیں۔ پیٹر نے ان تراجم پر خود اپنے مقالات تحریر کیے۔ یہ تحریریں یا کارپس خاصی مقبول ہوئیں۔ تاہم بعض حلقوں میں اس دلچسپی کے بارے میں تشویش پیدا ہوئی۔ پیٹر کے ایک حریف نے اسکے کارناموں پر اعتراض کیا جس کے جواب میں اس نے تحریر کیا،

''اگر میری مساعی صرف اس لیے لاحاصل نظر آ رہی ہیں کہ دشمن پر اس سے کوئی اثر نہیں ہوگا، تو عرض یہ ہے کہ ایک عظیم بادشاہ کے ملک میں کچھ کام ضرورتوں کے پیش نظر اور کچھ کام آرائش و زیبائش کے لیے اور کچھ دونوں کے

لیے کیے جاتے ہیں۔ صاحب اسٹن سلیمان نے دفاع کے لیے ہتھیار بنوائے جنگی ضرورت اس کے دور میں نہیں تھی۔ داؤد نے ہیکل کی آرائشی اشیاء تیار کروائیں، جبکہ یہ اشیاء انکے عہد میں استعمال نہیں کی جاتیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا کام لا حاصل نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اگر گمراہ مسلمان اس سے راہ حق (conversion) پر نہیں لائے جا سکتے تو وہ محقق جو تلاش حق میں سرگرداں ہیں، چرچ کے ان کمزور ارا کین کو آگاہ کرنے سے ہرگز گریز نہیں کریں کے جو آسانی متزلزل ہو جاتے ہیں یا غیر ارادی طور پر معمولی باتوں سے ہراساں ہو جاتے ہیں"۔

(R. W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, pp.38-39)

پیٹر وینیریبل کے بارے میں روڈنسن نے اعتراف کیا کہ۔

"اس کا مقصد بد عقیوں، یہودیوں، اور مسلمانوں سے کارگر علمی دلائل کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا"

(Maxine Rodinson; 1974 ed., Legacy of Islam, article 'The Western Image and Western Studies of Islam' ,p. 16)

پیٹر کی یہ دلچسپی اسلام کو سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ اسلام کے کمزور پہلو دریافت کرنے اور کلیسا کو وہاں سے حملہ آور ہونے کے لیے مواد فراہم کرنے کی غرض سے تھی۔ چنانچہ اس نے ترجمہ کے ساتھ ایک ضمیمہ بعنوان 'ازالہ عقائد محمدیان' (Refutation of Beliefs of Muhammadans) بھی شامل کیا تھا۔

(Phillips K. Hitti; Islam and the West, p.53)

قرآن کی طرح بارھویں صدی میں سیرت پر بھی کتب تحریر کی گئیں۔ گلبرت آف نوجنت کی تصنیف کو اولیت دی جاتی ہے۔ اس کتاب کو اس دور میں مستند ترین سیرت تصور کیا جاتا تھا۔ یہ کتنی مستند تھی اسکا اندازہ خود اسکے مصنف کے اعتراف سے ہو سکتا ہے کہ "اس کے پاس سند اور حوالوں کے لیے کوئی کتاب نہیں تھی اور نہ ہی اس نے اپنی تصنیف میں کسی اور کتاب سے کوئی مدد لی"۔

(R.W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.31)

اس نے اقرار کیا کہ "اس کا تمام کا تمام مواد رائے عامہ (Publica Opinio) (یعنی سنی سنائی باتوں) پر مشتمل تھا"۔ (حوالہ بالا)۔ واقعات کی صحت اور عدم صحت کی ذمہ داری سے گریز کرتے ہوئے اس نے تحریر کیا کہ "احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے شخص کو برا ہی کہا جائے جس کی بد افعالیاں اسقدر بڑھی ہوئی ہوں کہ بیان نہ کی جا سکیں"۔ (حوالہ بالا)۔

بارھویں صدی عیسوی میں جرمن شہنشاہ کے ایک سکریٹری گاڈفرے نے اپنے عالمی وقائع میں حیات نبوی ﷺ کا ایک معلوماتی خاکہ بھی شریک کیا۔

(N. Rodinson; 1974 ed., Legacy of Islam, p.20)

اسی طرح کارڈینل رودرق نے جو طیطلہ کا بشپ تھا، یورپ میں مرتب کی جانے والی اولین تاریخ عرب تحریر کی جس کی ابتدا عہد نبوی ﷺ سے کی گئی۔

راجر بیکن : راجر بیکن ازمنۂ وسطیٰ کا مشہور مصنف ہے۔اس نے اسلام سے نپٹنے کے لیے پوپ کی خدمت میں جو تجاویز پیش کیں انکی تفصیلات حال ہی میں سامنے آئی ہیں۔اس کی تصنیف (Opus Miaus) کے جو حوالے سدرن نے دیے ہیں، انکے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں اسلام کے بارے میں مغربی کلیسا کا اندازِ فکر کیا تھا۔اس نے لکھا،

''دنیا میں عیسائیوں کی تعداد بہت کم ہے جبکہ بے دینوں سے بھری پڑی ہے۔اور ایسا کوئی نہیں جو انہیں راہ حق بتلا سکے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ راہ بتلانے والا کیوں نہیں تو جواب یہ ہے کہ کچھ تو عالم عیسائیت کے مقاصد غلط تھے اور کچھ اس کے وسائل بھی نامناسب تھے۔مقاصد اس اعتبار سے غلط تھے کہ یہ غلبہ کی خواہش سے آلودہ تھے، جس کے سبب عیسائی بنانے کی کوششیں ضائع ہوگئیں۔جنگیں ناکام ہو چکی ہیں لیکن اگر یہ کامیاب بھی ہو جاتیں تو لاحاصل رہتیں، کیونکہ اتنے وسیع علاقے پر قبضہ برقرار رکھنا ممکن نہ ہوتا۔پھر جو لوگ باقی بچتے وہ فاتحین کے خلاف مشتعل ہوتے۔انکی ہمسائیگی خطرناک ہوتی اور یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کر لیتے۔اس حقیقت کا مشاہدہ آج ہم مختلف اسلامی مملکتوں میں کر رہے ہیں۔لہٰذا تبلیغ ہی وہ واحد طریقۂ کار ہے جس کے ذریعہ عالمِ اسلام میں نفوذ کیا جا سکتا ہے''۔

''اس مقصد کے لیے ہمارے وسائل تین اعتبار سے کم ہیں۔ضروری زبانوں سے کسی کو واقفیت نہیں ہے۔ بد اعتقادی کی کیفیتوں کا نہ تو مطالعہ کیا گیا ہے اور نہ ہی تعین۔اور پھر انکے ازالے کے لیے ابھی تک دلائل پر غور بھی نہیں کیا گیا ہے۔''

(Opus Miaus III ; 121-122, quoted by R. W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, pp. 56-57)

بیکن کی تحریروں کا بیشتر حصہ ایسی تجاویز سے بھرا پڑا ہے جو عیسائیت کو اسلام پر غلبہ دلانے کی غرض سے پیش کی گئی تھیں۔

بارہویں صدی کے مترجمین نے عالمِ اسلام کے بیشتر نامور فلاسفہ کے کارناموں کو لاطینی میں منتقل کر دیا تھا۔بیکن ان سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔چنانچہ اس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ فلسفہ کو بطور ہتھیار استعمال کرنا عیسائیت کے لیے ناگزیر ہے۔اس کے نزدیک لوگوں کو حق کی جانب مائل کرنے کے دو طریقے تھے۔ایک معجزات اور دوسرا فلسفہ۔ہتھیار کے بل بوتے پر تبدیلی مذہب کے امکان کو وہ پہلے ہی مسترد کر چکا تھا۔اب اس نے معجزات کو بھی خارج از بحث قرار دیکر صرف فلسفہ کی افادیت پر زور دیا۔اس نے لکھا،

''فلسفہ بے دینوں کا اہم ترین ہتھیار ہے۔اس میں جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے انہیں سے کیا ہے۔چونکہ فلسفہ بے دینوں کا خصوصی ہتھیار ہے اس لیے اس پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، تاکہ ان لوگوں کو جب بھی فلسفہ لوٹایا جائے تو وہ دینی تقدس سے لبریز ہو''(حوالہ بالا)

بیکن نے ادیان عالم کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیا اور اس امر کی نشاندہی کی کہ کس مذہب سے کس پیرائے میں بحث کی جائے۔ اسلام اسکے نزدیک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے، تاہم طول طویل بحث کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ اگر اس کا منطقی انداز اختیار کیا جائے تو اسلام کو اکھیڑ پھینکا جا سکتا ہے۔

(R.W.Southern; 'Western Views of Islam in the Middle Ages', p.59)

ریمنڈ لل : یہ شخص ہسپانوی کلیسا کا رکن، بیکن کا ہمعصر اور ہمخیال تھا۔ اسکی زندگی کا واحد نصب العین یہ تھا کہ حروبِ صلیبیہ کو مادّی جنگ سے روحانی جنگ میں تبدیل کر دے۔ [Earnest Barker, 1960 ed., Legacy of Islam, essay 'The Crusades' , p.64]۔ اس نے اپنی ساری توانائیاں اسلام کے خلاف نفرت انگیز لٹریچر تخلیق کرنے میں گزار دی۔ اسے مسلمانوں کی مکمل تباہی سے کم کوئی اور شے مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ یوں تو اس نے دو سو سے زیادہ کتابیں تحریر کیں لیکن اس کا بڑا کارنامہ اس کی کتاب (Refutation of Infidel Errors) [لادینی اغلاط کا ابطال] ہے، جسکا عنوان ہی اس کے مندرجات کے اظہار کے لیے کافی ہے۔ اس نے خود عربی زبان کی تحصیل کی۔ راہبوں کا ایک سلسلہ (Order) قائم کیا، جس کا مقصد اسلام اور بانی اسلام کی حیاتِ طیبہ کا راست عربی سے مطالعہ کر کے ان پر تنقید کرنا تھا۔

اس نے بھی اپنی تجاویز پوپ کو پیش کیں تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر روحانی حروبِ صلیبیہ لڑی جا سکیں۔ ان تجاویز میں تبلیغی سرگرمیوں اور عربی سے راست مطالعے پر خصوصی زور دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کا خصوصی بندوبست کیا تھا اور اس کی کوششوں سے روم، بلوگنا، پیرس، آکسفورڈ اور سلمانکا میں عربک اسٹڈیز کے مراکز قائم ہوئے۔ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے سلسلے میں وہ تیونس پہنچا جہاں اس نے کھلم کھلا گستاخیوں کا ارتکاب کیا، جس کے سبب قاضیِ شہر نے سزائے قید دینے کے بعد اسے شہر بدر کیا۔

(cf. Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, p.223)

دوسری بار پھر آیا اور مسلمانوں میں تثلیث کا پرچار کرنے لگا۔ اس کی یہ کوشش اس قدر ناکام رہی کہ جھنجلاہٹ کے عالم میں چیختا پھرتا تھا، ''عیسائی شریعت و قانون مقدس ہے اور موروں [مسلمانوں] کا جھوٹا''۔ اس پر مشتعل ہجوم نے اسے سنگسار کر ڈالا۔ (Phillips K.Hitti; Islam and the West, pp. 52-53)

تجاویز کی منظوری : بیکن اور لل کی تجاویز نے چرچ کے اربابِ حل وعقد کو متوجہ کیے بغیر نہ چھوڑا۔ ان کی ہر تجویز کسی نہ کسی کے دل کو لگی، جس کے سبب عربی زبان کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اسلامی علوم کے مطالعے کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی۔ تبلیغی سرگرمیاں ناگزیر تصور ہوئیں، روحانی تقدس سے لیس فلسفے کو اہم ہتھیار کی حیثیت حاصل ہوئی اور ازالۂ اسلام کے لیے مناسب دلائل فراہم کرنے کی مہم لازمی ٹھہری۔ وقت کے ان تقاضوں پر غور کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے ۱۳۱۲ء میں کلیسا نے ویئن کونسل (Vienne Council) بلائی، جس میں ان نظریات کی سرکاری طور پر منظوری دی گئی، جو بیکن اور لل نے عربی زبان اور مطالعۂ اسلام کے بارے میں پیش کیے تھے۔

(Maxime Rodinson; Legacy of Islam, 1974 ed., article 'The Western Image and Western Studies of Islam', p.26)

اس کونسل نے یہ نظریات کس ماحول میں منظور کیے ہونگے، اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ پوپ کلیمنٹ پنجم (Clament V) نے اپنا امتناعی حکم نامہ اسی کونسل کے پلیٹ فارم سے جاری کیا جس میں عیسائی حکمرانوں کو یہ ہدایت جاری کی گئی کہ وہ اپنے علاقوں میں اذان کی ممانعت کر دیں، اور اپنے مقبوضہ علاقوں کے مسلمانوں کو مقاماتِ مقدسہ (حرمین شریفین) کی زیارت کے لیے جانے کی اجازت نہ دیں۔

(Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, p. 258)

ان نظریات کی منظوری کی بدولت یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے شعبوں کا قیام عمل میں لایا جانے لگا۔ تبلیغی سرگرمیاں تیز تر ہوئیں۔ نئے نئے تبلیغی سلسلے (Orders) وجود میں آنے۔ تحقیقی ادارے قائم ہوئے۔ انگلستان میں ایک انجمن (Society for Promotion of Christian Knowledge) علوم مسیحی کے ارتقاء کے لیے قائم ہوئی۔ مسٹر سیل (Sale) اسی انجمن کے محقق گزرے ہیں، جنہوں نے ۱۷۳۴ء میں سوسائٹی کی جانب سے قرآنِ پاک کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ عصرِ حاضر تک مستند سمجھا جاتا تھا، تا آنکہ ۱۹۶۰ء میں اسے قابلِ اعتراض قرار دیکر حکما اسکے نسخے امریکن یونیورسٹی لائبریری قاہرہ سے خارج کیے گئے۔

(Phillips K. Hitti; Islam and the West, pp. 54)

فلسفہ: چودھویں صدی عیسوی سے فلسفے کی جانب بھی توجہ شروع ہوگئی۔ مسلم فلاسفہ کے مطالعے نے ابنِ رشد کو یورپ کے دل و دماغ پر مسلط کر دیا تھا۔ ابنِ رشد کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے خود کلیسا کو زبردست جدّ و جہد کرنی پڑی۔ سینٹ تھامس اکویناس نے جب ابنِ رشد کے ازالہ کا دعویٰ کیا تو مغرب میں ایسی مسرّت محسوس کی گئی گویا انہوں نے میدانِ فکر میں ایک شخص یا مکتبِ فکر کو نہیں بلکہ اسلام کو شکست دیدی ہو۔

اصلاحِ مذہب: علومِ اسلامیہ اور فلسفے کے بامقصد مطالعے اور دلائل و براہین کی تلاش نے بعض اہلِ نظر کو اصلاحِ مذہب کی طرف مائل کیا۔ انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ کیتھولک کلیسا کی خامیوں کی بدولت لوگ عیسائیت سے دور اور اسلام سے وابستہ ہیں۔ لہٰذا اگر کلیسا اور مذہب میں ضروری اصلاحات کر لی جائیں تو اسلام خود بخود ہی مرجھا جائے گا۔ اس نکتۂ نظر کا پرجوش حامی وے کلف (John Waycliffe) تھا۔ اس کے نزدیک اسلام میں جتنی خامیاں بیان کی جاتی تھیں وہ سب کی سب خود کلیسا میں موجود تھیں۔ اس نے اسلام کے ارتقاء کا ذمہ دار کلیسا کو قرار دیا۔ اس نے کہا کہ کلیسا کی نظر میں اسلام ایک بدعت ہی سہی، لیکن انجیلِ مقدّس کی نظر میں خود کلیسا اسلام سے بدتر بدعتی ہے۔

کلیسا سے مخالفت کی تہہ میں بھی اسلام سے دشمنی کا جذبہ کارفرما تھا۔ وے کلف کے مطابق اسلام سے صرف اس وقت مدِ مقابل ہوا جا سکتا تھا جب چرچ میں اندرونی اور بیرونی تطہیر کر لی جائے۔

(cf R.W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, pp. 78-82: also Henry Pirenne; A History of Europe, pp. 402-404)

بنی اسرائیل کی شکست وفتح کا عقیدہ بھی عیسائیت نے من وعن اپنایا۔ چونکہ خدا خود شریک جنگ ہوتا تھا اس لیے فتح تو اسکی خوشنودی کی علامت تھی۔ لیکن اس شرکت کے باوجود اگر شکست ہوتی تو اس شکست کی توضیح اسرائیلی انداز میں یہی کی گئی کہ یہ شامت اعمال کا نتیجہ تھی، جسے خداوند نے شکست کی صورت میں ان پر مسلط کیا۔

غرضیکہ کلیسا نے مغرب کو ایک موثر نظریہ جنگ عطا کیا، جس کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ اسپین میں مغلوب عیسائیوں کی جنونی تحریک چلی اور گیارہویں صدی میں پوپ کی ایک آواز پر صلیبی پرچم کے سائے تلے آئے۔ قیامت صغریٰ مشرق پر ٹوٹ پڑی۔ صلیب کے بادل چھٹے ہی تھے کہ منگول طوفان نے عالم اسلام کو تہہ وبالا کر ڈالا۔ اس طوفان کی انگیخت میں پوپ کی مساعی کو بھی دخل تھا۔

پندرہویں صدی عیسوی، تبدیلیاں اور اقدامات

سیاسی تبدیلیاں: صلیبی اقدامات اور منگول یلغار نے مغرب پر سے عالم اسلام کے دباؤ کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ ہسپانوی مسلمانوں کا کمزور وجود سمٹ کر غرناطہ میں محصور ہو چکا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی میں اسلام مغرب کے لیے کوئی خطرہ نہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس صدی کے اختتام تک مفکرین کے تمام نظریات محض تجاویز کی حیثیت رکھتے تھے، جن پر شدت سے عمل پیرا ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ گو عربی زبان کی تحصیل اور فلسفے کے مطالعے کی طرف پیشرفت ہو چکی تھی لیکن ان میں سے کسی مسئلے میں شدت نہیں پیدا ہوئی تھی۔

پندرہویں صدی عیسوی میں سیاسی حالات میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اسپین میں مسلم اقتدار نے آخری ہچکی لی تو یورپ کو مغرب کی سمت سے مسلم خطرے سے نجات ملی۔ لیکن اسی صدی میں مشرقی یورپ سے ترکوں نے اقدام کیا، اور اس صدی کے نصف اول میں لاطینی شہنشاہیت کی تمام بیرونی چوکیاں سر کر لیں۔ پورا بلقان کا علاقہ فتح کر لیا، اور قسطنطنیہ کے سقوط کے بعد ترکوں نے ہنگری کے پایہ تخت ویانا کے دروازے کھٹکھٹانا شروع کر دیے۔ ترکوں کی اس کامیابی کے باعث مغرب پر ایکبار پھر خطرے کے بادل منڈلانے لگے۔ عالم اسلام کے اس طرح روبرو آجانے کے باعث ایک بار پھر جنگ صلیبی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ پوپ نے صلیبی جنگ کی اپیل کی۔ ہنگرین اور جرمن اقوام ترکوں کے مد مقابل ہوئیں، لیکن شکست کھا کر پسپا ہوئیں۔

حکمتِ عملی کا تعین

ابتلاء اور ابتری کی اس صدی میں مغرب کا ہر ملک ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ ہر صاحبِ فکر اسلام کے خطرے سے نمٹنے کی تدابیر سوچ رہا تھا۔ ان حالات میں اس صدی نے چار شخصیتیں پیدا کیں۔ یہ سب کے سب کلیسا کے اہم عہدیدار اور ہمعصر تھے۔ انکا تعلق مغرب کے مختلف ممالک سے تھا۔ ان سب کا مطمحِ نظر اسلام کو کسی نہ کسی طرح نیچا دکھانا تھا۔ گو یہ اس حکمتِ عملی میں ایک دوسرے سے متفق نہیں تھے، لیکن اگر ہم ان کو انکے ملکوں کی نمائندہ شخصیات تصور کریں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ پورا مغرب اب اسلام کے خلاف مزید کچھ کر گزرنے پر کمربستہ ہو چکا تھا۔

جان دی سیگو ویہ: (Juan de Segovia) یہ ایک ہسپانوی نژاد (۱۴۰۰ء-۱۴۵۸ء) آرچ بشپ اور پوپ کا پرجوش حامی تھا۔ آخری عمر گوشہ نشینی میں گزاری۔ ایامِ گوشہ نشینی میں اس نے علومِ اسلامیہ کا مطالعہ کیا، اور زندگی کے آخری ایام میں قرآنِ مجید کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ اب ناپید ہے، تاہم اس ترجمہ کا مقدمہ محفوظ رہا۔ سابقہ تراجم خصوصاً پیٹر وینیریبل کے ترجمے پر اس نے اعتراضات کیے، اور ان میں لاطینی اصطلاحات کے استعمال کو بے محل قرار دیا۔ کیونکہ یہ اصطلاحات خالص عیسائی نکتۂ نظر کی حامل تھیں، جن کے ذریعہ مسلم نکتۂ نظر واضح نہ ہوسکتا تھا۔ (cf. D. Cabanelas Rodrigues; 1952, Juan de Segovia)۔

اس نے سنجیدگی اور متانت اختیار کی اور کوشش کی کہ صرف مذہبی رقابت کے باعث اسلام کو غلط رنگ میں نہ پیش کیا جائے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ سیدھے سادے ترجمے کے ذریعے قرآن کا الجھاؤ اور تضاد (نعوذ باللہ) زیادہ واضح ہوتا ہے۔ بیکن کی طرح اس نے بھی جنگ کی حکمتِ عملی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، اور یہ بھی تسلیم کیا کہ تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کو عیسائیت کی جانب راغب نہیں کیا جاسکتا۔

اس نے اپنی کچھ تجاویز پیش کیں اور ان پر غور کرنے کے لیے مسیحی علماء کا عام اجتماع طلب کیا۔ اس اجتماع کو اس نے کانفرنس کا نام دیا اور اس کے بعد ایسے اجتماعات کے لیے یہ نام ایک اصطلاح کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کانفرنس کا مقصد ہی ازالۂ اسلام تھا۔ یہ کانفرنس نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی نوعیت کی بھی تھی۔

(for details cf. R.W.Southern; Western Views of Islam in Middle Ages, pp. 86-91)

نکولاس آف کیوسا: (Nicholas of Cusa) (۱۴۰۱ء تا ۱۴۶۴ء)، ایک جرمن کلیسا کا کارڈینل، فلسفی اور نرم مزاج تھا۔ اس نے برسوں اسلام کے خلاف مواد جمع کیا۔ ایک کتاب یادگار چھوڑی جس میں اس نے ادیانِ عالم کا تقابل کیا تھا۔ وہ ایک زبردست ناقد تھا۔ اس کے مباحث اور تنقیدیں آج بھی یورپ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اس نے بھی ازالۂ اسلام کے لیے کانفرنسیں منعقد کیں۔ اس نے کلیسا کے وفود اپنے دور کے حکمرانوں خصوصاً ترک سلاطین اور شہزادگان کی خدمت میں روانہ کیے، جن کے ذریعے انہیں عیسائیت قبول

کرنے کی دعوت دی۔ ۱۴۶۰ء میں اپنی نوعیت کی یگانہ کتاب (The Cribratio of Alcoran) تحریر کی جس میں قرآنی مضامین کی چھان بین تفصیلی انداز سے کی اور یہ مفروضہ پیش کیا کہ قرآنی مضامین کے تین بنیادی عناصر ہیں۔ اولاً نسطوریت، ثانیاً عیسائیت کے اختلافی نظریات جن سے یہودی مشیروں نے روشناس کرایا اور ثالثاً وہ ردّو بدل، تحریف وتصریف جو وصال نبوی ﷺ کے بعد یہود نے (نعوذ باللہ) قرآن میں کی۔ اس کے نظریے کے مطابق نہ صرف جنگ وتبلیغ، بلکہ فلسفہ بھی اسلام کے خلاف بیکار اور بے اثر تھا۔ وہ خود قرآن میں نقائص کا متلاشی رہا، اور دوسروں کو بھی اس راہ پر گامزن ہونے کی دعوت دیتا رہا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۹۲ تا ۹۴)۔

ژاں ژرماں : (Jean Jermain) متوفی (۱۴۶۱ء) ایک فرانسیسی بشپ تھا جس کا مطمحِ نظر عالمِ اسلام کی تباہی تھا۔ اسکا اندازِ فکر دوسروں سے مختلف تھا۔ اس نے اپنے دور کے کرسچیئن حکمرانوں کو ابھارا کہ متفق ہوکر اسلام کے خلاف تلوار اٹھائیں، اور عیسائیت کو فتح اور کامرانی سے ہمکنار کریں۔

اس نے شاہِ فرانس کو تحریر کیا،

”آیئے ہم گادفرے اور بادولین کا جذبہ پیدا کریں، فلپس الفاتح، شاہِ فرانس کی روایت کو زندہ کریں، سینٹ لوئی کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو ساری دنیا آپ کی عظمت، شوکت اور فتح مندی کے ترانے گائے گی، آپکو چارلس الفاتح -شاہِ فرانس، نئے داؤد، نئے کانسٹنٹائین اور نئے شارلمین کے القاب سے یاد کرے گی، جنہیں خداوند نے تمام فتوحات عطا کرکے مقدس کیتھولک مذہب کی اعانت، اور حود اپنے عظمت وجلال کی خدمت کی عزت مرحمت فرمائی، اور لازوال نیک نامی سے سرفراز کیا۔“

(R. W. Southern; Western Views of Islam in Middle Ages, p.95)

اس نے ساری زندگی اس کوشش میں گزاردی کہ مغرب کو متحد کرکے کسی نہ کسی طرح پھر سے جنگِ صلیبی چھیڑی جائے، اور اسلام کی جگہ عیسائیت کو بزورِ شمشیر رائج کیا جائے۔ جان دی سیگو دیہ نے اسے جنگ سے احتراز اور پرامن طریقوں سے مسئلۂ اسلام کا حل تلاش کرنے کا مشورہ دیا، [cf. Cabanelas D.; Juan de Segovia, pp. 325-328]، تواس نے جواب میں تحریر کیا،

”عرصہ ہوا کہ مذہبی جنگ پوپ کے فیصلے اور بادشاہوں کے دستور کے مطابق مقدس ہوچکی ہے۔ رومن چرچ اسکا اختیار دیتا ہے اور اسکے شرکاء کو مغفرت عطا کرتا ہے۔ اس کی توثیق عہد نامۂ عتیق اور سورماؤں کے ایک طویل سلسلہ سے ہوتی ہے۔ ایک نئی جنگِ صلیبی تشکیل پذیر ہے، (لہٰذا) کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جو مغربی یورپ کے فوجی مقاصد کے منافی ہو“۔

(R.W.Southern; Western Views of Islam in Middle Ages, p.96)

یہ شخص اس قدر متعصب تھا کہ مسلمان تو مسلمان، ان عیسائیوں سے بھی متنفر تھا جو کبھی کسی مسلمان ملک میں گئے ہوں یا جنہوں نے اسلام میں پائی جانے والی کسی حقیقت کا اعتراف کیا ہو۔

اینیئس سلوئیس : (Aenias Silvius) متوفی ۱۴۶۳ء، ایک اطالوی پوپ تھا۔ اس کی فکر کا حاصل تخریبِ اسلام اور تعمیرِ عیسائیت تھی۔ اس نے بھی اس مقصد کے لیے شاہانِ یورپ سے توقعات وابستہ کیں۔ اپنی سی کوشش کر دیکھی کہ سب مل کر عالمِ اسلام پر دھاوا بول دیں۔ جان دی سیگو وِیہ نے اسے بھی جنگ جوئی سے باز رہنے کا مشورہ دیا، اور یاد دلایا کہ عیسائی اگر دس ہزار ہونگے تو تیس ہزار مسلمان اٹھ کھڑے ہونگے کیونکہ مسلمان تعداد میں عیسائیوں سے زیادہ ہیں۔ اس نے پوپ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ چرچ کا تحفہ جنگ نہیں بلکہ امن ہے۔ سلوئیس نے جان کو تو جواب نہیں دیا، ہاں ۱۴۶۰ء میں ایک خط سلطان محمد ثانی، فاتحِ قسطنطنیہ کو تحریر کیا، جس کے بعد جان کے خط کے جواب کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اس خط کو ۱۹۵۳ء میں جی۔ توفینن نے شائع کیا۔

اس خط کی ابتداء مغرب کی عظمت کے ترانوں، اس کی قوت و شان و شوکت، مغرب کی ہیبت اور عالم پر اسکی فوقیت کے بیان سے ہوتی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلاطینِ عثمانی کا کوئی مدِ مقابل نہیں تھا۔ پوپ کا یہ کھوکھلا بیان صرف مغرب کا بھرم قائم رکھنے کے لیے تھا۔ اس نے لکھا،

''آپ ہمارے کوائف سے اس قدر نابلد نہ ہونگے کہ عیسائی طاقتوں سے واقف نہ ہوں کہ اسپین کس قدر ثابت قدم، گال کتنے جنگجو، جرمن کتنے کثیر التعداد، برطانیہ کتنا طاقتور، پولینڈ کس قدر جری، ہنگری کتنا متحرک اور اطالیہ کسقدر دولتمند، بلند حوصلہ اور حرب و ضرب میں ماہر ہے۔ ترکوں کو اپنی حالیہ آسان فتوحات کی بنا پر اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ وہ یورپی اقوام پر قابو پالیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یورپ نے ابھی جنگ کی ابتداء بھی نہیں کی ہے۔''

اس کے بعد پاپا رقمطراز ہیں کہ،

''بہر کیف ایک معمولی سی چیز ایسی بھی ہے کہ جو آپ کو اس دور کا عظیم ترین، ناقابلِ شکست انسان اور لازوال شہرت کا مالک بنا سکتی ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ کیا ہے۔ اس کا حصول کچھ مشکل نہیں۔ اس کی تلاش میں بھٹکنا بھی نہیں پڑتا۔ یہ شے ساری دنیا میں عام ہے۔ ایک تھوڑا سا پانی، جس سے بپتسمہ لیکر آپ عیسائیت اختیار کر سکیں، اور انجیل پر ایمان لائیں۔ ذرا اتنا سا کر دیکھیے، پھر دنیا کوئی حکمران نہ ہوگا جو عظمت میں آپ سے زیادہ، یا سطوت میں آپ کے برابر ہو۔ ہم آپ کو شہنشاہِ یونان و مشرق کے لقب سے مخاطب کریں گے۔

جس سرزمین پر آپکا قبضہ بالجبر ہے اس پر یہ قبضہ بالاستحقاق ہوگا۔ تمام مسیحی آپ کے تقدس کو تسلیم کرلیں گے اور آپ کو اپنا عادل و منصف مانیں گے۔ کامیابی آپ کے لیے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ مسلم شریعت کے پیرو ہیں۔ بس ذرا ایک کرسچین ہو دیکھیے، پھر آپ اپنے دور کے عظیم ترین انسان تسلیم کیے جائیں گے۔''

(G. Toffanin; Lettera a Maometto, II, pp.113-114,

quoted by R.W.Southern; Western Views of Islam in Middle Ages, p.100)

بیسل کونسل : ۱۴۳۳ء میں کونسل آف بیسل منعقد ہوئی، جس میں مندرجہ بالا چاروں افراد نے شرکت کی۔ اس کونسل میں چرچ آف گریس اور چرچ آف روم میں مصالحت کی (ناکام) کوشش کی گئی، تاکہ

یورپ کو اسلام سے نمٹنے کی یکسوئی میسر آ جائے۔ اسی کونسل کے بعد ان شرکاء نے اپنے اپنے طور پر اسلام سے نبرد آزما ہونے کی راہیں تلاش کرنا شروع کیں۔

کانفرنسیں : نکولاس آف کیوسا نے اسلام کے خلاف متعدد کانفرنسیں کیں۔ ان میں شرکت کرنے کے لیے اس نے قاہرہ، اسکندریہ، آرمینیا اور یونان سے مندوب طلب کیے، جن سے اسلام کے خلاف مواد حاصل کیا، اور پھر مختلف وفود اسلامی ممالک کے حکمرانوں اور خاص کر ترک شہزادوں کی خدمت میں روانہ کیے تاکہ انہیں عیسائیت کی دعوت دیں۔ اہم ترین کانفرنس جان دی سیگو ویہ نے منعقد کی، جس کے شرکاء نے اسلام کے خلاف دفاع اور اس کے ازالے کی تجاویز پیش کیں، جس کے نتیجے میں چار مختلف گروہ منظم ہو کر سرگرمِ عمل ہوئے۔

چونکہ ہر گروہ کا بانی اور سربراہ خود پوپ یا کلیسا کا کوئی اعلیٰ عہدیدار تھا، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کلیسا کی تطہیر کے سوا ہر طریقۂ کار کو کلیسا کی منظوری حاصل تھی۔

پہلا طریقۂ کار جنگ : ژاں ژرماں اور اس کے گروہ کے نزدیک اسلام کا علاج جنگ تھا۔ گو صلیبی جنگیں بے سود ثابت ہو چکی تھیں، جس کے سبب اس کے ہمعصر مفکرین کو اس طریقِ کار سے اتفاق نہ تھا، تاہم اس نے اپنے عہد میں کرسچین حکمرانوں کو متحد کر کے اسلام کے خلاف صف آرا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اسکی حکمتِ عملی نے اسکی زندگی میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔ ترکوں کا فاتحانہ اقدام سولھویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں رک سکا۔ تاہم اس کے بعد اس کے طریقِ کار نے اپنے اثرات دکھلائے۔ اسپین میں مسلمانوں کی مکمل تباہی سے لیکر بیسویں صدی تک پورے عالمِ اسلام پر مغرب کا غلبہ اسی کے خواب کی تعبیر کہی جا سکتی ہے۔

دوسرا طریقۂ کار تبلیغ : تبلیغ کے ذریعے اسلام سے مقابلہ کرنے کی تجویز اوّلاً بیکن نے پیش کی تھی۔ لُل نے اسے آگے بڑھایا، اور پندرھویں صدی میں اس نکتۂ نظر کو اینیس سلویئس اور اس کے گروہ نے تحریک کی شکل دی۔ اس صدی کے بعد تبلیغی ادارے کثرت سے سامنے آئے اور اسلامی ممالک میں پہنچے۔ انکا کام یہ تھا کہ ان مباحث کی تشہیر کریں جنہیں مغربی مفکرین نے موضوع کیا ہوا اور ایسے مسائل سے کلیسا کو مطلع کریں جن کے باعث انکی سرگرمیوں میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو، تاکہ انکے ازالے کی فکر کی جا سکے۔

تیسرا طریقۂ کار تحقیق : بیکن نے کلیسا کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی تھی کہ [چرچ کے گمان کے مطابق] گمراہوں کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ نیز یہ کہ رہنمائی کے لیے ضروری وسائل یعنی زبان سے واقفیت، اسلامی علوم سے آگاہی، اسلام کے کمزور پہلوؤں کا تعین اور عقائدِ اسلامی کے ازالے کے لیے دلائل مفقود تھے۔

جان دی سیگو ویہ نے اس جانب پیشقدمی کی۔ اس نے اس طریقِ کار کو ایک تحریک کی شکل دی۔ جان اور اس کے متبعین کو شمشیر کی افادیت سے انکار تھا۔ ساتھ ہی ان کے نزدیک مسلم ممالک میں تبلیغ ہی ایک مشکل کام تھا اور اگر ایسے ذرائع میسر آ بھی جاتے تو منطقی طور پر مسلمانوں کو عیسائیت کا قائل کر لینا ممکن نہیں تھا۔ اس گروہ نے فلسفے، منطق اور علم کلام کو مسلمانوں کی قوت اور عیسائیوں کی کمزوری کا راز قرار دیا، اور کہا

کہ چونکہ یہ علوم معاشرے کے اعلیٰ اور ارفع اذہان کو متاثر کرتے ہیں، اور اعلیٰ اذہان معاشرے کا دل و دماغ ہوتے ہیں، لہٰذا اگر عالمِ اسلام کے اذہانِ عالیہ کو مسخر کرلیا جائے تو پورے معاشرے کو بآسانی مسخر کیا جاسکتا ہے۔

یہ تھا وہ گروہ جس نے نظریاتی محاذ کی ابتدا کی اور اسلام کے خلاف قلم کو آلۂ حرب کی حیثیت دی۔ ہمارا موضوعِ سخن یہی گروہ ہے۔

چوتھا طریقۂ کار اصلاح: دے کلف نے اسلام کے ارتقاء کا ذمہ دار چرچ کو ٹھہرایا تھا، کہ چرچ کی کوتاہیوں کے سبب اسلام پھیلا، اور یہ کہ چرچ اگر اب بھی اپنی اصلاح کرلے تو اسلام مرجھا جائے گا۔ اس نظریے کو لوتھر نے سولہویں صدی عیسوی میں ایک تحریک بنادیا۔ مارٹن لوتھر نے گزشتہ صدیوں کی اسلام دشمن تحریروں کو جمع کرکے انہیں جرمن زبان میں منتقل کیا اور ان میں خود اپنے پیش لفظ اور دیباچے بھی شامل کیے، جن میں اس نے بڑی شدت سے ازمنہ وسطیٰ کے اس دعوے کا اعادہ کیا کہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان مذہبی، علمی یا سیاسی مصالحت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ قائل تھا کہ مسلمانوں کو عیسائی نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ انکے دل سخت ہوچکے ہیں۔ وہ مقدس صحائف (اناجیل) کے منکر اور (نعوذ باللہ) قرآنی لغویات کے قائل ہیں۔

لوتھر نے عیسائیوں کے دو دشمن قرار دیے۔ بیرونی دشمن اسلام اور اندرونی دشمن پوپ۔ اس نے کہا، ''کیا اسلام ہی عیسائیت کا واحد اور عظیم ترین دشمن ہے۔ نہیں بلکہ اس سے زبردست اور عظیم ترین دشمن تو خود چرچ میں موجود ہے۔ اور یہ دشمن پوپ کے سوا اور کون ہے''۔

(Quoted by R.W.Southern; The Western Views of Islam in the Middle Ages, p.106)

نظریاتی محاذ

مستشرقین کی ابتداء اور علومِ شرقیہ کا مطالعہ

حکمتِ عملی کا تعیّن: لل اور بیکن (تیرہویں صدی عیسوی) سے لیکر لوتھر (سولہویں صدی عیسوی) تک تمام مفکّرین اس امر پر متفق تھے کہ اسلام سے نمٹنے کے لیے محض فوجی کارروائی ہی کافی نہ تھی، بلکہ نظریاتی جنگ اشد ضروری تھی۔ مفکّرین کی تجاویز کے مطابق نئے محاذ کے لیے حسب ذیل وسائل لازمی تھے۔

۱۔ السنہ مشرقی، خصوصاً عربی زبان سے واقفیت

۲۔ علوم اسلامی کا مطالعہ تاکہ کمزور پہلوؤں کو دریافت کر کے وہاں سے دباؤ ڈالا جا سکے

۳۔ ازالۂ اسلام کے لیے مناسب دلائل کی فراہمی

۴۔ مسیحی تقدّس سے لبریز فلسفہ جو عالمِ اسلام کے اذہان کو متاثر کر سکے

۵۔ ایسا لٹریچر جو مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی ختم کر سکے

۶۔ تبلیغی سرگرمیاں تاکہ مسلم معاشرے کو عیسائی بنایا جا سکے

مندرجہ بالا مقاصد سولہویں صدی عیسوی تک متعیّن ہو چکے تھے۔

ان متعیّن کردہ مقاصد کے حصول کے لیے جس گروہ نے عملی حصہ لیا وہ مستشرق کہلایا۔ یہ گروہ کلیسا کا پیدا کردہ تھا، اس لیے انیسویں صدی تک کلیسا کی مقرر کردہ پالیسی پر کاربند رہا۔ جب کلیسا کی گرفت کمزور ہوئی تو مستشرقین بھی کلیسا کے دباؤ سے آزاد ہوئے۔ مستشرقین کی اصل اہمیت مذہبی تھی لیکن جب مغربی ممالک کے سیاسی اور اقتصادی تعلقات ممالکِ اسلامیہ کے ساتھ قائم ہوئے تو انکی سیاسی اہمیت بھی پیدا ہوئی، تاہم دیگر اہمیت ثانوی تھی جو صرف مشرقی زبانوں سے واقفیت تک محدود تھی۔

مستشرقین کی ابتداء: لفظ مستشرق میں بڑی وسعت ہے، لیکن بنیادی مقاصد کے اعتبار سے یہ وہ گروہ ہے جو اربابِ کلیسا کے منصوبوں کے مطابق السنہ مشرق اور علوم اسلامیہ کا مطالعہ کرنے اور ایسا مواد فراہم کرنے کے لیے وجود میں آیا جو نظریاتی جنگ کے لیے مفید ہو۔ عربی زبان سے واقفیت اور علوم کے مطالعے نے مستشرقین کو علمی مقاصد کی تکمیل کا بھی موقع دیا۔ چنانچہ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں فرانسیسی، جرمن اور ولندیزی

مستشرقین نے تمام علوم اسلامیہ خصوصاً طب، فلسفہ، کیمیا، نباتات، ریاضی، جغرافیہ اور فلکیات کے خزانے اپنی قومی زبانوں میں منتقل کیے۔ سولہویں صدی (۱۵۸۶ء) میں عربی طباعت رائج ہوئی، جسکا مقصد تبلیغی اداروں کو عربی مطبوعات بہم پہنچانا تھا۔ اسکی بدولت بے شمار عربی کتب مستشرقین کے ہاتھوں میں پہنچیں۔ علمی اور مذہبی دلچسپی رکھنے والے افراد اور گروہوں کے علاوہ، سیاسی اور تجارتی مقاصد کے لیے بھی مشرقی زبانوں کی طرف بھی انگلستان اور یونائیٹڈ پراونس میں توجہ دی جانے لگی۔

سولہویں صدی عیسوی

عربی زبان کا اوّلین شعبہ، ۱۵۳۹ء میں کالج دی فرانس میں قائم ہوا، جسکی صدارت کا شرف گلاؤم پوستال (Guillaume Postal) کو حاصل ہوا۔ پوستال اپنے وقت کا عظیم مسیحی عالم تھا۔ اسے مستشرقین کا باوا آدم کہا جاسکتا ہے۔ اسکی محنت نے مستشرقین کی جماعت پیدا کی، جس میں جوزف اسکالیجر بہت نامور ہوا۔ اس شعبے کے کتب خانے میں بے شمار قلمی نسخے فراہم کیے گئے تاکہ سنجیدہ مطالعے کا سلسلہ شروع ہو۔ ان محققین کے کارنامے عربی رسم الخط میں شائع ہونے لگے، تاکہ دیگر مستشرقین کو آگاہی ہو سکے۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ صرف، نحو، لغات اور منطق سے بیشتر مستشرقین مسلّح ہو چکے تھے۔

سولہویں صدی میں ہی لیڈن میں بھی عربی شعبے کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ فرانسس فان راویلنجن (Francis von Ravelingen) نے ۱۵۹۳ء سے وہاں عربی کی تدریس شروع کی۔

سترہویں صدی عیسوی

سترہویں صدی سے عربی زبان کے شعبے تقریباً ہر یورپی ملک میں قائم ہوئے۔ پوپ اربن ہشتم نے ۱۶۲۷ء میں روم میں کالج آف پروپیگنڈہ (College of Propaganda) قائم کیا جہاں مشرقی علوم کا سرگرمی کے ساتھ مطالعہ کیا گیا۔ ۱۶۳۸ء میں آکسفورڈ میں شعبۂ عربی کا قیام عمل میں آیا۔ ایڈورڈ پوکاک اسکے اوّلین صدر مقرّر ہوئے۔ انکے ہمعصروں میں اسکالجر اور ہوتنگر خاصے نامور ہوئے۔ ان مستشرقین کی کوششوں کو بہت سراہا گیا۔ انکی کوششوں سے عربی زبان سے نابلد افراد نے بھی فائدہ اٹھایا۔ بی، دی ہربیلوت (B. de Herbelot) نے مستشرقین کے فراہم کردہ مواد پر اپنی کتاب (مطبوعہ ۱۶۹۷ء) 'ببلیو تیک اوریئنٹالو' (Bibliotheque Orientalo) ترتیب دی جو مغرب میں انسائکلو پیڈیا آف اسلام مرتب کرنے کی اوّلین کوشش تھی۔

مسلمانوں کی تحریروں کے راست مطالعے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کچھ اہلِ قلم ایسے بھی نظر آنے لگے جنہوں نے اسلام کی مدافعت میں قلم اٹھایا۔ رچرڈ سائمن (Richard Simon) نے ۱۶۸۴ء میں اپنی ایک کتاب میں مسلمانوں کے عقائد دیانتداری سے تحریر کیے اور کہیں کہیں سراہنے کا انداز اختیار کیا جس کے سبب اسکے دوستوں نے اسے مطعون کیا۔

(cf. Simon's Letters Choisies; 1930, Amster Dam, III-245, f: 258 f., quoted by Maxime Rodinson; The Legacy of Islam, 1974 ed., p. 37)

ولندیزی عربی داں اے ریلنڈ (A. Reland) نے بھی سائمن کے انداز میں سترہویں صدی کے اواخر میں اسلام پر قلم اٹھایا۔ فلسفی پیئر بیل (Pierre Bayle) نے سیرت پر ایک بے ضرر کتاب ۱۶۹۷ء میں تحریر کی۔ اسی صدی میں ہنری اسٹب (Dr. Henry Stubb) نے (Rise and Fall of Mohametanism; [1911, Published by Luzac and Co., London) نامی کتاب تحریر کی۔ اگر اس کتاب کی چند تاریخی غلطیاں، جنکا ماخذ کرسچیئن تحریریں ہیں، نظر انداز کر دی جائیں تو یہ نہ صرف ایک غیر جانبدار جائزہ بلکہ مغرب کا اولین اعتذار بھی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی

اداروں کا قیام: اٹھارویں صدی میں مستشرقین نے اپنے باقاعدہ جداگانہ ادارے قائم کیے، تاکہ تعلیم گاہوں سے باہر ہمہ وقتی تحقیق کی جا سکے۔ مستشرقین (Orientalists) کی اصطلاح بھی اسی صدی میں رائج ہوئی۔

۱۔ لوئی چہاردہم نے ۱۷۰۰ء میں اور میریا تھریسیا نے ۱۷۵۴ء میں مترجمین کی تربیت کے ادارے قائم کیے۔

۲۔ ہندوستان میں ۱۷۸۴ء میں ولیم جونز نے 'ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال' قائم کی۔

۳۔ ۱۸۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کولکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا، جس کی نگرانی میں مشرقی کتب، خصوصاً فارسی اور عربی سے، انگریزی میں ترجمہ کی گئیں۔

۴۔ اٹھارویں صدی کے بعد بھی مستشرقین کے ادارے انکی افادیت کے پیشِ نظر قائم ہوتے رہے۔ جرمنی میں اٹھارویں صدی کے اختتام تک یونیورسٹیوں پر کلیسا کا قبضہ رہا، جسکے باعث علوم شرقیہ کے آزاد مطالعے کی ابتداء انیسویں صدی میں ہوسکی۔ ۱۸۰۹ء میں ویانا میں 'اورینٹل اکیڈمی' کا قیام عمل میں آیا۔

علوم کا مطالعہ

مستشرقین کے اداروں کا قیام مغرب کے اندازِ فکر کا اہم سنگِ میل ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں سیاسی اعتبار سے اسلام خطرہ نہ رہ گیا تھا۔ جس کے سبب یورپ کا ذہن خوف سے آزاد ہو چکا تھا۔ عربی نسخوں کے تراجم کے باعث حقائق سامنے آنے لگے۔ خود مغربی محققین نے اپنے لٹریچر سے وضعی مواد کو خارج کرنا شروع کر دیا۔ اڈورڈ پوکاک، صدر شعبہ عربی، آکسفورڈ نے اپنے مطالعے کی بنیاد پر اپنے قارئین کو خبردار کیا کہ،

''معلق تابوت کی کہانی پر مسلمان جی کھول کر ہنستے ہیں، اور اسے محض ترچینی ذہن کی اپج قرار دیتے ہیں۔''

(Phillips K. Hitti; Islam and the West, p. 54)

اس نے کبوتر کی اس کہانی پر بھی تنقید کی جو پورے یورپ میں انیسویں صدی تک عام تھی جس کے مطابق نبی (ﷺ) نے ایک سفید کبوتر پالا تھا جو ان کے کاندھے پر بیٹھ کر کان سے دانہ نکال کر کھاتا تھا، جس سے لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا تھا کہ فرشتہ بشکلِ کبوتر وحی پہنچا رہا ہے۔ (حوالہ بالا)۔

اڈیسن کے ایک ہمعصر ہمفرے پریڈو (Humphery Prideaux) نے سیرت پر ایک کتاب مغربی اور عربی مواد کی بنیاد پر تحریر کی، جس میں کچھ اصول تنقید مقرر کیے۔ اس نے بھی کبوتر کی کہانی اور اس قسم کی دیگر خرافات کو اس بنیاد پر مسترد کیا کہ یہ سب بے بنیاد اور حقائق سے بعید تھیں، اور یہ کہ ایسی چالیں عربوں کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔

(Humphery Prideaux; The True Nature of Imposture Fully Displayed in the Life of Mohemet, 8th ed, p.38)

اٹھارویں صدی میں اسلام کے بارے میں خاصا مواد راست عربی کتب سے مغربی زبانوں میں منتقل ہو چکا تھا۔ عظیم علمی اور سائنسی سرمایہ صرف ترجمے کی محنت پر مغرب کی ملکیت بن چکا تھا۔ اسلامی معاشرے کو مغرب بچشمِ خود دیکھ رہا تھا۔ ان کے مبلغین عالمِ اسلام میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے سفراء مسلم حکمرانوں کے درباروں میں موجود تھے۔ تجار کا دن رات کا سابقہ تھا۔ اس کے باوجود اسلام انکی چشمِ روشن میں محض فریب اور (نعوذ باللہ) پیغمبر بہروپیے تھے۔

ہمفرے کی کتاب ایک طرف لغویات کو مسترد کرتی نظر آتی ہے تو دوسری طرف اسکا عنوان (Nature of Imposture Displayed)، [اظہارِ اندازِ فریب] ہی مقصدِ تحریر کو ظاہر کرتا ہے۔

پوکاک کے جانشین ریورینڈ جوزف وھائٹ نے ۱۷۸۴ء میں جو لیکچرز دیے انکا مقصد ترچینی عقائد کو مستحکم اور شبہات و بدعات کا ازالہ کرنا تھا۔ ان میں سے ایک لیکچر اسلام کے لیے مختص تھا۔ اس لیکچر کا عنوان بھی (Mahomet's Imposture) [فریبِ محمدی (ﷺ)] (نعوذ باللہ) تھا۔ (cf. Joseph White; [Sermons Preached before University of Oxford in the Year 1784, p.171)

اٹھارویں صدی کے مستشرقین میں جن لوگوں نے اسلام پر معاندانہ یا ہمدردانہ انداز میں قلم اٹھایا ان میں جوزف وہائٹ، ہمفرے پریڈو، ریسکی، ریلاند، ایڈمنڈ ڈوئے، ہینٹ بلیر، دی انکونا، سائمن اوکلے، ایڈورڈ گبن، جارج سیل، معروف فرانسیسی ادیب اور انقلابی والٹیئر اور مشہور جرمن شاعر گوئٹے بہت نامور گزرے ہیں۔

انداز میں تبدیلی: مسیحی علماء، شعراء اور ادباء کی بہ نسبت، مسیحی مورخین نے اسلام، قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کچھ بہتر رویہ اختیار کیا۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک مغربی مورخین تاریخ اسلام کو خلفاء راشدین کے عہد تک محدود رکھتے تھے۔ سائمن اوکلے (پروفیسر آف عربک، کیمبرج یونیورسٹی) نے اپنی تاریخ کی ابتداء وصال نبوی ﷺ سے کی۔ اگرچہ تاریخ نویسی میں اس نے اعتدال سے کام لینے کی کوشش کی لیکن ذاتِ نبوی ﷺ کے لیے (The Great Imposter) (نعوذ باللہ) [عظیم فریب کار]، اور اسلام کے لیے (Superstition) [توہم] کی اصطلاحات استعمال کرنے سے باز نہ رہ سکا۔

(Simon Ookley; The History of Saracens, 5th ed., p.94)

ایڈورڈ گبن نے اپنی مشہور تاریخ (The Decline and Fall of Roman Empire) میں ایک مکمل باب [۵۰] اسلام کے لیے مختص کیا۔ اپنی جولانیِ قلم، وسعتِ علمی اور اعتدالِ بیان کے باوجود اس نے اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر پیشرفت نہیں کی اور اپنے پیشرووں، یعنی پریڈو اور اوکلے کے نظریات کو جوں کا توں برقرار رہنے دیا۔

فرانس میں والٹیئر نے مورخ کی حیثیت سے قدرے رواداری کا ثبوت دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی شجاعت اور پامردی کا مقابلہ کرامویل سے کیا اور انکے کارناموں کو افضل قرار دیا۔ [cf. Phillips K. Hitti; Islam and the West, p.59] لیکن اپنی دوسری تصنیف میں اپنے دور کی روش سے گریز نہ کر سکا اور رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) بہروپیے کے روپ میں پیش کیا۔ (حوالہ بالا)

اٹھارویں صدی کا جرمن شاعر گوئٹے مشرق کا دلدادہ تھا۔ یہ صاحبِ فکر ونظر، پہلا مغربی فرد ہے جو کسی طور پر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو سکا کہ رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) بہروپیے تھے۔ اس نے حیاتِ طیبہ کو نظم کرنا شروع کیا تھا، مگر بدقسمتی سے یہ کاوش مکمل نہیں ہو سکی۔ علامہ اقبال نے اس نظم کے ایک حصے (Mahomets Gesang) (نغمۂ محمدی) کو منظوم کیا ہے۔

اس طرح اٹھارویں صدی عیسوی سے قبل مغرب اسلام اور داعیِ اسلام کی مخالفت میں یک زبان تھا۔ اٹھارویں صدی میں، علومِ اسلامیہ کے مطالعے کی بدولت، گو مخالفت ختم نہیں ہوئی، لیکن رکاکت ختم ہونے لگی۔ مخالفت میں بھی سنجیدگی اور معقولیت کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ کچھ لوگ حق و انصاف کی جانب مائل ہونے لگے۔ شخصیتِ نبوی ﷺ کے چند پہلو باعظمت تسلیم کیے جانے لگے۔

ایک ہزار سال کے بعد مغرب میں ایک آواز ایسی بھی سنائی دی جس نے مغرب کے متفقہ الزام 'بہروپیت' کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ گوئٹے کی اس اخلاقی جرأت نے فکرِ مغرب میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔

انیسویں صدی عیسوی اور نظریاتی حملے

انیسویں صدی میں مغرب نے بے شمار مستشرقین پیدا کیے، جنہوں نے ہر دو انداز میں قلم اٹھایا۔ ان میں تھامس کارلائل، ڈیون پورٹ، باس ورتھ اسمتھ، اسٹینلے لین پول، ریناں، واشنگٹن ارونگ، ایچ جی ویلز، کائیتانی، بکر، گرم، ولہاؤزن، فان کریمر، سپر، نولدیکی، سیل، اسپرنگر، دوزی، گولڈزیہر، وبر، ڈیوڈ مارگولتھ، سی ڈی بور، ہنری لیمن، اور ولیم میور کے نام بہت مشہور ہوئے۔

مستشرقین کی محنت کی بدولت اتنا عظیم سرمایۂ علمی بہم ہو چکا تھا کہ اس سے استفادے کے لیے علوم کو شاخ در شاخ تقسیم کرنا پڑا۔ اور ہر شاخ کی تحقیق کے لیے ماہرین کی ضرورت پیش آئی۔ مہارت اور حقائق دونوں کی دستیابی کے باعث تقابلِ ادیان کی راہ کھلی، جو یقیناً ایک صحتمند رخ تھا۔ اس کے باعث مغربی ٹکسال کے قدیم جھوٹے سکوں کا چلن ختم ہوا۔ گوئٹے کے نقشِ قدم پر کارلائل نے پیش رفت کی۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو انبیاء کا ہیرو تسلیم کیا۔ مغرب کو پہلی بار یہ باور کرنے پر مجبور کیا کہ حضور ﷺ اپنے مشن میں پرخلوص تھے، اور اسلام ایک حقیقی مذہب ہے۔ کارلائل کی اس پیش رفت نے مستشرقین کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ مغربی اہلِ قلم کے لیے اب یہ ممکن نہ رہ گیا تھا کہ اشہبِ قلم کو بے لگام ہونے دیں۔

نئی راہ : تاہم مستشرقین اور ماہرین اپنے معاشرے کے جزو تھے۔ ان میں سے کوئی اتنا توانا نہیں تھا کہ معاشرے کی مروّجہ روش کو ختم کر سکتا۔ نیز انکی تحقیقات کا مطمحِ نظر خالصتاً اسلام نہ تھا، بلکہ انکا اپنا معاشرتی مفاد تھا۔ یہ ماہرین اس تعصّب سے بالاتر بھی نہ تھے جو مغرب کی گھٹی میں پڑا تھا۔ مذہبی عصبیّت و جدل نے ماہرین کی نگرانی میں نئی راہ اختیار کی۔ غیر مفید حقائق بے دردی سے نظر انداز ہوئے۔ کار آمد مواد کا خوردبینی مطالعہ کیا گیا۔ اور اب جو اعتراضات سامنے آئے ان میں شاطرانہ مہارت پائی جاتی تھی، جسے رد کرنا عام انسان کے لیے آسان نہ تھا۔ یہ اعتراضات عیسائی دنیا کے لیے دل خوش کن، عالمِ اسلام کے لیے کرب انگیز، اور غیر جانبدار لوگوں کے لیے گمراہ کن تھے۔

انیسویں صدی کے سیاسی اور اقتصادی حالات یکسر بدل چکے تھے۔ عالم اسلام اب بھی دشمن تصوّر ہوتا تھا، لیکن ایسا دشمن جسکی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ ماضی کا یہ عظیم ہیرو نڈھال اور بے دست و پا ہو کر سپر انداز ہو رہا تھا۔ مغرب نے ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر عالمی برتری حاصل کر لی تھی۔ نہ صرف عالمِ اسلام بلکہ پورا کرّۂ ارض، مغرب کے سیاسی اور اقتصادی جال میں پھنس رہا تھا۔ اس بالا دستی نے مغرب کے قدیم احساسِ برتری کو شدّت سے بیدار کیا۔ انیسویں صدی کا یورپ اس آقا کے انداز میں گفتگو کرتا نظر آتا ہے، جس کا ہر قول و فعل خودستائی پر مبنی ہو۔ جو کل کائنات میں بے مثل ہو، کسی کو اپنا ثانی تصوّر نہ کرتا ہو اور جس کے مقابلے میں ہر شے پوچ، لغو اور ہیچ ہو۔

نظریاتی حملے

انیسویں صدی کی اہم ترین خصوصیت مذہب کی مخالفت ہے۔ بڑے بڑے مفکر، فلاسفر اور سیاستدان سب ہی نے حسبِ استطاعت مذہب کی خبر لی۔ ہیگل، فیورباخ، مارکس، اینگلز، وبر، ہر شخص نے مذہب پر تند و تیز حملے کیے۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے (عیسائیت کے) ایوانِ مذہب میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ وہ تو کہیے کہ فکرِ نو کلیسا کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی، ورنہ ان میں سے شائد ہی کوئی دار و رسن سے بچ سکتا۔ مذہب پر تنقید کرنا فیشن بن چکا تھا۔ ان میں سے جو جری تھے انہوں نے خود اپنے مذہب کو نشانہ بنایا، اور جن میں اتنی جرأت نہیں تھی، انہوں نے چاند ماری کے لیے دوسروں کے مذہب کو منتخب کیا۔ مستشرقین تو وقف ہی اسلام کے لیے تھے، انہوں نے بھی کھل کر اپنے جوہر دکھلائے۔

انٹلکچوئل حملوں پر گفتگو اور بحث کرنے کے لیے ہم یہاں صرف تین موضوعات پر اکتفا کریں گے، جو اسلام، قرآنِ مجید اور حیاتِ طیبہ ہیں۔ باقی موضوعات بخوفِ طوالت چھوڑے جا رہے ہیں۔

اسلام

انیسویں صدی میں مستشرقین کے درمیان اسلام کو بحیثیت مذہب تو تسلیم کیا جا چکا تھا لیکن اسے ناقص بیان کیا جاتا تھا۔

کریمر : ہندرک کریمر (Hendrik Craemer) نے ہیگل کے مکتبِ فکر کی پیروی میں مذہب کی تعریف یوں کی کہ،

"ہر مذہب ناقابلِ تقسیم ہوتا ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جانا چاہیے۔ اسکا ہر جزو، عقائد، رسوم، اساطیر، ادارے اور مسلک، سب اپنے کل سے اس طرح یکجان اور پیوست ہوتے ہیں کہ انہیں جدا کر کے ان کی افادیت، اہمیت اور انکے رجحانات کو کبھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسکی مثال زندگی کا وجود ہے کہ جسم کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور اسکا صحیح ادراک اس کے وجودِ کلی پر منحصر ہے۔ اجزائے بدن اسی وقت تک زندہ اور فعال ہیں جبتک (زندہ) بدن کے جزو ہیں"۔

(Hendrik Craemer;The Christian Message in a Non-Christian World,p.135)

لیکن یہی کریمر اپنی ہی متعین کردہ تعریفِ مذہب کو اسلام پر منطبق کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اسلام کو غیر اصلی مذہب (Un-Original Religion) قرار دیتا ہے۔ (حوالہ بالا)۔ اس کے نزدیک اسلام ایک ایسا عظیم بدنِ مشترک ہے، (Great Syncritistic Body)، جس میں متضاد عناصر کو ایک نظام میں مجتمع کر دیا گیا ہے۔ (حوالہ بالا)۔

سیدھے سادے الفاظ میں، وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ، عیسائیت کا اگر تجزیہ کیا جائے گا تو اسکی ماہیت، افادیت اور اہمیت سمجھی نہیں جاسکے گی، اس لیے اسکا تجزیہ نہیں کیا جانا چاہیے۔لیکن اسلام کی ماہیت سمجھنے کے لیے اسکا اجزاء میں منقسم کر کے مطالعہ ضروری ہے۔کریمر نے مذاہب کو جانچنے کے لیے یہ معیار مقرر کیا کہ "مذہبی تحریکیں اپنے ثمرات سے پہچانی جاتی ہیں۔" (Attributed to Kreimer, quoted by] Montgomery Watt; Truth in the Religions, p.10)]۔

اس اصول کو مقرر کرنے کے بعد پھل کو جانچنے کا ایک انوکھا معیار یوں مقرر کیا کہ،

"That for Christians, the value of Religious and Social Phenomena must be judged by Christian Values."

[عیسائیوں کے لیے، مذہبی اور معاشرتی نظم کی قدر، عیسائی اقدار کے مطابق جانچنی چاہیے۔] (حوالہ بالا)

مذہب اپنے ثمرات سے پہچانا جاتا ہے۔لیکن ثمر کتنا ہی اچھا ہو، اگر عیسائی اقدار کے مطابق نہ ہو تو فضول گردانا جائے گا۔گویا ثمر کی فطری خوبی کوئی شے نہیں ہے۔اصل شے عیسائی اقدار ہیں۔ظاہر ہے کہ اسلام کے ثمرات، عیسائی اقدار سے مطابقت نہیں رکھتے، پس اچھے نہیں ہیں۔اور برا پھل دینے والا درخت برا ہی سمجھا جاتا ہے۔

ویبر: میکس ویبر نے اپنی کتاب 'سوشیولوجی آف ریلی جن' میں اسلام پر بکثرت تبصرے کیے ہیں۔ ان تبصروں کو ترتیب دیا جائے تو اسکی نظر میں اسلام محض ایک سیاسی اور جنگی مذہب ہے۔یہ مسخ کردہ تصور اس دعوے کی روشنی میں اور بھی کریہہ ہو جاتا ہے کہ عیسائیت غیر سیاسی اور امن کا مذہب ہے۔اس نے تحریک اسلام کے بارے میں لکھا،

"The Religion of the Prophet, which is fundamentally political in its orientation, grew primarily out of his purely prophetic mission. A merchant, he was first a leader of pietistic conventicles in Mecca, until he realized more and more clearly that the organization of the interest of the Warrior Clans in the acquisition of the booty was the external basis provided for his missionizing". (Max Weber; The Sociology of Religion, p.47, translated by Ephxaim Fischoff)

[پیغمبر کا دین، جو اپنی سمت کے اعتبار سے بنیادی طور پر سیاسی ہے، ابتداً انکے خالص پیغمبرانہ نصب العین سے ابھرا۔وہ ایک تاجر، اور مکہ میں پرہیزگارانہ اجتماعات کے رہبر تھے، یہاں تک کہ انہوں نے اس بات کا، واضح سے واضح تر طور پر، ادراک کیا کہ جنگجو قبائل کی مال غنیمت کے حصول میں دلچسپی کا لحاظ، انکے نصب العین کی خارجی بنیاد ہونی چاہیے۔]

میکس ویبر کے تصور کے مطابق داعی اسلام ﷺ کی شخصیت کی عظمت، سیاسی اور فوجی بالادستی کی مرہونِ منت ہے۔جنگی کامیابیوں نے اسلام کو 'جنگی مذہب' کی حیثیت سے استوار کیا۔اسلام اس کے نزدیک

محض فوجیوں کا مسلک (Warrior Cult) تھا۔ اس کے نزدیک اسلام مذہب نجات نہیں۔ اسلام نے نفس اور بدن کے جو حقوق تسلیم کیے ہیں، ویبر انہیں عیش پرستی قرار دیتا ہے۔ اس مفروضہ پر اس نے دعویٰ کیا۔

"As a religion of Masters, Islam despite its Jewish-Christian roots, was never a religion of salvation."

[آقاؤں کے مذہب کے طور پر اسلام، اپنی یہودی-عیسائی جڑوں کے باوجود، کبھی بھی مذہب نجات نہیں رہا۔]

(Max Weber; Economy and Society, Vol. 3, p. 625, ed. Gunther Roth)

اس صدی کے عام مبصرین کی مانند ویبر نے بھی ذات نبوی ﷺ اور جنس پر گھٹیا تبصرے کیے۔ اسلام کے ارتقاء کو اس نے بھی جنگ اور فتحیابی کا نتیجہ قرار دیا۔

ولیم میور: اسلام کو بزور شمشیر پھیلانے کا الزام انیسویں صدی کے بیشتر اہل قلم کا دستور تھا۔ ولیم میور نے اس الزام کو بڑے زور و شور سے اچھالا۔ اس نے اپنی دو تصنیفات (Life of Mohammed, 1858)، اور (The Caliphate, Its Rise, Decline and Fall, 1891) میں یہ تاثر دیا کہ مسلمان کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن ہوتا ہے۔ گویا اسلام ایک مذہب جبر ہے جو مفتوحین اور ذمیوں کے لیے اسلام یا موت، دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور کرتا ہے، اور یہ کہ اسی جبر کے نتیجے میں اسلام پھیلا۔

میور نے اپنی الزام تراشی کو تقویت دینے کے لیے اپنے ذاتی مشاہدات بھی پیش کیے۔ اس نے ہندوستان کی جنگ آزادی کے واقعات اپنے بھائی کے نام تحریر کیے۔ اس خط میں اس نے لکھا،

''مسلمانوں نے یہ تصور کرتے ہوئے کہ انکے لیے اپنے مقاصد میں حتمی کامیابی کے امکانات خاصے روشن ہیں، کھلم کھلا غدر میں شرکت کر لی ہے۔ مثلاً علی گڑھ میں مسلمان کافی عرصے تک غالب رہے۔ انہوں نے وہاں کے بہت سے ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنایا۔'' (P. Hardy; The Muslims of British India, p.63)۔

ولیم میور کے اس نظریے سے مستشرقین عام طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ جی ای گریونے باوم ایک معتدل صاحب قلم ہونے کے باوصف اسی نظریے کو دہراتا نظر آتا ہے۔ (cf. G.E. Grunebaum, [Islam, essays on 'Nature and Growth of a Cultural Tradition', p.12)۔

شمشیر اور اسلام، عیسائی تزویر دفاع: حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو بزور شمشیر پھیلانے کا شاخسانہ عیسائیت کا وضع کردہ دفاعی نظریہ ہے۔ اس کے ذریعہ صرف یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام کی مقبولیت اسکی حقانیت کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے جبر کا نتیجہ ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف اب خود مغربی اہل قلم بھی کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ برائن ٹرنر نے لکھا،

"In order to explain the spread of Islam, Christian theology developed a defensive theory, which demonstrated that Islamic success was the product of Muslim violence, lasciviousness and deceit."

[اسلام کی توسیع کی وضاحت کرنے کے لیے عیسائی مذہبیت نے ایک دفاعی نظریہ پروان چڑھایا، جو یہ بیان کرتا تھا کہ اسلام کی کامیابی، مسلمانوں کے تشدد، شہوت رانی اور فریب کاری کا نتیجہ ہے۔]

(Bryan Turner; Understanding Islam, p.19)

یہ کہنے کی اب کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ اس نظریے کا پرچار کرنے والے صرف کرسچین تھیولوجی کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔

القرآن

عہد وسطیٰ میں قرآن کو طرح طرح سے ہدف بنایا گیا۔ کسی نے اسے (نقلِ کفر کفر نہ باشد) شیطانی کتاب قرار دیا۔ کوئی تھا جو اسے مجرمانہ سرقہ کہتا تھا۔ اور کسی کے نزدیک یہ کتابِ مقدس کا چربہ تھا۔ کسی کے خیال میں اسے کلیسا کے باغی راہبوں نے مدون کیا تھا۔ غرض یہ کہ قرآن سب کچھ تھا لیکن صحیفۂ سماوی نہیں تھا۔ مستشرقین میں بھی قرآن کے بارے میں یہی تصور پایا جاتا ہے کہ قرآن صحیفۂ آسمانی نہیں بلکہ انسانی تصنیف ہے، اور اس میں پایا جانے والا بیشتر مواد کتابِ مقدس سے ماخوذ ہے۔ یہ اندازِ فکر مغرب میں آج بھی عام ہے۔

میکسم روڈنسن نے مارکس اور فرائڈ کی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے یہ تاثر دیا کہ قرآن حضور ﷺ کے لاشعور کی پیداوار ہے۔ انکے لاشعور میں یہودی اور عیسائی تعلیمات موجود تھیں جو وقتاً فوقتاً غیر شعوری طور پر قرآن کی شکل اختیار کرتی رہیں۔ نیز یہ کہ وہ غیر مخلص نہیں تھے تاہم قرآن کو وحی باور کرنے میں (نعوذ باللہ) ان سے غلطی ہوئی۔ (cf. Maxime Rodinson, Mohammed, p.77)۔

معاندین کی زبان سے قرآن کے بارے میں جو کچھ نکلا، اس کے سوا ان سے اور کچھ توقع کی بھی نہیں جا سکتی تھی، لیکن حیرت تو اس وقت ہوتی ہے جب غیر متعصب سمجھے جانے والے، بلکہ معذرت کا انداز اختیار کرنے والے، مستشرقین بھی قرآن کو تورات وانجیل کے مطالعے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

ڈیون پورٹ : ڈیون پورٹ حضور ﷺ کے مداحوں کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن غارِ حرا میں حضور ﷺ کے تحنث کو جس طرح بیان کرتا ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قرآن دراصل بائبل کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اس نے لکھا،

''بیان کیا جاتا ہے کہ ہر سال وہ ایک مہینہ غارِ حرا میں گزارتے تھے، جو مکے کے مغرب میں تقریباً تین میل [پانچ کلومیٹر] کے فاصلے پر واقع ہے، اور یہی وہ مقام تھا جہاں انہوں نے بائبل اور گاسپل (صحائف) کا مطالعہ کیا، تحنث اور استغراق سے لطف اندوز ہوئے۔''

(John Davenport; An Apology for Mohammed and Quran, p.13)

نکلسن : آر اے نکلسن نے پامر کے ترجمہ قرآن کا دیباچہ تحریر کیا جس میں اس نے تذکرہ کیا کہ دورِ نبوی ﷺ میں ایسے کئی افراد تھے جنہوں نے اپنا قدیم مذہب ترک کر کے خود اپنی راہ متعین کر لی تھی، اور یہ کہ یہ لوگ حنیف کہلاتے تھے۔ پھر قیاس کیا کہ قبل نبوت رسول اللہ ﷺ کے تعلقات ان لوگوں سے ضرور رہے ہوں گے۔ نیز یہ کہ تجارتی سفروں نے حضور ﷺ کو یہ مواقع بہم پہنچائے کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے تبادلۂ خیال کر سکیں، جس کے نتائج قرآن میں محفوظ ہیں۔ (R. A. Nicholson, Introduction to 'The Koran' , [<translation of Quran from Arabic to English by E. H. Palmer>, pp. x -xix)

نکلسن کے نزدیک قرآن کے مصنف حضور ﷺ ہیں۔ اس نے مکی سورتوں کو انجیل کے انبیاء کے کلام کے مطابق قرار دیا جبکہ مدنی سورتوں کے بارے میں تحریر کیا کہ "یہ کہنا کہ بقیہ قرآن فیضانِ وحی سے مبرا ہے، اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسکا مصنف فریب (فراڈ) سے باخبر تھا" (حوالہ بالا)

قرآن کی ترتیب و تدوین پر بحث کرتے ہوئے نکلسن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ چونکہ وفاتِ نبوی کے بعد اس کے تدوین کرنے والے اس کی صحیح طریقہ سے تدوین نہیں کر سکے۔ اس لیے انہوں نے آسان طریقہ یہ اختیار کیا کہ طویل سورتیں پہلے اور مختصر سورتیں آخر میں جمع کر دیں۔ اور یہ کہ اگر طریقہ کار اس کے برعکس ہوتا تو قارئین کے لیے شکایت کی گنجائش کم ہوتی۔ (حوالہ بالا)

اس نے دعویٰ کیا کہ عبادات جیسے اہم معاملات میں تفصیلات کا نہ پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضور ﷺ اپنی وحی کو کسی کتاب کے ابواب نہیں تصور کرتے تھے، بلکہ صرف ایسا پیغام سماوی سمجھتے تھے جو وقتی ضرورت کی تکمیل کرنے کے لیے نازل ہوا ہو، اور بعدہٗ جس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرز فکر کے باعث، بقول اسکے، حضور ﷺ یا انکے سامعین، ان آیات کے مستقبل سے بے پرواہ تھے۔ (حوالہ بالا)

نکلسن قرآن کو اناجیل نہیں بلکہ اناجیل کے مسترد اور غیر مصدقہ مواد پر مبنی قرار دیتا ہے۔ (حوالہ بالا)

سیل، میور اور نولدیکی : سیل، ولیم میور اور نولدیکی میں سے ہر ایک نے قرآن کی جمع و تدوین کے مسئلے پر اپنے اپنے انداز میں بحث کی ہے، اور اپنے اپنے شبہات کا اظہار کیا ہے، جنکا مجموعی تاثر یہ ہے کہ حضرت زیدؓ نے جیسی بھی تحریر پائی درج کر دی اور مطالب و معنی محل و مقام سے غیر متعلق رہے۔ نیز یہ کہ ان کے مجموعے میں نہ تو پورا قرآن مدون ہو سکا اور نہ انکا ایڈیشن ملت نے تسلیم کیا۔

(cf. Muir, Life of Mohammed, pp. 555,557; Noldeke, Dictionary of Islam, pp. 486-487; Sale, Essays on Islam, pp. 214,218)

میور نے قرآن پاک کے بارے میں یہ شرانگیز دعویٰ کیا کہ "(نعوذ باللہ) محمد (ﷺ) خود اپنی وحی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔" (میور، حوالہ بالا، صفحہ ۱۴۲)

نولدیکی نے قرآن کے حروفِ مقطعات کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ حروف ان اشخاص کے ناموں کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے حضرت زیدؓ بن ثابت نے یہ سورتیں حاصل کیں۔ انہوں نے

بطور یادداشت یہ حروف سورتوں کی ابتدا میں تحریر کر دیے، جو بعدۂ متنِ قرآن کا جزو تصور کر لیے گئے۔ مثلاً الرٰ اس کے خیال میں الزبیر کا، المرٰ، المغیرہ کا، اور طٰہٰ حضرت طلحہ کے نام کا مخفف ہے۔

گولڈزیہر: (Goldziher) نے قرآن کا مطالعہ عمرانی نقطۂ نظر سے کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اسلام اور قرآن پر پارسیت اور عرب بدویت کے بھرپور اثرات ہیں۔ گولڈزیہر، نیز دیگر مستشرقین، ان اثرات کو جو علاقائی بودوباش کے تحت مسلمانوں نے قبول کیے یا ان لغزشوں کو جو انفرادی طور پر، یا گروہی حیثیت سے مسلمانوں سے سرزد ہوئیں، ہمیشہ اسلام سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اسلام پر پارسیت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اسے زبان اور آرٹ پر پارسیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ تاریخ نویسی میں اسلام اسے ایران کا پیرو نظر آتا ہے۔

اس کے نزدیک قرآن کی تلاوت پر زور، نوحہ کی ممانعت، قرآن میں میزان کا بیان، وضو اور غسل کے احکامات، پنج وقتہ نمازیں، لوحِ محفوظ، شرک کی نجاست کا تصور، سب کے سب پارسیت کے اثرات ہیں۔

(Goldziher, article 'Influence of Parsisue on Islam', The Religion of the Iranian People, pp. 163-186)

گولڈزیہر کو قرآن میں سبت کی عدم موجودگی پارسیت کا اثر معلوم ہوتی ہے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۸۲)۔ لطف یہ کہ جن لوگوں نے جمعہ کو سبت کے مترادف قرار دیا، انکو اسکا وجود، یہودیت اور عیسائیت کا اثر نظر آتا ہے۔

اس نے اپنی کتاب (Muhammedaneche Studien, Halle 1988) ، کے باب اوّل میں یہ دعویٰ کیا کہ قرآن نے قدیم بدوی ضابطہ اخلاق (مروۃ) کو من و عن اپنایا ہے۔ (cf. Montgommary Watt; What is Islam?, p.191)۔ اگنس گولڈزیہر کے اس نظریہ پر مستشرقین نے خاصی بحث و تنقید کے بعد اسے محض ایک غلو قرار دیا ہے، کیونکہ معروفات کسی ایک مذہب، قوم یا نسل کی میراث نہیں بلکہ انسانیت کی اعلیٰ قدریں ہیں۔ قرآن نے اگر انہیں مستحسن قرار دیا تو یہ کہنا کہ اس نے انہیں کسی سے مستعار لیا ہے، ایک نہایت ہی مضحکہ خیز امر ہوگا۔

مستشرقین کا نقطۂ نظر: قرآن پر مستشرقین نے کیا کیا لکھا اسکا احاطہ ممکن نہیں۔ تاہم جو بھی تحریر کیا وہ اپنی ہی قدروں کی بنیاد پر تحریر کیا۔ یہ تحریریں زیادہ تر تقابلی تھیں، جنکا مطمحِ نظر یہ تھا کہ بہر طور مغربی قدروں کی برتری ثابت کی جائے۔ چنانچہ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ وہ تراجمِ قرآن یا تحریریں جو مندرجہ بالا نکتۂ نظر کی حامل نہیں تھیں، یا تو شائع ہی نہیں ہوسکیں، یا اگر شائع ہو بھی گئیں تو اربابِ اقتدار نے عمداً انہیں نیست و نابود کرا دیا۔

مثلاً الیگزنڈر پاگانینی کا ترجمۂ قرآن، مطبوعہ ویانا، پوپ کے حکم سے نذرِ آتش کیا گیا۔

-(cf. John Davenport; An Apology for Mohammed and Quran, p.63)

سترہویں صدی عیسوی میں 'لودوویکو مراسی اس' (Lodovico Marracius) کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کی اجازت اس وقت تک نہ دی گئی جب تک اس نے قرآن کی مخالفت میں ایک دیباچہ شامل نہیں کیا۔

(حوالہ بالا، صفحہ ۶۴)

عیسائی اقدار کی برتری قائم رکھنے کے لیے قرآنی اخلاقیات پر ناروا حملے انیسویں صدی تک عام تھے۔قرآن کی دعوت کو وقتی اور مقامی ٹھہرایا گیا۔اسکی تعلیمات کو دنیا پرستی اور عیش کوشی کی تعلیم کہا گیا۔ اس کے جنت کے تذکروں کی تضحیک کی گئی۔ جہاد کو خونریزی کا حکم تصور کیا گیا۔ایک سے زیادہ شادیوں کو عیاشی، اور حج کی رسوم کو مشرکانہ رسوم کی یادگار کہا گیا۔اسکی زبان کو ھردری، ان گھڑ اور اکھڑ قرار دیا گیا۔اس میں تکرار، غیر موزونیت، الجھاؤ، ابہام، گرامر کی غلطیاں، حقائق سے ناواقفیت، تحریف و تصریف، اکتاہٹ جیسی غیر وصفی کیفیات بیان کی گئیں۔

ہر چند کہ ان حضرات کو قرآن میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی، لیکن پتہ نہیں کن مصلحتوں کی بنیاد پر اس کی تصنیف کا سہرا، عیسائی مانک اور ایرانی یہود کے سر باندھا جاتا ہے۔

حیاتِ طیبہ

عیسائیت اپنے بانی کے نام سے موسوم ہوئی۔ حضرت عیسیٰ کے بعد ان سے منسوب اقوال جمع ہوئے۔تاریخی حقائق سے قطع نظر انکی ایسی سوانحِ حیات مرتب کی گئیں جو خود اختیاری عقائد و رسوم کو سہارا دے سکیں۔ان کتب کو صحفِ سماوی کا نام دیا گیا۔اللہ کے اس برگزیدہ عبد کو اپنی صنم پرستی کی تسکین کے لیے معبود قرار دیکر اس کی پرستش شروع کردی گئی۔ چونکہ عیسائیت کا محور اس کے بانی کی ذات تھی، انہوں نے اسلام کو بھی اسکا مثنیٰ تصور کیا، اور اس کے بانی علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کی طرف توجہ مبذول کی۔

مذہبی جدل و تنگ نظری نے ان پر اسقدر غلبہ کیا کہ حضور علیہ السلام کی ذات گرامی پر تہمتوں اور الزامات کے انبار لگا دیے۔ہر بری بات منسوب کی۔صنمیات وضع کیں۔ چڑیا چڑے کی کہانیاں گھڑیں۔ وحوش و بہائم کی دلخراش داستانیں ترتیب دیں۔کنویں کا افسانہ تراشا۔ بیماری کے قصے تیار کیے۔ چنگیز کے اسلاف سے تعلق ثابت کرنے کے لیے خراسان کی وطنیت موسوم کی۔ ہسپانیہ کے مفروضہ سفر کے اہتمام کیے۔ راہبوں سے نام نہاد تعلیم کے حصول کے ڈھول پیٹے۔عیسائی فوج میں تربیت کی داستان تراشی۔فرضی حکمراں کے خون کا الزام رکھا۔ کلیسا کی عہدہ داری اور الوہیت [کے دعوے] کی تہمت دھری۔ پھر جو کروٹ بدلی تو جہنم کے شیاطین کو بھی پناہ مانگنے پر مجبور کر دیا۔(تفصیلات باب چہارم میں آ رہی ہیں۔)

مستشرقین کے سنجیدہ مطالعے نے یکے بعد دیگرے ان تمام لغویات کو مسترد کرنا شروع کر دیا۔ تاہم ایک الزام ایسا بھی تھا جو بیحد سخت جان نکلا۔ یہ الزام بہروپیت یا ڈھونگ کا تھا، جسکی بازگشت انیسویں صدی تک سنائی دی۔

تھامس کارلائل گو کہ اسلام یا عربی زبان پر کوئی خصوصی مہارت نہیں رکھتا تھا، لیکن اس نے ۸ مئی ۱۸۴۰ء کو اڈنبرا میں تاریخ کے ہیروز اور ہیروازم پر سلسلہ وار لیکچرز شروع کیے۔ اس کا دوسرا لیکچر (The Hero as Prophet) تھا، جس میں انبیاء کے ہیرو کی حیثیت سے آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ اس لیکچر نے پہلی بار مغرب کو یہ سننے پر مجبور کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایک پر خلوص شخص تھے۔ اس نے حضور ﷺ کے خلوص کے بارے میں کہا،

"Ah, No! This deep hearted son of the wilderness, with his beaming black eyes and open social deep soul, had other thought in him than ambition. A silent great soul; He was one of those who cannot but be in earnest, whom nature herself had appointed to be sincere."

(Thomas Carlyle; On Heros, Hero Worship, and the Heroic in the History, p.52)

[ارے نہیں، صحرا کے یہ گداز دل فرزند، اپنی مسکراتی سیاہ آنکھوں اور ہر ایک کے لیے گہری محبت رکھنے والی روح کے ساتھ، خودنمائی سے بہت ہی مختلف خیالات کے حامل تھے۔ ایک خاموش فطرت عظیم نفس۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو سوائے لگاؤ کے کچھ اور برت ہی نہیں سکتے تھے، اور جن کو خود فطرت نے بطورِ خاص خلوص کے لیے ہی مقرر کیا تھا۔] (تفصیلات باب چہارم میں آ رہی ہیں)۔

"We shall err widely if we consider this man as a common voluptuary; intent mainly on base enjoyments, nay on enjoyment of any kind."

[ہم بہت بڑی غلطی کریں گے اگر ہم ان صاحب کو ایک ایسا عام لذت پسند شخص گردانیں گے، جو بنیادی طور پر گھٹیا عیش کوشی پر مائل ہو (جبکہ وہ) کسی بھی قسم کی لطف اندوزی سے گریز کرتے تھے]۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۶۴)

کارلائل نے اپنے دور تک کے مغربی اندازِ تحریر کو شرمناک قرار دیا اور برملا کہا کہ یہ تصور کہ عرب کے نبی (ﷺ) نعوذ باللہ ایک منصوبہ ساز بہروپیے تھے، یا انکا دین خرافات کا مجموعہ تھا، اب کسی طور قابلِ قبول نہیں۔ جانتے بوجھتے کذب وافتراء کا جو طوفان انکے خلاف اٹھایا گیا ہے وہ مغرب کے لیے باعثِ ننگ ہے۔

(حوالہ بالا صفحہ ۴۰)۔

پھر اس نے مغربی اہلِ فکر کو اپنے دل ٹٹولنے کی دعوت دی کہ ان کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ گزشتہ کئی صدیوں سے کروڑوں افراد کی زندگی کی رہنمائی کر رہا ہے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ (ظہورِ اسلام) محض ایک کربناک روحانی فریب تھا جس کے لیے قادرِ مطلق کی مخلوق کی اتنی بڑی تعداد نے اپنی زندگی وقف کی اور ہنستے کھیلتے موت کو گلے لگا لیا۔ کارلائل نے کہا کہ وہ ایسے کسی مفروضے سے متفق نہیں ہو سکتا۔

(حوالہ بالا، صفحہ ۴۱)۔

کارلائل وہ پہلا مغربی فرد ہے جس نے اپنے معاشرے کے برخلاف یہ اعلان کیا،

"The man's words were not false, nor his workings lure below, no inanity and simulacrum; a fiery mass of life cast-up from the great bosom of nature herself....... The words of such a man is voice direct from nature's own heart."

[ان صاحب کے الفاظ دروغ نہیں تھے، نہ ہی انکے طرزِ عمل میں کوئی جال، کھوکھلا پن یا مصنوعی بھرم تھا؛ وہ تو زندگی کی حرارت سے بھرپور ایک وجود تھے جس نے فطرت کی اپنی کوکھ سے جنم لیا تھا ..... ایسے شخص کے الفاظ تو فطرت کے اپنے دل کی آواز ہوتے ہیں] (حوالہ بالا صفحہ ۵۰)

مستشرقین کے گروہ : کارلائل کے لیکچرز کی بدولت مستشرقین کے دعووں کے دبدبے، طنطنے میں بدل گئے۔ لے وہی رہی لیکن سروں میں فرق آ گیا۔ سیرت نگار مستشرقین دو گروہوں میں بٹ گئے۔ اولاً وہ گروہ جس نے باور کیا کہ نفسیاتی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نارمل تھے، لیکن وحی اور پیغامِ الٰہی کے بارے میں (نعوذ باللہ) پرخلوص نہیں تھے۔ دوسرا گروہ یہ باور کرتا ہے کہ وہ پیغامِ الٰہی اور فرائضِ نبوت پر پختہ یقین رکھتے تھے، لیکن (نعوذ باللہ) ذہنی طور پر متوازن نہیں تھے۔

روڈنسن نے ان دونوں الزامات کے درمیان یہ راستہ اختیار کیا کہ ایک نئی تہمت باندھی۔ اس دہریے نے انہیں بھی اپنا ہم خیال تصور کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ غیر مخلص تو نہیں تھے تاہم قرآن کو وحی باور کرنے میں انہیں غلط فہمی ہوئی۔ (cf. Rodinson Maxime; Muhammed, p.77).

نکلسن : نکلسن نے پامر کے ترجمۂ قرآن پر دیباچہ تحریر کیا، جس میں وہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے خلوص کو تسلیم کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکا کہ،

"When by force of circumstances, the prophet in him had grown into the ruler and legislator, it was a psychological necessity he should still feel himself to be chosen medium of the divine message."

(R. A. Nicholson; Introduction to 'The Quran' by E. H. Palmer)

[جب حالات کے جبر کے تحت، پیغمبر ایک حکمران اور قانون ساز میں ڈھل گئے، تو بھی یہ ایک نفسیاتی ضرورت تھی کہ وہ خود کو الہامی پیغامات کا منتخب ذریعہ سمجھتے رہیں]

ویبر : انیسویں صدی کے عام مبصرین کی مانند ویبر کے تبصرے بھی سطحی ہیں۔ اسے حضور ﷺ کے مکی دور میں تو نبوت کی شان نظر آتی ہے لیکن مدنی دور میں وہ اس شان کو دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس نے لکھا،

"His position in Medina, which was between that of an Italian Podesta and that of Calvin in Geneva, grew primarily out of his purely prophetic mission. A merchant, he was first a leader of pietistic conventicles in Mecca, untill he realized more and more clearly that the organization of the interest of the Warrior Clans in the acquisition of the booty was the external basis provided for his missionizing".

(Max Weber; The Sociology of Religion, p.47, translated by Ephxaim Fischoff)

[مدینے میں انکی حیثیت اطالیہ کے پودستا (شہر کے امیر اور حکمراں) اور جینیوا کے کالون (پروٹسٹنٹ فرقے کے ایک شہری اور دینی ناظم) کے بین بین تھی، جس نے بنیادی طور پر انکے خالصتاً پیغمبرانہ نصب العین سے نمود پائی تھی۔ وہ ایک تاجر، اور مکہ میں پرہیزگارانہ اجتماعات کے رہبر تھے، یہاں تک کہ انہوں نے اس بات کا، واضح سے واضح تر طور پر، ادراک کیا کہ جنگجو قبائل کی حصولِ مالِ غنیمت میں دلچسپی کا لحاظ، انکے نصب العین کی خارجی بنیاد ہونی چاہیے۔"

اس کے نزدیک بانیِ اسلام کی شخصیت کی عظمت سیاسی اور فوجی بالادستی کی مرہونِ منت ہے۔

<u>میور، اسپرنگر اور فان گریونے باؤم</u>: انیسویں صدی کے بیشتر مستشرقین نے حیاتِ نبوی کے واقعات کو مسخ کر کے ان میں کمزوری کے پہلو وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ولیم میور نے کہا کہ (نعوذ باللہ) "محمد (ﷺ) خود اپنی وحی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔" **(William Muir; Life of Mohamet, Vol II, p.142)**۔

اس نے 'کافروں کو مراعات' کے عنوان سے واقعہ غرانیق کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا،

"عالمِ بیچارگی میں محمد (ﷺ) نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے اہلِ وطن سے مصالحت کی کوشش کریں۔ وہ قریش کے درمیان دوستانہ ماحول میں بیٹھ کر سورۃ والنجم کی قرأت کرنے لگے۔ جب وہ آیت ۱۹-۲۰ پر پہنچے تو انکی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے: "کیا تم نے لات اور عزیٰ اور منات پر بھی غور کیا ہے؟ یہ نہایت معزز دیویاں ہیں اور بیشک انکی شفاعت کے مقبول ہونے کی امید ہے۔" اس کے بعد آیتِ سجدہ تلاوت کی اور تمام قریش سجدے میں گر گئے۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۱۵۱)

اسپرنگر کی تصنیف میں ایک بار پھر بہروپیت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اشہبِ قلم منہ زوری کرتا نظر آتا ہے۔ اس نے لکھا، (نعوذ باللہ)

"اسلام ... کا کارنامہ ہے۔ یہ اس بہروپیے (شخص) کی اپنی تعلیمات بھی نہیں۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس بہروپیے نے اسے اپنی بدکرداری اور ذہنی بے راہ روی سے آلودہ کیا اور یہ تمام قابلِ اعتراض تعلیمات اسی کی اپنی ہیں۔" **(Springer; Life of Mohammed)**۔

گریونے باؤم نے حجرِ اسود کے بارے میں تحریر کیا کہ کعبے کے پرستاروں کے لیے حقیقی کشش ایک سیاہ پتھر میں تھی۔ "یہ قدیم الایام پتھر اس کی دیواروں میں نصب تھا۔ حضور ﷺ کو بادلِ ناخواستہ اس پتھر کے

تقدس واحترام کو اسلامی رسوم میں جگہ دینا پڑی۔ جہاں وہ اب بھی اس امر کے ثبوت کے طور پر موجود ہے کہ اسلام قدیم رسوم سے اپنا دامن چھڑانے میں ناکام رہا۔(Von Grunebaum; Mediaeval Islam, p.68)۔
حجرِ اسود کے بارے میں یہ تبصرہ اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اس کی پرستش کرتے ہیں۔ حالانکہ بقول حضرت عمرؓ یہ صرف ایک پتھر ہے جسے اگر نبی کریم ﷺ نے بوسہ نہ دیا ہوتا تو ہرگز کعبے کے دوسرے پتھروں سے ممتاز نہ ہوتا۔ یہ نہ تو معبود ہے نہ اس کی پرستش ہوتی ہے۔ اسکی اہمیت صرف یہ ہے کہ اس سے لبِ نبوی (علیٰ صاحبہا صلوٰۃ و سلام) اور بعدہٗ صحابہ، تابعین اور بزرگان واعیانِ ملت کے لب مَس ہوئے۔ یہ وہ مستند ترین شے ہے جس کے توسط سے ایک عامی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے عبادِ صالحین سے بعدِ زمانی کے باوجود قرب حاصل کرلیا۔

باب چہارم

مستشرقین

۱۔ مستشرقین کی ابتداء

۲۔ عالمِ اسلام سے علمی استفادہ

۳۔ مستشرقین کی کاوشوں کا جائزہ

مستشرقین کی ابتداء

مغرب رومن ایمپائر کا وہ مرکزی خطہ تھا جس نے اس ایمپائر کی تشکیل کی تھی۔ عالم اسلام سے تصادم اور پسپائی کے باعث جب اس میں شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہوئے تو کلیسا نے مغرب کو رومن ایمپائر (بازنطین) سے علیحدہ کر کے اس کی آزادانہ اور جداگانہ حیثیت قائم کی اور اسے 'مسیحی جمہوریہ مغرب' اور 'ہولی رومن ایمپائر' کا نام دے کر از سرِ نو معاشرے کی تعمیر کی۔

اس معاشرے کے فکر و عمل میں واضح تضاد تھا۔ عملاً وہ رومن تہذیب کا جانشین تھا جس کا تابناک ماضی شمشیر و سناں سے تعمیر ہوا تھا، لیکن فکری اعتبار سے وہ عیسائیت کا پیرو تھا، جس میں رہبانیت کو مثالی حیثیت حاصل تھی۔ راہب کی حقیقی دنیا اندرونی دنیا تھی۔ بیرونی دنیا سے لاتعلقی کمالِ دینداری تصور ہوتی تھی۔ کشور کشائی، جہانگیری و جہانبانی، اور رہبانیت کی عزلت نشینی، مسکنت اور خاکساری کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حالات کا تقاضہ تھا کہ یہ تضاد دور کیا جائے۔ عالمِ اسلام کے فاتحانہ اقدام کو روکنا رہبانیت کے بس کی بات نہیں تھی اور اسے روکے بغیر عافیت بھی نہیں تھی۔

ان حالات میں تین ہی طریقے اختیار کیے جا سکتے تھے۔ فلسطین، مصر و افریقہ کی طرح اسلام قبول کر لیا جائے۔ بصورتِ دیگر اسپین کی طرح مسلم بالا دستی قبول کر کے ثانوی حیثیت اختیار کر لی جائے یا پھر رومن انداز میں نبرد آزما ہوا جائے۔ آخر الذکر طریقۂ کار منتخب کرنے کے لیے کلیسا نے معاشرے کی فکر میں تبدیلی پیدا کی۔ تارک الدنیا راہب کی جگہ شہسوار کو دی۔ طبل و علم پر مذہب کی چھاپ لگائی اور شمشیر زنی کو روائتی زہد کا نعم البدل قرار دیا۔

معاشرے اور تہذیبیں نظریات کی بنیادوں پر پروان چڑھتی ہیں۔ یہ نظریات اہلِ فکر و نظر فراہم کرتے ہیں۔ مغربی فکر کا سرچشمہ کلیسا تھا۔ کلیسا نے مغربی معاشرے کو جو نظریات دیے انہیں مذہبی حیثیت حاصل تھی۔ مذہبی نظریات کے ساتھ دقت یہ ہوتی ہے کہ سائنس، ادب، فلسفہ یا سیاست کے نظریات کی طرح ان میں تبدیلی نہیں پیدا کی جا سکتی۔ عام طور پر اصحابِ فکر و نظر با اقتدار نہیں ہوتے لیکن دوہرے نظامِ اقتدار کی بدولت مغربی کلیسا با اقتدار بھی تھا۔ جس کے سبب اس کے نظریات کو مذہبی عقائد اور قانونی احکام کی حیثیت حاصل تھی۔

کلیسا کے نظریات کے پس منظر میں اگر عہدِ وسطیٰ کے طرز عمل کا مطالعہ کیا جائے تو پورے دور کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ا۔ لاتعلقی کا دور: یہ وہ دور تھا جس میں کلیسا عملاً اسلام سے لاتعلق تھا۔ نہ اس نے سیاست میں قدم رکھا تھا نہ معاشرے کی سیاسی ضروریات کو مذہبی رنگ دیا تھا۔ وہ عالمِ اسلام کی وسعت کو تشویش کی نظر سے ضرور دیکھ رہا تھا تاہم اسلام کو محض ایک ایسی افتاد تصور کرتا تھا جو بالآخر خود ہی فرو ہو جائے گی۔ یہ دور جنگِ یرموک (۶۳۴ء) سے شروع ہوتا ہے اور پوپ کے پایۂ تخت روم پر عربوں کے دوسرے حملے (۸۷۵ء) پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کی تحریریں مغرب کی روائتی تلخی سے مبرا ہیں۔ جو کچھ تحریر کیا گیا وہ محض لاعلمی، افواہوں اور بازنطینی عیسائیوں کے مسخ کردہ مواد پر مبنی تھا۔

۲۔ نبرد آزمائی کا دور: روم پر عربوں کے دوسرے حملے کے بعد پوپ نے کلیسا اور دینِ مسیحی کی مدافعت کے لیے معاشرے میں اسلام کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا پرچار شروع کیا۔ اسی مہم کے دوران اسلام کو دشمنِ عیسائیت اور داعیِ اسلام ﷺ کو دشمنِ مسیح قرار دیا گیا۔ اسلام دشمنی کیتھولک عقیدے کی حیثیت اختیار کر گئی۔ نفرت کی شدید لہریں اٹھیں۔ اسلام سے جنگ ہر دیندار عیسائی کے لیے مذہبی فریضہ بن گئی۔ مدافعت میں کامیابی نے جارحیت کی شکل اختیار کی۔ صلیبی پرچم تلے عالمِ اسلام پر دو صدیوں تک بھیروں ناچتا رہا۔ مغربی بھیروں تھک گیا تو مشرقی عفریت منگول کو اس نے اپنا شریکِ کار بنا لیا۔ اس کے باوجود تیرہویں صدی عیسوی کے اختتام تک مغرب کو اپنی دیرینہ حدود تک لوٹ آنا پڑا۔ صلیبی ناکامیوں کے بعد مغرب کی ساری توانائیاں اسپین کی بازیابی اور ترکوں کے خلاف مدافعت میں استعمال ہوئیں۔ اس طرح نبرد آزمائی کا دور نویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس کی تحریروں میں تلخی اپنے شباب پر پہنچی۔

۳۔ سرد جنگ: سرد جنگ کی ضرورت کا احساس تو سقوطِ عکرہ (۱۲۹۱ء) کے فوراً بعد ہی ہونے لگا تھا۔ سقوط کی اطلاع جب اطالیہ پہنچی تو کلیسا میں بےچینی کی لہر دوڑ گئی۔ ریمنڈ لل نے اس موقع پر تحریر کیا: ''اگر نسطوری عیسائیوں کو اپنی صف (کیتھولک) میں شریک کر لیا جائے اور تاتاریوں کو عیسائی بنا لیا جائے تو سارے 'سراسین' بآسانی تباہ کیے جا سکتے ہیں''۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی متنبہ کیا: ''خوف یہ بھی ہے کہ اگر ان تاتاریوں نے ترغیب یا تحریص کے باعث شریعتِ محمدیہ تسلیم کر لی تو پھر عالمِ عیسائیت کے لیے شدید خطرہ پیدا ہو جائے گا''۔

(cf. R. W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, p. 65)

اس طرح مغرب پوری طرح اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اسلام کے خطرے سے نمٹنے کے لیے عیسائیت کی ترویج ناگزیر تھی۔ تاہم اس کا مقصد ابھی تک اسلام کو بالقوۃ تباہ کرنا تھا۔

مفکرین مغرب نے مسلح تصادم کی ناکامی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ عالمِ اسلام کی قوت و استحکام محض شمشیر و سناں کی بدولت نہیں بلکہ اس میں نظریاتی عنصر کا بڑا حصہ ہے۔ ریمنڈ لل نے کلیسا کو دعوت دی کہ ''علومِ شرقیہ کے مطالعے کو روحانی صلیبی جنگ کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے''۔

(Earnest Barker in his article 'The Crusade' states, *"It was Catalon Raymondus Lulls who first attempted to promote development of Oriental Studies as the instrument of sacrific crusades in which the arms would be entirely spiritual"*, cf. 'Legacy of Islam', 1960 ed.)

چنانچہ اس نے خود علوم شرقیہ کے مطالعے کے مدارس قائم کیے اور اپنی تبلیغی کاوشوں میں ہی جان دی۔ بیکن نے بھی اپنے نظریات پیش کیے لیکن اُس وقت ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

پندرہویں صدی عیسوی میں لل اور بیکن کے نظریات پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت کو شدّت سے محسوس کیا گیا۔ پوپ اور اس کے بشپ اس یکطرفہ سرد جنگ کو تیز تر کرنے کے لیے سرگرم ہو گئے۔ بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ اغراض و مقاصد کا تعین ہوا۔ طریقۂ کار طے کیے گئے۔ علومِ شرقیہ کے بامقصد مطالعے کا دور شروع ہوا۔ یونیورسٹیوں سے علوم شرقیہ کے ماہرین پیدا ہونے لگے، جن کا متعینہ مقصد یہ تھا کہ وہ عیسائیت کی ترویج اور اسلام کی بیخ کنی کے لیے خود کام کریں اور دوسروں کو مواد بہم پہنچائیں۔

<u>مستشرقین:</u> پس مستشرقین کا وجود کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے ذمہ دار اصحابِ فکر تھے، جو صدیوں سے عالمِ اسلام کے ساتھ حالتِ جنگ میں مبتلا تھا، اور عالمِ اسلام کو ہر قیمت پر نابود یا کم از کم مغلوب کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ جس نے اپنی کمزوریوں کی تشخیص کر لی تھی اور جسے دشمن کی برتری کے راز معلوم ہو چکے تھے۔ جس نے اپنی کمزوری رفع کرنے اور دشمن پر برتری حاصل کرنے کا ایک جامع منصوبہ تیار کر کے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا تھا۔ علومِ شرقیہ کا مطالعہ اسی جنگی منصوبے کا ایک اہم حصہ تھا۔ مستشرقین اس منصوبے کے اہم کارکن تھے۔ وہ روحانی حروبِ صلیبیہ کے ہراول دستے تھے۔ جن کا فرض یہ تھا کہ وہ دشمن کے خزانوں سے اپنے ملک کو مالا مال کریں اور ان کمزور مقامات کو دریافت کریں، جہاں سے دشمن پر حملہ آور ہوا جا سکے۔ اور ان مستحکم مقامات کی نشاندہی کریں جدھر سے نقصانات یقینی ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ حالات کے ساتھ ساتھ مستشرقین کا دائرۂ کار بھی وسیع ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے نہ صرف نظریاتی ضروریات کے لیے مواد فراہم کیا بلکہ انکی مساعی کی بدولت مغرب کو سیاسی اور اقتصادی سہولتیں بھی میسّر ہوئیں۔ مستشرقین نے ایشیا اور افریقہ کی تہذیبوں اور انکے علوم پر بڑی بڑی تحقیقات کیں۔ قبلِ تاریخ کی گمشدہ تہذیبوں کا سراغ لگایا۔ مردہ زبانوں کو معنی دیے۔ تاریخِ انسانی کی گمشدہ کڑیاں فراہم کیں۔ دنیا کی ہر زبان کے علمی خزانے اپنی زبانوں میں منتقل کیے۔ انکی تحقیقات اور کاوشوں کا موجودہ علوم کے ارتفاع میں ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ وہ اپنی تاسیس کے اعتبار سے اسلام سے سرد جنگ لڑنے کے لیے مختص تھے۔ زیرِ نظر مقالہ انکے اسی پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا ہم صرف یہ دیکھنے پر اکتفا کریں گے کہ اسلام سے انہوں نے کیا لیا اور اسلام کو انہوں نے کیا دیا۔

عالمِ اسلام سے علمی استفادہ

نبیِ امی ﷺ نے ہر مسلمان مرد و عورت کے لیے حصولِ علم لازم قرار دیا۔ مسلمانوں نے تعمیلِ حکم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ عالمِ اسلام میں عظیم پیمانے پر علم کی جستجو شروع ہوگئی۔ بغداد، قاہرہ، پلرمو، طلیطلہ اور قرطبہ علوم کے مرکز بن گئے۔ دنیا کے کونے کونے سے کتابیں ان مراکز میں پہنچنے لگیں۔ یونان، مصر، ہند و چین کے تمام علوم آٹھویں صدی عیسوی تک عربی میں منتقل ہو چکے تھے۔ مسلمانوں نے ان علوم کا صرف ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ انہیں سمجھنے کے بعد انہیں قابلِ فہم بنایا اور ان مبادیات پر ارتقاءِ علوم کی منازل طے کیں۔ تاریخِ انسانی میں مسلمانوں سے قبل کسی قوم کو بنی نوعِ انسان کے علوم کے تمام جواہر کسی ایک خزانے میں منتقل کرنے کا افتخار حاصل نہ ہوسکا تھا۔ مغرب کی سرحدوں پر ان علوم کے دو مراکز تھے۔ ایک قرطبہ، دوسرا پلرمو (سسلی)۔ ان دونوں مراکز سے علوم کی مشامِ جانفزا مغرب میں بھی پہنچنے لگی۔ اس دور کا مغرب قومی نظریات سے نابلد، مختلف ریاستوں پر مشتمل تھا جو سب کی سب ایک مشترک مذہبی قدر میں منسلک تھیں، اور رومن چرچ ان سب پر حکمران تھا۔ عقل وفہم کے تمام شعبے اسی کے قبضے میں تھے۔ علم پر اس کی اجارہ داری تھی۔ اس وقت کا مغرب عالمِ اسلام پر رشک کرتا تھا۔ عالمِ اسلام، صنعت و تجارت و حرب میں ہی ممتاز نہ تھا، بلکہ فلسفہ، سائنس، طب و قانون ہر میدان میں یکتا تھا۔ جبکہ مغرب میں اس وقت ان میں سے کسی شے کا وجود نہیں تھا۔ مغربی ذہن جب اپنی غفلت سے بیدار ہونے لگا تو اس میں اسلامی فطانت اور علوم کی طلب پیدا ہوئی۔ لیکن اس طلب میں یہ خوف بھی پوشیدہ تھا کہ کہیں ان علوم کے ساتھ اسلام کے مذہبی اثرات بھی نفوذ نہ کر جائیں۔ اس خدشے کے پیشِ نظر کلیسا نے انہیں کالے علوم کا خطاب بخشا اور اپنی حدود میں ممنوع قرار دیا۔ لیکن جب کلیسا کو یہ احساس ہوا کہ یہ علوم قوت کا سرچشمہ ہیں تو اس نے ان علوم کے حصول کی جانب توجہ کی، تاہم یہ احتیاط ملحوظ رکھی کہ علوم کو منتقل کرنے سے پیشتر انہیں بپتسمہ ضرور دیا جائے۔

علوم کا بپتسمہ: علوم کی منتقلی دو ادوار میں ہوئی۔ دورِ اوّل میں مغربی علماء نے عربی زبان سے ناواقفیت کے سبب یہودی مترجمین سے تراجم کروائے۔ پہلے تو یہود نے ہی ان علوم سے ممکنہ حد تک اسلامی اثرات دور کیے۔ پھر جب یہ علوم عیسائیوں کے پاس پہنچے تو سونے پر سہاگہ کے مصداق ان کو حتی الامکان اپنا رنگ دیا۔ انہیں خود سے منسوب کیا اور جن علوم کو خود سے منسوب نہ کر سکے انہیں یونانی الاصل قرار دیکر اپنی میراث ٹھہرایا۔ مسلم تصانیف کو اپنے ناموں سے منسوب کرنے کی شکایت ہمیں گیارہویں صدی عیسوی سے ملنی شروع ہو جاتی ہے۔ اس صدی میں ابنِ عدون (Ibn Adun) نے تحریر کیا کہ ''کتابوں کو عیسائیوں کے ہاتھ نہیں فروخت کرنا چاہیے، کیونکہ وہ انہیں ترجمہ کرکے اپنے بشپوں (Bishops) سے منسوب کردیتے ہیں''۔

(cf. E. Levi; Provencal: and E. Garcia Gomez; 'Sevilla a Cominzos del Siglo' XII, Madrid, 1948, p.173, quoted by Juan Vernet; Legacy of Islam, 1974, article 'Science' p. 486)

ایسی کتنی تصانیف کا سرقہ کیا گیا۔ کتنے مسلم علماء کی کاوشیں رہی ہونگی جن کے مصنّف اب عیسائی بشپ تصوّر کیے جاتے ہونگے، آج اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ بغداد کے کتب خانوں کی تباہی اور اس کے بعد قرطبہ کے کتب خانوں کا نذرِ آتش ہو جانا ایسے سانحے تھے جنہوں نے سرقوں کی تحقیقات کا امکان ہی ختم کر دیا۔

تاہم ان مشاہیر کی کتب کو جنکے متعدد نسخے موجود تھے، اور جنکا معیار مغربی معیارِ علم سے کہیں بلند تھا، مصنّفین سے ہی منسوب رکھا گیا۔ اگر انہی کی تفصیلات بیان کی جائیں تو اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ مغرب کا ہر علم مسلم علوم پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کی صدیوں کی کاوش کا ثمر مغرب کو ملا، اور مغرب نے اپنے علوم کی بنیاد مسلم علوم پر رکھی۔

منتقلی کا دورِ اوّل: یہ دور اسپین میں طلیطلہ کے سقوط (۱۰۸۵ء) سے شروع ہوتا ہے اور تیرہویں صدی عیسوی تک محیط ہے۔ اسپین میں طلیطلہ بھی علم کا عظیم مرکز تھا۔ اس کے سقوط کے بعد طلیطلہ کے نادر کتب خانے عیسائیوں کے قبضے میں آئے۔ طلیطلہ پر عیسائی قبضے کے باوجود وہاں بدستور عربی زبان کا چلن رہا۔ علماء اور خصوصاً یہودی اہلِ قلم اس زبان سے دامن کش نہ ہو سکے۔ انہی علاقوں میں مسلم علوم کی لاطینی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں منتقلی کا کام شروع ہوا۔ اس عہد میں فلاسفی ریاضی اور طب کو خصوصیت کے ساتھ مغربی زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ اس عہد کے مغربی علوم کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ان کی تمام بنیادیں عربی سے مستعار ملیں گی۔ طلیطلہ کے آرچ بشپ ریمند (۱۱۲۶ء تا ۱۱۵۱ء) نے ایک دارالترجمہ قائم کیا جو عربی سے لاطینی میں تراجم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ یہ دارالترجمہ تقریباً ایک صدی تک کام کرتا رہا۔ اس میں خود مسلم علماء، یہودی مترجمین اور مغربی اہلِ قلم سب ہی ملازم تھے۔ اس ادارے کا سربراہ ایک اطالوی، جرارد آف کریمونا (Gerard of Cremona) تھا، جس نے خود کم از کم اکہتر [۷۱] نادر کتب کا ترجمہ کیا۔ اس کی مترجمہ کتب کی فہرست میں بطلیموس کی کتاب المَاجسطی (Almagist)، ابنِ حنین کا 'ترجمۂ جالینوس' (Translation of Galen)، الخوارزمی کی 'الجبر والمقابلۃ'، الکندی کی تصانیف، ابن سینا کی 'القانون' (The Canon)، اور الزہراوی کی جراحی اور تشریح الاعضاء پر مبنی کتب شریک ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی تک القانون کی پندرہ بار لاطینی زبان میں اشاعت ہو چکی تھی۔ اسی طرح الزہراوی کی کتب کے بے شمار نسخے لاطینی میں بار بار چھپے۔ ان دونوں کتب کو صدیوں تک یورپ کی درسگاہوں میں حرفِ آخر کی حیثیت حاصل رہی۔ (cf. Philips K. Hitti; 'Islam and the West', p.72)۔

تیرہویں صدی میں مائیکل اسکاٹ (متوفی ۱۲۳۲ء) نے ابن رشد کی تصانیف کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس کی تصانیف نے مغرب کو ارسطو کے فلسفے سے متعارف کرایا۔ البرٹس میگنس (Albertus Magnus) (متوفی ۱۲۸۰ء) نے ارسطو کے فلسفے کو کلیسا کے عقائد سے ہم آہنگ کیا۔ انگریز فلسفی راجر بیکن نے بصریات میں

جو کارنامے انجام دیے ان کی بنیاد ابن الہیثم کے نظریات پر تھی۔ابن العربی، جنہوں نے اشراقی مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی، انکی تصانیف کا بھی ترجمہ کیا گیا۔

ایک اور مترجم رابرٹ تھا، جس نے الخوارزمی کے الجبرے کے علم کو لاطینی میں منتقل کیا۔اسی منتقلی کے سبب عربی ہندسوں نے رومن ہندسوں کی جگہ لی۔موجودہ ہندسے جنہیں ہم انگریزی تصور کرتے ہیں، حقیقتاً عربی تھے اور یورپ آج بھی انہیں عربی ہندسے (Arabic Numerals) کہتا ہے۔رومن ہندسوں میں یہ صلاحیت موجود نہیں تھی کہ وہ ریاضی کے لیے استعمال ہوسکیں۔عربی ہندسوں کی کل تعداد دس ہے اور یہ سائنسی طریقے سے جمع، ضرب، تفریق اور تقسیم کے ذریعے حساب کی ہر ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔عربی ہندسوں کے بغیر موجودہ ریاضی، جس پر سائنس اور ٹیکنالوجی کا دارومدار ہے، ہرگز ارتقاء پذیر نہیں ہوسکتی تھی۔

انگریزی زبان میں طبع ہونے والی پہلی [ترجمہ کردہ] کتاب (The Dictes and Sayings] [of Philosophers) تھی، جو ویسٹ منسٹر میں ۱۴۷۷ء میں چھپی۔یہ فرانسیسی زبان سے ترجمہ کی گئی تھی۔فرانسیسی میں اسکا ترجمہ لاطینی سے ہوا تھا اور لاطینی نسخہ عربی کتاب کا ترجمہ تھا، جس کا نام 'مختار الحکم ومحاسن الکلم' تھا جسے ایک شامی الاصل مصری مبشر ابن فاتک نے تصنیف کیا تھا۔

مغرب نے اسپین کے مسلمانوں سے صنعت وحرفت میں بھی بہت کچھ سیکھا۔ان میں پارچہ بافی، سلک سازی، رنگریزی، شیشہ گری، ظروف سازی، فنِ تعمیر، فنِ تزئین، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یہود کے تراجم: پروفیسر الفرڈ گلاؤم کا دعویٰ ہے کہ یورپ کے موجودہ ارتقاء پر یہود کا بہت بڑا احسان ہے۔کیونکہ وہ عربی اور لاطینی زبانوں کے درمیان ایک نہایت اہم کڑی تھے، اور انہی کی بدولت یورپ کو مسلمانوں کے علوم وفنون میسر آسکے تھے۔پروفیسر نے سینکڑوں مترجمین کے نام اور انکے کارنامے گنوائے ہیں۔

(see Alfred Guillaum's essay, 'The Jewish factor in Medieval Thought', published in 'Legacy of Israel')

یہودی عالم اسحٰق اسرائیلی نے اپنی کتاب (On Definition) میں عربی کی تمام طبی اصطلاحات کو جمع کرکے انکی تشریح کی۔ایک دوسری کتاب میں ارسطو کے طبیعیاتی مسائل جمع کیے جسے اس نے عربی کے توسط سے حاصل کیا تھا۔

ابن سینا کی عہد آفریں کتاب 'القانون' کے بارے میں، جس کا عہد وسطیٰ میں سب سے زیادہ مطالعہ کیا گیا تھا اور جس کا مکمل ترجمہ صدیوں یورپ میں طب کے نصاب میں شریک رہا، یہود کا دعویٰ ہے کہ اسے انہوں نے ہی عربی سے لاطینی میں منتقل کیا تھا۔ابی جبران کو کئی علوم میں دستگاہ تھی۔اس نے (Fountain of Life) نام کی کتاب یورپ کو دی۔یہ کتاب اسپین میں عربی تخیلات کی آئینہ دار ہے۔اس میں افلاطونی فکر کا نچوڑ ہے۔ابی جبران کو ایک عرصے تک یہودی مصنف ابن جبریل سمجھا گیا۔ابی جبران کا یہ شاہکار صدیوں تک یورپ میں ذوق وشوق سے پڑھا گیا ہے۔ابراہیم بن عذرا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اس قدر عربی لٹریچر لاطینی میں منتقل کیا کہ اس کے ترجمے لاطینی علوم کے سرتاج بن گئے۔

ابنِ رشد کی فکر کے جواب میں غزالی نے فلسفۂ فنا پیش کیا، جس کے جواب الجواب میں ابنِ رشد نے فناء الفناء تحریر کی۔ یہ دونوں کتابیں حسب ذیل ناموں سے لاطینی میں منتقل ہوئیں، غزالی کی کتاب (Destructio Philosophorum)، اور ابنِ رشد کی کتاب (Destructio Destructiones)۔

موسیٰ بن میمون جسے یورپ میمونائڈ کہتا ہے، ایک یہودی فلسفی اور طبیب تھا۔ جہاں اس کی اپنی تصانیف تھیں، وہیں اس نے مسلم علوم کو بھی کثرت سے قلمبند کیا۔ ابنِ سینا اور مسلم منجمین کے افکار اس کے توسط سے یورپ کو ملے۔

ایک شخص قسطنطین افریقی (Constentine Africano) نامی گزرا ہے، جو افریقہ سے مرتد ہو کر سلرنو (جنوبی اطالیہ) میں جا بسا تھا۔ یہ پہلا فرد تھا جس نے اطالیہ میں عربی علوم کے تراجم بہم پہنچائے۔ ادیلارد آف باتھ (Adelord of Bath) سے منسوب تمام مقالے اور نقشے مشہور مسلمان ماہر فلکیات و ہئیت دان الخوارزمی کے تراجم ہیں۔ ادیلارد کی کتاب (Introduction to the Art of Astronomy) بھی الخوارزمی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

پطرس الفانسو ایک یہودی تھا جو عیسائی ہو گیا تھا۔ چونکہ عربی سے بخوبی واقف تھا اس لیے اس نے بکثرت عربی کتابوں کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ یہی پطرس انگلینڈ پہنچا تو وہاں علماء وعقلاء کا مرکزِ توجہ بن گیا۔ اس کی مدد سے والچر (Walcher) نے عربی علمِ ہئیت کو انگریزی میں منتقل کیا۔ ایک اور عربی داں یہودی ابراہیم بن عذرا نے ریاضی، ہئیت، اور فلکیات کے علوم انگریزی زبان میں منتقل کیے۔ ایک دوسرے یہودی ابنِ داؤد نے ابنِ سینا کی کتاب 'الروح' کا ترجمہ (On the Soul) کے عنوان سے کیا۔ اس نے الغزالی کی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا۔ اس شخص نے علمِ ہئیت، فلکیات اور نجوم پر ضخیم کتابوں کا ترجمہ کیا، جن میں ابو ماشر بغدادی، عمر بن الفروشن ایرانی، ثابت بن قرہ، مصلح نصیری، الفرغانی وغیرہ کی تصانیف شامل ہیں۔ اس نے الفارابی کے بھی تراجم کیے، جن میں حسبِ ذیل مشہور ہیں۔

1. On the Division of Philosophy 2. On the Origin of Science

اس کے تراجم میں اہم ترین کتب محمد بن موسیٰ الخوارزمی کی کتبِ ریاضی ہیں۔

عربی علمِ مثلث (Trigonometry)، مساحت اور جیومیٹری سے لاطینی دنیا کو ابرہیم بن حیٰ نے، جسے صاحب الشرطہ (Sava Sorda) کہا جاتا تھا، متعارف کرایا۔

سسلی کے نارمن حکمراں نہایت علم دوست تھے۔ ان کے دربار میں عرب علماء کی توقیر تھی۔ وہاں ترجمے کی مہم سرکاری طور پر چلائی گئی۔ شاہ فریدرک اور اس کے بعد اس کے بیٹے مینفرد اور اس کے بعد چارلس آف آنجو کے عہد میں بے شمار تراجم ہوئے۔ سسلی کے تراجم میں اہم ترین کارنامہ امام زکریا رازی کی طبّی کتب کے ذخیرے کا ترجمہ ہے۔ سسلی میں ہی ابنِ رشد کی کتاب فناء الفناء کا بھی ترجمہ ہوا۔ غرض یہ کہ کہا جا سکتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی مغرب میں عربی سے تراجم کی صدی تھی۔

تیرہویں صدی میں اسپین میں شاہ الفانسو دہم کی سرپرستی میں تراجم کی مہم زوروں پر رہی۔ اس کے درباریوں میں بکثرت مترجم تھے۔ اس کے دور میں فلکیات کے جو جدول تیار کیے گئے انہیں الفانسوی جدول کہا گیا۔ یہی جدول یورپ کے علمِ فلکیات کی اساس ہیں۔ یہاں تک کہ سترہویں صدی میں گلیلیو اور کیپلر نے بھی انہیں جدولوں پر اپنے کام کی بنیاد رکھی۔

الفانسو کی پیروی اس کے ہمسایہ حکمرانوں نے بھی کی۔ ارغون کے حکمراں جیمس اوّل نے عرب تصنیفات اور نقشوں کی مدد سے بحری نقشے تیار کروائے اور اپنی بحری تجارت کو وسعت دی۔ یہی نقشے موجودہ نقشوں کے لیے بنیاد بنے۔

تیرہویں صدی کے نصف سے تراجم کا کام سست پڑ گیا۔ یورپ نے جو کچھ حاصل کیا تھا اسی پر اکتفا کرکے، اس پر عامل ہوگئے۔ علمی مراکز نے مغربی زبانوں میں کتابیں شائع کرنا شروع کردیں۔ عربی کلیات (قوانینِ طب) نے (Colliget) کا نام اختیار کرلیا۔

قدیم کتابیں از سرِ نو عربی سے ترجمہ کی گئیں۔ ابنِ رشد کی تحریریں پھر سے منظرِ عام پر آئیں۔ ابن زبیر ہسپانوی (متوفی ۱۱۶۴ء) کی کتاب تاثیر (Theiser) کے نام سے لاطینی میں آئی۔ عربی ادویات کی فہرستیں، خواص اور استعمال کے طریقے لاطینی میں منتقل ہوئے۔ غرضیکہ کوئی شعبۂ علم ایسا نہ تھا جو عربی علوم کا منت کش نہ ہوا ہو۔

فلسفہ، طب، ریاضی اور سائنس کی کتب کے علاوہ ادبیات کے بھی بے شمار ترجمے ہوئے۔ جن میں کلیلہ و دمنہ، سندباد کے سفر، کتاب الاغانی، الف لیلہ، حنین بن اسحٰق کے جمع کردہ اقوالِ فلاسفہ، سعدی کی گلستان و بوستان، کلامِ حافظ و خیام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تیرہویں صدی کے اواخر میں کسی نامعلوم عرب مصنف کی کتاب 'معراج' کا ترجمہ الفانسو دہم کے لیے ہسپانوی زبان میں کیا گیا۔ ہسپانوی زبان کے توسط سے یہ کتاب لاطینی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کی گئی۔ عیسائیوں کی نظر میں یہ کتاب مسلمانوں کا ایک ایسا مقدس صحیفہ تھی جسے خود پیغمبرِ اسلام ﷺ نے تحریر فرمایا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں آسن پولاشیس (Asin Palacius) نے اپنی تحقیق کی بنا پر یہ دعویٰ کرکے علمی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا کہ دانتے کی تصنیف 'ڈیوائین کامیڈی' (Divine Commedia)، اسی کتاب 'معراج' کا چربہ تھی۔

ائمہ اور انکے علوم

دورِ اوّل کے تراجم فنی اعتبار سے ناقص تھے۔ سولہویں صدی کے بعد جب مستشرقین نے عربی زبان سے واقفیت حاصل کرلی تو انہوں نے مشاہیر کے شاہکاروں کو براہِ راست عربی سے سمجھنے کی کوشش کی۔

جس کے باعث سترہویں صدی سے راست عربی کی طرف مراجعت ہوئی اور ان کتب کا از سر نو ترجمہ کیا گیا۔ یہ دور انیسویں صدی تک جاری رہا۔ سترہویں صدی کے مترجمین میں فرانس کے رائر (A-du-Ryer)، اطالیہ کے جینتیس (G. Gentius)، اور جرمنی کے کلاریوس (A. Clarius) بہت مشہور ہوئے۔

رازی : عہد وسطیٰ کے مسلم اہل قلم کی یہ بھی ایک خصوصیت تھی کہ ان میں سے بیشتر ایک سے زیادہ فنون کے امام تھے۔ ان میں سے ایک ابوبکر محمد بن زکریا رازی تھے، جنہیں یورپ (Rhazes) کے نام سے جانتا ہے۔ امام موصوف یونانی علوم کے ہر شعبے سے واقف تھے۔ یورپ نے بھی انہیں سترہویں صدی تک امام (Authority) تسلیم کیا۔ رازی کی بیشتر تصانیف جو فلسفہ، الہیات، کیمیا اور طب پر مشتمل تھیں، لاطینی میں منتقل کی گئیں۔ طب کے موضوع پر ان کی تصنیف 'الحاوی' لاطینی میں 'کانٹینن' (Continen) اور المنصوری (Ad Almansorum) کے نام سے ترجمہ ہوئیں۔ ان کتب میں رازی نے اپنے دور کے مروجہ طبی اصولوں کو ارادی طور پر چیلنج کیا۔ ایک اور کتاب میں انہوں نے یونان کے طبیب اعظم جالینوس (Galen) سے تعارض کیا ہے۔

رازی کو علم کیمیا میں بھی مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے تجربات، طریقۂ کار، تجربات کے لیے درکار آلات، اور تجربات سے حاصل کردہ نتائج، بلا کم و کاست بیان کیے۔ جس کے باعث انکی پیروی کرنے والوں کو بڑی مدد ملی۔

ابوریحان البیرونی: البیرونی عظیم سائنسداں ہونے کے ساتھ ساتھ، ریاضی داں، ماہر ارضیات وفلکیات اور اعلیٰ پائے کے مورخ بھی تھے۔ انکی مختلف کتابوں کے ترجمے لاطینی میں کیے گئے۔ جن میں بک آف اسٹون (Book of Stone) اور فارماکولوجی (Pharmacology) نے بڑی شہرت پائی۔ انکی ریاضی اور فلکیات کی کتب سے قطع نظر "کرونولوجی آف اینشینٹ نیشنز" (Chronology of Ancient Nations) کا تذکرہ کیے بغیر حق مضمون ادا نہیں ہوگا۔ اس کتاب کا شمار اس موضوع پر دنیا کی پہلی کتاب میں ہوتا ہے۔ تاریخ اقوام و مذاہب پر یہ کتاب نادر مواد سے پُر ہے۔

علم نجوم : ابو معشر جعفر بن محمد البلخی کی کتب نجوم کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ علم نجوم و سیارگان (Astrology) پر انکی کتابیں نہایت بلند پایہ تھیں۔ یورپ انہیں ہولی فیلیس ابن راگل (Holy Filius Aben Ragel) کہتا ہے۔ انکی کتاب 'البارع فی احکام النجوم' کا ترجمہ ہسپانیہ کے شاہ الفانسو دہم کے لیے کیا گیا۔

(On the Astronomical - Astrological Works at the Court of Alfonso , see E. Velyn and S. Proctor; 1951, Alfonso X of Castile, Patron of Literature and Learning, Oxford)

طب و عطاری

علی الطبری : یورپ کو مسلم علوم سے جس قدر خزانہ شعبہ طب کے توسط سے میسر آیا اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ ابنِ سینا اور رازی کی کتب کا حوالہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔ انکے بعد جو کتاب لاطینی میں منتقل ہوئی وہ علی بن ریحان الطبری کی مشہور تصنیف 'فردوس الحکمۃ' ہے، جو عربی میں قدیم ترین انسائکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی تھی۔ طبری نے یہ کتاب نویں صدی عیسوی میں تحریر کی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں اپنے ہم عصر طبیب حنین بن اسحٰق کی علم بصریات کی تحقیقات کی وضاحت کی گئی تھی۔ نیز ایک خصوصی باب طبِّ ہندی کے لیے مختص تھا جس میں ہندی اور یونانی طب کا موازنہ کیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بین الاقوامی علومِ طب کا مرقّع تھی۔

علی بن عبّاس : علی بن عبّاس بغداد کا شاہی طبیب تھا۔ اسے لاطینی میں (Holy Filius Abbas) کہا جاتا ہے۔ اس نے ایک عظیم کتاب طب تحریر کی جسے امیر عبداللہ سے منسوب کیا۔ یہ ترجمہ لاطینی میں (Liber Regius) یا (Regalis) کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کتاب اور اس پر مبنی دیگر کتب (Liber Fantegni) یا (Panthero) سلرنو کے مدرسۂ طب میں عرصہ تک رائج رہیں۔ قسطنطین افریقی نے بھی طبِّ اسلامی کے خزانے لاطینی میں مدرسۂ طبّیہ سلرنو کے لیے منتقل کیے جو کارپس (Corpus) کہلائے۔ ان کی حالیہ تحقیق سے واضح ہوا ہے کہ یہ نوشتے قیروان کے فلاسفہ اور حکیم اسحٰق بن سلیمان کی تحریروں پر مبنی ہیں۔

بوعلی سینا : سینا کی کتاب 'قانون' جو لاطینی میں (Canon) کہلائی، عہدِ وسطیٰ میں طب کی بائبل تسلیم کی جاتی تھی۔

ابنِ رشد : عظّامِ طب میں ابنِ رشد بھی صفِ اوّل میں تھے۔ انکی کتاب 'کلیّات' (Colliget) کے نام سے ترجمہ کی گئی۔

علم الابدان : اس علم پر ابنِ بطلان اور ابنِ رضوان کی نزاعی بحثیں اور ابن النفیس کے دورانِ خون پر نظریات کی کتب مائیکل سروِیٹس (Michael Servetus) نے لاطینی میں ترجمہ کیں۔

(cf. J. Schacht; 'Ibn Al-Nafis, Servetus and Columbo', xxii, pp. 317-336)

علم بصریات : عرب حکیم، علی بن عیسیٰ، (Jesus bin Hali) کی علمِ بصریات پر عظیم کتاب کا لاطینی میں ترجمہ وینس میں پندرہویں صدی عیسوی میں کیا گیا۔

علم تشریح اعضاء : جدید تشریح الاعضاء و جراحی (Anatomy and Surgery) کا بانی آندرے ویسالیس (Andreas Vesalius) کو باور کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی تصانیف سولھویں صدی میں طبع کرائیں۔ لاطینی میں طبع شدہ کتاب میں اس نے متعدد جداول (Tables) شامل کیے، تاکہ ابتدائی اصولوں کی وضاحت ہو سکے۔ ان جدولوں میں بکثرت عربی اصطلاحات، عربی و عبرانی رسم الخط میں موجود ہیں، جو اس امر کی غمازی کرتی ہیں کہ یہ علم بھی عربی سے لیا گیا تھا۔

دیگر سائنسی علوم

نباتات وزراعت: نباتات وزراعت پر بھی مسلم تصانیف کو لاطینی میں منتقل کیا گیا۔ ابوحنیفہ الدینا وری کی کتاب 'النباتات' کا ترجمہ (The Book of Plants) کے نام سے ہوا۔ ابنِ وحشیہ کی زراعت وکاشتکاری سے متعلق ایک کتاب کا ترجمہ (Nabataian Agriculture) کے نام سے ہوا۔ اس کتاب کے طویل حوالے متعدد تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔

جغرافیہ: وسیع اسلامی مملکت میں رسل ورسائل، حمل ونقل، تجارت وسیاحت، وغیرہ نے علمِ جغرافیہ کو ناگزیر بنادیا تھا۔ چنانچہ مسلم اہلِ علم نے اس شعبے میں نہایت اہم کارنامے انجام دیے۔ اس دور کے وسائل کے پیشِ نظر ان کارناموں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ سسلی کے نارمن حکمرانوں کی دلچسپی کے پیشِ نظر بکثرت عربی کتبِ جغرافیہ جمع کی گئیں۔ ان میں زمین کا وہ شہرہ آفاق نقرئی نقشہ بھی تھا، (Earth Silver Map) جو راجر ثانی کی فرمائش پر بنایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اکہتر [۷۱] دیگر نقشے اور بھی تھے۔ یہ سارے نقشے 'محمد الشریف الادریسی' کے رسالے پر مبنی تھے۔ [(cf. R. V. Tooley; Maps and Map Makers, chapter !!, 'The Arabs and Medieval Europe': also G. Oman; 'Encyclopedia of Islam',2nd Ed., article - 'Al-Idrisi')] ۔ ان نقشوں نے مغربی جہاز رانی کی ترقی میں بے حد مدد دی۔ واسکوڈی گاما کے پائلٹ ابنِ ماجد نے ایک رسالہ بحرِ ہند میں جہاز رانی کی بابت تحریر کیا، جس سے مغربی جہاز رانوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

(cf. S. Maqbool; Encyclopedia of Islam, 2nd Ed., article -'Ibn Majid')

ترک ملاح پیری رئیس نے بحرِ روم میں جہاز رانی کے بارے میں ایک رسالہ تحریر کیا جس میں شامل ایک نقشے کے بارے میں یورپ نے ہمیشہ یہ دعویٰ کیا کہ یہ نقشہ کولمبس کا تھا۔ عصرِ حاضر کے محقق چارلس ایچ ہیپگُڈ (Charles H. Hapgood) نے یہ ثابت کیا کہ رئیس کا نقشہ کولمبس کا نہیں بلکہ کسی اور قدیم تر نقشے پر مبنی تھا۔ کیونکہ یہ محض بندرگاہوں اور انکے راستوں پر ہی نہیں بلکہ حقیقی طور پر ریاضی کے اصولوں پر مبنی تھا۔ اس دور میں ایسے نقشے صرف مسلمان ہی تیار کر سکتے تھے۔

الادریسی کی کتاب: ۱۶۱۹ء میں دو ایسے افراد نے جنکا تعلق جہاز رانی سے تھا الادریسی کی کتب کے ماخوذات 'جیوگرافیہ نوبیئینسس' کے نام سے (Geographia Nubiensis) لاطینی میں شائع کیے۔

ریاضی: مسلمانوں نے جب سائنس کی طرف توجہ دی تو ریاضی کی ترقی لازم وملزوم ہوگئی۔ ہسپانوی زبان میں عربی سے سب سے پہلے ریاضی کو منتقل کیا گیا۔ یہ علم زیادہ تر الخوارزمی کے توسط سے لیا گیا۔ اسی لیے ہسپانوی لفظ گازرمے (Guarisme) کے معنی ہی اعداد، ہندسہ اور اعشاریہ کے ہوگئے۔ الخوارزمی کی شہرہ آفاق

کتاب 'الجمع والتفریق بحساب الہند' (عربی اصل اب معدوم) سب سے پہلے ہسپانوی زبان میں ترجمہ ہوئی۔ یورپی زبانیں اتنے طویل نام کی متحمل نہ ہوسکیں، اس لیے اس علم کو یورپ نے اپنے استاد الخوارزمی کے نام سے موسوم کیا، اوراس طریقہ میں مستعمل اعداد کا نام 'عربی اعداد' ہوگیا۔

الخوارزمی اور عمرخیام کا دوسرا کارنامہ الجبرا تھا۔ یہ مسلمانوں کی ہی ایجاد تھی اور انکے سوا کوئی دوسری قوم اس سے واقف ہی نہیں تھی۔ الخوارزمی کے علاوہ ابوکامل شجاع، الخازن اور الکرخی کے ریاضی کے شاہکار بھی منتقل کیے گئے۔ موسیٰ بن شاکر نویں صدی میں اقلیدس (جیومیٹری) کے امام تھے۔ انکی کتاب 'معارف المساحت الاشکال' کا ترجمہ 'جیرارڈ آف کریمونا' نے (Verba Filiorum Noysi Filii Sakir) کے نام سے کیا۔ (cf. F. Babinger; Encyclopedia of Islam, article by C.C. Hapgoog)
علم المثلث (ٹرائیگنو میٹری) کے ماہرین البطانی، ابونصر اور البیرونی کی تصانیف کو مختلف ادوار میں لاطینی میں منتقل کیا گیا۔

علم الہیئت: ہئیت میں پیائش کے لیے جو آلہ استعمال ہوتا تھا وہ اصطرلاب کہلاتا تھا۔ اس آلے میں قطب تارے کو مرکز قرار دیکر مختلف ستاروں اور سیاروں کی جائے وقوع ظاہر کی جاتی تھی۔ ابتداً ایسے قرص یا طشت استعمال ہوئے جو ہر زاویے کے لیے الگ الگ تھے۔ اندلسی ہئیت داں علی بن خلف نے ایسا طشت یا اصطرلاب تیار کیا جس میں سیاروں کی علامت کو حرکت دیکر ان کی جائے وقوع معلوم کی جاسکتی تھی۔ اس کی انتہائی اعلیٰ شکل مظفر الدین طوسی کی تیار کردہ اصطرلاب تھی۔ سولہویں صدی عیسوی میں اس اصطرلاب کو گیما فریشیا (Gemma Frisia) نامی ایک عیسائی نے بپتسمہ دیکر اسکا نام کیتھولک اصطرلاب (Astrolabum Catholicum's) رکھا۔ اندلسی ہئیت داں عباس بن فرناس نے قرطبہ میں ایک حجرہ بنایا تھا جسمیں سیارگان، ستارے، بادل، بجلی اور کڑک، ہر شے کا موجود ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ ان نمونوں کے ذریعے ہئیت کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام لیا جاتا تھا۔

مسلمانوں کا علمِ ہئیت پورے کا پورا یورپ کو منتقل ہوا۔ مغرب کی آسٹرونومی (Astronomy) اسی علمِ ہئیت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ہئیت اور علم المثلث (Trignor etry) کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عربی علم المثلث کے بغیر یہ علم پروان نہیں چڑھ سکتا تھا اس لیے علم المثلث کے ماہرین کی کتب کا ترجمہ کیا گیا۔

علمِ ہئیت کا عظیم ترین کام خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہد میں علماء کے ایک گروہ نے کیا تھا۔ اس گروہ نے عراق کے میدانوں میں موصل کے قریب سنجر کے مقام پر زمین کے قطر کی پیائش کی، اور عرض البلد کے ایک درجے کی قدر متعین ہوئی۔ اس دور میں یہ فاصلہ [۱۱۱،۸۱۴] کلومیٹر مقرر رہا تھا۔ (آج یہ فاصلہ [۱۱۰،۹۳۸] کلومیٹر ہے)۔ عرب ہئیت دانوں میں البطانی سب سے بڑے ہئیت داں ہیں۔ انہوں نے علم المثلث کو مدور اجسام (زمین وغیرہ) کی پیائش میں استعمال کیا اور نہایت اہم اضافے کیے۔ البطانی 'ممتحن' نامی نقشہ جات کے خالق ہیں۔ جن کی مدد سے سورج گہن اور چاند گہن کے اوقات کا تعین ہوتا تھا۔

ثابت بن قرہ : وہ ہئیت داں ہیں جنہوں نے سیاروں کی گردش کے مدار متعین کیے۔ اسی طرح سلطان جلال الدولہ ملک شاہ کے حکم پر عمر خیام نے شمسی سال کا کیلنڈر مدوّن کیا۔ یہ کیلنڈر حیرت انگیز حد تک موجودہ نافذ العمل گریگورین کیلنڈر سے مشابہت رکھتا ہے۔

علم بصریات : مسلمانوں نے اسے بڑی ترقی دی۔ قوسِ قزح کو روشنی اور پانی کے بخارات کی پیداوار ثابت کیا۔ سفید رنگ کو مختلف رنگوں کا مجموعہ قرار دیا۔ موجودہ دور میں اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ سفید رنگ مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے، ایک طشت استعمال کیا جاتا ہے جس پر ایک خاص تناسب سے سات مختلف رنگ کیے جاتے ہیں۔ جب اس طشت کو تیزی سے گردش دی جاتی ہے تو یہ طشت سفید نظر آنے لگتا ہے۔ یہ طشت نیوٹن کی تختی کہلاتا ہے اور اس تجربے کا سہرا نیوٹن کے سر باندھا جاتا ہے، جبکہ یہی تجربات نیوٹن سے صدیوں قبل قطب الدین الشیرازی اور کمال الدین الفارسی (متوفی ۱۳۲۰ھ) چکّی کے پاٹ کے ذریعے کر چکے تھے۔

ابن الہیثم : ابن الہیثم علمِ بصریات کے امام گزرے ہیں۔ انہوں نے اس بارے میں کہ ہم کیونکر دیکھتے ہیں اس نظریے کو صحیح قرار دیا کہ اشیاء سے روشنی منعکس ہو کر ہماری آنکھ تک پہنچتی ہے، جس کے باعث ہم دیکھتے ہیں۔ اپنے دلائل کے ثبوت میں انہوں نے کیمرے کی ابتدائی شکل ترتیب دی اور اپنے نظریات کے ثبوت بہم پہنچائے۔

ان ہی نظریات کی بنیاد پر روشنی کی رفتار کا تعیّن ہوا۔ انعکاسِ نور اور انعطافِ نور کے نظریات بھی ابن الہیثم نے دیے۔ عدسے (Lens) کی خصوصیات کا تعیّن بھی ابن الہیثم کا کارنامہ ہے۔ عدسوں کی مدد سے اشیاء کو بڑا دیکھنا انہوں نے ہی ممکن بنایا۔ انہی عدسوں کی بدولت دوربین اور خوردبین وجود میں آئیں۔ ابن الہیثم کی تصنیف 'کتاب المناظر' نہایت معرکۃ الآرا کتاب تھی جسے ۱۵۷۲ء میں (Thesarus Opticus) کے نام سے لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب نے عالمِ اسلام سے ہر شعبۂ علم وفکر کی بنیادیں مستعار لیں اور اس پر موجودہ تہذیب کی تعمیر کی۔ یہ کیفیت محض علوم تک محدود نہیں بلکہ صنعت وحرفت، تجارت و زراعت، تعمیر و تزئین، آرٹ اور لٹریچر ہر شعبے کو محیط کیے ہوئے ہے۔ وہ الفاظ جو آج بھی یورپ کی مختلف زبانوں میں پائے جاتے ہیں، اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ مطالب کے ساتھ ساتھ انکے الفاظ بھی اپنائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ کے الفاظ، ایڈمرل (امیر البحر)، آرسنل (دار الصنعہ)، میگزین (مخزن)، شوگر (شکّر)، موسیقی کے الفاظ، گٹار (ستار)، ریبک (Rebeck) (رباب)، تنبیر (طنبورہ)، لوت (Lute) (العود)، کیمیاء اور ہئیت کے الفاظ، صائفر (Cypher) (صفر)، ازیمتھ (Azimuth) (السمت)، زینتھ (Zenith) (زینت)، المبک (Alembic) (ترنبیق)، ازیور (Azure) (ازہر)، تجارت میں موہترہ (مختارہ)، فرانسیسی لفظ اوول (Oval) (حوالہ)، چیک (Check) (ثقہ، سک)، وغیرہ۔ یہ تو وہ الفاظ ہیں جو باقی ہیں۔ پتہ نہیں کتنے مسخ ہو کر مٹ گئے ہونگے یا مٹا دیے گئے ہونگے۔ تاہم یہ سب عالمِ اسلام کے احسانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

مغرب نے کلیسا کے دباؤ کے تحت اسلامی روح کو قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ اس نے اسلام سے صرف مادّی اثرات قبول کیے۔ یہی مادّی اثرات تھے جو بے روح علم بن کر مغرب کے ہاتھوں میں پہنچے، جسے انہوں نے عیسائی فضا میں پروان چڑھایا۔ وہ تناور درخت جس میں اسلامی روح نظر نہیں آتی، مسلمانوں کا لگایا ہوا پودا ہے، جو خود عالم اسلام میں نشو ونما نہ پاسکا اور ناموافق حالات میں ٹھٹھر کر رہ گیا۔

مستشرقین کی کاوشوں کا جائزہ

مستشرقین کو عہدِ وسطیٰ کے مغربی تصوّرِ اسلام سے ملی علمی میراث

عجب ستم ظریفی ہے کہ جس دور میں مغرب، عالمِ اسلام سے عہد آفریں علوم کا حصول کر رہا تھا، اسی دور میں اسلام سے نفرت اور عداوت کے شدید جذبات بھی بیدار کر رہا تھا۔ جسکے نتیجے میں پورا معاشرہ لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ قلم اور زبان دونوں کی تپش انتہا پر تھی۔ دنیا کی ہر واہی تباہی اسلام اور داعیِ اسلام ﷺ کے لیے وقف کی جا رہی تھی۔ اسلام میں کسی خوبی کا تصور تک [بزعمِ خویش] کسی ایماندار عیسائی کے لیے گناہ تھا۔ تحریر و تقریر کا یہ عقیدہ بن چکا تھا کہ "ایسے شخص کو برا کہنا ہی مناسب ہے جسکی برائیاں حدِّ بیان سے تجاوز کر جائیں"۔

(Attributed to Gilbert of Nogent, vide R.W.Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.31)

مغربی لٹریچر اور مسلمان : عیسائی اہلِ قلم نے مسلمانوں کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے، جنہیں اگر مسلمان کی صفت تسلیم کیا جا سکے تو اس کے معنیٰ ہی بدل جائیں۔ بہرحال یہ الفاظ اس دور کے معاشرے کی ذہنی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو بت پرست **(Pagan)**، ملحد **(Heathen)**، بے دین **(Infidels)**، فتنہ گر **(Miscreants)**، دشمنِ خدا، ہاجرین **(Hagarenes)**، قائین **(Canes)**، موابی، اور کہیں کہیں گاتھ اور وینڈال بھی تحریر کیا۔ (قائین اور موابی وہ اقوام ہیں جنکا ذکر تورات میں تحقیر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جبکہ گاتھ اور وینڈال مغرب پر حملہ آور جرمن اقوام کا نام ہے)۔ ایک لفظ 'سراسین' یا 'ساراسن' ایسا بھی ہے جو ہر دور میں مسلمانوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ طرفہ تماشا یہ کہ قدمائے مغرب یہ تصور کرتے تھے کہ یہ نام خود مسلمانوں نے اپنی نسلی کمتری پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنایا ہے۔ چنانچہ مورّخ میتھیؤ پیرس نے تحریر کیا "ساراسن بزعمِ خود یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ سارا (حضرت بی بی سائرہ) کی نسل سے ہیں، جبکہ انہیں ہاجرین یا اسمٰعیلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا"۔ **(Mathew Paris; English History, Vol.1, p.15, Bohns Ed., 1854)**۔

لیکن یہ نام اس قدر مقبول تھا کہ میتھیؤ پیرس کی تجویز بے اثر رہی۔ کثرتِ استعمال نے اس ایک لفظ کو نفرت اور ذلّت کی علامت بنا ڈالا۔ مستشرقین کے ہراول اسکالیجر **(Scaliger)** اور ہوتنگر **(Hothinger)** نے اس لفظ کی جانب خاصی توجہ دی، اور یہ نکتہ دریافت کیا کہ لفظ سراسین دراصل 'سارقین' ہے جس کے معنی چوروں کے ہیں اور جو عربی لفظ 'سرق' سے مشتق ہے۔ چونکہ یہ قوم چوروں اور ڈاکوؤں کی ہے، اس لیے سارقین کہلائی۔

(cf. Henry Stubb; Rise and Progress of Mohamatanism, p.114)۔ مستشرق پوکاک نے سراسین کو شرقیوں کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیا اور یہ بھی دعویٰ کیا کہ اسلام کا نام اسمٰعیل کی مناسبت سے رکھا گیا ہے، اور ہجرت کا تعلق حضرت ہاجرہ سے ہے۔

ترکوں کے حملوں نے مغرب کو لفظ ترک سے متنفر کیا۔ چودھویں صدی عیسوی سے لفظ ترک اور اسلام ایک دوسرے کے مترادف ہوگئے۔ اس لفظ پر بھی تحقیق ہوئی تو نتیجہ یہ نکالا گیا کہ یہ لفظ 'تارتارس' (Tartars) سے مشتق ہے۔ یہ وہ قوم ہے جو ایک جہنم تارترس (Tartarus) سے نکلی تھی۔ (cf. Buckles; Civilization in England, Vol.1, Chapter VI)۔ بعد کے دور میں عربوں کو یاجوج (Gog) اور ترکوں کو ماجوج (Magog) قرار دیا گیا۔

بت پرستی

مغربی چرچ میں یہ امر متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا تھا کہ مسلمان بت پرست تھے، اور اسلام بت پرستی کا مذہب تھا۔ ماہومت ایک بت تھا جس کی پرستش ہوا کرتی تھی۔ مورخ آرڈریکس (Ordericus) نے ایک مناجات ضبطِ تحریر کی جس میں فلسطینی خواتین یوں دعا کرتی نظر آتی ہیں:

"Praise be to Mahomet our God. Sound the glad timbrels and offer him victims that our terrible enemies may be overcome and perished."

(Ecclesiastical History of England and Harmony, Vol III, pp.175-176)

[سربلندی ہو ہمارے خداوند ماہومت کی: خوشی کی جھانجھریں بجاؤ اور اس کو قربانی پیش کرو تا کہ ہمارے ہولناک دشمن مغلوب اور ناپید ہو جائیں۔]

عوامی سطح پر سراسن بڑے جادوگر سمجھے جاتے تھے۔ مسلم عظام مثلاً الکندی، جابر، ثابت بن قرۃ، اور ابن سینا، یہاں تک کہ خود ختمی مرتبت ﷺ، (نعوذ باللہ) سب کے سب بڑے جادوگروں میں شمار کیے جاتے تھے۔

(cf. 'Wiliam of Malmsbury's Chronicles', pp.173-174, Bohn, Bohn's ed.: and Naudxus; History of Magic, Chapter XIV)

فرضی اصنام: ابتدائی صدیوں میں یہ عقیدہ عام تھا کہ مسلمان اپنے نبی کی پرستش کرتے ہیں۔ سدرن نے اوتو آف فریزنگ کے حوالے سے لکھا کہ "آرچ بشپ تھیمو کو مسلمانوں نے اس لیے قتل کر ڈالا کہ اس نے قاہرہ میں انکے بتوں کو توڑ ڈالا تھا"۔

(Southern R.W.; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.35)

نغماتِ رولینڈ (Songs of Roland) سے پتہ چلتا ہے کہ [ان کے خیال میں] عیسائیوں کی طرح مسلمانوں کے بھی اقانیمِ ثلاثہ تھے۔ ترویگان (Tervegan)، اپولو (Apollo) اور ماہومت (Mahomet)۔ (Phillips K. Hitti; Islam and the West, Reading No.16, p.150)۔ یہ یونانی علم الاصنام کا سیدھا سادا منطقی اندازِ فکر تھا کہ اگر عیسائیوں کے تین خدا ہو سکتے ہیں تو مسلمانوں کے اس سے کم نہیں ہونے چاہیے۔ پھر یہ تعداد بڑھتی چلی گئی۔ شائد اس لیے کہ صرف تین خداؤں کا وجود تو تثلیث ہو جاتا جو عین عیسائیت ہے، لہٰذا تکثیر ثابت کرنا ضروری تھا۔ مغربی لٹریچر میں کم و بیش تیس [۳۰] خداؤں کا ذکر ملتا ہے جنہیں سرا سن پوجتے تھے۔ انمیں لوسیفر (Lucifer)، جیوپیٹر، ڈیانا (Diana)، افلاطون (Plato)، دجّال (Anti-Christ) اور القرآن بھی شامل ہیں۔ انکے بیان کے مطابق، مسلمان اپنے ان خداؤں کی پرستش گا بجا کر کرتے تھے۔ ان کے آگے دھونی رمائی جاتی، قرنے پھونکے جاتے، رقص ہوتا، حیوانات کا خون پیا جاتا اور پھر دودھ اور شہد سے ضیافت ہوتی۔ (cf. B.P. Smith; Islam in English Literture, p.2)۔ اس اندازِ فکر کی بدولت ماہومت کے معنی ہی بت یا صنم کے ہو گئے۔ جس سے لفظ ممتری بنا جسکے معنی بت پرستی کے ہوئے۔

صنمِ اعظم : مغرب نے مسلمانوں کے لیے جو سب سے بڑا صنم تراشا اس کا نام ماہوئن یا ماہوئند (Mahoin/Mahoind) رکھا۔ تاریخِ چارلس اعظم کے صفحات اس فرضی بت کی تفصیلات سے مزیّن ہیں۔ صاحبِ تاریخ کے بقول اس بت کو خود موحدِ اعظم نے تراشا تھا، جسے شیطانوں کی مدد سے ناقابلِ شکست قوت کا مالک بنایا گیا تھا۔ جو شخص اسے تباہ کرنے کے لیے جاتا تھا خود تباہ ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پرندہ بھی اگر اس بت کے اوپر سے پرواز کرتا تو مردہ ہو کر گر پڑتا تھا۔ [cf. Bishop Turpin; 'History of Charles the Great, Chapter IV, pp.6-7, Translated by T. Rodd)]۔

فان سائبل (Von Sybel) نے اپنی تاریخ میں اس بت کے اور اسکی پرستش کے بارے میں مزید تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کے مطابق سمرقند میں خالص سونے کا یہ بت مقناطیسی کشش کے باعث ہوا میں معلق تھا۔ دور دراز سے سلاطین اس پر قربانی چڑھانے کے لیے حاضر ہوتے، اسکی پرستش کرتے اور دعائیں مانگتے۔ اس نے اس بت کی یاترا کا منظر کھینچتے ہوئے لکھا:

''اس کی خدمت میں بغداد سے سراسین کا پوپ حاضر ہوتا۔ پھر عرب حاضری دیتے۔ جو یسوع مسیح اور اسکے دوبارہ زندہ ہونے پر تبرا کرتے۔ کالے جادو کی ماہر جادوگرنیاں جلوس کی شکل میں شرکت کرتیں۔ انکے عقب میں مکہ کا حکمراں، ماہوئند کی مورتی یا شبیہ لیے آتا۔ یہ شبیہ اندر سے کھوکھلی ہوتی جس کے اندر ایک بدروح مقیم ہوتی۔ قوم پینم (Penim) اس کے آگے رقص کرتی۔ باجے گاجے کے شور میں یہ بت اپنی منزل تک پہنچایا جاتا۔ جہاں خلیفہ اس کے استقبال کا منتظر ہوتا۔ پھر اس کھوکھلی مورت کی بدروح یوں کلام کرتی کہ آسمان کی ملکیت عیسائیوں کے خدا کی ہے، لیکن زمین میری ہے۔ جسکے جواب میں مجمع نعرے لگاتا کہ ماہوئند نے کیا خوب فرمایا''۔

(cf. Von Sybil; History and Literature of the Crusades, edited by Lady Duff Gordon, pp.41-45)

یہ نام مغرب کے شعراء، افسانہ نویسوں اور ڈرامہ نویسوں کا مقبول ترین نام رہا ہے۔اس لفظ کو افراط وتفریط کے ذریعے کئی شکلیں دی گئیں، جیسے [Mahon, Mahoun, Mohown, Mahoune, (Maho, Macon]۔ نیز لفظ ماہومت، سے کئی الفاظ مشتق ہیں، مثلاً [Mammetry, Maumery, (Mahmet, Maumet]، وغیرہ۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ماہومت کے اٹھارہ [۱۸]، اور ماہوئند کے سترہ [۱۷] اور دیگر چھ [۶] تلفظ اور پائے جاتے ہیں۔اس طرح یہ نام اکتالیس [۴۱] مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔

ماہوئند کی قدامت : مغرب نے ماہوئند کو حق کا ازلی دشمن ثابت کرنے کے ملیے اسے نہ صرف مافوق الفطرت ہستی بنایا، بلکہ نامعلوم قدامت کا حامل بھی قرار دیا۔ ماہوئند ماقبلِ تاریخ بھی موجود تھا جس کی پرستش ہر دور کے بت پرستوں میں عام تھی۔ ہر وہ کردار جسے توریت یا انجیل نے مردود قرار دیا ہو، ماہوئند کا پرستار تھا۔ مغرب کے توسط سے ہمیں یہ اطلاع ملی کہ فرعون 'ماہومیتی' (Mahometan) تھا۔ جب وہ حضرت موسیٰ کا تعاقب کرتے ہوئے پانی میں گھر گیا تو اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ماہوئند سے رجوع کرے تاکہ وہ انہیں غرقابی سے نجات دلائے۔فرعون کا یہ تاریخی فرمان مغرب نے ان حروف میں محفوظ رکھا

"Hefe appe youre hartis ay to Mahomede, He will be nere us in oure node". (cf. York Plays; p.91, edited by Lucy T. Smith)

اسی طرح سیزر آگسٹس (پہلی صدی قبلِ مسیح) ماہوئند کی قسمیں کھاتا نظر آتا ہے۔

(cf. Tonnely; Plays IX, 'Ceaser Augustus', N.E. Text Society, 1897)

اس کی قسموں کا پسندیدہ انداز یوں ملتا ہے،

"I swear by Mahown", "I pray thee as thou lovest Mahown" or "By Mahownd's blood".

آگسٹس کی مبینہ آخر الذکر قسم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہوئند سے بھی مصلوبیت یا ایسی ہی کوئی روایت منسوب تھی جب ہی اس کے خون کی قسم کھائی جاتی تھی۔

یہودیہ کا حکمراں ہیرود (Herod) جس نے حضرت عیسیٰ کو انکے ایامِ طفلی میں قتل کرانے کی کوشش کی اور جس کے ہاتھ حضرت یحییٰ کے خون سے رنگین ہیں، ماہوئند کی شریعت کا پیروکار بتایا جاتا ہے۔ (cf. The Coventry Mystries, pp.20-91, Shok -SOC 1841)۔ وہ ایسے عیسائیوں کو جو ماہوئند کی شریعت کے منکر تھے، پھانسی دیکر، زندہ جلوا کر یا زندان میں اذیتیں دیکر نہایت محظوظ ہوتا تھا۔ ہیرود اور دیگر دشمنانِ مسیح کو ماہوئندی قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام عیسائیوں نے یہ گمان کیا کہ حضرت عیسیٰ کے قاتل مسلمان تھے۔دشمن خدا کی جو اصطلاح سراسین کے لیے استعمال ہوئی اسکی بنیاد غالبًا یہی دروغ بافی تھی۔

حضرت عیسیٰ چونکہ مغربی عقیدے کے مطابق خدا ہیں اور خدا کی مخالفت شیطان کے لیے وقف ہے لہٰذا ہر وہ طاقت جو حضرت عیسیٰ کے خلاف تصور کی گئی، اسے شیطانی طاقت سے تعبیر کیا گیا۔ ماہوئند اسی اعتبار سے

شیطان سے بھی بڑا طاغوت متصور رہوا۔ چنانچہ مغربی ڈراموں میں اس قسم کے مناظر بھی ملتے ہیں کہ شیاطین جہنم میں ماہوئند کی پناہ طلب کرتے ہیں۔

"All the develys, that ben in helle, shail pray to Mahound, as I telle".

(cf. 'The Coventry Mystries', Play XXII, p.207, 1841)

ماہوئند کی صفات : ماہوئند کی صرف ذات ہی نہیں بلکہ اس کی صفات کا تذکرہ بھی تفصیل سے پایا جاتا ہے۔ وہ عظیم ومقتدر الٰہ ہے جو اپنے پرستاروں کی نصرت کرتا ہے۔ زندگی میں انکی حفاظت کرتا اوران پر حکومت کرتا ہے۔ موت کے بعد اس کے پرستاروں کی روحیں اس کے قبضہ میں چلی جاتی ہیں۔ وہ الوہیتِ عیسیٰ سے حسد کرتا ہے اسی سبب سے اس کے پرستار عیسائیوں سے برسر جنگ رہتے ہیں، اور صلیب کے مقابلے میں اسکی شبیہ لیے پھرتے ہیں۔

(cf. The Siege of Milan and the Romance of Roland, p.11, N.E. Text Society, 1880)

پیٹر پلومین نے ماہون کو بے پناہ سفلی صفات کا مالک قرار دیا، تو ولیم ڈنبر (متوفی ۱۵۲۰ء) نے اسے جہنم کی نقاریب کا آقا بیان کیا ہے۔ (cf. G.E. von Grunebaum; Medieval Islam, p.48)۔

ماہوئند کے مغربی زائرین : ماہوئند کے بت کی زیارت کا شرف کئی عیسائیوں کو میسر آیا۔ مغرب کے کئی ہیرو ایسے بھی ہیں جنہیں اس عظیم بت کو پاش پاش کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ چارلس دی گریٹ نے اس بت کو محض اس مصلحت سے باقی رہنے دیا تا کہ اس کے تابع شیاطین انتقام نہ لیں۔ جبکہ رولینڈ، سر بے وس (Sir Bevis) وہ ہیرو ہے جو بت شکنی میں کامیاب ہوا۔ ایک تیسرا سورما رینالدو (Ronaldc of Montalbon) ان سب پر بازی لے گیا اور وہ خالص سونے کے اس بت کو صنم کدے سے لے اڑا۔ (cf. Wagner; Epics and Romances of Middle Ages)۔

بتانِ حرم : میتھیو پیرس نے اس بت کی مکہ میں موجودگی اور پھر تباہی کا ذکر کیا۔ بیل نے فادر موبیلاں کے حوالے سے اپنی ڈکشنری میں تحریر کیا کہ مسجدِ عمر میں سونے کا ایک عظیم بت پایا گیا ہے جسے چھ قوی افراد جنبش تک نہ دے سکے۔ (cf. 'Bayl's Dictionary; entry 'Mahomet')۔

اسلام میں بتوں کے وجود اور مسلمانوں کی بت پرستی کی گونج سولہویں صدی تک، اور ختمی مرسلات ﷺ کی الوہیت کا تصور مغرب میں سترہویں صدی عیسوی کے نصف تک پایا جاتا ہے۔

اسلام دشمنی کے جواز : مغربی عیسائیوں نے ہر دور میں اسلام دشمنی کا کوئی نہ کوئی جواز پیدا کیا، جس میں مذہبی تعصب بہرطور کارفرما ہوتا تھا۔ ہر [بزعمِ خویش] ایماندار عیسائی کسی نہ کسی جواز کا سہارا لیکر مسلمانوں سے نبرد آزما ہونا اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتا تھا۔ کبھی خداوند یسوع مسیح کی مقدس سرزمین کو بے دینوں کے تسلّط سے آزاد کرانے کے لیے، تو کبھی کسی مقدس سینٹ یا فرشتے کی دعوتِ جنگ پر لبیک کہنے کے لیے اندھا دھند ٹوٹ پڑتا۔ ایک اور وجہِ جنگ یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کے خون کا انتقام ہر عیسائی پر فرض تھا۔

چونکہ خداوند کے فرزند یسوع مسیح کو ان ہی سراسین کے اسلاف نے مصلوب کیا تھا، اور خداوند کے خون کا نہ کوئی حق تھا نہ جواز، اس لیے عیسائی، سراسین اور ان کے ہر فرقے کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ (Chronicles; p.403, Globe Edition, 1899)۔ ایک اور وجہِ عناد یہ بھی تھی کہ سراسین مقدس بپتسمے اور مریم عذرا پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

مسلمانوں سے جنگ اور انکی تباہی، عہدِ وسطیٰ کے عیسائی کا مذہبی نصب العین بن گیا تھا۔ اس میں شدّت پیدا کرنے کے لیے مذہبی حلقے اپنے عوام کو یہ باور کراتے تھے کہ ان جنگوں میں خداوند، اس کے فرشتے، کنواری مریم اور انکی مقرّب خواتین، اور مقدس اولیاء سب کے سب حصّہ لیتے تھے۔

(cf. C.H.Milis; History of Crusades, Chapter II, p.50)

ان جنگوں میں فتح، خداوند کی عظمت کا اظہار، اور شکست عیسائیوں کی شامتِ اعمال سمجھی جاتی تھی۔ جب مسلمانوں کی تباہی عالمِ بالا کا مقصد تھی تو بھلا عام عیسائی اس کارِ ثواب سے کیسے محروم رہ سکتا تھا۔

تباہی کی توقعات : عیسائی دنیا کا ہر دور میں یہ اعتقاد رہا کہ جلد یا بدیر اسلام کی تباہی یقینی ہے۔ فرزندانِ کلیسا نے چونکہ اسلام کو محض کفر و الحاد کا درجہ دے رکھا تھا، اس لیے اس کی تباہی نیک فال تصوّر کی جاتی تھی۔ یہ آخر کب فنا ہوگا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جو رہ رہ کر اٹھتا تھا، اور جس کے جواب میں ہر دور میں ایک نئی تاریخ متعین کرنا پڑتی تھی۔

(For predictions about destruction of Islam see:

Norman Daniel; The Arabs and Medieval Europe, pp. 108, 158, 208-209:

R.W.Southern; 'Western Views of Islam in the Middle Ages',pp.15, 24,39:

Roger of Windove; Flowers of History, Vol II, p.515)

کبھی یہ مدّت انجیل اور تورات کے مبہم الفاظ کو اعداد و شمار میں منتقل کر کے ۳-۱/۲ جگ یا (۷۰ × ۳،۵) یعنی ۲۴۵ سال مقرر کی گئی۔ کبھی علمِ نجوم کی مدد سے ۱۲۲۹ء اور ۱۲۳۶ء کے درمیان تباہی کا یقین دلایا گیا۔ مکّے اور مدینے کے چراغ گل ہونے کے خواب تاریخ کے صفحات کی زینت بنے۔ آئے دن عیسائیوں کے لیے خوشخبری، عجیب وغریب خبر، معجز خبر، رویاء اور پیشنگوئیوں کے عنوان سے چھوٹے موٹے پمفلٹ جاری ہوتے رہتے، جن میں کسی سیاح، منجّم یا سفیر کے توسّط سے یہ دل خوش کن اطلاع دی جاتی کہ بس اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اسلام مٹ جائے گا۔ اس قسم کی بہت سی تحریریں اب بھی محفوظ ہیں۔ ان میں کتابچے [Strange and Miraculous News from Turke; London 1642) کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

مریم عذرا اور مدینے کے چراغ : اس کتابچے میں ایک معجزے کا ذکر ہے جس کے مطابق شدید طوفان کے بعد مدینے کے افق پر آدھی رات کو عربی رسم الخط میں ایک تحریر نمودار ہوئی کہ 'آخر کذب پر ایمان کب تک!'۔ پھر اسی شب دو تین بجے کے قریب ایک خاتون سفید پوشاک میں ملبوس نمودار ہوئیں۔ سورج انکا ہالہ

کیے ہوئے تھا۔ انکے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ ان کے مدِّ مقابل ترکوں، ایرانیوں، عربوں اور دیگر مسلم اقوام کی افواج تھیں۔ یہ افواج اس خاتون پر حملہ آور ہوئیں۔ خاتون اپنی جگہ استقامت سے کھڑی رہیں۔ انہوں نے صرف کتاب کھولی ہی تھی کہ تمام افواج تحلیل ہو گئیں۔ اور اسی لمحے روضے کے تمام چراغ بھی گل ہو گئے۔ یہ منظر صبح کے آثار تک قائم رہا اور عام طور پر دیکھنے والوں کا تاثر یہ تھا کہ انکا مذہب جھوٹا اور ان کا.... جعلی ہے۔

سترہویں صدی میں اس قبیل کی بے شمار تحریریں پائی جاتی ہیں، جن میں مشترکہ طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ عنقریب دینِ اسلام پر مذہبِ عیسائیت کا غلبہ ہو جائے گا۔

(For further details, the following may be referred:

True News from Turkey, London 1664:

Prophecies of Christopher Kotterus, 2nd Ed., Hazlit 1664:

Great and Wonderful Prophecies', Duke Lane, Hazlit, 1684:

The Prophecies of a Turk', London, 1687, Guild Hall Library:

The Great Vision Sun in Turkey Land, 1702, Bib-Coll.,W.C. Hazlit)

فرضی مناظرے: عہدِ وسطیٰ کی تحریروں میں فرضی مناظرے کثرت سے ملتے ہیں۔ جن میں اہم ترین مباحث توحید و تثلیث کا تقابل اور تثلیث کی فضیلت، قرآن پر بائبل کی فضیلت، اور سیرت پر تنقید یں ہیں۔ ان مناظروں کا اختتام ہمیشہ مسلمان فریق کی ندامت اور پشیمانی پر ہوتا ہے۔

(cf. Mathew Paris; English History Vol.II, p.501:

and Turpin; History of Charles the Great, Ch. XXII, pp. 27-30)

اس قسم کی جانبدار اور متعصبانہ تحریروں کی بدترین مثالیں الکندی سے منسوب رسالے (Risalat al-Kindi, Cairo 1912) اور ولیم بیڈول (William Bedwell) کی ترجمہ کردہ کتاب (Mohammedis Imposture) ہیں۔ ان تمام فرضی مناظروں میں سوائے یکطرفہ جذباتیت کے کسی قسم کی سنجیدگی یا افہام و تفہیم کا وجود نہیں پایا جاتا۔

لفظی مغالطے: مغربی لٹریچر میں لفظی ہیر پھیر اور مغالطوں سے بھی بھرپور کام لیا گیا ہے۔ فرضی اصنام کے نام ماہوئن، ماہوئند، مامیت وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ اسپین کے نامور نیشنل ترقم الویرو نے اللہُ اکبر کے جو معنی پیدا کیے وہ اس کی فطانت کا شاہکار ہیں۔ اس کے مطابق زہرہ (وینس) کو عرب 'کبَر' یا 'کُبر' کہتے تھے۔ اسی ستارے کی تکریم میں ہر صبح عبادت گاہ سے 'اللہُ اکبر' کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔

(cf. Norman Daniel; The Arabs and Medieval Europe, pp.41-42)

اس نے اللہُ اکبر کا املا ''اللہ ھو کبر'' (Allaho Howa Kabar) کیا اور اس املے کی مدد سے یہ معنی پیدا کیے کہ اللہ ہی کبر ہے۔ منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کوا کب پرستی کا نام ہے۔ مستشرقین نے بھی لفظی کاوشوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ انیسویں صدی میں لفظ 'حنیف' پر اور 'مسلم' پر کافی زور و شور سے بحث ہوتی رہی ہے۔

اسلام اور تلوار: اسلام مٹنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ عیسائی ذہن پر یہ سوال مسلط رہتا تھا کہ آخر حق پر باطل کیوں اور کیسے مسلط ہے۔ اس کے متعدد جوابات دیے گئے۔ مثلاً عیسائیوں کی شامتِ اعمال کے سبب، خداوند نے عربوں اور ترکوں کو اپنے قہر کا مظہر بنایا۔ پھر یہ کہ جادو کے زور پر مسلمان ساحروں نے اقصائے عالم پر قبضہ کر رکھا ہے۔ نیز یہ کہ کائنات کی تمام سفلی قوتیں اسلام کی مددگار ہیں۔

جب ان جوابات سے تسلی نہیں ہوئی تو یہ نظریہ عام کیا گیا کہ اسلام کو تلوار کے زور پر رائج کیا گیا تھا اور اسے لوگوں پر مسلط رکھنے کے لیے ہر وقت ان کے سروں پر تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ وینکن دی وارد (Wynkyn de Worde) نے ۱۵۱۵ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ،

"جب مسلمانوں کا مبلغ اپنے جھوٹے عقائد کی تبلیغ کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو جب تک اس کا خطبہ جاری رہتا ہے اس کے ہاتھ میں ایک ننگی تلوار رہتی ہے۔ یا پھر یہ تلوار کسی ایسے بلند مقام پر رکھی رہتی ہے کہ سب کی نظروں میں رہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص لرزاں و ترساں رہے"۔ [Quoted by Henry Stubb; Rise and Progress of Mohometanism, Ch.VIII, p.158]۔

بعد کے دور میں مستشرقین نے اس نظریہ پر کافی زورِ قلم صرف کیا۔

حصولِ قرآن: حاصلِ وحی اور مہبطِ وحی کے بارے میں گمراہ کرنے کے لیے جس قدر شرمناک طریقے اختیار کیے گئے ہیں، انہیں دہرانا بھی قلم کو آلودہ کرنا ہے۔ صداقت و روحانیت کے ان سرچشموں سے رکاکت اور جعل و فریب کو صرف اس لیے منسوب کیا گیا کہ مغرب کا ذہن اس طرف راغب نہ ہو سکے۔ آندریو بوردے (Andrew Borde) نے اپنی کتاب (Introduction to knowledge) میں اپنے ناظرین کے لیے ایک حیرت انگیز کہانی پیش کی، جس میں اس نے لکھا،

"اس نبی نے اس مقصد کے لیے ایک اونٹ پالا تھا۔ اس اونٹ کی گردن سے ایک کتاب باندھی گئی اور اسے ایک نواحی جنگل میں پہنچا دیا گیا۔ جب لوگ ایک بڑے معجزے کی توقع میں جمع ہو گئے تو اس اونٹ کو چھوڑ دیا گیا۔ یہ اونٹ سیدھا اس نبی کے پاس پہنچا اور دوزانو ہو گیا۔ اس نبی نے اونٹ کی گردن سے کتاب کھولی، چند اسباق پڑھے اور پھر استعجاب کے ساتھ کہا، یہ اونٹ تو ہمارے لیے ہمارا قانون (شریعت) لایا ہے تاکہ ہم اس پر کاربند ہوں"۔ (حوالہ بالا، صفحہ-۲۲۸)

اسی ڈرامے کو ہلدے برت (طورس کے اسقفِ اعظم متوفی ۱۱۲۳ء) نے بھی دہرایا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں ہرکارہ اونٹ کی جگہ بیل ہے۔ ایک تیسری کہانی میں اونٹ اور بیل کا کردار گدھے سے ادا کرایا گیا۔

وحی کا تمسخر اڑانے کے لیے طرح طرح کی کہانیاں بیان کی گئیں۔ کبوتر کا افسانہ اور بیماری کی داستانیں اسی تمسخر کی کڑیاں ہیں۔ جب وحی کا وجود ہی تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس وحی پر مبنی کتاب کیسے صحیفۂ آسمانی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا الکتاب کسی نہ کسی نے مدوّن کی ہوگی۔ اس کی تدوین کا سہرا عیسائی قسیس سرجیس کے سر باندھا گیا، جو کلیسا سے منحرف ہو گیا تھا، اور انتقاماً اس نے اپنی تحریر کے بل بوتے پر ایک رقیب مذہب پیدا کر دیا۔ یہ اندازِ نظر

مستشرقین میں بھی کسی نہ کسی رنگ میں پایا جاتا ہے۔قرآن کے دنیاوی ماخذ کی تلاش، اسے انجیل کا چربہ قرار دینا اور اسلام کو عیسائیت سے متاثر ثابت کرنے کی کوششیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

حرمتوں کے فسانے

مغربی معاشرے میں شراب اور خنزیر جائز تھے۔جبکہ اسلام نے ان دونوں اشیاء کو حرام قرار دیا ہے۔فطرتاً مغربی ذہن میں اس کے سبب کے بارے میں تجسّس پیدا ہوا۔جب ان کے ذہن رسا کو ناکامی ہوئی تو چند قصّے کہانیاں گھڑ ڈالیں۔یہ من گھڑت کہانیاں اس قدر مستند تصور کی گئیں کہ تاریخ کے صفحات کی زینت بن گئیں۔

حرمتِ خنزیر : ملکہ الزبتھ کے دور کے ایک عیسائی مبلّغ ہنری اسمتھ کے حوالے سے راجر ونڈ دور نے حرمتِ خنزیر کے بارے میں تحریر کیا، (نعوذ باللہ)

''ایک شام...... اپنے محل میں شراب سے مخمور بیٹھا تھا کہ اسے اندازہ ہوا کہ اس پر اسکی بیماری کا دورہ پڑنے والا ہے، لہٰذا تیزی سے اٹھ کر روانہ ہوا۔بہانہ یہ بنایا کہ اسے فرشتے سے گفتگو کرنے کے لیے بلایا جا رہا ہے، لہٰذا کوئی اس کے پیچھے نہ آئے مبادا وہ فرشتے کو دیکھتے ہی ختم ہو جائے۔اس خیال سے کہ کہیں گرنے سے چوٹ نہ آ جائے وہ گوبر کے ایک ڈھیر پر چڑھ کر بیٹھ رہا، جہاں سے وہ اس حالت میں لڑھکتا گرا کہ دانت پر دانت جمے ہوئے تھے اور منہ سے کف جاری تھا۔یہ دیکھ کر وہاں پر موجود بہت سارے خنزیر دوڑ کر حملہ آور ہوئے، اور تکّہ بوٹی کر کے اسکا خاتمہ کر ڈالا۔اسکی بیوی اور اہلِ خانہ نے جو شور سنا تو دوڑے اور اپنے آقا کی لاش اس حالت میں پائی کہ اسکا بیشتر حصہ کھایا جا چکا تھا۔بچے کھچے اعضاء کو انہوں نے یکجا کر کے ایک تابوت میں بند کیا، جو سونے چاندی سے گھڑا گیا تھا اور یہ اعلان کیا کہ اللہ کے فرشتوں نے اسکا بدن مشکل سے ہی زمین پر چھوڑا ہے، اور اسکی روح کو خوشی خوشی آسمانی مسرتوں سے ہمکنار کر دیا گیا ہے''۔

(Roger of Windover; Flowers of History, Vol.1, p.74)

ایک دوسرے محترم پوپ نے حرمتِ خنزیر کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے لکھا،

''دیکھو کہ...... نے انہیں خنزیر کے استعمال سے آخر منع کیوں کیا ہے۔وجہ یہ ہے کہ ایک دن اس نے زمین میں پانی کے کچھ برتن پوشیدہ کیے، تاکہ موسیٰ کے معجزوں جیسا کوئی معجزہ دکھا سکے اور یہ باور کرا سکے کہ وہ بہت بڑا نبی تھا۔تو ہوا یوں کہ اس جانور نے جو زمین کھودا ہی کرتا ہے، ساری کرامت پر پانی پھیر دیا''۔

(Father Jerom Dandini: A Voyage to Mount Libanes, Ch. VIII)

حرمتِ سگ : ایولوگس (متوفّی ۸۵۹ء) نے لکھا، (نعوذ باللہ)

''جب اسے احساس ہوا کہ موت قریب ہے تو اس نے پیشینگوئی کی کہ اس کی موت کے تیسرے دن فرشتے آ کر اسکا جسد آسمان پر لے جائیں گے۔جب اسکی روح واصلِ جہنم ہوگئی تو اسکے معتقدین اسکی لاش کے پاس بیٹھ کر

انتظار کرنے لگے لیکن جب کوئی فرشتہ نہ آیا تو معتقدین نے یہ سمجھا کہ شائد انکی موجودگی آسمانی مہمانوں کی آمد میں مخل ہے۔ لہٰذا لاش کے (جو بگڑ کر متعفن ہوگئی تھی) پاس سے ہٹ گئے۔ اس کے بعد آسمانی فرشتوں کی جگہ کتے پہنچے، جنہوں نے لاش کو چیرنا پھاڑنا شروع کر دیا۔ جو کچھ باقی بچا اسے مسلمانوں نے دفن کر دیا۔ اسی حرکت کے باعث مسلمان کتوں سے انتقام لینے کے لیے ہر سال انکا قتلِ عام کرتے ہیں۔ اور یہ ہیں ...... کے معجزات''۔

(Quoted by R.Dozy; Spanish Islam, pp.79-80, translated by F.G.S.Stokes)

حرمتِ شراب : جان مانڈیول نے حرمتِ شراب کی تاویل میں مندرجہ بالا انداز کی ہی ایک اور کہانی پیش کی۔ اس نے لکھا:

''اور ...... کو ایک نیک راہب سے محبت تھی۔ یہ راہب ایک صحرا میں رہتا تھا۔ اکثر و بیشتر ...... اپنے لوگوں کے ساتھ اس راہب کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہ اور اس کے آدمی رات رات بھر شوق سے اس کی باتیں سنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس کے آدمیوں نے سوچا کہ اس راہب کو قتل کر ڈالیں۔ ایک رات ایسا ہوا کہ ...... نے عمدہ شراب پی اور سو گیا۔ اس کے آدمیوں نے ...... کی تلوار لی اور اس راہب کو قتل کر کے خون آلودہ تلوار میان میں واپس رکھ دی۔ صبح جب راہب کو مردہ پایا تو ...... غم و غصہ میں اپنے آدمیوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن سب کے سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ خود اسی نے تو راہب کو نشے کے عالم میں قتل کیا تھا۔ اور ثبوت کے طور پر اسکی خون آلود تلوار دکھلائی۔ تب اس نے شراب اور اسکے پینے والوں پر لعنت بھیجی''۔

(John Maundeville, 'Travels', Chapter XII, pp.140-141)

فادر جیروم نے حرمتِ شراب کی ایک اور وجہ تحریر کی۔ اسکے مطابق،

''...... ایک مرتبہ ایک گاؤں میں داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ اسکے کئی سپاہی بھی تھے۔ انہوں نے شراب پینے کے لیے رقم طلب کی، لیکن اس نے انکار کیا۔ کیونکہ شراب پی کر وہ اسے مجبور کرتے کہ گاؤں کی عورتوں کو تصرّف میں لانے کی اجازت بھی دے۔ چونکہ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا یا کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے شراب کو ہی حرام قرار دے دیا''۔ (Father Jerom Dandini; A Voyage to Mount Libanes, Ch. VIII)۔

کاش ان خرافات کو نظر انداز کیا جا سکتا لیکن معاملے کی نوعیت اور اسکی سنگینی کا تقاضہ یہ ہے کہ مغربی کارنامے بلا کم و کاست نقل کیے جائیں۔

داعیِ اسلام ﷺ

کائنات کی کوئی اور شخصیت اس قدر موضوعِ گفتگو نہیں بنی، جس قدر کہ سرورِ کائنات ﷺ کی ہمہ پہلو شخصیت۔ عالمِ اسلام میں قلم انکے عشق و مستی میں سرشار تو عالمِ عیسائیت کا قلم بغض و عناد میں ڈوبا ہوا۔ ابوجہل و ابولہب نے اگر انہیں شاعر و ساحر و مجنون و مفتون قرار دیا تو صادق و امین و حلیم و کریم بھی تسلیم کرتے تھے۔

لیکن مغرب کی نظر میں عرب جاہلیہ کے تعاون سے بھی عاری تھیں۔ انہیں سوائے قبح کے کوئی حسن نظر ہی نہیں آیا۔ اپنی کورچشمی کو وہ انکی شخصیت کا عکس سمجھے۔ اپنی ذہنی قبح کو الفاظ میں ڈھالا اور اسے سیرت نگاری تصور کرتے رہے۔

سیاسی مناقشت کو مذہبی مسئلہ بنانے کے باعث سیاسی اختلافات نے مذہبی رنگ اختیار کیا۔ سیاسی دشمنی مذاہب کی دشمنی بن گئی۔ اسلام کو عیسائیت کا دشمن اور داعی اسلام کو بانی عیسائیت کا مخالف قرار دیا گیا۔ عیسائیت کی بقا کے لیے اسلام کو نیست و نابود کرنا ضروری ٹھہرا۔ کرائسٹ کی عظمت کے اظہار کے لیے مفروضہ 'دشمنِ عیسیٰ' پر تبرا لازمی ہوا۔ جب بنیاد ہی غلط مفروضوں پر پڑی تو نتائج کا کریہہ ہونا لازمی تھا۔

عیسائیت کے بانی کو اگر الٰہ کا درجہ حاصل تھا تو داعی اسلام ﷺ کو بھی مدعی الوہیت تصور کیا گیا۔ اگر انکا خدا حقیقی تھا تو اسکے مقابلے میں خدائی کا دعویٰ کرنے والا صرف جھوٹا خدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ماہوئند، زمان و مکاں سے آزاد، ابلیس سے بھی بڑا طاغوت نظر آتا ہے۔

مرور زمانہ کے بعد جب مغرب کے علم میں یہ بات آئی کہ داعی اسلام الٰہ نہیں، صرف عبدہ ورسولہ ہیں، تو انہوں نے اپنی تصحیح کی۔ مافوق البشر ماہوئند پس پردہ چلا گیا، اور اب جو کردار انکے اسٹیج پر لایا گیا وہ گوشت پوست کا ماہوئند تھا۔ جس کی پوری زندگی از مہد تا لحد سرتا سر فریب تھی۔

سلسلۂ نسب: مورخ میتھیو پیرس نے ایک لمبا چوڑا سلسلۂ نسب فراہم کیا ہے اس کی ابتدا حضرت اسمٰعیل سے کی۔ اٹھائیسویں پشت میں حضور ﷺ کے ایک ہمنام کا ذکر کیا، اور پھر انکی اولاد میں ترتیب وار عبدِ شمس، ہومنلا، ایبلاز، اکفان، مورکن، عبدالملب، عبدالرحمٰن (یہی عبدِ مینف بھی کہلاتے تھے) کا تذکرہ کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ آخرالذکر حضور ﷺ کے والد تھے۔ (Mathew Paris; English History, pp.14,28)۔

والدین: پیٹر ہیلن ایک سیاح گزرا ہے جس نے اپنے ہموطنوں کی ضیافتِ طبع کے لیے حسب ذیل ہرزہ سرائی کی ہے: (نعوذ باللہ)

''یہ...... اطرارپ (Itrarip) میں ۵۷۱ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کٹر بت پرست اور والدہ توہم پرست یہودن تھی۔ ایسے معزز جوڑے سے ایسا ہی خدا پرست شیطان پیدا ہو سکتا تھا، جیسا کہ......''۔

(Peter Heylyn; A Little Description of the Great World, p.606)۔

حلیہ: پیٹر مذکور نے اپنی ذہنی پستی کو ان الفاظ کا سہارا دیا: (عیاذاً باللہ)

''...... پستہ قد، گنجے سر، بد ہیئت تھے۔ بدکرداروں میں پائی جانے والی تمام شیطانی صفات کے حامل، انتہائی چور پن اور بیحد عیاش''۔ (حوالہ بالا)

مولد: پیٹر مذکور نے اطرارپ (غالباً یثرب) کو مولد قرار دیا تو راجر وِنڈ وور نے انہیں صوبہ خراسان کا باشندہ بتلایا۔ (cf. Roger Wendover; Flowers of History, Vol. 1, p. 73)۔ رومن دی ماہومت کے مصنف نے انہیں ایدوم کے ایک کسان کا فرزند تحریر کیا۔ [Quoted by Henry Stubb; Rise and)

(Progress of Mahomatenism, p.220] بہت سے دیگر وقائع نگاروں نے انہیں شامی اور رومی تصور کیا۔

راہب کی پیشینگوئی : رومن دی ماہومت کے مطابق 'عبد مبنف' کی ملاقات ایک راہب سے ہوئی جس نے یہ پیشینگوئی کی کہ ماہومت کے باعث شریعتِ عیسوی سخت بحران میں مبتلا ہوگی۔ اور ایک جھوٹی شریعت انکے توسّط سے پروان چڑھے گی۔ (حوالہ بالا)۔

مشاغل : ابتدائی تحریروں میں انہیں دربارِ روم سے منسلک بیان کیا گیا ہے۔ وہ عیسائی تھے جنہیں پوپ بننے کی آرزو تھی۔ (cf. Phillips K.Hitti; Islam and the West, p.52)۔ جب یہ آرزو پوری نہیں ہوئی تو شام کی جانب رخ کیا۔ اس پر کسی نہ کسی طرح قبضہ کیا اور ایک نیا مذہب رائج کیا۔

فوجی ملازمت : ہنری اسٹب سترہویں صدی کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اس دور میں اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت بے باکی سے مغربی اندازِ نگارش کی مذمت کی۔ ممکنہ حد تک ان الزامات کی تردید کی جو ان کے عہد میں داعیِ اسلام سے منسوب کیے جاتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے حضور ﷺ کے مشاغل میں رومن فوج کی ملازمت کو شریک کیا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جو واقعات انہوں نے بیان کیے ہیں، وہ تاریخی حقیقت سمجھ کر بیان کیے ہیں، جنہیں قبولیت عامہ حاصل تھی۔ موصوف نے لکھا:

''ان کے فوجی ذوق وصلاحیت نے انہیں نچلا نہیں بیٹھنے دیا۔ چونکہ ان کے ہم وطنوں میں بہت سے لوگ عیسائی فوج میں ملازمت کرتے تھے، وہ بھی اپنے چچا ابوبکر کی ماتحتی میں، جو عیسائی فوج کی بریگیڈ کے کمانڈر تھے، فوج میں شامل ہوگئے۔ یہیں انہوں نے فوجی اور انتظامی حکمتِ عملی سیکھی، اور عیسائیوں کے افتراق اور کمزوریوں کا پتہ چلایا''۔

(Henry Stubb; Rise and Progress of Mahomatenism, p. 218)

سفرِ اسپین : اسٹب نے حضور ﷺ کی سیاحت کی تفصیلات بھی تحریر کی ہیں۔ ان کے بموجب انہوں نے نہ صرف اسکندریہ اور مصر کے دیگر حصّوں کی سیاحت فرمائی بلکہ افریقہ کے دور دراز علاقوں کا بھی سفر کیا۔ جہاں سے گزر کر ۶۰۵ء میں اسپین پہنچے۔ وہاں ملک میں شدید بے چینی پائی۔ وہاں کے حالات درست کرنے کے لیے اپنے عقائد کی ترویج کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سینٹ اسی دور (Saint Isidore) کی روم سے واپسی کی بدولت مراجعت کرنی پڑی۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۵)

شادی : حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شادی کی مختلف روایات ملتی ہیں۔

رومن دی ماہومت میں انہیں اچھا قسّیس (Good Clerk) بتایا گیا ہے، اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ جس رومن امیر کے یہاں ملازم تھے، اس کی موت کے بعد اس کی بیوہ کو ورغلا کر اس سے شادی کی۔ شادی کے دن مرگی کا دورہ پڑا جسے نزولِ وحی کا نام دیا گیا۔ کتاب کے مطابق وہ مکّہ کی حوالی میں اپنے حشم و خدم کے ساتھ رہائش پذیر تھے اور ان کے قبضے میں منتخب جنگلات، چراگاہیں، باغات اور دریا تھے۔ کثرتِ ازدواج، ختنے کا حکم،

اور رسومِ عیسائیت کی مخالفت انکی تعلیمات کا لبّ لباب تھا۔ انتقال کے بعد انکا جسم ایک دھاتی تابوت میں رکھ کر ہوا میں معلّق کر دیا گیا۔

(cf. Roman the Mahomet, Edited by Reinand; Paris, 1831, quoted by Henry Stubb; Rise and Progress of Mahomatenism, p.220)

مورّخ راجر وِنڈ و-ور کے مطابق خراسان کی ملکہ قدیسان (Qodison) تھیں۔ سراسین کے نبیِ کاذب نے ان کی ملکہ کو رجھایا اور مسیحا ہونے کا دعویٰ کیا۔ ملکہ نے اس دعوے سے دھوکہ کھا کر شادی کر لی۔ اس طرح یہود اور سراسین کے گروہ کے گرد جمع ہو گئے۔ اس مورّخ نے صرع کی بے بنیاد کہانی اور وصال کے شرمناک افسانے کو بھی بیان کر کے اپنے اعمال سیاہ کیے ہیں۔

(Roger of Wendover; Flowers of History, Vol.1, p.173)

حصولِ اقتدار : بارہویں صدی عیسوی تک مغرب کے لٹریچر میں داعیِ اسلام ﷺ کو عیسائی تحریر کیا جاتا رہا، جنہوں نے چرچ سے روکش ہو کر ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ ہلدے برت (Hildebert) نے بھی انہیں عیسائی بیان کیا اور تحریر کیا:

''وہ یروشلم کا اسقف بننا چاہتا تھا جسکے باعث اس دور کے شہنشاہ نے ملک بدر کیا۔ تب وہ مجوسی لیبیا چلا گیا، جہاں وہ ایک درباری کے گھر مقیم ہوا، جسے اس نے قتل کر ڈالا تا کہ اس کی جگہ خود لے لے۔ لیبیا کے بادشاہ کی موت کے بعد اس نے اعلان کیا کہ جو شخص ایک خاص بیل کو رام کر لے گا وہ ملک کا بادشاہ ہوگا۔ اس سفید بیل کو خفیہ طور پر خود اس نے سدھایا تھا اور اس طرح وہ بادشاہ بن بیٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اسے خدا مان لیں، لیکن خدا نے اسے مرگی کی سزا دی۔ وہ بڑی دردناک موت مرا۔ خنزیروں نے اسے بھنبھوڑا، اور اسکا تابوت ہوا میں معلّق ہوا''۔

(quoted by Henry Stubb; Rise and Progress of Mahomatenism, p.219)

بیل، اونٹ یا گدھا، مرگی، معلّق تابوت، دردناک موت کی کہانیاں مغربی لٹریچر میں تواتر کے ساتھ ملتی ہیں۔ عیسائی ذہن کی ان خرافات میں، جنکا حقائق سے کوئی واسطہ ہی نہیں، جسقدر مکروہات ہو سکتی ہیں، سب جمع کر دی گئی ہیں۔ ان کے اہم اجزاء، مثلاً چرچ کے عہدوں کی طلب، چرچ سے اخراج، بدعت، فریب، خونِ ناحق، بیماری، غاصبانہ قبضہ وغیرہ، سب کے سب عیسائی روایتوں کے عناصر ہیں۔

عیسائیت کے نزدیک کوڑھ، برص اور مرگی ایسے امراض تھے جو آسمانی سزا کے طور پر بدکردار افراد پر مسلّط کیے جاتے تھے۔ ایسے افراد کو معاشرے کا ناسور سمجھ کر شہر سے باہر محصور کر دیا جاتا تھا۔

یونانی دیومالا میں ایک بدکردار شخص کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ جس کے مرنے کے بعد زمین اور آسمان دونوں نے اسکی لاش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اسکا تابوت ہوا میں معلّق ہو گیا تھا۔ معلّق تابوت بدکرداری کی علامت بن گیا۔ دھوکے اور فریب کو مقدّس ہستیوں سے منسوب کرنا بھی کوئی نئی بات نہیں۔ تورات کی کتابِ پیدائش، باب بیس [۲۰]، کے مطابق امِ اسرائیل ربقہ نے سازش کر کے

حضرت اسحٰقؑ سے حضرت یعقوبؑ کو برکت (نبوت) دلوائی، جو وہ اپنے بڑے فرزند عیسو کو دینا چاہتے تھے۔ اسی طرح باب انتیس [۲۹] میں حضرت یعقوب اور انکے سسرالی رشتہ دار ایک دوسرے کے ساتھ بدمعاملگی میں ملوث کیے گئے۔ کتاب خروج باب بارہ [۱۲] کے مطابق، خروج سے پہلے حضرت موسیٰؑ کے حکم پر بنی اسرائیل نے مصریوں سے انکے زیورات اور ملبوسات مستعار لیے، اور پھر وہ یہ مال اپنے ساتھ لیکر خروج کر گئے۔ اس طرح انہوں نے مصریوں کو دھوکا دیکر لوٹا۔ غرضیکہ کہ مکر وفریب، دھوکا اور جعل جب خود اپنے مقدس انبیاء سے منسوب کیا جا سکتا ہے تو غیر اس سے کب محفوظ رہ سکتے تھے۔ پھر وہ جھوٹ جو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے ہو، انکی اصطلاح میں 'مقدس جھوٹ' کہلاتا ہے، جو ہر کہہ و مہہ کے لیے جائز تصور کیا جاتا ہے۔

بدعت کا الزام: مغربی لٹریچر میں حضور کو ابتدأً عیسائی تصور کیا گیا۔ کبھی دربارِ روم سے منسلک بتلایا گیا، کبھی اچھا قسیس بیان کیا گیا۔ کبھی پوپ کے عہدے کے طلبگار ٹھہرائے گئے، کبھی یروشلم کے اسقف بننے کے تمنائی بتائے گئے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام عیسائی نے یہی باور کیا کہ داعیِ اسلام ﷺ بنیادی طور پر عیسائی تھے، جنہوں نے بعدہٗ ایک نیا مذہب ایجاد کر کے اسے عیسائیت کا رقیب بنا دیا، جو دنیا بھر میں عیسائیت کو زچ کر رہا تھا، تو بلا توقف اسلام کو بدعت اور اسکے داعی کو بدعتی قرار دیا۔ عیسائیت میں بدعتی کا مقام جہنم ہے، اس لیے شعراء نے بلا تکلف جہنم کے مناظر کھینچے اور اس کے اسفل ترین درجے میں ان کا مقام متعین کیا۔ [cf. Phillips K.]

[Hitti; Islam and the West, p.52: also refer Dante's Inferno, XXIII, pp.31-32)

مصوروں نے اس قسم کی تصاویر سے کلیسا کو رنگا۔ ڈرامہ نویسوں نے ڈراموں میں اس قسم کے مناظر دکھلائے۔ اطالوی مصور اورکاگنا (Orcagna) نے پیسا میں کیمپو سانتو (Campo Santo) میں ایک تصویر بنائی جس میں انہیں جہنم میں دکھایا گیا۔

ایک نبی گر: تیرہویں صدی کے اختتام تک مغرب کو یہ پتہ چل چکا تھا کہ وہ نہ تو عیسائی تھے نہ رومی، نہ راہب تھے نہ قسیس، تو فنکاروں نے اپنی دروغ بافی میں ترمیم کی۔ اب انہیں ایک بدعتی عیسائی کی جگہ ایک بدعتی قسیس کا آلۂ کار کہا جانے لگا۔ یہ ترمیم ہمیں گولڈن لی جنڈ (Golden Legend) میں واضح انداز میں ملتی ہے۔ لی جنڈ میں انہیں نبی کاذب ہی کہا گیا تاہم پچھلے دروغ کی یوں توجیہہ کی گئی،

''دربارِ روم میں ایک نہایت ہی نامور قسیس تھا، جسے وہاں سے حقیر کر کے نکالا گیا۔ اس کی ملاقات ماہومت سے ہوئی۔ اس نے کہا میں تمہیں تمام اقوام کا آقا اور سربراہ بنا دوں گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک کبوتر کو تربیت دینا شروع کیا۔ وہ قسیس ماہومت کے کان میں گیہوں کے دانے رکھتا اور کبوتر کو انکے کاندھے پر بٹھاتا تاکہ کان سے دانہ چگے۔ جب پرندہ تربیت پا گیا تو اس قسیس نے لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ وہ اُس شخص کو ان پر بادشاہ مقرر کرے گا، جس پر روح القدس کبوتر کی شکل میں نزول کرے گا۔ پھر اس نے خفیہ طور پر کبوتر کو چھوڑا جو اڑتا ہوا سیدھا ماہومت کے کاندھے پر آ بیٹھا۔ لوگوں نے باور کیا کہ یہ روح القدس تھا، جو ان پر نازل ہوا تھا''۔

آگے چل کر اس قسیس کا نام سرجئیس بیان کیا گیا۔

(Golden Legend; transiated by Caxton, 1470, quoted by Henry Stubb; Rise and Progress of Mohametanism)

لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہ کہانی دورِ نبوی سے کم وبیش دوسو سال پہلے فادر اتھناسیئس سے منسوب تھی۔ اس پادری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن راہ میں ایک کبوتر اڑتا ہوا اسکے کاندھے پر کان کی طرف آ بیٹھا۔ تثلیث پرستوں (Trinitarians) نے اسے ایک معجزہ قرار دیا، جبکہ ایرین (Arians) فرقے کے لوگوں نے اسے جادو ٹھہرایا۔

کبوتر عیسائیوں کی مذہبی علامت ہے۔ انجیل لوقا، باب چہارم[۴]، جملہ [۲۲] کے مطابق روح القدس کا نزول حضرت عیسیٰ پر کبوتر کی شکل میں ہوتا تھا، جبکہ عربوں اور مسلمانوں میں اس پرندے کی کوئی مذہبی اہمیّت نہیں ہے۔ کبوتر کا اس انداز میں استعمال صرف عیسائی ذہن کو ہی متاثر کرسکتا تھا۔ یہ حربہ اسقدر کامیاب رہا کہ کہانی اپنے جھول کے باوجود انیسویں صدی تک دہرائی جاتی رہی۔

(for the fables of dove see;

I) Shakespeare; Henry VI, Part I, Act 1, Scene 2, 140 Sequence

ii) John Sheffield; A dialogue between Mahomet and the Duke of Guise, Vol II

iii) J. Lee; The Life of Mahomet , the famous Oriental Imposter

iv) Lodewik Lloyd; Consent of Time, p.292

v) Phillips K. Hitti, Islam and the West, pp. 54-55)

شیکسپئیر جیسا ادیب بھی اس روایت کو دہرانے سے باز نہ رہ سکا۔ مغربی ادیب اس کبوتر کی ذات اور رنگ تک سے واقف تھے۔ کبوتر بازوں نے کبوتروں کی ایک نسل کا نام ہی ماؤمت (Maumet) رکھ دیا تھا۔

معلّمین : یہ مسئلہ کہ داعیِ اسلام ﷺ کے تعلیمی ذرائع کیا تھے، ہر دور میں زیر بحث رہا۔ اور مغرب آج بھی اس مسئلے پر غور وخوض کرتا نظر آتا ہے۔ اگر وحی کو ذریعۂ ابلاغ تسلیم کرلیا جاتا تو سارا مسئلہ ہی ختم تھا۔ لیکن بنیادی نکتہ تو یہی تھا کہ داعیِ اسلام ﷺ کی نبوّت ہی ناقابل قبول تھی۔ لہٰذا اس پہلو کو چھوڑ کر باقی تمام قابل قیاس پہلوؤں پر عقل کے گھوڑے دوڑائے گئے اور وحی کو شیطانی الہامات اور فرشتے کو شیطان ٹھہرایا گیا۔ ابتدائی دور میں انہیں ماہوئند تصوّر کیا گیا۔ پھر جب انہیں بشریّت کا مقام دیا تو عیسائی کلیسا کا رکن سمجھا گیا جسکے معنی یہ ہوئے کہ ان کے معلّمین کارکنانِ کلیسا تھے۔ چونکہ اسلامی تعلیمات کیتھولک عقائد کے منافی تھیں، اس لیے معلّمین کا تعلق کسی ایسے فرقے سے رہا ہوگا جو غیر کیتھولک بلکہ تثلیث سے منحرف تھے۔ اس دور میں ایسا فرقہ نسطوری تھا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرلیا گیا کہ نسطوری قسّیس سرجیئس یا سوئیس معلّم رہا ہوگا۔ اتفاقاً سفرِ شام کا واقعہ اکثر مسلمان مورّخین نے بڑے وثوق سے بیان کیا ہے، جس میں ایک راہب بحیرہ سے ملاقات کا ذکر پایا جاتا ہے۔ تو بحیرہ کے معلّم ہونے میں کلام نہیں رہ گیا۔ لیکن دقّت یہ تھی کہ ملاقات صرف ایک مرتبہ اور نہایت مختصر وقت کے لیے بیان کی جاتی ہے، جو

تعلیم و تعلّم کے لیے قابلِ غور نہیں۔ لہٰذا اس قسم کے معلّمین کو عرب میں تلاش کیا گیا۔ لوگوں کی نظریں ورقہ بن نوفل پر پڑیں، جو عبرانی علوم میں ماہر سمجھے گئے۔ قرعہ فال انہی کے نام پڑا۔ بڑے وثوق سے یہ بات کہی گئی،

''ان [خدیجہ] کے ایک چچا ورقہ نامی تھے، جو عبرانی یا شامی زبان جانتے تھے، اور فنِ تحریر سے بھی واقف تھے۔ انہیں اس خاتون نے ماہومت کی تعلیم پر مامور کیا۔ قریش میں مشکل سے ہی کوئی ایسا رہا ہوگا جو لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ جلد ہی انہوں نے لکھنا سیکھ لیا۔ جس سے ان کے وقار میں اضافہ ہوا''۔

(Henry Stubb; Rise and Progress of Mohametanism, pp.77-78)

ورقہ کے معلّم ہونے کا دعویٰ پوکاک نے بھی کیا۔ مستشرقین نے معلّمین کی تلاش میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ انہوں نے [یہ مفروضہ] دریافت کیا کہ زیدؓ بن حارثہ عیسائی تھے، اور دن رات حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ اسی طرح حضرت بلالؓ اور امُ المومنین ماریہؓ قبطیہ کے عیسائی ہونے پر زور دیا گیا۔ گو انہیں معلّم نہیں کہا گیا لیکن ان کے (مفروضہ) قدیم مذہب کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ عیسائیت سے ان کے توسط سے واقفیت ہوئی۔ جس امکان کی طرف اشارہ ہے اس پر ہنسی آتی ہے کیونکہ حضرت زیدؓ بن حارثہ جب حضور ﷺ کی خدمت پر مامور ہوئے تو ان کی عمر صرف نو [۹] سال کی تھی۔ حضور ﷺ نے خود ان کی تربیت فرمائی۔ حضرت بلالؓ عالی مرتبت اصحاب میں سے ہیں، لیکن ان کے علم و فضل کی بابت کوئی ضعیف روایت بھی نہیں ملتی۔ حضرت ماریہ قبطیہ ۷ھ میں خدمتِ نبوی میں تشریف لائیں اور یہ دور کسی بھی صورت میں تعلیم و تعلّم کا نہیں سمجھا جاسکتا۔

ہجرت : ہجرت کو اب تک محض فرار تصور کیا جاتا ہے۔ اسے عظیم قربانی کے بجائے محض پناہ گیری کا رنگ دیا جاتا ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں ہجرت کا تصور یہ تھا کہ کسی جرم کی سزا میں ملک بدر کیا گیا تھا۔ چنانچہ مورخ میتھیو پیرس نے متعدد الزامات عائد کرنے کے بعد تحریر کیا،

"He seized the camel of Aize Hali and fled to Medina whereupon the inhabitants expelled him from the city".

(Mathew Paris; English History,p.28)

[انہوں نے علی کا اونٹ لیا اور مدینے چلے گئے، جب شہر کے باشندوں نے انہیں جلاوطن کردیا۔]

نبوّت کی گواہی : عالمِ عیسائیت کے شدید پروپیگنڈے کے باوجود، ایسا لگتا ہے کہ یہ سوال بار بار اٹھا کہ آخر لاکھوں انسان داعیِ اسلام پر ایمان کیوں لائے۔ ابتدائی جواب تو یہ تھا کہ یہ سب کچھ سحر اور جادو کی بدولت ہوا۔ شیطانی اور سفلی قوّتوں نے لوگوں کو مسحور کرلیا۔ لیکن جادو اور سحر وقتی چیزیں ہوتی ہیں اور ان کے اثرات دیرپا نہیں ہوتے۔ سفلی قوّتیں بھی آخر تھک ہار جاتی ہیں۔ ان میں بھی ایسا استحکام نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ یقین دہانی اپنی اہمیّت کھو بیٹھی۔ جب ازسرِ نو یہی سوال اٹھا تو اسکے جواب میں یہی سمجھا گیا کہ یہ سب دھوکے اور فریب کے نتائج ہیں۔ چنانچہ سینٹ جان دمشقی نے تحریر کیا، (نعوذ باللہ)

''شہنشاہ ہرقل (Heraclius) کے دور میں ایک کاذب نبی اٹھا، جسکا نام...... تھا۔ اس نے عہد نامہ قدیم وجدید سے واقفیت حاصل کی اور پھر ایک ایرین راہب سے تبادلۂ خیال کے بعد ایک فرقہ قائم کیا۔ مکّارانہ پاکبازی کے ذریعے اس نے اپنی قوم کے دل جیت لیے۔ بعد میں اس نے دعویٰ کیا اس کے اوپر آسمان سے ایک صحیفہ نازل ہوا ہے۔ اُن تمام مہمل اور مضحکہ خیز احکام کو، جو اس نے اس کتاب میں تحریر کر رکھے تھے، اپنی قوم کے لیے مقدس تعلیمات قرار دیا'' ۔(Von Grunebaum; Mediaeval Islam, p.43)۔

سینٹ جان نے یہ خاکہ آٹھویں صدی عیسوی میں فراہم کیا تھا۔ اس کی یہ پریشان خیالی مغرب کے بڑے کام آئی۔ اس کے ایک ایک جملے کے ثبوت میں مغرب نے فرضی قصّے گھڑے، اور انہیں تاریخی حیثیت دی۔ نزولِ صحیفہ سے متعلق لغویات ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ حرمت خنزیر و حرمتِ شراب کی توجیہات بھی نظر سے گزر چکیں۔ ایرین اور نسطوری معلّمین کی روایات اور انجیل و تورات سے واقفیت کے دعوے، سب سینٹ جان کے اجمال کی تفصیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مغرب نے تکذیبِ نبوّت اور مکّارانہ پاکیزگی کے ضمن میں جو کارنامے انجام دیے ہیں، انکی تفصیل نہایت کربناک ہے۔ انکے مکر وفریب کا کچھ اظہار، کبوتر کی کہانی، سفید بیل کے افسانے، شادی کی روایات اور ہجرت کے بارے میں لغویات سے ہوتا ہے۔ نبوّت کی تکذیب کے لیے مغرب نے خود شیطان سے رابطہ قائم کیا، اور اسے مجبور کیا کہ وہ حقیقت کا اعتراف کرلے۔ شیطان کی بھلا کیا حیثیت تھی۔ ایک مقدس پادری اور عیسائی مبلّغ ہنری اسمتھ کے روبرو اسے یہ اقرار کرنا ہی پڑا کہ (نعوذ باللہ) ''قرآن میں صرف بارہ ہزار [۱۲۰۰۰] جھوٹ ہیں، اور باقی سب سچ ہے''۔ (The Works of Henry Smith; Vol II, pp. 404-412, edited by J.C.Miller, Nicholl's Series of Standard Devine)۔

شیطان کے اقرار کے بعد مبلّغ مذکور کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں، (نعوذ باللہ) (حوالہ بالا)

"Their is no evidence to prove Mahomet a true prophet, many prove him to be a false prophet, and blasphemous and presumptuous, and his religion to be a wicked, cruel, absurd and false religion, proceeding from a proud spirit, and human, subtle, corrupt invention, and even from Devil, the crafty father of lies, a murderer and a man killer from the beginning".

[ماہومت کے سچے نبی ہونے کے بارے میں کوئی شہادت نہیں ہے جبکہ اس کے جھوٹے نبی، اہانت کنندہ اور حد سے زیادہ خود اعتماد ہونے کی کئی ہیں۔ اسی طرح سے اس کے مذہب کے گندے، ظالم، مضحکہ خیز اور جھوٹے ہونے کے بارے میں بھی ہیں، جو شیطان کی اعانت سے ایک مغرور روح کی، انسانی، خام اور بدعنوان ایجاد ہے۔ ، جھوٹ گھڑنے والوں کا باپ، قاتل اور ابتدا سے انسان کُش تھا۔]

الیگزینڈر راس ایک اور مسیحی پادری تھے، جنہیں فرانسیسی زبان سے انگریزی میں قرآن کا ترجمہ کرنے کی اوّلیت حاصل ہے۔ انہوں نے ترجمے کے ساتھ ایک دیباچہ بھی شریک کیا۔ اس میں جہاں کہیں انہیں موقع میسّر آیا، اسم گرامی کے ساتھ اسمِ توصیفی ضرور استعمال کیا۔ مثلاً، (نعوذ باللہ)

"The Great Arabian Imposter, the Little Horn in Daniel, Arabian Swine, Goliath, Great Hypocrite, Great Thief, Thieving Carcus, The Great Destroyer as his name signifies". **(cf. Ross; 'A Needful Caveat', appended to the translation of the 'Al-Koran of Mahomet')**

[ترجمہ دانستہ چھوڑ دیا گیا ہے۔] اسی قبیل کے اوصاف موصوف نے الکتاب [قرآن] کے بھی بیان کیے۔

ڈاکٹر اسٹب کے توسط سے ہمیں یہ پتہ چلا کہ مغرب میں سترہویں صدی عیسوی میں کنویں کی بھی ایک کہانی رائج تھی، جسکے مطابق، (نعوذ باللہ)

"...... نے اپنے گھریلو ملازم کو شاہراہ پر واقع ایک کنویں میں چھپنے کی ہدایت یہ کہہ کر دی کہ جب وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ وہاں پہنچیں تو ان کی رسالت کی گواہی بلند آواز سے دے۔ جب تعمیلِ حکم ہو چکی تو ...... نے اس غیبی شہادت پر خدا کا شکر ادا کیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس کنویں کو پر کر کے اس معجزے کی یاد میں اس پر ایک مسجد بنائی جائے۔ اور یوں وہ غریب پتھروں میں (زندہ) دفن کر دیا گیا تا کہ فریب کا پردہ چاک نہ ہو سکے۔

(quoted by Nick Earl; 'Culture and Greed', p.65)

دورِ دانش

ساتویں صدی تا سولہویں صدی کے دور کو مغرب زمانۂ جاہلیت کا نام دیتا ہے۔ سترہویں صدی سے یورپ کا دورِ دانش شروع ہوا۔ اس دور میں پروپیگنڈے کو بھی معقولیت کی جانب موڑا گیا۔ زمانۂ جاہلیت کے بھونڈے پروپیگنڈے کی تصحیح کی گئی۔ پرانی شراب نئی بوتلوں میں منتقل کی گئی۔ مثال کے طور پر مشہور مصنّف فرانسس بیکن (Francis Bacon) نے 'جرأت' کے عنوان سے ایک ایسا وضعی واقعہ تحریر کیا جسے عیسائی دنیا میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس نے لکھا:

"...... نے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ وہ ایک پہاڑ کو اپنے پاس بلائیں گے۔ اور اس پہاڑ کی چوٹی سے اپنی شریعت کے متبعین کے لیے دعا کریں گے۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو ...... نے پہاڑ کو بار بار آواز دی کہ وہ ان کے پاس آئے، اور جب پہاڑ بے حرکت کھڑا رہا تو پشیمان ہونے کے بجائے یہ کہا کہ اگر پہاڑ ...... کے پاس نہیں آتا تو ...... خود پہاڑ کے پاس جائیں گے"۔ **(Works of Francis Bacon; Vol II, p.279)**۔

مندرجہ بالا اندازِ نظر خالص مسیحی ہے، جو فرانسس بیکن نے بڑے شاطرانہ انداز میں داعیِ اسلام سے منسوب کر دیا ہے۔ عیسائیت اپنے ابتدائی دور میں بڑے یقین کے ساتھ آسمانی حکومت کی آمد کی منتظر تھی۔ لیکن جب آسمانی حکومت کے آثار نہ پائے گئے تو اس کی توضیح یہ کی گئی:

"Jesus had been misunderstood. If the Kingdom of Heaven was not coming to man, then man must be going to the Kingdom of Heaven."

[یسوع کو غلط سمجھا گیا تھا۔ اگر آسمانی بادشاہت انسان کے پاس نہیں آ رہی تو انسان کا آسمانی بادشاہت کی طرف جانا لازم ٹھہر چکا ہے۔]

تکذیبِ نبوّت کی مہم نہایت قدیم تھی۔ اس مقصد کے لیے بائبل کو پوری طرح سے استعمال کیا گیا۔ بائبل میں ملنے والے الفاظ کھینچ تان کر اسلام اور داعیِ اسلام ﷺ پر چسپاں کیے گئے۔ عہد نامۂ قدیم کی کتاب دانیال اس معاملے میں بڑی کام آئی۔ دانیال نے خواب میں چار درندے دیکھے۔ ان میں چوتھا درندہ نہایت ہولناک اور زبردست تھا۔ اس کے دس سینگ تھے۔ پھر ایک چھوٹا سینگ نکلا، جس نے تین سینگ اکھاڑ پھینکے۔ اس سینگ میں انسان کی سی آنکھیں تھیں اور ایک منہ تھا، جس سے گھمنڈ اور غرور کی باتیں نکلتی تھیں۔ اس سینگ کے بارے میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ یہ مقدسوں سے جنگ کرتا رہے گا، جبتک 'قدیم الایام' آ کر مقدسوں کا انصاف نہ کرے۔ (کتاب دانیال، باب ۷، ۱-۲۵)۔ چھوٹے سینگ کے بارے میں تحریر ہوا کہ وہ دس بادشاہوں کے بعد گیارہواں بادشاہ ہوگا، جو تین بادشاہوں کو زیر کریگا۔ حق تعالیٰ کے مقدسوں کو تنگ کریگا اور شریعت کو بدلنے کی کوشش کریگا۔ ایک دور، دو دور اور آدھا دور اس کے حوالے کیے جائینگے۔ تب عدالت قائم ہوگی اور سلطنت اس سے لے لی جائے گی۔

اس خواب کی تعبیر مغرب کو اسلام کی شکل میں نظر آئی۔ چوتھے درندے کے اعداد [۶۶۶] بنتے تھے، جو اسمِ گرامی کو حسب ذیل املا کر کے پورے کیے گئے۔

(MAOMETHS; M=40,A=1,O=70,M=40, E=5, T=300, H=10, S=200; 40+1+70+40+5+300+200=666)

نیز چھوٹے سینگ کی پھبتی بھی کسی گئی، جیسا کہ اوپر الیگزنڈر راس کے حوالے میں آ چکا ہے۔ قبلِ اسلام جب روم، عیسائیت پر بلائے بے درماں بنا ہوا تھا، تو عیسائی بزرگوں نے روم کو بابل کا ثانی اور قیصرِ روم کو خواب کے درندے کا نام دیا، اور نمبر [۶۶۶] الاٹ کیا گیا۔ مکروہ تشبیہات عیسائی ادب، یہاں تک کہ آسمانی کتب میں بھی معیوب نہیں سمجھی جاتیں۔ روم کو پال اور سینٹ پیٹر کے دور میں مادرِ مشفق سمجھا جاتا تھا، لیکن جلد ہی یہ انداز بدل گیا، اور سینٹ جان نے اپنے مکاشفہ میں روم کو بیسوا بنا دیا۔ روم کے بارے میں تحریر کیا،

''میں تجھے اس بڑی کسبی کی سزا دکھلاؤں جو بہت سے پانیوں پر بیٹھی ہوئی ہے اور جس کے ساتھ زمین کے بادشاہوں نے حرام کاری کی، اور زمین کے رہنے والے اسکی حرام کاری کی لے سے متوالے ہو گئے۔۔۔۔۔۔ ایک سونے کا پیالہ مکروہات یعنی حرام کاریوں کی ناپاکیوں سے بھرا ہوا اسکے ہاتھ میں تھا''۔

(مکاشفہ یوحنا، باب ۱۷، ۲-۴)

سینٹ جان کی نظر میں رومی شہنشاہ، ظل اللہ سے درندہ، بلکہ دانیال کے خواب کا درندہ **(The Beast)** بن گیا تھا۔

اس نے لکھا، ''جو سمجھ رکھتا ہے وہ اس درندے کا عدد گن لے کیونکہ وہ آدمی کا عدد ہے، اور اسکا عدد چھ سو چھیاسٹھ [٦٦٦] ہے''۔(مکاشفہ یوحنا، باب ۱۳، ۱۸)

علمائے مسیحی اس امر پر متفق ہیں کہ اس درندے سے مراد قیصرِ روم ہے۔

"One thing is certain, that mainly it refers to the Caesar, who has made himself into a God. If the enigma is conceived into Greek, the values of the letters of the word 'Lateinos' will give [666]. If it is conceived in Hebrew the value of the letters in the words 'Neron Qesar' will add up to the required figure. In either case it is the same person, that is meant".

(Warner Stark; The Sociology of Religion-- A study of Christiandom, Vol.3, p.3)

پس عیسائیت کا یہ دستور رہا ہے کہ جس شہر سے وہ متنفر ہوں اسے بابل، اور جس مقتدر سے انہیں خوف ونفرت ہوا سے [٦٦٦] کے اعداد والا درندہ کہتے ہیں۔ یہی طرزِ عمل انہوں نے داعیِ اسلام ﷺ کے ساتھ بھی روا رکھا۔

مغرب کا ایمان تھا کہ حق وصداقت، روحانی پاکیزگی، خالق سے ربط اور نجات صرف عیسائیت کے لیے مختص ہے۔ باقی مذاہب نیم پختہ، نامکمل، ضلالت وگمرہی اور اوہام ہیں۔ اس ذہنی تیقّن کے ساتھ دورِ دانش میں مغرب نے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ تیقّن نہ ہوتا تو شائد کلیسائے مغرب کو اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرنے کے لیے ۱۹۶۵ء تک کی مہلت درکار نہ ہوتی۔(تاریخِ عیسائیت میں پہلی بار کیتھولک کلیسا نے دوسری ویٹیکن کونسل کے بعد ۱۹۶۵ء میں یہ اعتراف کیا، کہ اسلام میں بھی حقانیت پائی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں عالمِ عیسائیت میں اعلیٰ سطح پر اسلام کے ساتھ ماضی میں کی گئی ناانصافیوں کا ازالہ کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ ویٹیکن کے غیر مسیحی امور کے دفتر **(Office for Non-Christian Affairs)** نے ایک ضخیم دستاویز شائع کی ہے۔ جس میں قارئین کو ہدایت کی گئی ہے کہ ماضی سے ملنے والے فرسودہ تصورِ اسلام کو فراموش کر دیں۔ ماضی کے پرتشدّد تعصب کا احتساب کریں اور توحید کے پرستاروں میں یگانگت پیدا کریں۔ اس اتحاد کی جانب خود پوپ نے پیشقدمی کی اور ۱۹۷۴ء میں اپنے نمائندے شاہ فیصل کی خدمت میں بھیجے۔ چھ ماہ بعد پوپ پال ہشتم نے ویٹیکن

میں سعودی علماء کے وفد کا استقبال کیا۔ اسکے بعد جامعۃ الازہر اور ویٹیکن آفس کے وفود کا بھی تبادلہ ہوا۔ (ملاحظہ ہو ڈاکٹر بوکائی، بائبل، قرآن اور سائنس کا دیباچہ، ۱۹۷۹ء)۔ اس تیقّن کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں ہر وہ پہلو دلنشیں نظر آیا جس سے کراہت محسوس ہو اور ہر وہ پہلو جو حسین تھا داغ داغ کیا گیا۔ داعیِ اسلام علیہ السلام کا عظیم ترین اور اہم ترین وصف نبوّت تھا۔ دورِ دانش کے اہلِ قلم نے بے سروپا کہانیوں کو ترک کر کے سارا زور انکی نبوّت کی تردید پر صرف کیا۔

لینکلاٹ ایڈیسن (Lanclot Adison) نے ۱۶۷۹ء میں لندن سے ایک کتاب (The First State of Mahometism or an Account of the Author and Doctrine of that Imposter) شائع کی۔ اسمیں اس نے شعوری طور پر فرضی اور مضحکہ خیز کہانیوں سے گریز کیا۔ تاہم گستاخی اور دریدہ دہنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

ایڈیسن کے ہمعصر ہمفرے پریڈو (Humphrey Predaux) نے، جو ناروچ کا ڈین تھا، حیاتِ طیبہ پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ اس میں اس نے عربی تراجم اور دیگر زبانوں کی مدد سے مواد حاصل کیا، اور تنقیدی طریقہ کار اختیار کیا۔ اس نے کبوتر کی کہانی اور دیگر کہانیوں کو سختی سے مسترد کیا، اور انہیں بے بنیاد اور حقیقت سے مبرّا قرار دیا۔ اس نے لکھا، ''ایسی چالیں عربوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں''۔

(Humphrey Predaux; The True Nature of Imposture Fully Displayed in the Life of Mahomet, 8th Ed., p.38) اس کے باوجود کتاب کا موضوع صرف یہ تھا کہ اسلام پرفریب مذہب کا مکمل نمونہ ہے۔ یہ کتاب ایک صدی سے زیادہ عرصے تک معیاری تصوّر کی گئی۔

(Henry Stubb; Rise and Progress of Mohametanism, p.229)

مصلحین اور داعیِ اسلام : شاعروں، مصوّروں اور مورّخین کو اسلام کا جو تصوّر ملا تھا وہ مسیحی فضلاء سے ملا تھا۔ ہر معاشرے میں مذہبی گروہ حق پرست طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مغرب کا مذہبی گروہ اسلام کے معاملے میں بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ کیتھولک اربابِ کلیسا کے بیانات اور ارشادات نظر سے گزر چکے۔ وہ مصلحین جنہوں نے پوپ اور کیتھولک چرچ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، ان سے توقع ہوسکتی تھی کہ وہ کیتھولک کلیسا کی غلط روش کی اصلاح کریں گے، لیکن اسلام کے معاملے میں انہوں نے پوپ کے نقشِ قدم سے سرِ مو انحراف نہیں کیا۔ مذہبی مصلحین نے اس باب میں جو کچھ کیتھولک کلیسا سے وراثتاً پایا تھا، اسے نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اسمیں حسبِ توفیق شیطانی اضافہ ہی کیا۔

لوتھر جو پروٹسٹنٹ فرقے کا بانی، پوپ کا دشمن اور کلیسا کا حریف تھا، اسلام اور داعیِ اسلام علیہ السلام کے معاملے میں مجسّم قہر و غضب بن جاتا ہے۔ اس نے کہا،

''شیطان، سراسین اور ترک، سب ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں''۔ (حوالہ بالا)۔

مزید ملاحظہ ہو: (حوالہ بالا) (نعوذ باللہ) [ترجمہ دانستہ نہیں کیا گیا]۔

"Oh fie for Shame, you horrid Devil, you damned Mahomet"

یہی مصلح گرامی، یسوع مسیح سے التجا فرماتے ہیں کہ،

''القرآن کے مصنف پر آگ اور پتھروں کی بارش فرما''۔ (حوالہ بالا)

جان بیل (John Bale) (متوفی ۱۵۰۳ء) ایک بشپ گزرے ہیں۔ پوپ کے سخت مخالف تھے۔ اس کی تحقیر کے لیے انہوں نے پوپ کا موازنہ داعیِ اسلام سے کیا۔ انکے مضامین کا ایک مجموعہ پایا جاتا ہے۔ اس میں انہوں نے بے شمار انکشافات کیے ہیں۔ لکھتے ہیں،

''روح القدس نے یاجوج ماجوج کا جو ذکر کیا ہے، اس سے کوئی اور نہیں، بلکہ صرف پوپ اور ......، اور انکی بدقماش نسلیں مراد ہیں''۔ اس نے مزید لکھا کہ:

''رومی پوپ اور ...... کی چالیں اسقدر شاندار ہیں کہ انکے متبعین انہیں فرشتۂ نور تصور کرتے ہیں۔ انکی عبادت گاہیں نہایت مقدس تصور کی جاتی ہیں، جبکہ دونوں ہی اپنی مکروہ تاریکیوں کے ساتھ مجسم شیطان ہیں''۔ اس نے مزید تحریر کیا:

''پوپ اپنا درندہ خود تخلیق کرتا ہے۔ وہ مہا پجاری ہے۔ وہ پیٹر کا ہمسر ہے۔ وہ غلطی سے مبرا ہے۔ وہ اپنے چرچ کا سربراہ ہے اور حجتِ بالغہ ہے۔ وہ کرائسٹ کا نائب ہے۔ وہ اپنے درندے کے ذریعے لوگوں کو باور کراتا ہے کہ وہ ان کے لیے قانون (شریعت) مرتب کرسکتا ہے۔ انجیل کا پابند کرسکتا ہے اور سلطنتیں تقسیم کرسکتا ہے۔ ...... بھی تو دعویٰ کرتا ہے کہ وہ عظیم نبی ہے۔ وہی وہ مسیح موعود ہے جسکی بشارتیں دونوں کتبِ مقدسہ میں آئی ہیں۔ ان دونوں فتنہ پروروں نے شریعتِ موسوی، زبور اور انجیل کی تعلیم کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنے قوانین (شریعت) مرتب کیے جو ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ پوپ کے قابلِ نفریں قوانین اور ...... کی فاسق کتاب ...... وہ لوگوں کا بیدریغ قتل کرتے ہیں۔ اس طرح اگرچہ وہ بظاہر نہایت پرہیزگار نظر آتے ہیں، لیکن حقیقتاً شیطان کے خبیث نائب ہیں''۔

(Bales Select Works, pp.262,571 Parker Society, 1849

پروٹسٹنٹ عظام نے جن ہتھیاروں کا استعمال کیتھولک سربراہ پوپ کے خلاف کیا، انہی ہتھیاروں کا استعمال کیتھولک فرقے نے پروٹسٹنٹ فرقے کے خلاف کیا۔

فاضل کارڈینیل پیرون (Peron) نے اس معرکے میں حصہ لیتے ہوئے ایک کتاب (Luther's Al-Coran) تصنیف کی۔ انہوں نے لوتھر کی تعلیمات اور قرآنی تعلیمات کی مماثلت میں چالیس [۴۰] نکات پیش کیے۔ اور پھر پروٹسٹنٹ شخصیتوں خصوصاً ہنری ہشتم کا موازنہ ذاتِ نبوی سے کیا۔ اور لکھا کہ،

''یہ تو غنیمت ہے کہ ...... اور ہنری، پلوٹارک فلسفی کے عہد میں نہ ہوئے، ورنہ وہ انکو انسانیت کے نابکارترین عفریت قرار دیتا''۔ (Peron Cardinal, Luther's Al-Coran, Part II, p.III)

کارڈینل مذکور نے ہنری کی بداعمالیوں کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے تان یہاں پر توڑی کہ،

"The ecclesiastical primacy of the church was never challanged until this 'Mahumetan Henry' through more than Nimrodian avarice, had demolished several thousands of religious houses". (Ibid p.125)

(' کلیسا کی مذہبی بالا دستی کو 'محمدی ہنری' سے پہلے کبھی کسی نے نمرودی ہوس کے ذریعے، ہزاروں دینی مکانوں کو مسمار کر کے اس طرح سے نہیں للکارا تھا')۔

اس موازنہ کے بعد اس کا قلم لوتھر اور سرجیئس کی شخصیتوں کے موازنے کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں کو شیطان کا آلۂ کار اور مروجہ دین سے برگشتہ کہا، اور نئے دین کی تعلیمات کی تدوین کا الزام دیتے ہوئے سرجیئس کو القرآن کا مصنف قرار دیا، اور معاشرے کو پروٹسٹنٹ تحریک سے متنفر کرنے کے لیے اسے (Gallo Mahumetani) کا نام دیا۔ (حوالہ بالا، پارٹ-۱، باب-۳۱)۔

مناجات : گرجا گھروں میں مناجات اور خطبات میں تبرّا ایک عام بات ہے۔ ملکہ الزبتھ کے دور کی جو مناجاتیں ضبطِ تحریر میں آئی ہیں، ان میں جہاں شیطان سے پناہ طلب کی جاتی ہے وہیں ترکوں کا نام بھی آتا ہے۔ پارکر سوسائٹی نے اس دور کی جو مناجاتیں جمع کی ہیں، اس کی ایک مناجات کے آخری حصے کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

''لہٰذا ان وجوہات کی بنا پر وہ (ترک) ہم سے نفرت کرتے ہیں کہ ہم تجھے خدائے پدر مانتے ہیں۔ اور تیرے فرستادہ یسوع مسیح کو تیرا فرزند تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ترک تیرے محبوب ترین فرزند یسوع مسیح پر خبیث، عفریت، ملعون،.....کو برتری اور عظمت دیتے ہیں''۔ (نعوذ باللہ)

(Litergical Services of the Reign of Queen Elizabeth; p.533)

سیاحوں کے سفرنامے : دورِ دانش میں بے شمار مبلّغین اور سیاحوں نے مسلم ممالک کے سفر کیے۔ لیکن جو سفرنامے اور وقائع انہوں نے ترتیب دیے، ان میں وہی قدیم ہرزہ سرائی برقرار رکھی، اور اپنے ہم وطنوں کو باور کرایا کہ اسلام اور داعیِ اسلام کے بارے میں ان کے قومی تصورات من و عن صحیح تھے۔ یہ تجاہلِ عارفانہ کیوں؟ شائد اس لیے کہ وہ معاشرے کے مروّجہ نظریات کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ یا پھر مسخِ عمد کے پابند تھے۔ اور بہت ممکن ہے کہ انکی سیاحت ہی فرضی ہو۔ لائیڈ لدوک کا سفرنامہ ۱۵۹۰ء میں شائع ہوا جس میں وہی گھسی پٹی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اسکا ایک جملہ ہی اندازِ تحریر اور رپورٹنگ کی نوعیت کے اظہار کے لیے کافی ہوگا۔ (نعوذ باللہ) [ترجمہ دانستہ چھوڑ دیا گیا۔]

"This poisoned scorpion and the only plague of Christians .... vomited his malice". (cf. Lloyd Ludowik; Consent of Time, pp.282-292)

پیٹر ہیلن اور الیگزینڈر راس بھی سیاح تھے۔ ان کے حوالے ہم پچھلے اوراق میں دے چکے ہیں۔ اوّل الذکر نے والد اور والدہ کا ذکر کرتے ہوئے مکروہ حلیہ بیان کیا اور ثانی الذکر نے بدترین اوصاف کو منسوب کیا۔

اہانت کا ترقّی یافتہ انداز

یہ تھی وہ علمی وراثت جو مستشرقین کو اپنے بزرگوں سے ملی تھی۔ انکے اغراض و مقاصد متعیّن تھے۔ وہ روحانی صلیبی جنگ کے ہراول تھے۔ انکا ذہن مغربی معاشرے کا آئینہ دار تھا۔ انکا مطمحِ نظر اسلام کو شکست دیکر روندنا تھا۔ لہٰذا انکے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ غیر جانبداری کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرسکیں۔ انکی تحریریں ایک خاص مقصد کی پابند تھیں۔ وہ مواد جو انکے کام آ سکتا تھا منتخب کیا گیا۔ وہ صحیح مواد جس سے تحریف و تصرّف کا کام لیا جا سکتا تھا، مسخِ عمد کا شکار ہوا۔ کلبی اور واقدی جیسے دروغ گو جنہیں عالمِ اسلام نے مردود قرار دیا تھا، مستشرقین کے لیے ثقہ ٹھہرے۔ ابنِ اسحٰق جسے امام مالک نے کاذب قرار دیا تھا مغرب کی نظر میں معتبر ہوا۔ احادیث کے وضّاع قابلِ اعتماد، اور ابنِ عبّاس جیسے بزرگ محدّث واضع قرار دیے گئے۔

تاہم مستشرقین کی بدولت، اہلِ مغرب کو اسلام کے بارے میں راست علمی معلومات ملنی شروع ہوگئیں۔ جس کے باعث کم از کم یہ ضرور ہوا کہ 'علم الاصنام' قسم کا مواد اسلام کے باب سے خارج ہونے لگا۔ پوکاک، اسٹب، ہوٹنگر، اسکالیجر وغیرہ نے وحوش وطیور کے قصے کہانیوں پر سخت تنقید کی۔ اپنے اہلِ وطن کو مطّلع کیا کہ مسلمان توحید پرست ہیں، اور داعیِ اسلام معبود نہیں بلکہ عبد ہیں۔ حضور ﷺ کی عالی نسبی کے خلاف الزامات کو رد کیا۔ فرضی معلّمین کی نفی کی۔ اسٹب نے لکھا کہ اگر کوئی عیسائی قرآن کا مصنّف ہوتا تو اس کے لیے الوہیت عیسیٰؑ سے انکار ناممکن ہوتا۔ جبکہ قرآن انہیں ابن اللہ کے بجائے ابنِ مریمؑ کہتا ہے، اور اگر کوئی یہودی مصنّف ہوتا تو وہ حضرت عیسیٰؑ کا احترام برقرار نہ رکھ سکتا۔ اس نے پوکاک کے اس دعوے کی بھی تردید کی کہ ورقہ بن نوفل نے (حضور ﷺ کو) عبرانی رسم الخط سکھایا تھا، جس کی مدد سے عربی زبان بھی ضبطِ تحریر میں آ سکتی تھی۔ اسٹب نے تردید میں یہ دلیل پیش کی کہ صرف رسم الخط سے اگر واقفیت ہو بھی تو محض اسکے سبب قرآن جیسا عظیم کارنامہ سرانجام نہیں پا سکتا۔ اس نے مغربی دریدہ دہنی کو بھی اس بناء پر مطعون کیا کہ،

"It is certain that the Christians which lived under the Mahomatens, do mention Mahomet with great respect as Mahomet of glorious Memory, and Mahometan super quo pax and benedictis & C.".

(Henry Stubb; Rise and Progress of Mahometanism, p.143)

[یہ بات قطعی ہے کہ جو عیسائی محمدیوں کے زیرِ نگیں رہے ہیں، وہ محمد (ﷺ) کا ذکر نہایت احترام سے کرتے ہیں، جیسے عظیم یادوں والے محمد، اور عظیم المرتبت امن اور برکتوں والے محمد، وغیرہ۔]

سترھویں صدی عیسوی یورپ کی تاریخ کا نیا موڑ ہے۔ یہ انقلابی صدی کہلاتی ہے۔ یہ ہیجانی دور تھا۔ اس میں بے شمار تحریکیں، قومیت کا احیاء، مذہبی اصلاح، خانہ جنگیاں، اصلاحات کی جدّ وجہد، سائنسی پیش رفت، آزاد خیالی، فکری تجدّد، فلسفہ واخلاق کا نزاع، سب ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ اس میں

ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو مسیحائی اور خدائی کا دعویٰ کرتے تھے۔ایسے گروہ بھی ابھرے جو حق کے متلاشی ہونے کے دعویدار تھے۔اسی صدی میں چرچ کا اقتدار مجروح ہوا۔ چرچ کی عدالتیں ختم ہوئیں۔گرجاؤں میں جبری حاضری کا قانون منسوخ ہوا۔ چرچ کی جائدادوں پر ٹیکس عائد ہوئے۔ چرچ کے قوانین پارلیمنٹ مرتب کرنے لگی۔عوام پر سے چرچ کے ٹیکس ختم ہوئے۔حکومت سے چرچ کے اراکین خارج کیے گئے۔ چرچ سے سزائے موت کا اختیار چھن گیا۔لے دے کر صرف تعلیم اور سنسر کے اختیارات چرچ کے پاس رہ گئے۔یونیورسٹیوں میں بھی آزاد خیالی کی گنجائش پیدا ہوئی۔

ان تبدیلیوں کا یہ اثر ہوا کہ مستشرقین میں بھی چرچ کی پالیسیوں سے اختلاف کی ہمت پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ سترہویں صدی اور اس کے بعد ایسے اصحابِ قلم ملتے ہیں جو حرفِ حق زبان پر لانے کی جرأت کرنے لگے اور زبان سے اسلام کے بارے میں حقائق کا اعتراف کرنے لگے۔تاہم صدیوں کے اثرات یکلخت ختم نہیں ہو سکتے تھے۔اگر کسی نے حق گوئی کی جرأت کی تو معاشرے نے اسے تنقید کا نشانہ بنایا۔نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے ادیب بھی اپنی تحریروں میں اہانت کے مرتکب ہوتے رہے اور یہ سلسلہ سترہویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے نصف تک مسلسل جاری رہا۔انیسویں صدی کے نصف سے اس انداز میں واضح تبدیلی ہونے لگی۔

اخلاص : جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں عرض کیا کہ اقبال کا مجذوب فرنگی 'گوئٹے' وہ پہلا فرد نظر آتا ہے جس نے حضور ﷺ کے خلوص سے عاری ہونے کو تسلیم کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔ پھر کارلائل نے ایک قدم آگے بڑھایا اور حضور ﷺ کے خلوصِ نیت کو وزنی دلائل سے ثابت کر کے اپنے ہم مذہبوں کو مہر بلب کیا۔جس کے بعد خلوص کی مختلف تاویلات کی گئیں۔کسی نے کہا کہ قرآن ان کے لاشعور کی پیداوار تھا، جسے ان کے خلوص نے وحی تصور کیا۔گویا قرآن کو صحیفہ سماوی سمجھنے میں پرخلوص غلط فہمی ہوئی۔کسی نے کہا کہ جبرئیل کا وجود محض تصور کا پیدا کردہ ہیولا تھا، جسے وہ وجودِ لطیف تصور کرتے تھے اور عالمِ استغراق میں محسوس کرتے تھے کہ فرشتہ ہمکلام ہے۔ گویا وجودِ جبرئیل محض واہمہ تھا۔کسی نے کہا کہ عالمِ جذب طاری کرنے پر قادر تھے، ورنہ قرآن ان کی مرضی کے مطابق کیوں اترتا تھا۔گویا حصولِ وحی خود اختیاری نفسیاتی کیفیت تھی۔غرضیکہ ان تاویلات کے ذریعے یہ کوشش جاری رہی کہ وحی کو غیر حقیقی قرار دیا جائے۔

وحی پر شک وشبہ نبوّت وقرآن پر شک وشبہ کے مترادف ہے، اور نبوّت وقرآن پر شک کے بعد منطقی طور پر دین وایمان برقرار نہیں رہ سکتا۔مقامِ رسالت محض معاشرتی اصلاح ہو کر رہ جاتا ہے، جو سراسر ارتکابِ اہانت ہے۔

اگر قرآن جیسے عظیم کلام کو ناقدین غیر الہامی قرار دے سکتے ہیں تو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں رہ جاتا کہ عالمِ انسانیت الہامی کتب سے محروم ہے، کیونکہ پھر قرآن سے کمتر درجہ کی کتب کو بھی الہامی نہیں کہا جا سکتا۔

کردار : ۱۸۷۴ء میں باسورتھ اسمتھ نے رائل انسٹیٹیوٹ آف گریٹ برٹن میں لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا جس میں انہوں نے یہ کوشش کی کہ مغرب کو کردار نبوی ﷺ کی عظمتوں سے روشناس کرائیں، اور ان احسانات پر

روشنی ڈالیں جو ان کی ذات نے عالمِ انسانیت پر کیے۔ باسورتھ کے معترضین نے ان کی اس پیش رفت پر شدید اعتراضات کیے، جس کے باعث انہیں اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے پیش لفظ میں یہ لکھنا پڑا،

"So many Christian writes, as it seemed to me, had approached Islam only to vilify and misrepresent it, that it appeared desirable that one who was at least profoundly impressed with the dignity and importance of the subject, should, in default or better qualified persons, make an attempt to treat it not merely with a cold and distant impartiality but even with something akin to sympathy and friendliness".

(Boswarth Smith; Muhammed and Muhammedanism, Introduction)

[بہت سے عیسائی مصنفین نے، مجھے ایسا لگتا ہے، اسلام کا قرب صرف اسے کمتر ثابت کرنے اور اسکی غلط تصویر پیش کرنے کے لیے ہی حاصل کیا، حالانکہ پسندیدہ یہ بات ہوتی، کہ کم از کم وہ لوگ یا ان سے زیادہ لائق فائق افراد جو موضوع کی اہمیت اور اسکی بزرگی سے متاثر تھے، اس کے ساتھ بعد اور سرد مہری سے لبریز غیر جانبداری سے ماورا ہو کر بلکہ کچھ ہمدردانہ اور دوستانہ رویہ اپناتے ہوئے، برتاؤ کرتے۔]

اسی طرح کارلائل نے بھی اپنے معاشرے کی روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ جس شد و مد کے ساتھ اس نے اسلام اور داعیِ اسلام ﷺ کی مدافعت میں قلم اٹھایا، اس کی نظیر مغرب میں اس سے قبل نہیں ملتی۔ اس نے کوشش کی کہ ذاتِ نبوی کے کردار عالیہ کے مختلف روشن پہلو اجاگر کرے۔ اس کی پیش رفت نے قدیم انداز کا دھارا موڑا۔ لیکن باسورتھ اور کارلائل کی تحریروں کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو اسلام اور داعیِ اسلام ﷺ کے بارے میں انکی تحریروں میں ایک خاص احساسِ برتری پایا جاتا ہے، کہ اسلام دراصل عیسائیت کی ایک ثانوی شکل ہے۔ یہ نکتہ نظر بذاتِ خود اہانت آمیز ہے۔ جب وہ عظیم اہلِ قلم جو موافقت کا دم بھرتے نظر آتے ہیں، اسلام کو عیسائیت سے کمتر تصور کرتے ہوں، تو ان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی جو موافقت کے دعویدار نہ ہوں۔

اس پیشگی تیقّن کے باعث عیسائی تحریریں عدل سے بیگانہ ہی رہیں۔ ٹوئین بی جیسا بے لاگ صاحبِ نظر جب ذاتِ گرامی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو اس کی فکری بلندیاں مائل بہ پستی نظر آنے لگتی ہیں۔ اس نے تحریر کیا:

''اپنی کمیونٹی میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مکّہ میں قاصر رہے۔ اور جب مکّے نے رد کر دیا تو مدینے میں شاندار استقبال ہوا۔ وہ حقیقتاً مدینے کے لیے زیادہ کارآمد تھے کہ وہاں سیاسی امن و امان قائم کر سکتے تھے''۔

''محمد (ﷺ) کی حیات کے دو حصے ہیں۔ مکّہ میں ان کی کوشش محض مذہب کے لیے تھی۔ دوسرے مرحلے میں انہوں نے مذہبی کام کو پسِ پشت ڈال دیا، اور سیاسی مقاصد نے غلبہ حاصل کر لیا''۔

(Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. II, p.278)

پچھلے ابواب میں ہم ٹوئن بی کا ایک تبصرہ پیش کر چکے ہیں، جس میں مدنی کامیابی کو اس نے نبوت کی ناکامی قرار دیا اور کہا کہ ''عرب کے سیزر بن کر انہوں نے مقامِ نبوت کی توہین کی''۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۴۷)

جارج برنارڈ شا کی عظمت کا کسے اعتراف نہیں۔ آزادیِ فکر کے عظیم علمبردار ہیں۔ لیکن یہی جارج برنارڈ شا جب داعیِ اسلام کا ذکر کرتے ہیں تو عجب سوقیانہ سا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ باور نہیں آتا کہ انہوں نے ہی یہ لکھا ہوگا، (نعوذ باللہ)

"It could nerve Mahomet to convert the fierce tribes of Arabia from worshipping stones to an exalted monotheism; but it could not make him say no to a pretty woman".

(Shaw on Religion; p.141, edited by Warren Sylvaster)

[محمد (ﷺ) عرب کے تند خو قبائل کو پتھروں کی پرستش سے ہٹا کر ایک خالص توحید کو منوانے کا عزم تو کر سکتے تھے مگر کسی حسین خاتون کو رد کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔]

غرضیکہ مغرب اپنی تہذیب کی برتری کا اس طرح شکار ہے کہ کسی اور تہذیب کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ دیگر عظیم تہذیبوں کو اپنا رقیب تصور کرتا ہے اور یہ رقابت ہی اسے حرفِ حق کہنے سے باز رکھتی ہے۔

مغرب کلام الملک، ملک الکلام کے بموجب اپنے جھوٹ کو بھی سچ قرار دیتا ہے۔ خود ایک انسان کو خدا تو مان سکتا ہے لیکن دوسرے انسان کو نبوت کے مقام پر بھی فائز نہیں دیکھ سکتا۔ عیسائیت کے ہر ہیرو پر روح القدس نازل ہو سکتا ہے، لیکن یہی روح القدس کسی غیر عیسائی سے تعلق قائم کر سکے، مغرب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ عالمِ بالا کو بھی وہ اپنی خود ساختہ قدروں کا پابند تصور کرتا ہے۔ پتہ نہیں کہ اپنی اس کیفیت کو وہ فطرت کی توقیر سمجھتا ہے کہ توہین۔

باب پنجم

سترہویں تا انّیسویں صدی عیسوی کا مشترکہ انداز

۱۔ اسلام، قرآن، حدیث اور حیاتِ طیّبہ پر اعتراضات

۲۔ مسخ بالعمد اور ازالۂ اعتراضات

۳۔ حیاتِ طیّبہ اور مستشرقین

۴۔ انفرادی اعتراضات

۵۔ مسخ کردہ حقائق

۶۔ کردارِ نبوی

اسلام، قرآن، حدیث اور حیاتِ طیّبہ پر اعتراضات

سینٹ جان دمشقی کا حوالہ پچھلے باب میں دیا جا چکا ہے، جس نے اسلام کو عیسائیت کی بگڑی ہوئی [بدعتی] شکل قرار دیا، اور یہ باور کرایا کہ شہنشاہ ہرقل کے دور میں ایک نبی کاذب (نعوذ باللہ) عربوں میں اٹھا، اس نے عہد نامہ قدیم و جدید سے واقفیت حاصل کی اور پھر ایک ایرین راہب سے تبادلہِ خیال کے بعد اپنا ایک فرقہ قائم کیا۔ مکارانہ یا کبازی کے ذریعے اس نے لوگوں کے دل جیتے۔ بعد میں اس نے دعویٰ کیا کہ آسمان سے اس پر ایک صحیفہ نازل ہوا ہے اور ان تمام مہمل اور مضحکہ خیز احکام کو، جو اس نے اس کتاب میں تحریر کر رکھے تھے، اپنی قوم کے لیے مقدس تعلیمات قرار دیا۔ (von Grunebaum; Medieval Islam, p.43)۔

سینٹ جان نے مندرجہ بالا خاکہ آٹھویں صدی عیسوی میں فراہم کیا تھا۔ سترہویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے معاند مستشرقین کی تحریروں کا جائزہ یہ واضح کرتا ہے کہ انہوں نے کسی نہ کسی عنوان سے سینٹ جان کی ہی پیروی کی۔ ان کا زورِ قلم سینٹ مذکور کے اجمال کی ہی تفصیل فراہم کرنے میں صرف ہوا۔ ان کے تمام اعتراضات، تنقیدیں اور تبصرے حسبِ ذیل عنوانات سے ہی متعلق نظر آتے ہیں۔

۱۔ قرآن کو غیر الہامی کتاب قرار دینا۔ اسے کتبِ قدیم کا چربہ بتلا کر اس کی مقدس تعلیمات کو مضحکہ خیز اور مہمل باور کرانا۔

۲۔ اسلام کو کھینچ تان کر عیسائیت اور یہودیت کی ہی ایک شکل قرار دینا۔

۳۔ عقائد و ارکانِ اسلام کا خاکہ اڑانا۔

۴۔ تاریخی واقعات کو مسخ کرنا۔

۵۔ تابناک کردارِ نبوی کو مغربی اقدار پر پرکھنا۔

ہر چند کہ یہی مقاصد عہدِ وسطیٰ کی تحریروں کے بھی تھے لیکن اس دور کی تحریریں حقائق سے ناواقفیت کی بنا پر بازاری رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ انیسویں صدی تک یورپ کی تمام زبانوں میں قرآن، حدیث، سیرت، مغازی اور تاریخوں کے تراجم ہو چکے تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوٰۃ المصابیح، الواقدی کی کتاب المغازی، ابنِ ہشام کی سیرت رسول اللہ ﷺ، تاریخ ابوالفداء، سمہودی کی تاریخِ مدینہ، ابنِ قتیبہ کی تاریخِ معارف، مسعودی کی تاریخِ مروج الذہب، تاریخِ یعقوبی، تاریخِ طبری، اور ابن سعد کی نادر الوجود کتاب طبقات ابنِ سعد قابلِ ذکر ہیں۔

ان اصل تاریخی تصنیفات سے واقف ہونے کے بعد انیسویں صدی کے لٹریچر میں نمایاں تبدیلی آئی۔گوئیتے، کارلائل، باس ورتھ اسمتھ، جان ڈیون پورٹ، کائیتانی، ڈوزی، رینان، ٹوئین بی، اوراسمتھ سدیو، سب کے سب انیسویں صدی کے مشاہیر ہیں جن کی تحریروں میں یہ شعوری کوشش پائی جاتی ہے کہ حقائق کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔محققین کے ایک بڑے گروہ نے تاریخ اسلام اور سیرت پر آزادانہ تحقیق کرکے کثیر تعداد میں کتابیں لکھیں۔چنانچہ صرف سیرت پر انیسویں صدی میں کم وبیش پچاس کتابیں منظرِ عام پر آئیں جن میں کارلائل، باس ورتھ، ڈیون پورٹ، سمتھ سدیو، واشنگٹن ارونگ نولد یکی، مارگولتوتھ، ولہوزن، رینان، دی پرسیوال، اسپرنگر، گاڈفرے ہگنس، ولیم میور، آنرے دی کاستری، ہنری لیمن، ویل، گولڈزیہر، اور بور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ان مصنفین کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وہ جو عربی سے واقف نہیں، اور جن کا ماخذ اوروں کی تصنیفات ہیں۔ان حضرات نے تمام مشتبہ اور ناقص مواد جمع کیا اور عہدِ وسطٰی کی یاوہ گوئی کی مطابقت میں ایک قیاسی ڈرامہ ترتیب دے کر اس کا نام سیرت رکھ دیا۔اس قسم کی کتب چونکہ یورپ کے عامیانہ مزاج کے مطابق تھیں اس لیے زیادہ مقبول ہوئیں۔یہ گروہ گویا کہ سینٹ جان دمشقی کا حقیقی پیرو تھا۔

۲۔ اس دوسرے گروہ میں عربی داں حضرات شریک ہیں۔انہوں نے صرف عربی پڑھ کر خود کو فنِ حدیث، فقہ، تفسیر، سیرت اور مغازی کا بھی ماہر تصوّر کر لیا۔محض زبان سے واقفیت کو علوم پر مہارت تصوّر کرنا خوش فہمی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔چنانچہ یہ حضرات اصطلاحات، اسلامی امور اور سیرت کے بارے میں فاش غلطیوں کے مرتکب ہوئے، مثلاً جرمن ڈاکٹر ساخو کے تراجم اور مضامین میں بعد المشرقین ہے۔طبقاتِ ابنِ سعد اور البیرونی کی کتابوں کے ترجمے اعلیٰ ہیں تو ان پر دیے گئے حواشی امورِ متعلقہ سے ناواقفیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔نولد یکی نے خاص طور پر قرآن کا مطالعہ کیا لیکن انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (جلد ۱۶) میں اس کا مضمون قرآن اس کے تعصب وجہل کا شاہکار ہے۔اسی طرح پامر کا ترجمہ قرآن ہے جس کے حواشی مغربی ذہنیت کے آئینہ دار ہیں۔یہ گروہ سینٹ جان کی پیروی پیتر- بیزیبل کے توسّط سے کررہا تھا۔

۳۔ تیسرے گروہ میں وہ مستشرقین ہیں جو عربی کے ساتھ مذہبی لٹریچر سے بھی واقف ہیں۔ان سے گو عام غلطیاں سرزد نہیں ہوتیں لیکن ان کا مطالعہ خوردبینی ہوتا ہے، یعنی مطمحِ نظر کمزوریاں تلاش کرنا ہے۔وہ تجزیاتی گفتگو کرتے ہیں اور کریمر کے اصول کے مطابق مذاہب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کی روح فنا ہوجاتی ہے۔

(H. Krammer; The Christian Message in the Non-Christian World, p. 135)

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس تجزیاتی اور خوردبینی مطالعہ کا مقصد ہی اسلام کو بے روح ثابت کرنا ہے۔ یہ حضرات سادہ سے سادہ شے کو جس میں قبح کا شائبہ تک نہ ہو اپنے فن کی مدد سے کریہہ المنظر دکھاتے ہیں۔

گزشتہ تین صدیوں میں مستشرقین اور محققین نے اسلام اور داعیِ اسلام کے بارے میں جو اعتراضات اور الزامات عائد کیے ہیں ان کے مشترکہ انداز پر آنے والی سطور میں گفتگو کی جا رہی ہے۔

اسلام

اسلام پر گفتگو کا عمومی انداز کچھ اس طرح کا ہے۔

۱۔ اسلام مذہب ہی نہیں ہے۔

(Bryan S. Turner; 'Weber and Islam', p.1)

۲۔ اسلام جنگی ٹولے کا ضابطہ اخلاق ہے۔(حوالہ بالا)

۳۔ اسلام عام مذاہب سے جدا ہے اس لیے عمرانیاتِ مذاہب سے خارج ہے۔ (ملاحظہ ہو حوالہ بالا)

۴۔ اسلام عرب جاہلیہ کی 'مروۃ' کا بدلا ہوا نام ہے۔

(Ignas Goldziher; Muslim Studies,p.22)

۵۔ اسلام دنیاوی مذہب ہے۔ اسلام مذہبِ نجات نہیں۔

(P. Hardy; Muslims of British India, p.175)

۶۔ اسلام 'لوٹ' ہے۔ (Maxime Rodinson; Mohammed, p.77)

۷۔ اسلام انفرادی مذہب ہے۔(حوالہ بالا)

۸۔ اسلام یہودیّت اور عیسائیت کا مرہونِ منّت ہے۔

(Klein, F. A; The Religion of Islam, p.21)

۹۔ داعیِ اسلام دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام دینِ ابراہیمی کی تجدید ہے جبکہ حقیقتاً یہ ایک نیا مذہب ہے۔

(Davonport, J.; An Apology for Mohammed, p.138)

۱۰۔ اسلام عیسائیت کا رقیب و دشمن ہے۔

۱۱۔ اسلام کے ارکان دوسرے مذاہب سے مستعار ہیں۔ توحید اور عبادات یہودیّت اور عیسائیت سے، حج مشرکینِ عرب سے، طوافِ کعبہ، حجرِ اسود کا بوسہ اور جانوروں کی قربانی مقامی مذاہب سے مفاہمت کی نشانی ہے۔ پس اسلام مختلف مذاہب کا اشتراک ہے۔

(H. Krammer; The Christian Message in the Non-Christian World)

۱۲۔ اسلام میں شدید جمود ہے۔ ارتقاء میں ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں۔ اس کی قدریں اپنی افادیت کھو رہی ہیں۔ سود کی حرمت، پردہ اور قطعِ ید سے خود مسلم معاشرہ بیگانہ ہو رہا ہے۔(متعدد)

۱۳۔ مسلمانوں کی پستی کا ذمہ دار اسلام ہے۔(متعدد)

۱۴۔ اسلام بزورِ شمشیر رائج کیا گیا۔(متعدد)

قرآن اور حدیث

قرآن وحدیث کے بارے میں گفتگو کا عام انداز یہ ہے۔

۱۔ قرآن کلام اللہ نہیں، داعیِ اسلام کی تصنیف ہے۔ (بیشتر)

۲۔ قرآن بے ربط، پرتکان، گنجلک اور پر پیچ ہے۔

(Thomas Carlyle; On Heros, Heroworship and the Heroic in the History, pp. 64-65) •

۳۔ قرآن کی روایات یہود کے مضامین اور بائبل کے غیر مستند مواد پر مشتمل ہیں۔

(R.A. Nicholson; Introduction to W.H. Palmer's translation of 'The Koran')

۴۔ قرآن کا اوّلین ایڈیشن ملّت نے تسلیم نہ کیا۔ موجودہ نسخہ نظرِ ثانی کے بعد ترتیب دیا گیا۔

(Muir; Life of Mohammed, pp. 555-557)

۵۔ قرآن مریم عذرا اور تورات کی مریم میں تمیز نہیں کرتا۔ نیز اس میں تورات کے کردار ہامان کو فرعون کا وزیر بیان کیا گیا ہے۔ (متعدد)

۶۔ قرآن عرب شعراء کے دیوان سے مطابقت رکھتا ہے۔

(Noldeke; Dictionary of Islam, pp.486-487)

۷۔ احادیث وضعی ہیں۔ دوسری صدی میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی عظمت بڑھانے یا قرآنی مباحث کی تشریح کے لیے وضع کی گئیں۔

(Klein; The Religion of Islam, pp.4)

۸۔ قرآنی قوانین قابلِ نفاذ نہیں ہیں۔

(von Grunebaum; Medieval Islam, pp. 143-144)

حیاتِ طیّبہ پر مشترکہ اعتراضات

سترہویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مستشرقین نے حیاتِ طیّبہ پر بے شمار اعتراضات کیے جن میں سے بیشتر مستشرقین نے ہی رفع بھی کیے۔ مستشرقین نے فریبی اور مکّار کہا تو مستشرقین نے ہی اس دعوے کی تکذیب بھی کی۔ اس میں سے بیشتر نے عالی نسبی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو ان میں سے ہی ایسے بھی ہیں جو اس انکار کو احمقانہ فعل قرار دیتے ہیں اور عالی نسبی کو ایک تاریخی حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔ بہتوں نے حضور ﷺ کے فرضی معلّم دریافت کیے تو دوسروں نے ہر معلّم کے وجود سے انکار کیا۔ انہوں نے ہی مبتذل حکایات

ترتیب دیں اور انہوں نے ہی ان حکایات کو لغو بھی قرار دیا۔ کسی کو ان کی حیاتِ طیبہ عیش و عشرت کی زندگی نظر آئی تو دوسروں نے اس زندگی کو سادہ اور میانہ روی پر گامزن پایا۔ تاہم انیسویں صدی کے اختتام بلکہ بیسویں صدی میں دوسری عالمگیر جنگ تک جو مشترکہ انداز پایا جاتا ہے اس میں بھی شدید غلط فہمی بلکہ بعض معاملات میں مسخِ عمد باقی ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ، (نعوذ باللہ)

۱۔ حضور ﷺ اگرچہ تاریخ کے دور میں تشریف لائے مگر ان کی زندگی کے حقیقی خد و خال تاریخ کی نظروں سے اوجھل اور روایات میں گم ہیں۔

۲۔ داعیِ اسلام ﷺ کو توحید پسندی کا تصوّر یہودیوں اور عیسائیوں سے ملا۔

۳۔ داعیِ اسلام ﷺ کو اندازہ تھا کہ یہود و نصاریٰ کی ترقی کا راز تورات و انجیل میں مضمر تھا۔ ان کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ ایک ایسی کتاب اپنی قوم کو دیں جسے وہ آسمانی کتاب کے طور پر قبول کرے، اور ترقی کی راہیں طے کرے۔ چونکہ عرب کے ماحول میں ایسا کر گزرنا نہایت آسان تھا اس لیے قرآن ان کا ذاتی کارنامہ ہے۔

۴۔ انہوں نے مروّجہ مذاہب کا بغور مطالعہ کیا۔ یہود و نصاریٰ کے عقائد سے آگاہی حاصل کی اور پھر ایک نیا مذہب استوار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے تمام انبیاء تورات و انجیل کے مذکور انبیاء ہی ہیں۔ اسی لیے اسلام کے ارکانِ عبادت دوسرے مذاہب سے ماخوذ ہیں۔

۵۔ مکہّ کی زندگی عسرت میں بسر ہوئی۔ دولت کی طلب نے ہر لمحہ پریشان رکھا۔ اس عسرت کے خاتمے کے لیے معمّر دولتمند خاتون سے شادی کی۔ اسی دولت کے حصول کے لیے مدینے کی زندگی میں مختلف چھاپوں اور لوٹ مار کے واقعات نظر آتے ہیں۔

۶۔ مکّی زندگی میں صرف بت پرستی کی مخالفت کی، جبکہ مدنی زندگی میں یہودیّت اور نصرانیّت سے بھی ناطہ توڑ لیا تاکہ ان کا اپنا مقام ثانوی نہ رہ جائے۔

۷۔ ابتداء میں اپنی نبوّت کا جواز پیدا کرنے کے لیے تمام عظامِ بنی اسرائیل کو تسلیم کیا کیونکہ نبوّت کا تصوّر صرف بنی اسرائیل میں تھا۔ اگر یہ سہارا نہ لیا جاتا تو محلِ نبوّت نہ رہ جاتا۔ لیکن جب قوّت مل گئی اور نبوّت تسلیم کر لی گئی تو خود کو سب سے بڑا نبی قرار دیا۔ اور سلسلہ نبوّت کو اپنی ذات پر ختم کر لیا۔ اپنے دین کو دیگر ادیان کا ناسخ قرار دیا تاکہ مسلمان ادیانِ قدیم کی طرف توجہ نہ دے سکیں اور یہ حقیقت مستور رہے کہ دینِ اسلام ان سابقہ ادیان کی ہی خوشہ چینی ہے۔

۹۔ اپنا نسبی تعلّق حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ سے قائم کیا اور انہیں بھی نبی کا درجہ دیا۔ مکّی دور میں ان کے ہیرو حضرت موسیٰؑ تھے۔ مدینے میں یہود کی مخالفت کے سبب حضرت ابراہیمؑ کو ہیرو بنا دیا۔ ان کے کارنامے بڑھا چڑھا کر بیان کیے۔ انہیں اسرائیل اور نصاریٰ

کہ دینِ ابراہیمی ہی دینِ اسلام ہے۔اس طرح اس سلسلہ تقدس کا رخ تاریخی حقیقتوں کے خلاف موڑ کر اپنی جانب کر لیا اور یہود و نصاریٰ کو نظر انداز کر کے اس ورثہ کو معرّب کیا اور اپنا قومی ورثہ قرار دیا۔مکی زندگی درویشانہ اور پیمبرانہ زندگی تھی لیکن مدنی زندگی میں پیمبری کی شان بادشاہت میں بدل گئی۔اقتدار ملنے کے بعد لوازمِ سلطنت اختیار کیے۔لشکر کشی، خونریزی، قتل وانتقام وغیرہ شیوہِ پیغمبری نہیں بلکہ دنیاوی بادشاہت کے لاحقے ہیں۔

۱۰۔ اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلایا۔

۱۱۔ کثرت ازدواج کی آڑ میں نفس پرستی کی۔

۱۲۔ مجرمین کو دی جانے والی سزائیں قتل وخونریزی ہیں اور مسلمان درحقیقت قاتل اور لٹیرے ہیں۔

۱۳۔ داعیِ اسلام ﷺ نے کئی بار موقع پرستی سے کام لیا۔اس کی تائید میں واقعہ غرانیق کو رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ کفار مکہ سے رعایات حاصل کرنے کے لیے کفار کی تین دیویوں کو شریک الوہیت تسلیم کر لیا گیا،لیکن جب حضور ﷺ کو اس کے عواقب ونتائج کا اندازہ ہوا تو اس شرکت کا انکار کر دیا۔

۱۴۔ حضور ﷺ کی ذات میں مختلف عوارض تھے۔

۱۵۔ کتبِ سیرت میں پائی جانے والی تفصیلی حیاتِ طیبہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ یہ شبہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ چونکہ کتبِ سیرت وصال کے صدیوں سال بعد تحریر ہوئیں اس لیے حضور ﷺ کی حقیقی زندگی وہ نہ رہی ہوگی جو کتبِ سیرت میں ملتی ہے۔سیرت میں عقیدت ایک مثالی زندگی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کرتی ہے۔یہ وہ واقعات نہیں جو حقیقی زندگی میں پیش آئے بلکہ وہ افسانے ہیں جو سیرت کو اسلام کی روح سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مولفین نے لکھ کر اپنے نبی سے منسوب کر دیے۔سیرت نگاروں نے اپنے ہیرو کی داستان کو موثر، پرکشش اور پرعظمت بنانے کے لیے سیدھی سادی زندگی کو عقیدت کے رنگ میں رنگ دیا۔

۱۶۔ قرآن کے محمد [ﷺ] صرف ایک انسان ہیں۔مسلمانوں نے انہیں ربانی اور ملکوتی مقام پر فائز کر دیا۔

۱۷۔ وہ معجزات جو داعیِ اسلام ﷺ سے منسوب ہیں، صرف انکی ذات کو انبیاء صادق کے ہم پلہ ثابت کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔

مسخ بالعمد اور ازالۂ اعتراضات

اسلام

'اسلام مذہب نہیں یا اسلام جنگی ٹولے کا مذہب ہے۔ اسلام انفرادی مذہب ہے۔ اسلام عرب جاہلیہ کے 'مروۃ' کا بدلا ہوا نام ہے یا اسلام لوٹ ہے'۔ یہ اور ان جیسے بے اصل اور بے بنیاد اعتراضات اس قابل بھی نہیں کہ ان پر غور بھی کیا جا سکے۔ ہر وہ شخص جو اسلام سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے ان مہمل دعووں کو لاعلمی یا پھر کذبِ عمد پر محمول کرے گا۔

'اسلام مختلف مذاہب کا اشتراک ہے۔ اس لیے اس کی تعلیمات کے سرچشمے عیسائیت اور یہودیت ہیں'۔ یہ دعویٰ بھی عہدِ وسطیٰ کے اس الاپ کی یادگار ہے جس میں اسلام کو عیسائیت کی ایک بدعتی شاخ قرار دیا جاتا تھا۔ تمام مذاہب میں چند قدریں مشترک ہیں۔ حقیقت عظمیٰ کا وجود، اس کی توقیر و تکریم، اس سے ہدایت حاصل کرنے کے مخصوص طریقے، ہدایت پر عمل، عبادت، ریاضت، تزکیہ نفس، نکوکاری، بدکاری سے اجتناب، یہی تو وہ قدریں ہیں جن پر مذاہب استوار ہوتے ہیں۔ اس بنیاد پر مذاہبِ عالم سب کے سب ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ پس ایک اصل کی دو شاخوں میں مماثلت بھی فطری ہے۔ اور کسی ایک کو دوسرے کی عاریت قرار دینا مضحکہ خیزی ہی ہے۔ اسلام کو انفرادی مذہب قرار دینا یا اس کی افادیت کو کسی مخصوص زمانے یا خطّے تک محدود کرنا بھی کھلی زیادتی ہے۔

زمان و مکاں: اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے نسلی امتیاز پر شدید ضرب لگائی۔ اقصائے عالم میں بسنے والا ہر مسلمان، بلا امتیازِ رنگ و نسل، ایک دوسرے کا ہم رتبہ ہے۔ اسلام نے عظمت کا معیار کردار کو مقرر کیا۔ ذات پات، برادری، حسب و نسب، مال و دولت، قوت و اقتدار کے امتیاز کو صرف ایک جملہ کہہ کر رد کر دیا،

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (سورۃ الحجرات۔ آیت۔ ۱۳)

''بیشک تم میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم وہ ہے جو سب سے بڑھ کر صاحبِ تقویٰ ہے''۔

یہ ایک نیا معیارِ تکریم تھا جو انسانیت کو اسلام نے عطا کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عالمِ اسلام میں مختلف النسل اقوام نے ہمیشہ ایک ملّت کی حیثیت سے گزر بسر کی۔ یہ ایسی مساوات تھی جس نے رنگ و نسل کے مسائل پر نہایت کامیابی سے قابو پایا۔ بین الاقوامی اسلامی برادری کا قیام اور اس کا استحکام ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ

قابلِ عمل نظام ہے۔ اسلام محض فرد کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ صالح افراد کے ذریعے ایک نظریاتی معاشرہ ترتیب دیتا ہے۔ یہ معاشرہ مطلق العنان، خودسر، گردن کش، جابر و بے راہ رو نہیں بلکہ قادرِ مطلق کے آگے جواب دہ ہے۔ یہاں قوانین کی پابندی کرانے کے لیے کسی بیرونی قوت اور دباؤ کا استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ یہ فرد کی اندرونی انضباطی قوت ہے جو ہر شخص کو پابند رکھتی ہے۔ اسلام نے فرد اور معاشرہ دونوں کو اپنا محاسب خود بنایا ہے۔ ایسے مذہب کو انفرادی قرار دینا یا علاقائی تصور کرنا حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

اسلام کی افادیت کو دورِ ماضی سے وابستہ کرنا بھی فیشن ہے۔ عصرِ حاضر کو کوئی صحیح الدماغ شخص دورِ ماضی نہیں کہہ سکتا۔ دیکھنا چاہیے کہ اس عہدِ حاضر کے عمومی مسائل کیا ہیں اور جو مذہب ان مسائل کے شافی حل پیش کرتا ہو اس کی افادیت سے انکار کرنے والوں کو کس زمرے میں شامل کیا جانا چاہیے۔

نسلی امتیاز: نسلی امتیاز عہدِ حاضر کا ایک نہایت اہم مسئلہ ہے جسے اسلام نے اپنے اوّلین دور میں ہی حل کر دیا تھا۔ عالمِ اسلام میں اس مسئلے کا کوئی وجود ہی نہیں۔ نسل کی طرح رنگ کے تفوق پر بھی اسلام نے ہی پہلی ضرب لگائی۔ اسود و احمر کے امتیاز کو حضور نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ختم فرما دیا جس کے باعث اس تفوق کا وجود مٹ گیا۔

بین الاقوامی برادری: دنیا نے پچھلی صدی میں بےحد مہیب عالمی جنگیں لڑیں، جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو انسانیت کی تباہی لازمی ہے۔ ٹکنالوجی نے جنگ کو ایک مہیب صنعت بنا ڈالا ہے۔ اجتماعی ہلاکت و تباہی کے جس قدر طاقت ور ہتھیار آج موجود ہیں اس سے قبل کبھی بھی نہ تھے۔ عصرِ حاضر اس تباہی سے محفوظ رہنے کے لیے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ایک عالمی برادری قائم کی جائے جہاں عالمی مسائل گفت وشنید کے ذریعے حل ہو سکیں اور قوت کا استعمال ترک ہو۔

یہ حل اسلام نے چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا۔ اس نے ابتدائی دور میں ہی بین الاقوامی برادری قائم کرنے میں پیش رفت کی اور اس برادری کو ایک اعلیٰ ضابطہ اخلاق دیا۔ اس کے حقوق کی حفاظت کی اور حق تلفی کی ممانعت کی۔ بلا فکر کبھی کوئی معاشرہ عظیم نہیں بنا۔ یہودی، عیسائی، بودھ، چینی اور روسی معاشرے سبھی کی بنیاد فکر پر ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کے سوا کوئی اور فکر بین الاقوامی معاشرہ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ دیگر مذاہب اور نظریات کا نکتۂ نظر عالمی نہیں۔ کوئی صرف ایک مخصوص نسل کی ترجمانی کرتا ہے جس کے باعث دیگر نسلیں اسے اپنے لیے قابلِ قبول نہیں پاتیں۔ دوسرا انسانی زندگی کو مختلف دائروں میں تقسیم کر کے اپنا دائرۂ کار محدود کر لیتا ہے۔ کوئی انسان کی تقسیم طبقات میں کرتا ہے اور خود کو پسماندہ طبقے کے لیے وقف کرتا ہے، اور دیگر طبقات کا وجود مٹا دینا اس کا مطمحِ نظر قرار پاتا ہے جس کے باعث طبقاتی نفرت شدید تر ہو جاتی ہے۔ اس منظرنامہ میں صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جو انسانی گروہ کو ایک مکمل نظام عطا کرتا ہے۔ ایک عالمی برادری کے قیام کی راہیں کھولتا ہے اور عالمی قوانین کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

معاشیات: آج کے دور کا اہم ترین مسئلہ معاشیات ہے۔ دنیا کے دو عظیم معاشرے (مغرب اور روس؛ جس زمانے میں یہ مقالہ لکھا گیا تھا، سوویت یونین منتشر نہیں ہوا تھا) ایسے بھی ہیں جنھوں نے معاشیات کو پر کار کا مرکز بنا کر پورے نظام کو اس کے گرد گھما رکھا ہے۔ معاش انسانی زندگی کا ایک جزو ہے کُل نہیں۔ صرف اس جزو کو اس قدر اہمیت دینا کہ کُل اس میں گم ہو جائے محض ایک ظلم ہے۔ انفرادیت کو اجتماعیت میں فنا کر دینا، فرد پر انتہائی زیادتی ہے۔ اشتراکی معاشرہ بھی جس مقصد کو لے کر اٹھا تھا اس میں ابھی تک کامیابی نہیں حاصل کر سکا۔ طبقاتی جنگ جو شروع میں بہت شدید تھی بظاہر ختم ہو چکی ہے۔ سرمایہ داروں، کولکوں (Kulaks)، جاگیرداروں اور کارخانہ داروں کا اشتراکی معاشرے سے وجود مٹ چکا ہے۔ لیکن طبقات اب بھی ہیں۔ ایک حاکم اور دوسرا محکوم۔ بہت سے طبقات مٹ چکے ہیں لیکن اسٹیٹ اب بھی باقی ہے۔ یہ اسٹیٹ جس نے ہر فرد کو اپنا تابع بنا رکھا ہے، اس معاشرے کے عوام کے لیے عظیم ترین طبقہ ہے۔ جب تک یہ نظام قائم ہے سرمایہ دارانہ نظام خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ نتیجہ یہ کہ عالمی برادری دو متحارب کیمپوں میں منقسم ہے۔ دونوں آپس میں سرد جنگ میں مبتلا ہیں جو کبھی بھی حقیقی جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

معاشی نظریات کے اس اختلاف نے پوری انسانیت کو دہشت زدہ کر رکھا ہے۔ ایک کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام استحصالی ہے تو دوسرے کے نزدیک اشتراکیت ایک لعنت ہے۔ یہ دونوں ہی ہر اعتبار سے انتہا پسند ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کی فنا دوسرے کی بقا ہے۔ یہ نظریاتی بُعد متصادم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ دونوں معاشرے ایک دوسرے کی قوت سے خوف زدہ ہیں، اور صرف اپنی بربادی کے خوف سے دوسرے پر حملہ کرنے سے گریزاں ہیں۔ لیکن امکان اس بات کا ہے کہ جیسے ہی کسی ایک کو یہ اطمینان ہوگا کہ دوسرے کو مغلوب کر سکتا ہے وہ جنگ چھیڑنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرے گا۔ یہ جنگ نسل انسانی کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگی۔ اس تباہی کا سدّ باب صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ دونوں فریق انتہا پسندی سے باز آ جائیں۔ مصالحت کی فضا پیدا کرنے کے لیے اپنے نظریات میں لچک پیدا کریں۔ جہاں اپنی اقدار کو عزیز رکھیں وہیں دوسروں کی اقدار کا بھی احترام کریں۔ اپنی اقدار کو تسلیم کرانے کے لیے قوت اور دباؤ سے گریز کریں۔ پھر جو مشترک عالمی اقدار سامنے آئیں گی وہ اسلام کی روح سے ہم آہنگ ہوں گی۔

سرمایہ داری کو سرمائے کے ارتکاز کی حد مقرر کرنی ہوگی۔ اسلام سرمائے کے ارتکاز کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ لیکن دولت کی کس مقدار کو سرمائے کا ارتکاز قرار دیا جائے اس کا تعین نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام معاشرے کو یہ اختیار دیتا ہے کہ حالات کی روشنی میں یہ حد قائم کرے۔ افراد اور گروہوں کو اس حد سے تجاوز کی اجازت نہ دے۔ اضافی دولت کا رخ معاشرے کی بہبود کی جانب پھیرے۔ یہ ایک ایسا نظام ہوگا جو سرمایہ داری کی تمام لعنتوں سے معاشرے کو پاک کر سکتا ہے۔

سوشلزم کو انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرنا ہوگا: انسان محض معاشی حیوان نہیں کہ ساری زندگی کولھو کے بیل کی طرح صرف نانِ شبینہ کے لیے پسینہ بہاتا رہے۔ سرمایہ داری نظام ہو تو اپنی محنت سے سرمایہ دار کی تجوری بھرتا

رہے اور سوشلسٹ نظام ہو تو معاشرے کے لیے فنا ہو جائے۔ یہ اس کی فطری خواہش ہے کہ اپنی صلاحیت اور اپنی محنت سے اپنی ذات کو نفع پہنچائے۔ جو کچھ اس نے کمایا ہے بلا شرکتِ غیر اس کی اپنی ملکیت ہو۔ یہ خواہش آزادی کا جزو ہے۔ انسان کو آزادی فطرتاً عزیز ہے، جس میں سیاسی آزادی، معاشی آزادی، آزادیٔ فکر، اظہارِ خیال کی آزادی، جسم و روح کی آزادی سب ہی شریک ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر بھی پابندی ہو تو مکمل آزادی نہیں رہ جاتی۔ ایک فرد کے اکتساب کو دوسرا فرد غصب کرے تو یہ لوٹ ہے اور اگر ایک پورا طبقہ اپنے اکتساب کی ملکیت کے حق سے محروم ہو تو یہ معاشی غلامی ہے۔

اسلام ان تمام آزادیوں کو حق دیتا ہے، اور معاشی آزادی کا جس قدر مکمل نظم صرف ایک بلیغ جملہ میں بیان کرتا ہے وہ سوشلزم اور سرمایہ داری دونوں کے لیے مشعلِ ہدایت ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا:

وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ○ (سورۃ النجم، آیت ۳۹)۔

''اور یہ کہ انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے خود کوشش کی''۔

لفظ انسان کا اطلاق فرد، معاشرہ اور بنی نوعِ انسان سب پر ہوتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی سعی سے پیدا ہونے والی منفعت کو فرد اور معاشرے دونوں کے لیے تسلیم کیا گیا ہے۔ سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں میں جس چیز کا مشترکہ فقدان ہے وہ میانہ روی ہے۔ سرمایہ داری اپنے جائز حقوق سے تجاوز کر کے مزدور کو اس کے حقوق سے محروم کرتی ہے تو سوشلزم فرد کی سعی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حقِّ ملکیت کو ہی تسلیم نہیں کرتا۔

اگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دونوں مروّجہ نظام اس افراط و تفریط میں اعتدال پیدا کر لیں یعنی سرمایہ کے ارتکاز کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر ہو جائے اور انفرادی یا اجتماعی پیداوار پر کارکنوں کا حق تسلیم کر لیا جائے تو دونوں متضاد اور متحارب نظاموں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے اور نوعِ انسانی کی تباہی کا خطرہ جو دونوں نظاموں کے اختلافات کے باعث درپیش ہے ٹل سکتا ہے۔

عالمی ضابطۂ اخلاق : فی الحال اس نام کی کسی شے کا وجود نہیں ہے۔ تاہم وہ وقت دور نہیں ہے جب عالمی ضابطۂ اخلاق کی ضرورت شدید ہوگی۔ عالمی قوانین، عالمی عدالتیں، مختلف عالمی اداروں کے قیام کے بعد عالمی برادری اور عالمی حکومت کی جانب پیش قدمی ہوگی جس کے لیے عالمی ضابطۂ اخلاق لازمی ہوگا۔ اسلام کا ضابطۂ اخلاق ماضی میں بین الاقوامی ضابطے کی حیثیت منوا چکا ہے۔ اسلام ہی وہ واحد نظام ہے جو عالمی ضابطۂ اخلاق فراہم کر سکتا ہے۔ اس کے معروفات اور منکرات ہی عالمی برادری کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہونگے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ دعویٰ کرنا کہ اسلام کی افادیت وقتی یا مقامی ہے، نہایت ہی مضحکہ خیز ہے۔

اسی طرح یہ تصور کہ اسلام میں جمود ہے، حرکت کو جمود سے تعبیر کرنے کا نام ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی کو اسلام سے منسوب کرنا بھی محض ایک طعن ہے۔ پس ماندگی بے عملی اور وسائل کی کمی کے سبب سے ہے۔ [اس میں بڑا ہاتھ جغرافیائی حالات اور تاریخ کے جبر کا بھی ہے۔ درحقیقت اس پس ماندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے قدرت کے باوجود اپنے دورِ عروج میں، اسلامی تعلیمات کی وجہ سے محکوموں کے ساتھ

ظلم و جور کا سلوک روا نہیں رکھا، ان کے وسائل کا استحصال نہیں کیا اور انکی نسل کشی نہیں کی، جبکہ دورِ حاضر کی ترقی یافتہ اقوام نے اس ضمن میں کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔] اس کا تعلق کسی طور بھی مذہب سے نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کا راز ان کے قبضہ کردہ وسائل اور انکی فعالیت میں مضمر ہے۔ اس میں ان کے مذاہب کا کوئی دخل نہیں۔ ورنہ مذاہب عالم میں اسلام وہ واحد مذہب ہے جو علم و عمل پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ یہی اعتراض اگر مغرب پر کیا جائے تو بے شمار تاریخی ثبوت اس امر کی شہادت دیں گے کہ مغرب نے جب تک اپنا دامن کلیسا سے نہیں چھڑایا، اس وقت تک ترقی کی راہیں مسدود ہی رہیں۔

مغرب کی ترقی کی راہ میں کلیسا سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ نشاۃِ ثانیہ کے دور میں کلیسا کو زندگی کے تمام میدانوں سے خارج کیا گیا۔ تب کہیں جا کر ارتقاء کی راہیں کھل سکیں۔ اپنی کمزوریوں اور گناہوں کو دوسروں سے منسوب کرنے کی یہ بھی ایک مثال ہے۔

توحید

اسلام کے منفرد عقیدہ توحید نے مستشرقین کو سرگرداں رکھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کریں کہ عقیدۂ توحید اسلام نے یہودیت اور عیسائیت سے مستعار لیا ہے۔ مافی الضمیر صرف یہ ہوتا ہے کہ اس انفرادیت سے اسلام کو معرّا قرار دیں۔ اس خوبی کا سہرا کسی اور مذہب کے سر نہ باندھ سکیں تو عرب جاہلیّہ سے ہی متعلق کر دیں تاکہ اسلام توصیف سے محروم ہو سکے۔ ڈی۔ جی مارگولتوتھ نے لکھا کہ قرآن کے اندازِ بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ابتداءً ان لوگوں سے مخاطب تھا جو ایک واجب الوجود کو تسلیم کرتے تھے۔ اس نے کئی مثالیں ایسی دیں جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ توحید کا وجود عرب میں اسلام سے پہلے سے تھا جسے اسلام نے اپنے اندر ضم کر لیا۔

(D.G. Margoltouth; The Origins of Arab Poetry)

سی۔ سی۔ توری نے صرف عقیدۂ توحید ہی نہیں بلکہ پورے قرآن کو عرب جاہلیّہ کے نظریات پر مبنی قرار دیا۔

"His Arabic Koran, a work of genius, the great creation of a great man, is indeed built throughout from Arabic materials." **(C.C. Torrey; The Jewish Foundation of Islam, 2nd Lecture)**

[انکا عربی قرآن، ایک فطانت کا شاہکار، اور ایک عظیم آدمی کی عظیم تخلیق، بلاشبہ اوّل تا آخر عرب مواد سے تشکیل دیا گیا ہے۔]

اس نے عربی اصطلاحات پر غور کیا اور فیصلہ دیا کہ یہ اصطلاحات عرب میں عام تھیں۔ اصطلاحات کا وجود تخیل کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ عرب جاہلیّہ میں اسے توحید کا دھندلا تصور ملتا ہے جس کا اظہار عبادات کی شکل میں نہیں ہوتا تھا۔

توری نے قرآن اور عہد نامہ قدیم میں راست تعلق قائم کرنے اور اسلام کے عقیدۂ توحید کو یہودی توحید سے ماخوذ ثابت کرنے کے لیے ایک بیرونی معلّم کی تلاش میں سرکھپایا۔ اس نے اس امر پر خاصا زور صرف کیا کہ حضور ﷺ نے اس امر سے انکار نہیں کیا کہ کسی انسان نے انہیں تعلیم دی، بلکہ اس پر اصرار کیا کہ یہ تعلیمات ان کو بذریعہ وحی ملی ہیں۔

(C.C. Torrey; The Jewish Foundation of Islam, pp. 32, 48, 50, 71, 74)

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذاہبِ عالم میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ مثلاً ہر مذہب ایک یا کئی مافوق الفطرت قوّت یا قوّتوں کا قائل ہوتا ہے۔ اس قوّت کو انسان پر اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد روحانی دنیا میں بھی اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس کے دائرۂ عمل اور اختیارات کا تعیّن ہر مذہب جدا جدا کرتا ہے۔ ان کے نام اپنے ذوق کے مطابق رکھتا ہے لیکن پرستش اسی با اختیار قوّت کی ہی کرتا ہے۔ ہر عالمی مذہب حیات بعد الممات کا قائل ہے۔ کہیں یہ حیات ایک بار اور کہیں بار بار متصوّر ہوتی ہے۔ کوئی مذہب اس حیات کو مادّی جسم کے ساتھ اور کوئی روحانی جسم کے ساتھ خیال کرتا ہے۔ ہر مذہب نے کچھ اخلاقی اور روحانی اقدار مقرّر کی ہیں۔ ان اقدار پر عمل پیرا ہونا باعثِ ثواب اور روگردانی کرنا باعثِ عذاب ہوتا ہے۔ اقدار پر عمل پیرا ہونے میں نجات کا انحصار ہوتا ہے۔ ہر مذہب اپنے ماننے والوں کو اپنے حلقۂ اثر میں رکھتا ہے اور دوسرے تمام مذاہب کے اثرات کو ناپسند کرتا ہے، وغیرہ۔

اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر مذہب ایک دوسرے کا خوشہ چیں ہے۔ اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کلیتاً ایک نیا مذہب ہے۔ اس کے برخلاف اس کی تعلیم یہ ہے کہ توحید پسندی دینِ فطرت ہے۔ تمام انبیاءِ سابقین موحّد تھے اور ایک خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان انبیاء کے گزر جانے کے بعد معاشرہ رفتہ رفتہ توحید سے غافل ہو جاتا تھا۔ اور انہیں از سرِ نو توحید کی راہ پر لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نئے انبیاء کو مبعوث کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ابتدائے نسلِ انسانی سے چلا آتا ہے۔ اس اعتبار سے عقیدہ توحید ازلی ہے، کوئی نیا نہیں۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا عقیدۂ توحید اور انبیائے سابق کا عقیدۂ توحید ایک ہی ہے تو یہ عین حقیقت ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اسلام نے یہ عقیدہ یہود و نصاریٰ سے یا مشرکینِ عرب سے حاصل کیا ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ دینِ اسلام عقیدۂ توحید کی بنیاد پر ہی استوار ہوا ہے، لیکن اگر اسکی بنیاد یہود و نصاریٰ کا عقیدۂ توحید ہوتا تو اسلام کی نوعیت ان مذاہب سے اس قدر جداگانہ نہ ہوتی۔

توحیدِ اسلام: (لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ) زندگی کا فطری قانون جلبِ منفعت اور دفعِ ضرر ہے۔ کمزور نے فقر و احتیاج رفع کرنے کے لیے ہر نفع بخش طاقت کو اور اپنی حفاظت کی خاطر، ہر ضرر رساں قوّت کو الٰہ قرار دے دیا۔ اس سے ذلّ و افتخار کی نسبت قائم کی، اور اس کے آگے سجدہ ریز ہو کر خود کو ذلیل کیا۔

لا الٰہ کے عقیدے نے انسان کو ان تمام فرضی خداؤں سے نجات دلا دی اور الّا اللہ کے اثبات نے اسے ایک ذاتِ واحد سے جو تمام صفاتِ کمالیہ سے متصف ہے، وابستہ کیا۔ اسے عزّتِ نفس دی، آزادی، بے خوفی اور قوّت

عطا کر کے نفسِ مطمئنہ عطا کیا۔ اس کی عبادت، اس کی فرمانبرداری اور اس کے حکم کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پابند کیا۔ اس کی کائنات میں اس کا بندہِ نائب ہوا۔ اسے رب کے عطا کردہ اختیارات میسّر آئے اور بندہ اپنے اعمال کا جوابدہ اپنے رب کے ہی سامنے ٹھہرا۔ سعادت اس کے لیے نصیب ہوئی اور بہیمیت اس کے لیے متروک ہوئی۔

توحید اگر بنیادی عقیدہ ہے، عمل کا مرکز ہے تو مسئلہ علم الکلام بھی ہے۔ توحید اسلامی کی وسعتیں صرف حیاتِ انسانی پر ہی نہیں بلکہ کائنات پر بھی محیط ہیں۔ چند الفاظ میں توحید یہ ہے کہ اللہ کی ذات واحد کو اس کی صفات کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔ اگر مخلوق کی صفات اس کے ساتھ وابستہ کی جائیں تو یہ تجسیم اور اگر اللہ کی صفات کسی مخلوق کے ساتھ وابستہ کی جائیں تو یہ شرک ہوگا۔ تجسیم و شرک دونوں ہی توحید سے خارج ہیں۔

صفات : لا الٰہ الا ھو، ھو الحی القیوم، ھو الظاہر و ھو الباطن، وہی اوّل وہی آخر، وہی خالقِ کائنات، اس کا علم کائنات سے وسیع تر، لا مکاں و لا زماں وہی، نور وہی حق وہی، ہر جگہ موجود، قیدِ مکانی سے منزّہ، قادرِ مطلق، کوئی کمزوری اس سے تعلق نہیں رکھتی، وہی رب جو کائنات کے ذرّے ذرّے کو تربیت دیتا ہے اور اسی تربیت کے طفیل ان کے ربطِ باہمی کا ظہور ہے اور اسی ربط سے کائنات کی فعالیت کا وجود ہے۔ وہ رحیم وہ رحمٰن، وہ کریم وہ ستار و غفّار، وہی نجات دینے والا، نہ اس کو کوئی پیدا کرنے والا، نہ اس کا کوئی بیٹا یا رشتہ دار، نہ اس کا کوئی شریک نہ مقابل، نہ مثل ہے نہ ضد، نہ صورت ہے نہ شکل، نہ جسم ہے نہ اعضاء، نہ جسد ہے نہ نہایت، نہ اس کی بدایت ہے نہ غایت، تمام قیود سے آزاد، قیدِ اطلاق سے بھی منزّہ، باعتبارِ ذات نامعلوم و ناقابلِ فہمِ انسانی، جسے صرف اس کی صفات سے جانا جا سکتا ہے، ذات سے صفات قائم، ذات میں وحدت، صفات میں کثرت، ذات غیر متبدّل، صفات میں تغیّر، ذات کو اجمال و تفصیل نہیں، صفات کو اجمال و تفصیل، تخلیق بھی اسی کی صفت، تغیّر بھی اسی کی حکمت، مخلوق کی بوسیدگی اور معدومیت بھی اسی کی قدرت، معدومیت کے اسباب اسی کے پیدا کردہ، وہ خود قادرِ مطلق، تاہم مخلوق کی محدود دائروں میں صفتِ قدرت اسی کی عطا کردہ، وہی عادل وہی منصف۔ غرضیکہ تمام دینِ اسلام کا انحصار توحید پر ہی ہے۔ عبادت کی بنیاد توحید، سعادت کا حصول توحید۔ توحید بمنزلہٗ دل ہے کہ درست ہو تو تمام بدن درست اور یہ فاسد ہو تو کل وجود فاسد۔

یہود کا تصوّرِ توحید: اس عظیم تصوّرِ توحید کو یہود و نصاریٰ یا عرب مشرکین کے تصوّرات سے ماخوذ قرار دینا صریح ناانصافی ہے۔ سوال یہ ہے کہ خود انہیں یہ تصوّر کہاں سے ملا؟ کیا یہ ان کی اپنی فکر کا نتیجہ تھا۔ اگر تھا تو فکر کا مبداء کیا تھا۔ جس مبداءِ فکر نے انہیں، موجودہ مبہم و نامکمّل، اور ہمارے یقین کے مطابق ابتداءً مکمّل تصوّر جو بعد میں مسخ ہو گیا، عطا کیا تھا اسی مبداءِ فکر نے اسلام کو بھی یہ تصوّر عطا کیا۔ یہ مبداءِ فکر ذاتِ مطلق، علیم و خبیر کی ہے۔

مروّجہ مذاہبِ عالم میں مذہبِ یہود قدیم ترین مذہب ہے جو صرف ایک خدا کی پرستش کا حکم دیتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی کتبِ مقدسہ خدا کے صحیح تصوّر سے ناآشنا ہیں۔ یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰؑ نے اپنی امم کو یہ نامکمّل تصوّر دیا ہوگا۔

اسی باعث یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان انبیاء نے جو صحیح تصورِ ذاتِ باری تعالیٰ کا امّتِ یہود یہ کو دیا تھا اس تصور کو وہ اس کی صحیح روح کے ساتھ محفوظ نہ رکھ سکے، بلکہ اس سے اپنے ذوق کے مطابق ایک ایسا خدا بنالیا جس کی صفات یہ ہیں۔

۱۔ **متذبذب خدا:** قادرِ مطلق تو ہے، حکیم مطلق نہیں۔ کتابِ پیدائش بابِ اوّل کا مطالعہ یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ عملِ تخلیق میں خدا مصروف ہے، اپنی تخلیق کے بارے میں اسے اندیشہ ہے کہ کہیں نتائج خلافِ منشاء نہ برآمد ہوں۔ تخلیقی مدارج کے بعد وہ تخلیق کا معائنہ کرتا نظر آتا ہے۔ جب نتائج حسبِ منشاء ملتے ہیں تو وہ مطمئن ہوتا ہے۔ چھ دن کی تخلیقی محنت کے بعد ساتویں دن آرام کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ گویا تھکن اور اضمحلال کے عوارض کا بھی اس سے تعلّق ہے۔ وہ ہمہ توانا نہیں۔

۲۔ **شراکت دار خدا:** یکہ وتنہا نہیں، اس کے کچھ شریکِ کار بھی ہیں جن میں بعینہٖ اس کی صفات موجود ہیں۔

''اور خداوندِ خدا نے کہا، دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں 'ہم میں سے ایک' کی مانند ہوگیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت میں سے بھی کچھ لے کر کھائے، اور ہمیشہ زندہ رہے''۔ (پیدائش، باب ۳، درس ۲۲)

یہاں نہ صرف وحدت معرضِ بحث میں آجاتی ہے بلکہ مقدرت بھی کہ حیاتِ ابدی کا تعلّق خدا کے بجائے حیات کے درخت سے تھا جس سے کچھ کھا کر انسان لافانی ہوسکتا تھا۔ اور اس کا علاج صرف یہ تھا کہ انسان کو باغِ عدن سے نکال باہر کیا جائے۔ (ملاحظہ ہو، پیدائش، باب ۳، درس ۲۳)

۳۔ **ترساں خدا:** یہود کا خدا انسان سے ترساں یعنی خوفزدہ ہے۔ اس کی ایک مثال تو اوپر آچکی ہے۔ اس کا ترساں ہونا ان سطور سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

''اور خداوند نے کہا دیکھو یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے۔ وہ جو کچھ یہ کرنے لگے ہیں تو اب کچھ بھی جس کا یہ ارادہ کریں ان سے باقی نہ چھوٹے گا۔ سو آؤ ہم وہاں جا کر ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں تا کہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکیں''۔ (پیدائش، باب ۱۱، درس ۶ تا ۷)

۴۔ **پشیمان خدا:** یہ ایک ایسا خدا ہے جو پشیمان بھی ہوتا ہے۔

''تب خداوند انسان کو زمین پر پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔ اور خداوند نے کہا 'میں انسان کو، جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین پر سے مٹا ڈالوں گا''۔ (پیدائش، باب ۶، درس ۶ تا ۷)

''اور خداوند نے ان کی (سوختنی قربانی کی) راحت انگیز خوشبو لی، اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے سبب میں پھر کبھی زمین پر لعنت نہ بھیجوں گا۔ کیونکہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے برا ہے۔ اور نہ پھر سب جانداروں کو جیسا اب کیا ہے، ماروں گا''۔ (پیدائش، باب ۸، درس ۲۱)

۵۔ **یاد دہانی کا ضرورتمند خدا:** یہود کا خدا جو عہد باندھتا ہے اس کو یاد رکھنے کے لیے اسے نشان مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا عارضہ نسیان کا اس کے ساتھ تعلّق ہے۔

''اور کمان بادل میں ہوگی اور میں اس پر نگاہ کرونگا، تا کہ عہد کو یاد کروں''۔ (پیدائش، باب ۹، درس ۱۶)

۶۔ **نسل پرستی کا حامی خدا:** یہود کا خدا صرف بنی اسرائیل کا خدا ہے۔وہ بنی نوع انسان کا خدا نہیں۔صرف بنی اسرائیل اس کی محبوب قوم ہے۔بقیہ نوعِ انسانی اس کی مغضوب ہے۔اس تصوّر نے بنی اسرائیل میں شدید قسم کی نسل پرستی کو جنم دیا۔یہود برہمنوں کی طرح اپنے آپ کو نوعِ انسانی سے افضل و برتر سمجھتے ہیں۔خود کو خدا کے بیٹی بیٹے کہتے ہیں۔بقیہ عالمِ انسانیت اس فضیلت سے محروم ہے۔

۷۔ **مغضوب الغضب خدا:** یہود کا خدا، خدائے جنگ و ربّ الافواج ہے۔مغضوب الغضب ہے۔ اس کے مغضوب الغضب ہونے کے حوالے تورات کی پانچوں کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔اس کا حکم ہے کہ مفتوحین میں سے کسی کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔شہر جلا کر راکھ کیے جائیں۔مفتوح کا مال و متاع لوٹ لیا جائے۔(استثناء، باب ۷،درس ۲ اور ۱۶، باب ۲۰، درس ۹ تا ۱۱)

۸۔ **مجسّم خدا:** یہود کا خدا مجسّم ہے جسے رہنے کے لیے مسکن کی ضرورت پڑتی ہے۔اسے بنی اسرائیل کے بزرگوں اور شرفاء نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا۔(خروج، باب ۲۴، درس ۹ تا ۱۱)

۹۔ **محدود طاقت کا خدا:** یہ مجسّم خدا محدود جسمانی طاقت کا حامل ہے جو رات بھر حضرت یعقوبؑ سے کشتی لڑتا رہا اور صبح تک انہیں نہ پچھاڑ سکا۔صبح ہوتے اپنی جان چھڑانے کے لیے اس نے یعقوبؑ کی ران کی نس دبائی جس کے صدمے سے انہوں نے خدا کو چھوڑ دیا۔اس زور آزمائی کی بدولت ہی انہیں اسرائیل کا لقب ملا جس کے لفظی معنیٰ 'خدا سے زور آزمائی کرنے والا' ہیں۔جس مقام پر یہ کشتی ہوئی اس کا نام 'فنی ایل' یعنی 'خدا کا دیدار' رکھا گیا۔اس واقعے کی یادگار میں ران کی اندرونی نس یہود پر حرام ہوئی۔ (دیکھیے پیدائش، باب ۳۲، درس ۴ تا ۳۱)

۱۰۔ **پڑوسیوں کو لوٹنے والا خدا:** یہود کا خدا غیروں کی دولت ہتھیانے کی تعلیم دیتا ہے۔

''اور یوں ہوگا کہ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے۔بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی اپنی پڑوسن سے اور اپنے اپنے گھر کے مہمان سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی۔ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے''۔ (خروج، باب ۳، درس ۲۲)

مندرجہ بالا مثالیں اس امر کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہود کی نظر میں ان کے خداوندِ خدا کا کیا مقام تھا۔یہ ضرور ہے کہ وہ بت پرست نہ تھے،ایک خدا کے قائل تھے،جس کی الوہیت میں فرشتے بھی شریک تھے۔ ان کے نظریۂ توحید اور بت پرستوں کے دیومالائی قصوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ یہود کسی مورت کو سامنے نہیں رکھتے تھے۔

نظریۂ توحید کا ارتقاء: یہود کا نظریۂ توحید ہزارہا سال کے ارتقائی منازل کا حامل نظر آتا ہے۔حضرت موسیٰؑ سے قبل کثرت پرستی پائی جاتی تھی۔مشاہیر پرستی اور آباء پرستی بھی ہوتی تھی۔ہر خاندان کے دیوتا جدا جدا تھے۔ شجر اور حیوان،مثلاً سانپ بھی معبود تصوّر ہوتے تھے۔توحید کی تجدید کے بعد دیوتاؤں کے نام محو ہوگئے،تاہم بعل

اور مولک کے نام کتابِ مقدس میں پائے جاتے ہیں جن کی پرستش ممنوع قرار دی گئی۔ ایک قدیم دیوتا ایل شدوائی تھا۔ یہی آگے چل کر 'یہواہ' ہوا۔

"یہواہ" : یہواہ کب اسرائیلیوں کا معبود بنا اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں، کیونکہ تورات کے مطابق حضرت یعقوبؑ کے زمانے تک بنی اسرائیل اس کے نام سے ناواقف تھے۔ ایک طبقے کے نزدیک یہ مدیان کا قبائلی دیوتا تھا۔ بہر حال 'یہواہ' کی ذات پر یہود کا اجماع، توحیدِ ناقص پر دلیل ہے۔ گو وہ خود صرف اسی کی عبادت کرتے تھے مگر یہ یقین بھی رکھتے تھے کہ دوسری اقوام کے معبود جدا جدا ہیں۔ گویا وہ یہواہ کے علاوہ بھی دیگر معبودوں کے وجود کے قائل تھے اور لا الٰہ کے مقام سے ناواقف تھے۔ اس اعتبار سے وہ صرف اپنے قومی خدا کی پرستش کرتے تھے جو ان کا محافظ تھا اور انہیں فتح و نصرت سے ہمکنار کرتا تھا۔ اس توحید میں آفاقیت نہیں صرف قبائلیت کارفرما تھی۔ تصور یہ تھا کہ یہواہ دیگر معبودوں سے زیادہ مقتدر ہے۔

یہواہ کا ایک حریف 'الوہ' تھا، چنانچہ تورات میں دونوں کا ہی نام آتا ہے۔ اور آخر میں الوہ کا نام ختم ہو کر یہواہ کا ہی نام رہ گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہواہ اور الوہ کے پرستاروں میں کشمکش ہوئی۔ الوہ کے پرستار ہار گئے اور یہواہ کا اقتدار مسلّم ہو گیا۔ یہواہ انسانی صفات کا حامل تھا۔ ابتداءً پتھر پر، پھر چٹان پر اور پھر خیمے میں مقیم رہتا تھا۔ جب ہیکل سلیمانی بن گیا تو اس میں مستقلاً سکونت پذیر ہوا۔ یہ خدائے جنگ تھا۔ اس کا اختیار صرف زندہ لوگوں پر نظر آتا ہے۔ موت کے بعد اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

بعد کے ادوار میں یہواہ کی صفات میں اضافہ ہوا۔ اس کے باوجود وہ شام کو ہوا خوری کے لیے نکلتا۔ اس نے حضرت نوحؑ کو شرفِ ہمرکابی بخشا۔ حضرت یعقوبؑ کو زور آزمائی سے مشرف کیا اور حضرت ابراہیمؑ سے ہم طعام ہوا۔ قومی نکتۂ نظر کے باعث یہواہ صرف یہود کا خدا تھا اور یہود صرف یہواہ کی قوم تھی۔ اس کی منظورِ نظر، اس کی روحانی اولاد، اس کی اکلوتی قوم۔ جب ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد یہواہ خدائے واحد کے مقام پر فائز ہو گیا تب یہ عقیدہ عام ہوا کہ وہی سب کچھ کرتا ہے۔ حمد و ثنا کے ساتھ دعائیں بھی شریک ہوئیں اور خوف کے ساتھ محبت کا عنصر بھی جھلکا۔

عرب جاہلیہ: عرب جاہلیہ کی توحید جس کا ذکر مغرب کرتا ہے، سرے سے توحید ہی نہ تھی۔ عرب میں پوجے جانے والے چوبیس بتوں کے نام تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ ان کے علاوہ سورج، چاند، شعریٰ، عطارد اور مشتری کی پرستش کا بھی رواج تھا۔ بعض شجر بھی پوجے جاتے تھے۔ اللہ کو بھی وہ معبودِ اعظم کی حیثیت سے جانتے تھے، جس کا کہیں کوئی بت نہیں تھا اور جس کی عبادت کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ تصور یہ تھا کہ تمام بڑے کاموں کی تدبیر اللہ کرتا ہے لیکن چھوٹے امور ان دیوی دیوتاؤں کے سپرد تھے جن سے مختلف صفات الوہیت منسوب کر رکھی تھیں۔ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ ان کے ذریعے قربِ الٰہی میسر آ سکتا ہے اور ان کی سفارش موجبِ نجات ہے۔

محض اللہ کے نام سے واقفیت اور اس کو معبود تسلیم کرنے کو مغرب توحید قرار دیتا ہے گویا شرکِ جلی اور توحیدِ مطلق میں انہیں کوئی امتیاز ہی محسوس نہیں ہوتا۔

نصاریٰ کی توحید: اسلامی عقیدۂ توحید کی رو سے نصاریٰ کا عقیدہ، توحید نہیں تثلیث ہے۔ انہوں نے یہودی عقیدۂ توحید سے بھی صریحاً روگردانی کی۔ ایک انسان کو صفاتِ الوہیت سے متصف کر کے اسے خدا کا بیٹا بنا لیا۔ اور ایک فرشتے سے یہی صفات متصف کر کے تثلیث کے اقانیمِ ثلاثہ میں اسے داخل کیا۔ اگر یسوع اور روحِ مقدس کی الوہیت سے انکار کریں تو عیسائی نہیں رہ جاتے اور اگر اقرار کرتے ہیں تو موحّد کی تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں۔ لیکن دعویٰ توحید کا عیسائی بھی کرتے ہیں۔ توحید فی التّثلیث اور تثلیث فی التّوحید کے لفظی ہیر پھیر کے ذریعے وہ یہ باور کراتے ہیں کہ یسوع اور روح القدس ایک ہی ذات کے مظہر ہیں اور اسی کے جزو ہیں۔ اسی ایک سے یہ تین ہوئے اور ان تینوں سے وہ ایک ہے۔ عیسائی توحید سے اگر اسلام متاثر ہوتا تو روح القدس اور یسوع کی الوہیت کا بھی قائل ہوتا۔ [یہ کیسا اثر ہے کہ بنیادی عناصر کو ہی غائب کر دیا گیا ہے۔] یہاں تو توحیدِ مطلق کے بارے میں "لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُولَدْ" کے الفاظ نے اس قسم کی کسی بھی فلسفیانہ موشگافی کی گنجائش بالکل ہی ختم کر کے رکھ دی ہے۔ یہ تو واضح طور پر عیسائی نظریے کی تردید ہے نہ کہ خوشہ چینی۔

عیسائی تثلیث بھی ایک معمہ ہے۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اوّل سنہ عیسوی سے چار یا سات سال قبل، یہود میں ایک نبی پیدا ہوا۔ یہود ایک مسیحا کی آمد کے منتظر تھے۔ انہوں نے اپنی توقعات اس نبی (حضرت عیسیٰؑ) سے وابستہ کیں لیکن جب وہ پوری ہوتی نظر نہیں آئیں تو ان کی نبوّت پر شک کیا۔ یہود کی شریعت کی رو سے جھوٹا مدّعیِ نبوّت موت کا سزاوار ہوتا ہے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ پر مقدّمہ چلا کر اپنی دانست میں شریعت کے تقاضے پورے کر لیے۔ تورات صرف ایک خدا کا تذکرہ کرتی ہے۔ اس کے بیٹے کے تصور سے ناآشنا ہے۔ لہٰذا کوئی یہودی اپنے آپ کو معنوی بیٹے سے بڑھ کر جسمانی یا حقیقی بیٹا تصور نہیں کرتا۔ حضرت عیسیٰؑ نے تورات کی تصدیق کی اور اس کی توحید کا احیاء کیا۔ وہ کس طرح خدائی کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد ایک دوسرا یہودی پال اٹھا۔ اس نے یہودی نبی کو خدا بنا ڈالا۔ پال افلاطون کے فلسفے سے بخوبی واقف تھا۔ مشرقِ وسطیٰ، مصر، یونان اور روما کے عقائد سے واقف تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر تثلیث کا عقیدہ پیش کیا جائے تو اس کی قبولیتِ عامّہ کے امکانات روشن ہیں۔ وہ افلاطون کے فلسفۂ تثلیث کو اس وقت تک عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا جب تک یہودی مذہب سے قطع تعلق نہ کر لے۔ چنانچہ اس نے یہودی خول کو توڑا، اور تورات کی شریعت کو لعنت قرار دیکر اس سے پیچھا چھڑایا۔

اس نے ایک ایسا عقیدۂ تثلیث دیا جس میں شام، فریجیا، مصر، عراق، یونان اور رومہ کے مروّجہ عقائدِ تثلیث کو ضم کرنے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ پرانے دیوی دیوتاؤں کے ناموں کی جگہ پال کے اقانیمِ ثلاثہ نے لے لی۔ صرف نام بدلے، کافرانہ عقائد جوں کے توں قائم رہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عقیدۂ توحید کا تثلیث سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا توحید کو عیسائیت کے اثرات کہنا آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔

پس ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ اسلام کو عقیدۂ توحید کسی بھی مروّجہ مذہب سے وراثت میں نہیں ملا۔ اس کا تعلق انسانی فکر کے ارتقاء سے نہیں ہے بلکہ براہِ راست وحی سے ہے۔

اسلام کے ارکانِ عبادت

مستشرقین کی جانب سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قرآن کی مختلف اصطلاحات غیر مذاہب اور غیر زبانوں سے مستعار ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جب الفاظ مستعار ہیں تو ان کے معنیٰ اور مفہوم بھی درآمد کیے گئے ہیں۔ گویا اسلام دیگر مذاہب کا محض چربہ ہے۔ پچھلے باب میں کریمر کا تذکرہ آچکا ہے جس میں اس نے اسلام کو ایک ایسا مذہب قرار دیا ہے جو مختلف مذاہب کے اشتراک سے بنا ہے۔

شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں قرآن کے مختلف الفاظ اور اصطلاحات کو بیرونی الفاظ اور اصطلاحات کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

(cf. Shorter Encyclopedia of Islam; article 'Quran', pp. 273-274) ۔

مثلاً

<u>ارامی سے مشتق</u> اللہ-الاہا، امّت-اُمّتہ، سجدہ-سگد، کرسی-کرسیا، مدینہ-مدینتہ، مسجد-مسگد، ملّت-ملّا

<u>عبرانی سے مشتق</u> امّت-امّہ، آیت-ادت، جبروت-جبروت، جہنّم-گہنّم، صدقہ-صداقہ، صلوٰۃ-صلوتا، عاشوراء-عاشور، قرآن-کریانا، قربان-قوربان، کروبیون-کروبین، ملّت-ملّہ، مہر-موہار، نبی-نابی

<u>سریانی سے مشتق</u> دجّال-دگالے یا دغالے، فرقان-فرکانا، مہر-مھرہ

<u>حبشی سے مشتق</u> سجدہ-مسگاد، منافق-منافق

<u>فارسی سے مشتق</u> برزخ-فرخ

<u>سامی سے مشتق</u> ملائک-ملک

ان کا مافی الضمیر یہ ہے کہ جس مذہب کے پاس اس کے اپنے الفاظ نہیں ہیں وہ ان تصورات سے بھی بیگانہ تھا۔ چونکہ اللہ، قرآن، صلوٰۃ، سجدہ، ملائکہ، مسجد، آیت اور قربان جیسے بنیادی الفاظ مستعار ہیں اس لیے یہ سارے تخیّلات اور ارکانِ عبادت ان مذاہب سے مستعار ہیں جن میں یہ الفاظ پائے جاتے تھے۔ ان الفاظ میں سے بیشتر چونکہ عبرانی سے تعلّق رکھتے ہیں اس لیے یہ سب اثرات یہود کے مذہب سے قبول کیے گئے ہیں۔

اسی اندازِ فکر کے باعث کائتانی، وینسنک اور بوہل (Buhl) نے روزے کو عیسائی، مجوسی اور عرب بت پرستوں کی عبادت قرار دیا۔ (cf. Montgomary Watt; Mohammed at Medina, p.203)۔

بوہل نے جنگِ بدر کو حضرت موسیٰ کے خروج کی مناسبت سے فرقان کہا کہ جس طرح حضرت موسیٰ نے خروج کی کامیابی پر عاشوراء کے روزے رکھنے کا حکم دیا تھا اسی طرح بدر میں کامیابی پر رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ (cf. Buhl; Origin of Islam, p.124)۔ حالانکہ روزے جنگِ بدر سے قبل فرض

ہو چکے تھے اور ۱۷ رمضان ۲ ھ کو جب جنگِ بدر ہوئی تو روزے رکھے جا رہے تھے۔ بیت المقدس کو قبلہ قرار دینے میں بھی انہیں یہی اثرات کارفرما نظر آتے ہیں۔ مدینہ میں مسجدِ نبوی کی تعمیر کو یہود کے ہیکل کا اثر کہا گیا۔

(cf. Montgomary Watt; Mohammed at Medina, p.200)

کعبے کی حرمت، طواف اور حج کو تو شعارِ جاہلیہ قرار دیا ہی جا چکا تھا، زکوٰۃ کو سریانی اور عبرانی زبانوں کا لفظ قرار دیکر جس کے معنیٰ ان زبانوں میں 'اعلیٰ اخلاق' کے آتے ہیں، اسے بھی بیرونی اثر قرار دیا گیا۔ جہاد تو ان کے نزدیک نہایت ہی ناپسندیدہ فعل ہمیشہ سے رہا ہے، اسے تو مذہبی عمل سے خارج قرار دیا گیا۔ حنیف کے لفظ سے عرب واقف ہی نہ تھے، یہ لفظ بیرونی زبانوں میں بے دین، بدعتی اور منافق کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا، لہٰذا اسلام، جو خود کو دینِ حنیف کہتا ہے، بے دینی، بدعت اور منافقت کا دین ہوا۔

تاراندرے نے اخلاق کے موضوع پر یہ فیصلہ کر دیا کہ اسلام کی مذہبی قدریں، مثلاً دنیاوی مال و دولت سے بیزاری، غرور سے نفرت، بے دینوں سے لاتعلقی، ہنسی ٹھٹھے سے گریز، مذاق اور غیر محتاط گفتگو سے پرہیز، خیرات کی اہمیت پر زور، گناہوں کا کفارہ، جنت کا تخیل، یہ سب کے سب شامی عیسائیوں (نسطوریوں) کی تحریروں سے بھرپور مماثلت رکھتی ہیں۔(Shorter Encyclopedia of Islam, p.393)

الفاظ کی مماثلت : ۵۲۰۰ قبلِ مسیح تا ۱۵۰۰ قبلِ مسیح جو قومیں شام، فلسطین، عراق، عرب، فنیشیہ، اور مصر میں آباد تھیں ان کے کردار، زبان عقاید اور معاشرت میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کے سبب یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ تمام اقوام جو بابلی، آسوری، کلدی، آموری، عبیری، عربی اور مصری کہلاتی تھیں، سب کی سب ایک نسل سامی سے تھیں۔ سامی نسل کا اصل وطن کہاں تھا، ماہرین اس ضمن میں مختلف الخیال ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ شمالی افریقہ سے پھیلے۔ دوسرا گروہ جو عہد نامہ عتیق سے متاثر ہے ان کا اصل وطن دجلہ وفرات کی وادی کو قرار دیتا ہے۔ ان دعووں کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی معاشرے نے زرعی زندگی اختیار کرنے کے بعد بدوی زندگی اختیار کی۔ یہ طریقۂ عمل قانونِ ارتقاء کے خلاف ہے۔

اب مورخین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ،

''سامی تہذیب کا گہوارہ یہی خطۂ عرب تھا۔ اسی نے ان سپوتوں کو پروان چڑھایا جو ترکِ وطن کر کے ہلالِ تہذیب میں آ بسے اور بعدہٗ فنیقی، شامی اور بابلی کہلائے۔ یہی لوگ تاریخ کے عبرانی لوگ ہیں۔ سامی تہذیب کی اسی سرزمین سے یہودیت کے آثار نمایاں ہوئے۔ یہیں عیسائیت پروان چڑھی۔ اسی ریگزار سے ایک نیا مذہب اسلام ابھرا''۔ (Phillips K. Hitti; History of Arabs, p.3)۔

جب سامی نسل عرب کے ریگزاروں سے نکلی ہوگی تو وہی زبان لے کر نکلی ہوگی جو اس دور میں عرب میں بولی جاتی تھی۔ بعد کے ادوار میں ان زبانوں میں تبدیلی آتی گئی اور یہ زبان آرامی کہلائی۔ یہ حقیقت ہے کہ شام و عراق اور عرب تینوں جگہ آرامی رائج تھی۔ شامی آرامی سے عبرانی، بابلی آرامی سے کلدانی، اور عربی آرامی سے عربی وجود میں آئی۔ عرب کے یمنی قبائل نے حبشہ میں اپنی نو آبادیاں قائم کیں تو ان کی زبان اور مقامی زبان

کے اشتراک سے حبشی زبان نے ترقی کی۔ یہاں تک کہ علمائے لسانیات حبشی زبان کو عربی زبان کی شاخ قرار دیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو مولانا سیّد سلیمان ندوی؛'ارض القرآن'، باب 'زبانیں')۔

وہ قومیں جو عرب سے باہر نکل گئیں اور جنہیں بیرونی اقوام سے سابقہ پڑا، ان کی زبانیں آہستہ آہستہ بیرونی اثرات کے تحت تبدّل وتغیّر کا شکار ہوئیں، لیکن وہ لوگ جنھوں نے عرب میں ہی بود و باش رکھی ان کی زبان بیرونی اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رہی۔ گویا انہوں نے اصل سامی زبان یا آرامی زبان کو تغیّر و تبدّل سے محفوظ رکھا۔ لہٰذا ایک ہی اصل زبان کی مختلف شاخوں میں اگر الفاظ مشترک ملتے ہیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ جس طرح مغرب ان الفاظ کو غیر زبانوں کے الفاظ کہنے پر مصر ہے اسی طرح اگر دعویٰ کیا جائے کہ یہ سارے اصلاً عربی الفاظ ہیں، جنہیں حبشی، آرامی، سریانی اور عبرانی زبانوں نے مستعار لے رکھا ہے تو بعید از قیاس نہ ہوگا۔

بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ الفاظ سے پہلے ان کے اصطلاحی معنی اور مطالب اخذ کیے گئے، اور چونکہ ان کے لیے متبادل الفاظ میسّر نہ تھے اس لیے انہی الفاظ کو قائم رکھا گیا۔ لیکن اگر عربی لغات اور عبرانی لغات کا موازنہ کیا جائے تو روزمرّہ کے استعمال اور بنیادی ضروریات کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ مشترک پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اب، ارض، اسیر، امر، امّ، امّہ، برد، برق، برکت، بطن، بکا، بکر، بن، بنت، بہق، بہیمہ، بئر، بیت، بیضہ، تلمیذ، تنّور، جبل، جمل، حرب، حرم، حکمت، حشر، حکیم،، دم، ذئب، زرع، ستر، سفل، سفینہ، سکت، طعم، طعن، طہر، طول، عبد، عتیق، عقب، عقد، عقرب، عمل، عنب، عنق، عین، کبد، کبش، کبیر، کتاب، کذب، کرم، کنز، کوکب، لبن، لحم، لعب، لعن، لہب، ماء، ملح، مر، مسکن، ملک، ملبوس، من، موت، نصر، نہار، نہر، نور، ہوا، ولد، ید، یلد، یم، یمین، یوم، وغیرہ وغیرہ۔

کیا ان کے اور ان جیسے الفاظ کے مشترک ہونے کے معنی یہ لیے جاسکتے ہیں کہ عربوں کو ان بنیادی الفاظ کے لیے عبرانی کا منت کش ہونا پڑا، اور ان الفاظ کے متوازی الفاظ عربی میں موجود نہیں تھے۔ یا یہ کہ چونکہ یہ الفاظ عبرانی سے لیے گئے اس لیے ان الفاظ سے متعلق معنی اور تصوّر بھی مستعار لیا گیا۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ایک ہی شاخ کی دو زبانیں اگر مشترک الفاظ رکھتی ہیں تو اس میں طعن کیا ہے۔ چلیے اگر مغرب کا یہ دعویٰ صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ متنازعہ الفاظ عربی میں پہلے سے مستعمل تھے کہ نہیں۔ اس کا جواب خود توری کی زبان سے یہ ہے کہ،

"All the properties of the Quranic diction including the foreign words and proper names, had been familiar in Mekka before he appeared on the scene." **(C.C. Torrey; The Jewish Foundation of Islam, 2nd Lecture, 'Genesis of the New Faith'.)**

[قرآنی لغت کے تمام عناصر، بمعہ بیرونی الفاظ و اسمائے خاص، ان (محمد ﷺ) کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے سے مکّے میں عمومی طور پر رائج تھے۔]

علاّ مہ جلال الدّین سیوطی نے اپنی کتاب 'الاتقان' میں ایک باب (نوع -۳۸)، قرآن میں مستعمل غیر عربی الفاظ کے لیے وقف کیا ہے، اور تقریباً سو (۱۰۰) ایسے الفاظ بیان کیے ہیں جو عربی الاصل نہیں ہیں۔ امام شافعیؒ، ابوعبیدہؒ اور ابن اوسؒ، قرآن میں غیر عربی الفاظ کے استعمال کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ ابنِ جریر کا قول ہے کہ ان الفاظ میں توارد ہو گیا ہے۔ بیشتر علماء اور مفسّرین کا مسلک یہ ہے کہ الفاظ معرّب ہو چکے تھے۔ عربی بول چال اور اشعار میں کثرت سے استعمال ہونے لگے تھے۔ اس اعتبار سے ایسے تمام الفاظ عربی ہی شمار ہوتے ہیں۔

ارکانِ عبادت : یوں تو معاندین کی طرف سے اسلام کی تمام عبادتوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے لیکن حج اور جہاد خاص طور پر زیرِ بحث آتے ہیں۔ جب اسلام کا نظریہ ہی یہ ہے کہ آدم سے لیکر خاتم النّبیین ﷺ تک تمام انبیائے صادق اللہ کے ہی مبعوث کیے ہوئے ہیں اور ان سب کی تعلیم مشترک ہے، لہٰذا اگر عبادتوں میں مماثلت پائی جاتی ہے تو اسمیں حیرت کی کیا بات ہے؟ یہ حیرت تو اس وقت بجا ہوتی اگر اسلام کے بارے میں یہ دعویٰ ہوتا کہ یہ ہر مذہب سے مطلق جداگانہ ایک نیا مذہب ہے اور اسے کسی اور نبی کی تعلیمات یا دستور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عبادت معبود کی عظمت وجلال اور قوّت وجبروت کے اعتراف اور بندے کی کمتری اور بندگی کے اظہار کا نام ہے۔ یہ اظہار مختلف جذبات کے اظہار کی طرح فطری ہے۔ مختلف جذبات کا اظہار بلا استثناء زمان ومکان انسان، ایک جیسے انداز میں کرتا ہے۔ غصہ ہو خوشی ہو یا رنج، پشیمانی تاسّف وندامت، ہمدردی، محبت ودشمنی، ان سب جذبات کے اظہار میں ہر فرد کی کیفیت کم وبیش یکساں ہوتی ہے۔ ان کیفیات اور اسکے اظہار میں کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ ایک دوسرے کی نقالی ہے۔ یہ تو انسانی فطرت کی یکسانیت ہے۔ بندگی بھی فطری جذبہ ہے۔ اس کے اظہار میں بھی یکسانیت فطری ہے۔

اسلام کا دوسرا نام دینِ ابراہیمی و دینِ حنیفہ ہے۔ یہودیّت وعیسائیت بھی حضرت ابراہیمؑ سے اپنے آپ کو منسوب کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے ارکانِ عبادت میں مماثلت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ان سب کے باوجود عملاً اسلام اور دیگر مذاہب کے طریقِ عبادت میں واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔ [واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عمداً یہ کوشش ہوتی تھی کہ عبادات میں خصوصاً یہود کی مماثلت سے بچا جائے۔]

اذان : اسلام میں اذان عبادت کے سلسلے کا پہلا قدم ہے۔ یہ فضائے عالم میں بلا انقطاع چوبیس گھنٹے گونجتی رہتی ہے۔ اسے ناقوس، قرنوں یا گھنٹیوں سے کوئی تعلّق نہیں۔

صلوٰۃ : دوسرے مذاہب میں پیشہ ور افراد عبد اور معبود کے درمیان حائل ہیں۔ وہاں کوئی عامی اپنے رب سے براہِ راست تعلّق نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ کوئی عیسائی بلا پادری کے عبادت نہیں کر سکتا۔ اور عامی کی عبادت بھی اس کے سوا کیا ہے کہ اتوار (یوم الشّمس) کو گرجے میں کچھ دیر کے لیے حاضری دے لے۔ ایک خطبہ سنے۔ اگر استغراق کا اہل ہے تو کچھ دیر استغراق کی کوشش کرے اور پھر لوٹ جائے۔

جماعت، امامت، تکبیر، تثنیہ، قرأت، قیام، رکوع، سجود، قعدہ وسلام کی جو کیفیت اسلام میں ہے، [illegible] مماثلت نہیں [illegible] سب سے اہم [illegible] فرد اپنی عبادت کے لیے کسی

پیشہ ور پنڈت یا پادری کا محتاج نہیں ہے۔ یہاں چرچ کا کوئی وجود نہیں۔ علماء کا وجود نہایت اہم اور ضروری ہے، لیکن وہ پیشہ ور مذہبی کارندے نہیں ہیں۔ ان کی عدم موجودگی کے باعث کوئی عبادت بھی متاثر نہیں ہوتی۔

روزہ : روزہ بھی کسی نہ کسی شکل میں ہر مذہب میں پایا جاتا ہے جس کا انشاء تزکیہ نفس ہے۔ اس اشتراک کے علاوہ اور کوئی مماثلت اس عبادت کی کسی اور مذہب سے نہیں۔ ایک ماہ کے مسلسل روزے، فجر سے لیکر مغرب تک خورد ونوش سے پرہیز، ہر برائی سے دامن کشی، عبادت میں انہماک، اور کہاں ہے؟ پھر یہ عبادت اختیاری نہیں بلکہ ہر بالغ مسلمان مرد و عورت پر فرضِ عین ہے۔ پوری امت ساری دنیا میں بیک وقت اللہ کے حکم کی بجا آوری میں صائم ہو جائے، اس کی نظیر دیگر ادیان میں اگر پائی جائے تب ہی اس کا مستعار ہونا محلِ غور ہو سکتا ہے۔

زکوٰۃ : یہ ایک مالی عبادت ہے، ٹیکس نہیں۔ صدقہ اور خیرات نہیں۔ حکم خداوندی کے تحت مال کو بھی پاک کیا جاتا ہے۔ اگر مال کا تزکیہ نہ کیا تو وہ مال طیّب نہیں رہ جاتا۔ نہ جانے اس تصوّر کو کس اعتبار سے شامی عیسائیوں سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان میں بھی خیر خیرات کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ دان پن کا تصوّر نہایت قدیم سہی لیکن تزکیہ مال کا تصوّر اسلام کے سوا اور کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔

جہاد : مسبب الاسباب پر کلّی توکّل کا فطری نتیجہ یہی ہے کہ انسان کے ذمّے صرف پر خلوص کوشش رہ جاتی ہے۔ اس کوشش کے نتائج و عواقب کو اس اللہ کی مرضی کا تابع گردان کر، جو فاعلِ حقیقی، افعال و آثار کا مرجع، حول وقوّت کا مبداء ہے، اور تمام امور اس کو تفویض کر کے اس کے احکامات کے مطابق جدّ و جہد کی ذمّہ داری فرد و ملّت پر رہ گئی۔ اس ذمّہ داری سے پر خلوص، انتھک کوشش کے ذریعے عہدہ برآ ہونے کا نام جہاد ہے۔ جہاد کے متعدد دائرہ ہائے عمل ہیں۔ یہ افراد سے شروع ہوتا ہے اور معاشرے پر محیط ہوتا ہوا بین الملّی حدود تک پہنچتا ہے۔

فرد کا جہاد یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔ کردار کی صحیح خطوط پر تعمیر کرے اور حصول سعادت کے لیے کوشاں ہو۔ اندرونی کشمکش میں حق کو باطل پر غالب کرے۔ اپنی قوت بہیمیہ کو مغلوب اور قوّت ملکیہ کو مستحکم کرے۔ جہاد کا دوسرا دائرہ عمل یہ ہے کہ صرف اپنی ہی نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح کو مدّ نظر رکھے۔ معاشرے کو باطل اثرات سے پاک کرے اور حق کی سربلندی کی جدّ و جہد کرے۔ تیسرے دائرۂ کار میں ملّت کی فلاح و بہبود آتی ہے۔ پوری ملّتِ اسلامیہ میں باطل کے مقابلے میں حق کی جدّ و جہد کرنا۔ چوتھا دائرۂ کار اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کو بیرونی جارحیت سے محفوظ رکھنا ہے۔

جہاد محض قلم سے ہی نہیں، زبان، قلم اور ارادے سے بھی کیا جاتا ہے۔ اللہ کی راہ میں ہر جدّ وجہد جہاد ہے۔ جہاد صرف وہ ہے جو خالصتاً اللہ کے لیے ہو۔ وہ شخص جو کسی اور نیت سے قتال کرتا ہے مثلاً اپنی شجاعت کے اظہار کے لیے یا قبائلی غیرت کے سبب مجاہدین کے ساتھ ہو، اور وہ اس میں اپنی جان بھی دیدے، تو اس کا یہ عمل جہاد ہرگز نہیں ہوگا۔ کیونکہ نیّت کے اعتبار سے وہ راہِ خدا میں مخلص نہیں تھا۔ غرضیکہ جہاد ایک عبادت ہے اور دیگر عبادتوں سے افضل۔ اور جہاد کا اعلیٰ ترین مقام حق کی حفاظت کے لیے باطل کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جانا ہے۔

حج: عام طور پر حج کے بارے میں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ مشرکینِ عرب کی ایک رسم تھی، جسے اسلام نے مقامی اثرات کے تحت یا مشرکینِ عرب کو خوش کرنے کے لیے اپنا لیا۔ واٹ نے اس مغربی تصور کی ترجمانی یوں کی کہ،

"When one religion replaces another, it usually finds it advantageous to take over the previous observance of sacred places and sacred times and gives it justification from its own tradition. In Islam pre-Islamic rites connected with the pilgrimage to Mecca have been taken over in their external forms, but have been given an Islamic significance."

(Watt, M.; Truth in the Religions, pp. 28-29)

[جب ایک مذہب دوسرے کی جگہ لیتا ہے تو عموماً اسے پچھلے مذہب کے مقدس مقامات اور مقدس ایام کو اپنانے میں فوائد نظر آتے ہیں، لیکن ان ماخوذ چیزوں کو نیا مذہب اپنی تاویلات دیتا ہے۔ اسلام میں زمانۂ قبل از اسلام کی مکّہ کی زیارت کی رسوم اپنی ظاہری شکل میں اپنالی گئی ہیں۔ لیکن انہیں اسلامی اہمیت دے دی گئی ہے]۔

شارٹر انسائکلو پیڈیا نے ڈوزی کے حوالے سے تمام رسومِ حج کو اسرائیلی رسوم سے مماثل قرار دیا۔ **(Shorter Encyclopedia of Islam, p.124)**۔ اور مضمونِ حج میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ حضور ﷺ کا حج کے بارے میں عقیدہ یکساں نہ تھا۔ مکّی اور ابتدائی مدنی سورتوں میں حج کے بارے میں کوئی حکم نہیں ملتا۔ نیز یہ کہ مدینے میں بھی حج میں دلچسپی بدر کے بعد نظر آتی ہے۔ چونکہ یہودِ مدینہ کے معاملے میں سخت ناکامی ہوئی اس لیے ان سے مذہبی رشتہ توڑا۔ اس دور میں مذہبِ ابراہیمی کا تذکرہ سامنے آیا، اور دعویٰ کیا گیا کہ اسلام اور یہودیت کی حقیقی شکل دینِ حنیفہ تھا۔ تعمیرِ کعبہ حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسمٰعیلؑ سے منسوب کی اور کعبہ کو مرکزیت دی۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۲۳)۔ ولہوزن نے حج کو موسمی تہوار قرار دیا جو عرب کھجوروں کے پک جانے کے بعد منایا کرتے تھے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۲۳)۔

انسائکلوپیڈیا کا یہ تبصرہ پریشان خیالی اور تضاد بیانی کا شاہکار ہے۔ ولہوزن کی بات مانی جائے تو ڈوزی کا نظریہ مسترد ہو جاتا ہے۔ ڈوزی کا نظریہ قبول کیا جاتا ہے تو انسائکلو پیڈیا کی ماہرانہ رائے بے معنی ہو جاتی ہے۔ اگر حج یہود سے مستعار ہوتا تو یہود سے مذہبی ناطہ توڑنے کے بعد اس کو اپنانے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی ناطہ کون سا تھا جو توڑ لیا گیا۔ کیا پہلے اسرائیل کے خدا کو خدا کہا گیا پھر اسے تختِ الوہیت سے برطرف کر دیا گیا یا اس کا کوئی رقیب کھڑا کر دیا گیا۔ یا شریعتِ یہود کو تسلیم کرنے کے بعد اس کو لعنتی قرار دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا ضرور، لیکن الحمدللہ کہ یہ داعیِ اسلام ﷺ نے نہیں بلکہ ساؤل یا پال نے کیا۔

توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانے کی ضرورت ہے کہ حج، خانۂ کعبہ، طواف اور قربانی کا احترام ابتدائے اسلام سے ہی پایا جاتا ہے۔ سورۃ قریش جو ابتدائی مکّی سورتوں میں ہے، خانۂ کعبہ کو بیت اللہ قرار دیتی ہے۔ سورۃ کوثر قرآن کی مختصر ترین سورۃ، جو مکّی ہے اسمیں نحر یعنی قربانی کا حکم موجود ہے۔ اسلام میں قربانی کا تعلق صرف حج سے ہے۔ کسی اور عبادت کے ساتھ قربانی وابستہ نہیں۔ مکّی دور میں حضور ﷺ اور انکے اصحاب

کے طواف کعبہ کے تذکرے موجود ہیں۔ ہجرتِ مدینہ سے قبل انصار سے دو مرتبہ بیعت لی گئی۔ یہ دونوں بیعتیں بیعتِ عقبہ کہلاتی ہیں۔ یہ کس مقام پر ہوئیں۔ کیا عقبہ منیٰ کی ایک گھاٹی کا نام نہیں، اور منیٰ صرف حج کے دوران آباد ہوتا ہے۔ اگر حضور اور ان کے اصحاب عقبہ میں موجود تھے تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ مناسکِ حج ادا کرنا مقصود نہیں تھا۔ تبلیغ تو اور مقامات پر بھی ہو سکتی تھی کہ شرکائے حج، حج سے پہلے اور حج کے بعد، مختلف بازاروں اور میلوں میں خاصی مدّت قیام کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حج کے واضح احکامات موجود نہ ہونے کے باوجود ہجرت سے قبل بھی حج کو اسلامی عبادت کا مرتبہ حاصل تھا۔

بیعت عقبہ سے قبل چھ [۶] انصارِ مدینہ نے دعوتِ اسلام قبول کی تھی۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ میں ان میں سے پانچ [۵] موجود تھے۔ بیعت عقبہ ثانی میں تہتر [۷۳] انصار نے بیعت کی، جن میں گیارہ [۱۱] افراد وہ بھی شریک تھے جو بیعتِ اولیٰ میں مشرّف باسلام ہو چکے تھے۔ درج ذیل جدول سے یہ کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔

شمار	قبلِ بیعت ایمان لائے	بیعت عقبہ اولیٰ ۱۲ نبوی کے شرکاء	بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانی ۱۳ نبوی میں مشترک
۱	اسعدؓ بن زرارہ	اسعدؓ بن زرارہ	اسعدؓ بن زرارہ
۲	عوفؓ بن حرث	عوفؓ بن حرث	عوفؓ بن حرث
۳	رافعؓ بن مالک	رافعؓ بن مالک	رافعؓ بن مالک
۴	قطبہؓ بن عامر	قطبہؓ بن عامر	قطبہؓ بن عامر
۵	عقبہؓ بن عامر	عقبہؓ بن عامر	-
۶	جابرؓ بن عبداللہ	-	جابرؓ بن عبداللہ
۷	-	ذکوانؓ بن عبدقیس	ذکوانؓ بن عبدقیس
۸	-	عبادہؓ بن صامت	عبادہؓ بن صامت
۹	-	ابوعبدالرحمٰنؓ یزید بن ثعلبہ	ابوعبدالرحمٰنؓ یزید بن ثعلبہ
۱۰	-	عباسؓ بن عبادہ	عباسؓ بن عبادہ
۱۱	-	ابوالہیثمؓ مالک بن تیہان	ابوالہیثمؓ مالک بن تیہان
۱۲	-	معاذؓ ابن الحرث	معاذؓ ابن الحرث

(ناموں کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سیرۃ ابنِ ہشام، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، صفحات ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۲۳-۲۲۶)

یہ جدول ظاہر کرتی ہے کہ ان چھ [۶] افراد میں سے جنہوں نے ۱۱ نبوی میں اسلام قبول کیا، پانچ [۵] نے ۱۲ نبوی میں حج کیا۔ اور بیعت عقبہ اولیٰ کے بارہ [۱۲] میں سے گیارہ [۱۱] شرکاء نے ۱۳ نبوی میں فریضہ حج ادا کیا۔ اس جدول کی رو سے ایک اشکال اب بھی باقی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ شرکاء ممکن ہے حج کی نیّت سے نہ آئے ہوں، بلکہ چونکہ مدینے میں اسلام کی تبلیغ جاری تھی اس لیے تبلیغ کے سرگرم ارکان نے محض تبلیغی مقاصد کے لیے یا رابطہ پیدا کرنے کے لیے شرکت کی ہو۔

یہ اشکال بھی شرکاء کے اپنے بیان سے ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت کعبؓ بن مالک جو بیعتِ ثانی کے شرکاء میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

''ہم اپنی قوم کے ساتھ جس میں مسلمان بھی تھے اور مشرکین بھی، حج کرنے کے لیے چلے۔ اور ہم میں ہمارے بزرگ اور سردار براءؓ ابن معرور بھی تھے۔ اور ہم لوگ نماز بھی پڑھتے تھے اور دین کی باتوں سے بھی واقف ہو چکے تھے''۔ (ابنِ ہشام، صفحہ ۲۱۵)

ابنِ ہشام اور دیگر علمائے سیر نے بیعتِ ثانیہ کے موقعے پر مسلمانوں کی آمد کا مقصد ادائیگی حج بیان کیا ہے۔ ہجرت کے بعد بھی ابتدائی ایام میں زیارتِ بیت اللہ کے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ ہجرت کے بعد حضرت سعدؓ بن معاذ کعبہ کے طواف میں مصروف تھے کہ ابو جہل سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ابو جہل نے انہیں دھمکایا کہ تم لوگوں نے ہمارے مقابلے میں محمد (ﷺ) اور انکے ساتھیوں کو پناہ دی ہے اس لیے ہم تم لوگوں کا وجود مکّے میں برداشت نہیں کرسکتے۔ جس کے جواب میں حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ اگر تم نے ہم لوگوں کی مناسک حج کی ادائیگی میں رکاوٹ پیدا کی تو ہم بھی تمہارے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت اپنے علاقوں میں روک دیں گے۔

جنگِ بدر کے بعد قریش اور مسلمانوں کی دشمنی اتنی شدید ہو چکی تھی کہ اگر کوئی اکا دکا مسلمان ہتھے چڑھ جاتا تھا تو قریش اسے جنگِ بدر کے مقتولین کے انتقام میں قتل کر ڈالتے تھے۔ چنانچہ ۳ ھ ہجری میں بنی قارہ نے، اسلام کی تعلیم دینے کے لیے، حضور ﷺ سے کچھ معلّمین کو روانہ کرنے کی پُرفریب درخواست کی۔ پھر رجیع کے مقام پر اس گروہ پر حملہ کر کے تین معلّمین کو قیدی بنا لیا اور باقی کو شہید کر ڈالا۔ ان تین اسیروں میں سے ایک، عبداللہؓ بن طارق، اپنی رہائی کی کوشش کرتے ہوئے شہید ہوئے اور باقی دو، خبیبؓ بن عدی اور یزیدؓ بن دثنہ کو مکّے میں قریش کے ہاتھوں فروخت کیا گیا، جہاں انہیں بھی مقتولین بدر کے انتقام میں شہید کر دیا گیا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے فریضۂ حج ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صلحِ حدیبیہ تک اس فریضے کی ادائیگی نہیں ہوسکی۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مسلمان مکّہ کے قرب و جوار تک پہنچے تو انہیں روکنے کی کوشش صرف مکّہ کے قریش نے کی اور اس رکاوٹ کی وجہ بھی محض قریش کی قومی حمیّت تھی۔ اس میں کوئی مذہبی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ قرآن میں جس انداز سے اس واقعے کا تذکرہ آیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ قریش کی یہ حرکت نہایت معیوب بلکہ مجرمانہ تھی۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○ (سورۃ الفتح، آیت ۲۵)

(یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد الحرام سے اور قربانی کو اس کے مقام تک پہنچنے سے روکا۔ اور اگر ایسے مومن مرد نہ ہوتے اور ایسی مومن عورتیں نہ ہوتیں، جنہیں تم نہیں جانتے ہو، اور اگر انہیں ضرر پہنچتا تو بے خبری میں تمہیں ہی نقصان پہنچتا۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے۔ اگر یہ جدا جدا ہوتے تو کافروں کو ہم سخت عذاب دیتے۔)

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان زیارتِ بیت اللہ کو فریضۂ دین سمجھتے تھے۔ اس موقع پر تمام شرکاء کا بیعتِ رضوان کرنا بھی واضح کرتا ہے کہ وہ اس رکاوٹ کو اپنے حق میں شدید ناانصافی تصور کر رہے تھے۔ اگر مسلمان معاشرہ حج و عمرے کو مشرکانہ رسم تصور کرتا تو اس طرح جاں نثاری کے عزم کا اظہار کرنے کے بجائے کسی نہ کسی طرح سے بے چینی کا اظہار کرتا۔

حج، رسمِ ابراہیمی: ہم نے دیکھا کہ حجِ بیت اللہ کسی مرحلے پر بھی مسلمانوں کے لیے اجنبی نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بنی اسرائیل کی کچھ رسموں اور حج میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ مماثلت صرف اس لیے ہے کہ عرب بنی اسمٰعیل تھے اور یہود بنی اسرائیل۔ ان دونوں کا نسبی تعلق حضرت ابراہیمؑ سے تھا۔ بنی اسرائیل نے بنی اسمٰعیلؑ کو اپنے دشمن کی حیثیت دی۔ ان کا تذکرہ حقارت کے ساتھ کیا۔ ان کی والدہ کو لونڈی ہونے کی تہمت دی۔ سب کچھ کیا مگر یہ جرأت نہ کی کہ قریش کو بنو اسمٰعیلؑ کے سوا کچھ اور کہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے عبرانی ہونے سے کوئی منکر نہیں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ سامی نسل کا گہوارہ عرب تھا۔ سامی نسل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اپنی تہذیب سے وابستگی ہمیشہ برقرار رکھتی ہے۔ جس جگہ جاتی ہے اپنا تہذیبی ورثہ ساتھ لے جاتی ہے۔ اور اپنی زبان، اپنا کیریکٹر، اپنا دین ہر جگہ اور ہر حال میں برقرار رکھتی ہے۔ تہذیب سے وابستگی آبائی وطن کی یاد دل سے محو نہیں ہونے دیتی۔

حضرت ابراہیمؑ نے شمع توحید روشن کی تو اس کی روشنی سے کلدانیہ، آسوریہ، لبنان، فلسطین اور مصر کو منوّر فرمایا۔ اسی نور کی ایک مشعل آپ نے اپنے اصلی وطن عرب کو حضرت اسمٰعیلؑ کی شکل میں دی۔ حضرت اسمٰعیلؑ خود اپنے پدر بزرگوار سے تربیت یافتہ تھے اس لیے وہ تمام مذہبی احکام و رسوم جو حضرت ابراہیمؑ سے متعلق تھے اپنے ساتھ عرب لائے۔ اس امر سے کسی کو بھی انکار کی جرأت نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنے سے جدا علیحدہ ملک عرب میں بسایا۔ (ملاحظہ ہو کتاب پیدائش، باب ۲۱، درس ۱۴ تا ۲۱)۔ حضرت اسمٰعیلؑ کو کیوں الگ کیا اس کی جو وجہ کتابِ پیدائش میں بیان کی گئی ہے اس میں صرف رقابت کی بو آتی ہے، اور یہ چنداں معتبر نہیں۔ کتاب پیدائش کے مطابق حضرت اسمٰعیلؑ نے (خود سے سولہ سال چھوٹے) حضرت اسحٰقؑ کا مذاق اڑایا، جسے حضرت اسحٰقؑ کی والدہ برداشت نہیں کر سکیں اور انہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ اور انکی والدہ کو گھر سے کیا، ملک سے بھی

نکلوادیا۔ انبیائے عظام کے بارے میں ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ایسی معمولی بات پر ایسا انتہائی اقدام کریں۔ اس قسم کا اقدام مزاجِ نبوّت تو کیا، ایک عام سمجھدار آدمی کے عدل کے بھی منافی ہے۔ آیئے تورات کی ہی روشنی میں اس کی وجوہات دیکھیں۔

۱۔ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا پہلوٹا بچّہ خدا کے لیے وقف ہوتا ہے۔ (گنتی-۸، ۱۷)۔ حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ سے سولہ سال بڑے تھے، لہٰذا پہلوٹے تھے، اور خدا کے لیے وقف تھے۔

۲۔ پہلوٹے کی فضیلت کسی طور ضائع نہیں ہوسکتی۔ جب ایک عام اسرائیلی کے لیے حکمِ خداوندی ہے کہ ''محبوبہ کے بیٹے کو غیر محبوبہ کے بیٹے پر جو فی الحقیقت پہلوٹا ہے، فوقیت دیکر پہلوٹا نہ ٹھہرائے''۔ (استثناء-۲۱، ۱۶)۔ تو ایسا فعل حضرت ابراہیمؑ سے منسوب کرنا کہاں کا انصاف ہے۔

۳۔ جو اولاد خدا کے لیے نذر کردی جاتی تھی اسے ترکہ نہ ملتا تھا۔ ''تب خدا نے لادی کی اولاد کو اس لیے مخصوص کرلیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور تاکہ خدا کے آگے کھڑا ہو کر وہ خدا کی خدمت کرے۔ اس کے نام سے برکت لے۔ یہی وجہ ہے کہ لادیوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں ملا۔ کیونکہ انکا حصہ خدا ہے''۔ (استثناء-۱۰، ۸تا۹)

۴۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا جو اکلوتا اور محبوب تھا۔ (پیدائش-۲۲، ۴)

تورات کے ان عام احکامات کی روشنی میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے پہلوٹے کو، (خواہ وہ غیر محبوبہ سے ہی رہا ہو)، خدا کے لیے وقف کیا۔ انہی کو قربانی کے لیے پیش کیا۔ تب پتہ چلا کہ یہ قربانی تمثیلی تھی اور جسمانی قربانی درکار نہیں تھی، بلکہ ساری زندگی خدا کے لیے وقف کرنے کا حکم تھا۔ ان کا حصّہ خدا تھا۔ دنیاوی وراثت درکار نہیں تھی۔ حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش تک حضرت اسمٰعیلؑ کی تربیت مکمل ہوچکی تھی، اس لیے حضرت ابوالانبیاء نے عملی زندگی کی ابتداء کرنے اور راہِ خدا میں گامزن ہونے اور منشائے خداوندی کی تکمیل کے لیے انہیں ان کی مادرِ مشفق کے ساتھ عرب کی سرزمین میں بسایا تاکہ وہ یہاں نورِ ہدایت پھیلائیں۔

قریش کا دعویٰ صرف یہی تو ہے کہ وہ اسمٰعیلی ہیں۔ خود تورات نے بنی اسمٰعیلؑ کے بارہ قبائل بیان کیے ہیں۔ قریش کے جدِّ امجد قیدار حضرت اسمٰعیلؑ کے صاحبزادے تھے۔ ان کا مسکن بنی نابت کے جنوب (حجاز) میں مقرّر کیا۔ عہدِ وسطیٰ کے مورّخین نے سرا ٓن کو اسمٰعیلی قرار دیا۔ پھر کون سا امر مانع رہ جاتا ہے کہ یہ باور نہ کیا جائے کہ عربوں میں جو رسوم رائج تھیں ان میں سے کچھ حضرت اسمٰعیلؑ کی یادگار بھی تھیں، جو حضرت ابراہیمؑ کا روحانی ورثہ تھیں۔

شارٹر انسائکلو پیڈیا آف اسلام میں حج کے بارے میں تحریر کیا گیا کہ،

''لفظ حج کے معنوں کے بارے میں کچھ زیادہ تحقیق نہیں ہوسکی۔ عربی (زبان کے) علماء اس لفظ کے معنی اپنے آپ کو پیش کرنا بیان کرتے ہیں جو لفظ زیارت (Pilgrimage) کے ہم معنی ہے۔ لیکن اس لفظ سے قریب تر عبرانی لفظ ہیگ (Hag) موجود ہے، جس کے معنی شمال اور جنوب دونوں جگہ طواف کرنے کے ہیں۔ اس سے بھی ہمیں

کچھ زیادہ معلومات میسّر نہیں آتیں، کیونکہ ہمیں یہ بھی نہیں پتہ کہ یہ طواف فریضۂ حج تھا بھی کہ نہیں۔ کیونکہ اس دور میں دو میلے، ایک ذی قعدہ میں عکاظ کے مقام پر، اور دوسرا ذی الحجہ میں ذوالمجاز پر لگتا تھا۔ یہاں سے لوگ سیدھے عرفات جاتے تھے۔ اور عرفات میں طواف سے نہ اسلام واقف ہے، نہ ہم۔ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت ایک قدیم سامی دستور ہے جو تورات کے قدیم اجزاء میں بھی تحریر کیا گیا ہے۔ 'تو سال بھر میں تین بار میرے لیے عید (Hag) منانا'۔ (خروج-۲۳، ۱۷)۔ 'تیرے سب مرد سال میں تین بار خداوند خدا کے آگے جو اسرائیل کا خدا ہے حاضر ہوں'۔ (خروج-۳۴، ۲۳)۔

اس دور (جاہلیہ) میں بھی عرفات میں وقوف یا قیام لازمی تھا۔ یہی وقوف اسرائیل کے قیامِ طور میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس قیام کے لیے اسرائیل کو جنابت سے دور رہنا پڑتا ہے اور غسل کرنا پڑتا ہے۔ اور وہاں وہ خدا کے منتظر رہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی جنابت سے پرہیز کرتے ہیں۔ غسل کر کے احرام باندھتے ہیں اور خدا کے حضور کھڑے ہوتے ہیں''۔ (Shorter Encyclopedia of Islam; p.124)۔

مندرجہ بالا مماثلت اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ یہ تمام رسوم ایک ہی اصل سے دونوں شامی شاخوں میں منتقل ہوئیں۔ اس سے یہ قطعی گمان نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی رسم ایک دوسرے سے مستعار ہے۔ کیونکہ مرکزی عرب یہود کے مرکز کی پیروی سے قطعی آزاد تھا۔ وہ واضح طور پر یہودیت کو ایک غیر مذہب تصور کرتے تھے، جن کے مذہبی شعائر کو مقامی رسوم میں کوئی دخل نہ تھا۔ واقعہ اصحاب الاخدود سے مترشح ہے کہ یہودیت سے عام عربوں کو ایک نفرت سی تھی۔ ان حالات میں یہ قابلِ قیاس نہیں کہ عرب کے بت پرستوں نے حج کو ایک پناہ گزیں اقلیت سے اپنایا ہو۔ عرب جاہلیت میں صرف اپنے آباء واجداد کی رسوم کے پابند تھے، اور حج کی رسم انہیں اپنے جدِّ امجد حضرت اسمٰعیلؑ سے ملی، جسے انہوں نے ہمیشہ زندہ رکھا اور اسی ناطے سے اسلام نے اسے فریضۂ دین بنایا۔

اسلام اور شمشیر

مغرب نے اپنا سارا زورِ قلم اس پروپیگنڈے پر صرف کیا ہے کہ اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلایا گیا ہے۔ اس سفید جھوٹ سے دنیا کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا انہوں نے برضا و رغبت نہیں، بلکہ ظلم و جور اور خوف و ہیبت سے مجبور ہو کر اس مذہب کو قبول کیا ورنہ اس مذہب میں ایسی کوئی کشش نہیں جس کے باعث دنیا اسے بطیبِ خاطر قبول کرتی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے روشن خیال دور میں بھی یہ پروپیگنڈہ عام ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والی کتاب (Our World Through Ages)، جو ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ منظرِ عام پر آئی، اس کے باب ششم کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

1. ***"Above all Mohammed urged his followers to spread their faith, even by sword, if necessary."*** **(p.146)**

2. *"(Accept) the Quran, (pay) tribute or (die by) the sword. This was the warning to unbelievers."* (p.147)

3. *"In India, many Hindus and Budhists were converted to Islam by force."* (p.148)

مذہب کو بزورِ شمشیر رائج کرنا خود مغرب کا شیوہ رہا ہے۔ گزشتہ ابواب میں شارلیمین کے قانون کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ ہنسا اسٹیٹس (Hansa States) کے قیام کی تفصیلات باب اوّل میں بیان کی جا چکی ہیں۔ رومن دورِ عیسائیت کی ترویج بالقوۃ نظر سے گزر چکی ہے۔ مغربی معاشرے میں کسی مذہبی اقلیت کا وجود کبھی برداشت نہیں کیا گیا۔ عیسائیت کی ترویج کے لیے صدیوں خونریزی کی گئی۔ کیتھولک کلیسا میں دو سو سال قبل تک باقاعدہ ایسے ادارے تھے جن کا کام ہی ان لوگوں کی دارو گیر تھا جو کیتھولک عقائد سے متفق نہ تھے۔ کلیسا انہیں گرفتار کر کے قید و بند، اذیت ناک سزاؤں، یہاں تک کہ موت سے بھی ہمکنار کرتا تھا۔ غیر عیسائی بلکہ غیر کیتھولک کے لیے مغرب کی سرزمین تنگ تھی۔ مذہب کے نام پر جن لوگوں کا قتل کیا گیا، ان کی تعداد لاکھوں میں ہے۔

شارلیمین کے قتلِ عام سے لیکر امریکہ میں ریڈ انڈینز کی نسل کشی تک ترویج بالقوۃ کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آتا ہے، جس میں ہر قتلِ عام کو کلیسا کی برکت اور مکمل تائید حاصل ہوتی تھی۔ اس ضمن میں وہ مسیحی بھی نہیں بخشے گئے جو رومن کیتھولک فرقے سے غیر متعلق تھے۔ عیسائیت کی پوری تاریخ انسانی خون سے رنگین نظر آتی ہے۔

(For details see: Millman; Latin Christianity, Vol. I, p. 352: and Lecky; History of Nationalism in Europe, especially Chapter on Persecution)

اپنے اس گھناؤنے جرم کو انہوں نے اسلام کے سر منڈھا۔ ورنہ اسلام میں کسی قسم کا کوئی جبر نہیں ہے۔ یہ وہ واحد مذہب ہے جو دنیا کو قبولیت کی دعوت دیتا ہے اور اسلامی مملکت کی حدود میں بسنے والے ہر فرد کو اجازت دیتا ہے کہ غور و فکر کرنے کے بعد جب دلجمعی ہو جائے تو اسے قبول کر کے دوسرے مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کر لے اور اگر اس کا دل نہ مانے تو ذمّی کی حیثیت سے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے زندگی گزار دے۔ اس نے کبھی کسی مذہب کے عقائد میں دخل اندازی نہیں کی۔ کبھی مذہبی دارو گیر نہیں کی۔ اسلام کی تاریخ میں غیر مذہب پر مقدّمات اور احتساب کا کوئی ادارہ، کسی دور میں کسی جگہ نہیں پایا جاتا۔

اسلام ایک دین ہے جو مغرب کی تین جداگانہ اقدار کا بیک وقت احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ مذہب بھی ہے، سیاست بھی ہے اور کلچر بھی ہے۔ عیسائیت اور اسلام میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عیسائیت کی تعمیر و ترویج مغربی اسٹیٹ اور کلچر نے کی۔ جبکہ اسلامی اسٹیٹ اور کلچر کی تعمیر مذہب نے کی۔ وہاں معاشرتی قدروں کے مطابق مذہب کو ڈھالا گیا اور اسٹیٹ کی قوت پر اسے رائج کیا گیا جبکہ یہاں مذہبی اقدار کے مطابق معاشرہ بنایا گیا، اور اس معاشرے نے اسلامی احکامات کی روشنی میں اسٹیٹ کی تشکیل کی۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسٹیٹ اور ایمپائر شمشیر کے بل بوتے پر ہی قائم ہوتی ہیں۔ ان کی مدافعت، استحکام اور استقلال سب ہی کے لیے شمشیر ناگزیر ہے۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد ایک عظیم

مسلم امپائر کے قیام میں شمشیر نے جو کارنامہ انجام دیا، مغرب اسے اسلام سے منسوب کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلم امپائر تلوار کے زور پر قائم ہوئی اور اس کی توسیع و مدافعت شمشیر کی مرہونِ منت ہے تو اس میں کوئی کلام نہیں، لیکن یہ کہنا کہ اسلام شمشیر کے زور پر پھیلایا گیا، حقیقت کو مسخ کرنا ہے۔

داعیِ اسلام سے لیکر آج تک اسلام کسی پر بالجبر مسلط نہیں کیا گیا۔ دلوں کو تلوار سے مسخر نہیں کیا جاسکتا۔ کردار کی تعمیر جبر سے نہیں ہوتی۔ حضور ﷺ نے تبلیغ کی ابتداء فرمائی تو تن تنہا تھے۔ کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ تلوار کے زور پر ایک ایک فرد کو اپنا تابع بنا رہے تھے۔ اس کے برعکس معاشرے کی تلواریں ان کے اور انکے متبعین کے خلاف بے نیام ہوگئیں۔ قریش نے انہیں مٹا ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ظلم کا کوئی حربہ نہیں تھا جو آزمایا نہ گیا ہو۔ جو مسلمان ہوگئے ان پر قیامت توڑی گئی۔ خود حضور ﷺ کو بے آب وگیاہ گھاٹی میں برسوں محصور رہنے پر مجبور کیا گیا۔ جسمِ اطہر خون سے رنگین ہوا۔ ترکِ وطن تک کی نوبت آئی۔ جائدادیں ضبط ہوئیں، لیکن ایک بھی صاحبِ ایمان ایسا نہیں تھا جس نے ان شدائد سے تنگ آکر اسلام کو ترک کر دیا ہو۔ آخر ان سابقون الاولون کو اسلام سے وابستہ رکھنے میں کونسی قوت، کونسا جبر یا کونسی تلوار کارفرما تھی۔ کیا یہ قوت محض اسلام کی کشش نہ تھی۔ اسلام بذاتِ خود ایک قوت تھا جو ہر بیرونی قوت سے مدافعت کرنے کا ولولہ عطا کرتا تھا۔

اسلام کے ابتدائی تیرہ سال تلوار کے نام سے واقف نہیں ہوئے۔ تیرہ سال کی مدت ایک طویل عرصہ ہے۔ اٹھی تلواروں اور کھنچی کمانوں کی زد میں صبر و ثبات کے ساتھ تبلیغ صرف داعیِ اسلام کا ہی حصہ ہے۔ جبکہ حضرت عیسیٰؑ جیسے امن پسند نبی، جنکا معاشرہ ان کی تبلیغ کے لیے پرامن اور سازگار تھا، صرف تین سال کی کاوشوں کے بعد تلوار کے استعمال پر غور کرنے لگے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے ہمراہیوں پر نہ کوئی ظلم ہوا، نہ کھانا پانی بند ہوا، نہ مقاطعہ ہوا۔ نہ انہوں نے کسی کے خداؤں کو باطل ٹھہرایا، نہ ہموطنوں کو روم کے خلاف ابھارا، نہ غریب کی غربت دور کرنے کے لیے جدّوجہد کی کہ معاشرے کا کوئی طبقہ انکا مخالف ہوجاتا، نہ مروّجہ مذاہب کی مخالفت کی۔ وہ تو صرف قدیم شریعت کا احیاء کرنا چاہتے تھے۔ ان کی جو بھی مخالفت یہود کی طرف سے ہوئی، وہ صرف زبانی کارروائی تک محدود تھی۔

کیا اندازِ موازنہ ہے کہ جو صرف تین سال کی مدّت میں تلوار اٹھانے پر غور کرنے لگے، اس کے پیرو، اس ذاتِ اقدس پر جو تیرہ سال تک ہیبت ناک مظالم کا ہدف بنے اور قوت کے استعمال پر غور بھی نہ کرے، یہ بہتان باندھیں کہ انہوں نے اپنا دین بزورِ شمشیر پھیلایا۔

ہجرت کے بعد جب مدینے میں شمعِ رسالت کے گرد اس کے پروانے جمع ہوگئے اور اسلام کی روشنی نے ماحول کو منوّر کرنا شروع کر دیا تو تاریکی نے ناپاک ارداوں کے ساتھ اس شمع کی جانب یلغار کی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں جو اختیار کی جاسکتی تھیں۔ یسوع کے شاگردوں کی طرح محض اس لیے کہ مستقبل کا مغربی قلمکار تلوار کے استعمال کا الزام عائد کرے گا، پروانے اس شمع کو چھوڑ کر اپنی اپنی جان بچانے کی فکر کرتے یا پھر بے سروسامانی کے باوجود طوفانوں سے ٹکر لیتے۔ بے عملی کی صورت میں کفارِ عرب کی خوں آشام تلواریں مٹھی بھر موحدین کی

جماعت کو نیست و نابود کر دیتیں۔ اسلام کا نام ونشان مٹ جاتا۔ ایک عظیم ملّت، عظیم تہذیب، ایک عظیم نظریہ، ایک عظیم فکر، ایک عظیم ترین ایمپائر، وجود میں آنے سے قبل ہی معدوم ہو جاتی۔ انسانیت کا ارتقاء تھم جاتا۔ تہذیب جامد ہو جاتی۔ علوم کے سرپرست نہ پیدا ہوتے۔ غلامی انسان کا مقدر بن جاتی اور روح نجات کی تلاش میں بھٹکتی رہتی۔ لیکن یہ محسنِ انسانیت ﷺ طاغوتی طاقتوں کے آگے جھکنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ اسلام کو سربلند رکھنے کے لیے اوّلاً قریش، اس کے بعد عرب، اور آخر کار ساری دنیا کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ حق کی حفاظت کے لیے کمزوری کے باوجود ہر قوت سے ٹکرا گئے۔

کس قدر پاکیزہ جذبہ تھا۔ اسی جذبے اور عمل کا نام جہاد ہے۔ یہی وہ لفظ ہے جس سے مغرب کو خوف آتا ہے۔ اسی جذبے کے طفیل بدر کے میدان میں تین سو تیرہ [۳۱۳] نیم مسلّح افراد نے ایک ہزار [۱۰۰۰] پوری طرح اسلحہ سے لیس قریشی سپاہ پر کامل برتری حاصل کی۔ تین ہزار کی جمعیّت کا صرف سات سو [۷۰۰] افراد نے میدانِ احد میں منہ پھیر دیا۔ جنگِ احزاب میں سولہ ہزار [۱۶،۰۰۰] سے زیادہ مشترکہ عرب افواج سے محض تین ہزار افراد نے کامیاب مدافعتی جنگ لڑی۔

یہی وہ جذبہ تھا جس کے سبب چالیس ہزار [۴۰،۰۰۰] کی نیم مسلّح، غیر تربیت یافتہ، اور بے قاعدہ فوج نے یرموک کے میدان میں سلطنتِ روما کی تین لاکھ [۳۰۰،۰۰۰] مسلّح تربیت یافتہ اور باقاعدہ پیشہ ور فوج کو منہ توڑ شکست دی۔ یہی وہ جنگیں ہیں جن کی کامیابی کی وجہ سے اسلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے بزورِ شمشیر پھیلایا گیا ہے۔ کیا منطق ہے کہ اٹھی تلوار اور کھنچی کمان کو مظلوم اگر اپنی مدافعت میں توڑ ڈالے تو اس کے اس فعل کو مذموم گردانا جائے۔

کیا فتحِ مکّہ اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلانے کی پرزور تردید نہیں کرتی، کہ اس وقت اسلام کے خلاف اٹھنے والی تلواریں ٹوٹ چکی تھیں۔ کوئی قوت ایسی نہیں رہ گئی تھی جو خود کو اسلام کے حریف کے طور پر پیش کرتی۔ مفتوحینِ مکّہ میں سے جو بھی تھا اسلام کا دشمن تھا۔ فاتحین وہ تھے جن پر تیرہ سالہ مکّی دور میں اور آٹھ سالہ مدنی دور میں اس شہر کے باسیوں نے ستم ڈھائے تھے۔ فاتحین کے دل ان کے تیر و نشتر سے خونچکاں تھے۔ اس کے باوجود فاتحین نے ایک قطرۂ خوں نہیں گرایا۔ رحمت للعالمین نے ہر جرم سے چشم پوشی فرمائی۔ باز پرس کے بجائے یہ اعلان فرما دیا کہ ہر فرد کا جرم معاف کر دیا گیا ہے۔ لوگوں کو تلوار کے ذریعے سے مجبور کرنا ہوتا تو اس سے بہتر موقع اور کونسا ہوتا۔ لیکن اس موقع پر بھی کسی ایک فرد کو بھی بالجبر مسلمان نہیں بنایا گیا۔ جو لوگ بھی مسلمان ہوئے بلا جبر و اکراہ ہوئے۔ فتحِ مکّہ کے بعد بھی بعض مشرکینِ مکّہ کا اپنے قدیم مذہب پر قائم رہنے اور اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے کے لیے غور و فکر کی مہلت طلب کرنے کے شواہد قدیم ماخذ میں ملتے ہیں۔

واٹ نے فتحِ مکّہ کے باب میں تحریر کیا کہ،

"محمد (ﷺ) نے صفوان سے پچاس ہزار [۵۰،۰۰۰] درہم، اور عبداللہ بن ربیعہ اور حویطب سے فی کس چالیس ہزار [۴۰،۰۰۰] درہم قرض لیے اور ضرورتمندوں میں فی کس پچاس درہم تقسیم کیے۔ ان روساء کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ یہ اور بہت سے دوسرے کفر پر ہی قائم رہے"۔

(Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.67)

حضور ﷺ کا ہر لفظ اور ہر عمل ملتِ اسلامیہ کے لیے قانون اور نظیر کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ کے طرزِ عمل سے جہاں کئی اور فقہی قوانین کا استنباط ہوا، وہیں یہ بھی منتج ہوا کہ جو شہر خود کو ازروئے صلح حوالے کر دے وہ مامون ہوتا ہے۔ نہ وہاں خونریزی کی جاسکتی ہے، نہ لوگوں کو غلام بنایا جاسکتا ہے، نہ ان کے اموال و اسباب ضبط کیے جاسکتے ہیں۔ ہاں مجرمین کو ان کے ذاتی جرائم کی پاداش میں سزا دی جاسکتی ہے۔

اگر اس موقع پر یا کسی اور موقع پر ایک فرد کو بھی بالجبر مسلمان کیا گیا ہوتا تو یہ ایک نظیر بن جاتی۔ مغرب کی ہی طرح، کسی مسلم ملک میں کسی مذہبی اقلیت کا وجود نہ ہوتا۔ اسپین پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال قبضہ رکھا، وہاں عیسائی باقی نہ رہ سکتے تھے۔ ساتویں صدی تا بیسویں صدی لبنان پر مسلم اقتدار رہا، آج وہاں عیسائیت کا نام لیوا نہ ہوتا۔ ایران میں مجوس، عراق میں صابی، اور برِ صغیر میں ہندووں اور بدھوں کا وجود نہ ہوتا۔ بیسویں صدی میں ترکیہ میں یونانی نہ پائے جاتے۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کی رواداری کا اعتراف ہر سلجھے ہوئے مورّخ نے کیا ہے۔

قرآن کے احکامات کی خلاف ورزی کوئی دیندار مسلمان نہیں کرسکتا۔ اس معاملے میں قرآن کی نصِ صریح موجود ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ ان چار الفاظ نے عالمِ اسلام کی ہر اقلیت کو سپر مہیا کر دی ہے۔ اس حکم کی خلاف ورزی کی جرأت کسی مسلمان کو نہیں ہوسکتی۔ اور اگر کسی نے خلاف ورزی کی بھی تو یہ اس کا اپنا مکروہ فعل تھا، جس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں عائد ہوتی۔

واضح رہے کہ اسلام حضور ﷺ کے دورِ مبارک میں مکمل ہوگیا تھا۔ جس کے بعد کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون وضع کرسکے۔ جب قرآنی حکم امتناعی موجود ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے اور رسول اللہ ﷺ کا عمل یہی رہا ہے کہ کسی پر اسلام قبول کرنے کے لیے کوئی دباؤ نہیں ڈالا تو اس قانون میں ردّ و بدل کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اسلام اور داعیِ اسلام ﷺ نے تو دین کے معاملے میں اس قدر احتیاط برتی ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کے جھوٹے خداؤں کو بھی برا کہنے سے منع فرمایا ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مغرب جزیہ کے سلسلے میں بھی شدت سے لے دے کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جزیہ کون ادا کرتا تھا۔ وہی غیر مسلم جو مملکتِ اسلامیہ میں رہتے بستے تھے اور جن سے مسلمانوں سے پہلے رومن امپائر صدیوں پول ٹیکس وصول کرتی رہی۔ اگر ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار کا بہیمانہ قانون تھا تو یہ جزیہ دینے والے کون تھے۔ کیا یہ جزیہ سال بہ سال وہ مردے ادا کرتے تھے جنہیں اسلام نہ لانے کے جرم میں (بقول معترضین کے) قتل کیا جاچکا تھا۔ جذبات کی رو میں حقائق کو مسخ کرنا ایک بڑا اخلاقی جرم ہے۔

۔ خوف و دہشت کی فضا میں جو عقائد قائم ہوتے ہیں ناپائدار ہوتے ہیں۔ جیسے ہی خوف ختم ہوتا ہے، جبر کمزور پڑتا ہے، لوگ ان عقائد اور نظریات سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ کیا اسلام کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مغرب نے صلیبی جنگوں میں وسیع مسلم علاقے پر قبضہ کیا۔ انہیں کیا تجربہ ہوا؟ کتنے مسلمان ایسے تھے جنہوں نے اسلام ترک کر کے کفر یا عیسائیت اختیار کی۔ تاتاریوں نے عالمِ اسلام کو پامال کر ڈالا۔ فاتح تھے لیکن عالمِ اسلام کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے بجائے خود حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے۔ ان پر کون سی تلوار مسلّط تھی جس کے خوف سے انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اٹھارویں صدی سے مغرب کو پورے عالمِ اسلام پر تسلّط حاصل ہونے لگا تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی اور عسکری قوت ختم ہوچکی تھی لیکن اس کا اثر اسلام پر کیا پڑا۔ کیا اسلام مرجھا گیا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ تلوار کے بل پر پھیلنے والے مذہب کے نہ مٹنے کا راز کیا ہے؟ راز صرف اتنا ہے کہ اسلام کو لوگوں نے بلا جبر و اکراہ، بطیبِ خاطر قبول کیا تھا اور اس سے مجبوراً نہیں بلکہ صدق دلی سے وابستہ ہوئے تھے۔ اسلام ان کے لیے پرکشش تھا۔ اس کی ہدایات و تعلیمات سے وہ مطمئن تھے۔ کسی اور مذہب کی تعلیمات ان کے لیے قابلِ قبول نہ رہ گئی تھیں۔ اسلام انکے لیے بوجھ نہ تھا بلکہ تقویت تھا۔ مغرب مسلمان فاتحین پر الزام دھرتا ہے کہ انہوں نے کونے کونے میں اسلام پھیلایا، ہمیں انہی فاتحین سے یہ شکایت ہے کہ وہ مفتوحہ علاقوں میں تبلیغ کا حق ادا نہ کر سکے۔

تلوار اور قرآن کا الزام مسلمانوں پر صرف بہتان ہے۔ ورنہ یہ قانون خود مغرب کی مذہبی کتب میں آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ ملتا ہے کہ مفتوحین کا قتلِ عام کر کے انہیں نیست و نابود کر دیا جائے۔ ملاحظہ ہو،

۱۔ ''اور جب انکو تیرا خدا تیرے آگے شکست دلائے اور تو انکو مار لے تو انکو بالکل نابود کر ڈالنا''۔ (استثناء، باب-۷، درس-۲)

۲۔ ''اور تو ان سب قوموں کو جنکو خداوند تیرا خدا تیرے قابو میں کر دے گا نابود کر ڈالنا''۔ (استثناء، باب-۷، درس-۱۶)

۳۔ ''جب خداوند تیرا خدا اسکو تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا۔ لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں اور اس شہر کو سب مال اور لوٹ کو تو اپنے لیے رکھ لینا اور تو اپنے دشمن کی لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھکو دی کھانا''۔ (استثناء، باب-۲، درس ۱۳-۱۴)

اسلام کی شکل میں تاریخ نے پہلی بار دیکھا کہ مفتوح کو بھی کوئی مذہب فاتح کے حقوق عطا کرتا ہے۔ کیا اس سے قبل کسی فاتح نے کسی مفتوح سے کہا تھا کہ میرے مذہب کی رو سے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ تمہیں پوری آزادی حاصل ہوگی۔ تمہارے وہی حقوق ہونگے جو میرے ہیں۔ تمہیں اپنے عقیدے اور مذہب کی پوری آزادی حاصل ہے۔ چاہو تو اپنے عقیدے پر قائم رہو اور اگر ہمارے مذہب کو سچا جانو تو ہمارے ساتھ شامل ہو کر خود فاتح بن جاؤ۔

جو لوگ معترض ہیں کاش وہ خود اپنی تاریخِ کلیسا پر نظر ڈالیں۔ پوری تاریخ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ

کلیسا نے خود انسان کو کیا دیا۔ اس نے بدرجۂ مجبوری صرف عیسائیوں کو انسانی حقوق عطا کیے۔ بقیہ نوعِ انسانی کو صرف دہشت، ہرزہ سرائی، اتہامات اور احساسِ کمتری عطا کیا۔ دوسرے مذاہب کے مقتولین کی فہرست مرتب کی جائے تو اس سے کہیں طویل تر فہرست کلیسا کے قتلِ عام کی نکلے گی۔ خود مغربی مبصرین کو اقرار ہے کہ:

"مسیحی کلیسا جس قدر سنگدل رہا ہے اور اس نے جس قدر خونریزی کی ہے، اس قدر، ساری دنیا میں، شائد ہی کسی مذہب یا ادارے نے کبھی کی ہو"۔

(Willman; Constitutional History of England, Vol. I, Chapter II, p.62)

غرضیکہ اسلام پر تلوار کی تہمت مسخ عمد کی بدترین مثال ہے۔ اسلام کو بزورِ شمشیر نہ داعیِ اسلام ﷺ کے زمانے میں پھیلایا گیا نہ اس کے بعد کسی دور میں یہ مذموم کوشش کی گئی۔

قرآن اور حدیث

دنیا کی تمام مذہبی کتب پر قرآن کو ہر حیثیت سے فوقیت حاصل ہے۔ عہد نامۂ قدیم کی تدوین میں کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ لگا۔ بادشاہوں سے لیکر فقیہوں تک ہزاروں افراد نے اسکی تدوین میں حصہ لیا۔ اسکا مستند ترین حصہ تورات (پنٹاٹوئیش)، دو جداگانہ مذہبی کتب (الوہی اور یہوی) کا اشتراک ہے، اور تحریف اور تصریف سے پر ہے۔ اسے حضرت موسیٰؑ سے منسوب کیا جاتا ہے جبکہ اس میں وہ واقعات بھی درج ہیں جو ان کے بعد وقوع پزیر ہوئے۔ عہد نامۂ قدیم کی حقیقی اہمیت صرف یہ ہے کہ وہ یہود کی مذہبی تاریخ کو بیان کرتا ہے۔ عہد نامۂ جدید کی حقیقی نوعیت یہ ہے کہ متعدد نا معلوم افراد نے حضرت عیسیٰؑ کی سوانحِ حیات اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ترتیب دے لی۔ یہ مولفین خود عینی شاہد تک نہیں۔ صدیوں بعد سنی سنائی باتوں کو ایک تسلسل دے دیا، اور یہ کتب آسمانی قرار پا گئیں۔ جبکہ قرآن ایک فردِ واحد پر نازل شدہ وحی کا مجموعہ ہے، جس کی حفاظت کا شعوری اہتمام دورِ نبوی سے ہی ملحوظ رہا ہے۔ اسے نہ صرف تحریری طور پر محفوظ رکھا گیا بلکہ حضور ﷺ کی زندگی میں سینکڑوں افراد نے اسے حفظ کیا۔ وصالِ نبوی کے دو سال کے اندر اندر، خلیفۂ اوّل نے اسکے تمام اجزاء کو جمع کر کے اسکا مکمل نسخہ مدوّن کیا۔ دنیا میں پائے جانے والا کوئی نسخہ اس اوّلین نسخے سے سرِ مو تفاوت نہیں رکھتا۔

قرآن عظیم تقدّس کا حامل، جسے سوائے حالتِ طہارت کے چھوا نہیں جا سکتا، جس کی قرأت باعثِ ثواب، جس پر عمل باعثِ نجات، جس کی آیات باعثِ برکت، زینتِ محراب، وجہِ سربلندی، جس کے الفاظ کی کتابت کے لیے حروفِ طلائی اور زمرّدی روشنائی زیبا۔ یہی تعلیم کی بنیاد، یہی زندگی کا رہبر، پیدائش سے موت تک اس دنیا میں اور موت کے بعد دوسری دنیا میں رہنما، صراطِ مستقیم، کلامِ الٰہی، قانونِ اعظم، حکومت کے قوانین اور شاہی فرامین سب اس کے تحت، یہی عبادت و روحانی سکون کا منبع، اسلام اسکے بل پر قائم، موت کا شیرازہ اس

سے دائم، یہی علم، یہی میدانِ عمل، یہی زندگی کا شرارہ، اسی پر زندگی قربان، اربوں کھربوں افراد کو گزشتہ چودہ سو سال سے ملکوتی فعالیت عطا کرنے والا۔ اس نے عظیم تہذیب جگائی۔ اس کا فیض صرف مسلمانوں تک محدود نہیں، کافروں اور مشرکوں کو بھی سیراب کرتا ہے۔ جس کی مخالفت کے طفیل یورپ، یورپ بن گیا۔ عیسائیت کی تثلیث کا نام توحید ہوا۔ جس کے توسط سے یہ ہم تک پہنچا، اس نے خود اس کے مصنّف ہونے سے انکار کیا۔ لیکن مستشرق اس کو تصنیف نبوی قرار دینے پر مصر، اس کی تعلیمات اور اس کے اخلاق پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس کی بیان کردہ نعمتوں پر طنز کرتا ہے۔ کارلائل جس نے داعیِ اسلام کو انبیاء کا ہیرو تسلیم کیا، جو اسلام کی موافقت میں قلم اٹھانے میں سرِفہرست ہے، جب قرآن کا ذکر آتا ہے تو ساری خوش فہمی رفع کر دیتا ہے۔ اس نے لکھا، (نعوذ باللہ)

"As toilsome reading as I ever undertook, a wearisome confused jumble, crude, incondite, endless iterations, long-windedness, entanglements, most crude incondite, insupportable stupidity; in short nothing but a sense of duty could carry any European through Koran." **(Thomas Karlyle; On Heros, Hero-worship and the Heroic in History, pp. 64-65)**

[میری زندگی کی سب سے زیادہ محنت طلب خواندگی، ایک اکتا دینے والا، پریشان بے ترتیب مجموعہ، خام، ناپختہ، لامتناہی تکرار، طول طویل گفتگو، الجھاؤ، انتہائی خام اور غیر نفیس، ناقابل دفاع حماقت؛ مختصراً یہ کہ سوائے ادائے فرض کے احساس کے، کسی یورو پین کو کوئی چیز قرآن کو پڑھ جانے پر آمادہ نہیں کر سکتی]۔

[ملاحظہ ہو یورپین ہونے کا غرور، کہ کوئی یورو پین، چاہے جاہلِ مطلق ہی کیوں نہ ہو، غیر یورپی علماء پر بھی کیسی فوقیت رکھتا ہے۔]

بیشتر مستشرقین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآن داعی اسلام کی تصنیف ہے۔ آر، اے نکلسن کے نزدیک ایک ادبی کارنامے کی حیثیت سے اس میں کئی خامیاں پائی جاتی ہیں، اور قرآنی جنّت میں مادّی عیش وعشرت کا تذکرہ اصل میں بت پرستوں کے تخیّلات کی مشابہت ہے۔ **[R.A. Nicholson; Introduction to the Koran, Translation of Quran by R.N. Palmer)**۔ انکے خیال میں داعیِ اسلام میں بھرپور صلاحیت نہیں تھی کہ وہ عروض میں شعر کہہ سکیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی رائے شعراء کے بارے میں اچھی نہیں تھی۔ قرآن کا یہ دعویٰ کہ وہ انبیائے سابق کی تعلیمات کی توثیق اور تصحیح کرتا ہے، کم وزن رکھتا ہے۔ قرآن کی باتیں سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں مستعار اشاروں پر دکھاوے کے قلعے تعمیر کیے گئے ہیں۔ جن میں سے بیشتر یہود کی بیانیہ مذہبی روایات **(Haggadah)** اور غیر مستند **(Apocrypha)** مواد پر مشتمل ہیں۔ (ملاحظہ ہو حوالہ بالا)۔

مستشرقین کے نزدیک قرآن کے ذرائع معلومات بلاشبہ یہودیت، عیسائیت اور مشرکین کے مروّجہ مذاہب تھے۔ قرآن کے بیشتر انبیاء تورات کے کردار ہیں، جنہیں قرآن نے نبی بنا دیا ہے۔ اٹھائیس میں سے اٹھارہ انبیاء تورات کے کردار ہیں، جبکہ عہد نامۂ قدیم کے انبیاء جیسے عاموس، یرمیاہ اور یسعیاہ کا کوئی تذکرہ نہیں

پایا جاتا۔ قرآنی مواد چونکہ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے، اس وجہ سے اس میں مستند اور غیر مستند باتوں میں تمیز مفقود ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ کا پالنے میں لوگوں سے گفتگو کرنا، مٹی سے بنائے ہوئے پرندوں کا زندہ کرنا، مریم عذرا اور مریم اخت ہارون کو ایک ہی شخصیت سمجھنا، بائبل کے ایک کردار ہامان کو جو شہنشاہ اخسویرس کا مقرب تھا لاعلمی کے باعث فرعون کا وزیر بیان کرنا، وغیرہ۔

(For details see: George Sale; The Quran: J.H. Rodwell; The Quran: E.H. Palme; The Koran: Dr. Tesdall; Sources of Quran)

تدوین قرآن: میور، نولڈیکی اور سیل نے جمع و تدوین قرآن پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت زیدؓ عالم عادل تھے۔ ان سے تحریف وتصریف کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے دو گواہوں کی شہادت پر قرآن میں سورتیں درج کیں۔ مطالب و معانی سے قطع نظر انہوں نے متن بلا کم و کاست درج کیا، لیکن ان کے مجموعے میں پورا قرآن مدوّن نہ ہوسکا۔ ان کے ایڈیشن کو پوری ملّت نے تسلیم نہیں کیا۔ تاہم یہ ایک اہم کام تھا اور اسی کی بنیاد پر دوسرا نسخہ ترتیب دیا گیا۔

(cf. Muir; Life of Mohammed, pp. 555: Noldeke; Dictionary of Islam, pp. 486-487: Sale; Essays on Islam, pp. 218-224)

شعراء کا دیوان: کلائن (**F.A. Klein**) نے بزعم خود قرآن کو عرب شعراء کے دیوان سے مطابقت دی، اور دونوں کا سطحی موازنہ کیا۔

قرآن	دیوان
مجموعہ وحی	مجموعہ کلامِ شعری
سورۃ = بڑا حصّہ	قصیدہ = بڑا حصّہ
آیت = چھوٹا حصّہ	بیت = چھوٹا حصّہ
فاصلہ = آخری حرف	قافیہ = آخری حصّہ

ریورینڈ مذکور نے مندرجہ بالا موازنے کی بنیاد پر قرآن کو سجع قرار دیا، اور اسے قدیم عرب کاہنوں کا انداز بتایا۔

(cf. Klein; The Religion of Islam, p.4)

یہی مصنف قرآن کو یہودی اور عیسائی مواد کا مجموعہ بیان فرماتے ہیں۔ انہوں نے تحریر کیا،

"Though Mohammed pretended that every word of the Quran was the result of the divine inspiration, it must become evident that by far the greater portion of it consists of material collected from Jews, Christians, Sabeans, Magi and Pagan Arabs". **(cf. Klein; The Religion of Islam, p.21)**

[گو محمد (ﷺ) اظہار تو یہی کرتے تھے کہ قرآن کا ایک ایک لفظ وحیِ الٰہی کا نتیجہ تھا، لیکن اس بات کو واضح ہو جانا چاہیے کہ بڑی حد تک اس کا ایک معتدبہ حصہ اس مواد پر مشتمل ہے جو یہودیوں، عیسائیوں، صابیوں، مجوسیوں اور بت پرست عربوں سے لیا گیا تھا]۔

جبکہ وہ یہ بھی یقین دلاتے ہیں کہ داعیِ اسلام ﷺ کی دسترس میں تورات یا انجیل کا کوئی جزو نہیں تھا۔

"That he did not, however, possess any part of old or new tetament from which he might have derived much of his information, is pretty certain".

(cf. Klein; The Religion of Islam, p.21)

[یہ بات بہرحال یقینی ہے کہ ان کے پاس عہد نامہ قدیم یا عہد نامہ جدید کا کوئی بھی حصہ نہیں تھا، جس سے انہوں نے اپنی کچھ زیادہ معلومات اخذ کی ہوں]۔

مستشرقین نے قرآن وحدیث میں ایسے الفاظ تلاش کیے جو غیر زبانوں میں بھی مستعمل تھے، اور یہ باور کرایا کہ ان الفاظ کے توسّط سے مفہوم بھی مستعار لیا گیا، مثلاً جہنّم کے لیے قرآن میں سات مختلف الفاظ آئے ہیں۔ ان میں سے سعیر اور سقر کو شامی، جحیم کو حبشی، جہنّم اور لفظ صلوٰۃ کو عبرانی اور لفظ سجدہ کو حبشی لفظ بتایا گیا۔

حدیث وفقہ: قرآن کے ساتھ حدیث وفقہ پر بھی حسب استطاعت زورِ قلم صرف ہوا۔ فقہ چونکہ قرآن وسنّت پر مبنی ہے، اس لیے فقہ کو مغرب اللہ کا قانون کہتا ہے، اور سیاسی تبدیلیوں کے باعث مسلم ممالک میں قانونِ شریعت سے بے توجہی کو 'اللہ کے قانون' کی ناکامی کا نام دیا گیا۔ بعض اصحاب قلم کو اسلام میں بھی ثنویّت نظر آنے لگی، اور یہاں بھی انہوں نے دوہرے نظام اقتدار کو ثابت کرنے کی سعی کی۔

"Thus the Government of Allah and the Government of Sultan grew apart. Social and political life was lived on two planes. The law of God failed because it neglected the factor of change to which Allah had subjected his creatures. To this very day the failure continues".

(G.E. von Grunebaum; Mediaeval Islam, pp. 143-144)

[نتیجتاً اللہ کی حکومت اور سلطان کی حکومت الگ الگ پروان چڑھنے لگیں۔ سیاسی اور سماجی زندگیاں دو سطحوں پر بسر کی جانے لگیں۔ اللہ کا قانون، جو اس نے اپنے بندوں کے لیے وضع کیا تھا، (نعوذ باللہ) ناکام ہو گیا کیونکہ اس نے تبدیلی کے عنصر کو نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ ناکامی آج تک جاری چلی آ رہی ہے۔]

اس قسم کے سطحی تبصرے صرف یہ واضح کرتے ہیں کہ مبصّر اصولِ فقہ سے یکسر نابلد ہے۔ فقہ کوئی جامد شے نہیں ہے۔ اجتہاد کے دروازے اسلام نے ہمیشہ سے کھول رکھے ہیں۔ قرآن نے اصولِ قانون سازی دیے ہیں، قانونی جزئیات نہیں دی ہیں۔ حدودِ اصول میں رہتے ہوئے حسبِ ضرورت جزئیات کی تدوین ہو سکتی ہے۔ پس اگر قانون ناکام بھی ہوا تو یہ ناکامی صرف فقیہہ کی ہے جو وقت کا ساتھ نہیں دے سکا۔ اسے قانونِ الٰہی کی ناکامی قرار دینا محض تنگ نظری ہے۔

گریونے باوم کو نہ جانے کہاں سے یہ شواہد نظر آئے کہ اس نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ تحریر کر ڈالا کہ،

"Muslim Law leaves the idolators only the choice between conversion and death". (G.E. von Grunebaum; Mediaeval Islam, pp. 145)

[اسلامی قانون بت پرستوں کو صرف تبدیلیِ مذہب یا موت کا اختیار ہی بخشتا ہے۔]

غالباً شارلمین کے قانون کو اس نے مسلم قانون تصور کیا۔ اگر ایسا تھا تو اسپین اور سسلی کی بازیابی، ہندوستان اور مسلم ممالک میں اقلیتوں کے وجود کی کیا توضیح ہوگی۔ اور امریکہ اور آسٹریلیا کے باشندوں کی نسل کشی کیا اسی اسلامی قانون کے ماننے والوں کا کارنامہ ہے۔

تدوینِ حدیث کے بارے میں مستشرقین یک زبان نظر آتے ہیں کہ کتبِ حدیث دوسری صدی کی تحریریں ہیں جو مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کی عظمت بڑھانے اور بیرونی تصورات کی اسلام میں گنجائش پیدا کرنے کے سلسلے میں وضع کر لی ہیں۔

"It (Hadith) served as a means for introducing into Islam alien traditions and concepts." (Philips, K. Hitti; Islam and the West, p.105)

[اس (حدیث) نے اسلام میں اجنبی روایات اور تصورات کو متعارف کرانے کے لیے ایک ذریعہ کا کام کیا۔]

حدیث کی جانب خصوصی توجہ کائتانی، اسپرنگر اور گولڈزیہر نے دی۔ مستشرقین کے تجزیے کے مطابق، ''حدیث نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو عقائد اور قیود کی بندشوں کو نرم کرنے میں مدد دی۔ عقائد اور رسم و رواج میں تبدیلی کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے حسبِ ضرورت احادیث وضع کی گئیں۔ الفاظ دہنِ مبارک سے منسوب کیے گئے۔ حسب منشاء افعال حیاتِ طیبہ سے متعلق بیان کیے گئے۔ احادیث کے ذریعے سیرتِ طیبہ کو تابناک بنانے کا کام لیا گیا۔ قرآن نے داعیِ اسلام (ﷺ) سے کوئی معجزہ منسوب نہیں کیا، جبکہ احادیث معجزات کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتی ہیں۔ قرآنی مباحث میں جب کوئی نزاع پیدا ہوا، احادیث وضع کر کے طے کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ متضاد احادیث پائی جاتی ہیں''۔

اس قسم کے تبصرے بھی یہ واضح کرتے ہیں کہ مبصرین کو اصولِ حدیث کا علم نہیں۔ اگر وہ تاریخ تدوینِ حدیث پر ہی نظر ڈالتے تو اس صدی میں حدیث کے بارے میں یہ تحریر کرنے سے گریز کرتے کہ،

"About one hundred years after Mohammed, the Khalif Umer II (99-101 a.h.) gave orders to have them collected and committed to writing".
(F.A. Klein; The Religion of Islam, pp.25-26)

[محمد (ﷺ) کے تقریباً ایک سو سال بعد، خلیفہ عمر ثانی (۹۹ تا ۱۰۱ ہجری)، نے انہیں جمع کرنے اور ضبطِ تحریر میں لانے کے احکامات جاری کیے۔]

مستشرقین نے فنِ حدیث کو فنِ تاریخ تصور کیا۔ یا پھر دیگر مذاہب کی کتب سے مماثل سمجھا کہ مجہول الحال مورخین کی تحریروں کو بلا کسی تفتیش کے تاریخی وثیقہ مان لیا جائے۔ بائبل کے گمنام مصنفین کے افکار کو

صحیفہ سماوی تسلیم کر لیا جائے یا سنجے گاڑی بان کی روایت پر بھگوت گیتا کو کرشن بھگوان کی تصنیف سمجھ لیا جائے۔ یہاں لاکھوں چشم دید شاہد ہیں جن کی نظریں حیاتِ طیبہ کی ہر خفیف جنبش پر لگی ہوئی ہیں۔ جن کے گوش منتظرِ سماعت ہیں، اور ہر لفظ کو حاصلِ کلام جان کر محفوظ کر رہے ہیں۔ ان لاکھوں کیمروں اور ٹیپ ریکارڈروں کی موجودگی میں کسی غلط بیانی کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ ہر غلط بیانی یا سہو دوسرے گواہ کے بیان کی روشنی میں خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ صحاحِ ستہ کی تالیف دوسری صدی میں ہوئی لیکن یہ ان کی اپنی تصانیف نہ تھیں کہ حدیث کی ابتدا ان کے مولفین سے سمجھی جائے۔ اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ صحاحِ ستہ سے قبل حدیثیں تحریری شکل میں موجود نہیں تھیں۔ جبکہ اس امر کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ احادیث خود دورِ نبوی میں کتابی شکل اختیار کرنے لگی تھیں۔

مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی کی 'تدوینِ حدیث' محدّثین کے کارناموں، انکی احتیاط، انکے زہد و تقویٰ، اور اہتمامِ حفاظتِ حدیث کا مرقع ہے۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ کوئی حدیث کسی محدّث کے لیے اس وقت تک قابلِ قبول نہیں تھی جب تک اس کا راوی خود قابلِ اعتماد نہ ہو۔ وہ خود شاہد ہو یا اس نے کسی شاہد سے راست سماعت کی ہو۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ عہدِ صحابہ ایک صدی سے زیادہ بسیط ہے۔ حضرت انسؓ عہدِ نبوی کے بعد سو [۱۰۰] سال سے زیادہ حیات رہے۔ حضرت ہرماسؓ بن زیادہ باہلی ایک سو بارہ [۱۱۲] سال، حضرت محمودؓ بن ربیع عہدِ نبوی کے بعد ایک سو نو [۱۰۹] سال زندہ رہے۔ ایسے صحابہ جو عہدِ نبوی کے بعد سو [۱۰۰] سال سے کم لیکن ساٹھ [۶۰] سال سے زیادہ حیات رہے، ان کی تعداد تیس [۳۰] سے تجاوز کرتی ہے۔

(ملاحظہ ہو مناظر احسن گیلانی، 'تدوینِ حدیث'، صفحات ۵۱ تا ۶۵، طبع دوم، کراچی، ۱۳۹۰ھ)۔

ان حالات میں یہ تصوّر کرنا کہ حضرت عمر ثانی جیسے دیندار خلیفہ متدیّن علماء سے احادیث جمع کرنے کے لیے کہیں اور غیر مستند مشکوک یا وضعی احادیث جمع کر دی جائیں، اور انہیں بے شمار اصحاب رسول اللہ ﷺ من وعن قبول کر لیں یا عمداً خاموشی اختیار کر لیں، محض سوءِ ظن ہوگا۔ عمر بن عبدالعزیز اسلام کے ''پال'' نہ تھے جنہیں اپنے چرچ کے استحکام کے لیے متی، لوقا یا مرقس کی انجیل درکار ہوتی۔ انکا مقصد محض اقوالِ رسول اللہ ﷺ کو کتابی شکل میں محفوظ کرنا تھا۔ لہٰذا اس مجموعے کی تصدیق و توثیق ہر ممکن ذریعے سے کرانا ناگزیر تھا۔ ان حالات میں محض بُعدِ زمانی، شک و شبہ کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

قرآن اور دیگر صحفِ سماوی

پال یہودی تھا۔ اس کے ابتدائی متبعین رومیوں اور یونانیوں کے بجائے وہاں کے یہودی تارکینِ وطن تھے۔ اس کی تبلیغ کو نئے اور جداگانہ مذہب کے پیغام کے بجائے قدیم یہودیت کی تجدید تصوّر کیا گیا۔ اگر ابتدا سے ہی عیسائیت کو جداگانہ مذہب کی حیثیت حاصل ہوتی تو رومیوں اور یونانیوں کی طرح یہود بھی

اس سے غیر متعلق رہتے۔ یہود کو وابستہ رکھنے کے لیے عہد نامۂ قدیم کو شاملِ ایمان رکھنا ناگزیر تھا۔ یہود کی کوششوں سے ہی عیسائیت نے یورپ کی سرزمین پر استحکام حاصل کیا۔ مرورِ زمانہ نے یہود کو عیسائیت سے بے دخل کر دیا۔ لیکن یہود کی تورات (عہد نامۂ قدیم) عیسائی بائبل کا جزو لاینفک بن گئی۔

جس طرح عیسائیت نے یہود کے صحف سماوی کو من وعن تسلیم کر کے شریکِ بائبل کیا اسی طرح یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اگرچہ قرآن میں بائبل کی کتب کو شامل نہیں کیا گیا، لیکن اس کے سارے کے سارے مضامین بائبل سے ہی ماخوذ ہیں۔ ماخوذ! کس نے اخذ کیا؟ کیا ایک ایسے عربی باشندے نے جس نے کبھی مدرسہ کی شکل بھی نہیں دیکھی، جس کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہ آئی، جو قرآن کو کبھی اپنے قلم سے نہ لکھ سکا، اور جو عربی کے سوا کسی اور زبان سے نا آشنا تھا؟ عربی کا لٹریچر قبل از اسلام کیا تھا؟ سبعہ معلقات کے سوا کسی اور تحریر کا ذکر تک تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ سوائے شعراء کے اشعار کے، جن میں جنگ وجدل، حمیت جاہلیہ، فخر ومباہات، تشبیب، غزل، ہجر ووصال کے علاوہ اور کچھ نہیں پایا جاتا تھا، اور کوئی سرمایہ ادب نہ تھا۔

کیا مغربی مستشرقین یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ عرب میں اس زمانے میں کتنی لائبریریاں تھیں اور ان میں کتنی کتابیں تھیں؟ مکہ کی بے آب وگیاہ پہاڑیوں میں کتنے کالج تھے اور ان میں کتنے پروفیسر تھے؟ کونسی اتھارٹی وہاں موجود تھی جو تورات وزبور کی حقیقی تعلیم دے سکتی تھی۔ کہتے ہیں کہ عرب میں یہود موجود تھے اور ان کے پاس تورات اور زبور موجود تھی، ان ہی سے تعلیم حاصل کی ہوگی۔ مگر یہ کبھی نہیں کہتے کہ یہود اپنی مذہبی تعلیم کسی غیر یہودی کو دینا گناہ تصور کرتے تھے۔ پھر یہودی تعلیم اور حرمت عیسیٰؑ دو متضاد باتیں ہیں، اور حجاز میں عیسائیوں کا وجود نہیں تھا۔ پھر عیسائی تعلیم کے بعد تثلیث سے انحراف کیونکر ممکن ہوسکتا؟ الوہیت عیسیٰؑ سے انکار کس طور ممکن ہوتا؟

عرب کا ماحول علمی ماحول نہ تھا۔ ایک علمی مقالہ، ایک علمی ماحول میں برسوں کے عمیق مطالعے کے بعد تحریر ہو پاتا ہے۔ قرآن جیسا عظیم کارنامہ، جو عرب تو کجا ساری دنیا میں نہ اس سے قبل نظر آتا ہے نہ اس کے بعد، عرب کے بدوی ماحول میں جہاں گلہ بانی، صحرانوردی، فسق وفجور، جنگ وجدل اور اخلاقی پستی کے سوا کچھ نہ تھا، کس طرح انجام پایا؟ وہ مخالف ماحول جو دشمنی اور عناد پر کمربستہ تھا، کیوں اس معلّم یا ذریعہ تعلیم کو دریافت نہ کرسکا جس سے قرآن (بزعم دشمناں) ترتیب پا رہا تھا؟ دشمنوں کے لیے اپنی توانائیاں مخالفت میں صرف کرنے کے بجائے یہ زیادہ سہل ہوتا کہ وہ اس معلّم یا ذریعہ تعلیم کی نشاندہی کر کے اپنا دردِ سر ختم کر لیتے۔ قرآن کے اس دعوے کو بے اثر کر دکھاتے کہ قرآن کی ایک سورۃ بھی انسان کے لیے ناقابلِ تدوین ہے۔

عرب کے ماحول میں دنیا کی عظیم ترین کتاب کی تصنیف ناممکن تھی۔ پھر آخر قرآن کیسے ظہور پذیر ہوا؟ یہ مسئلہ اس وقت تک حل طلب ہی رہے گا جب تک وحی الٰہی کو ذریعہ علم تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اور جونہی وحی کو اس کا ذریعہ تسلیم کر لیا جائے، تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں کہ تمام صحف سماوی کا تعلق ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے ہے جس کے باعث ان میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ قرآن میں عہد نامہ قدیم وجدید کے مذکور انبیاء کا تذکرہ اسی لیے بار بار ہوتا ہے کہ وہ بھی انسان اور عالمِ بالا کے درمیان واسطہ تھے۔ جس طرح پیشہ ور طبقے

مثلاً مورخ، سائنسداں، اطباء، فلسفی، سب کے سب اپنے پیشرو مشاہیر سے اپنا تعلق قائم رکھتے ہیں اسی طرح اگر سلسلہ توحید میں یہی تعلق نظر آتا ہے تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ کوئی بھی شخص جو کسی صحیفۂ سماوی کا قائل ہو، قرآن کے صحیفۂ سماوی ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔ قرآن ہر پہلو سے دیگر صحفِ سماوی سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔

عہد نامۂ قدیم و جدید کسی ایک دور یا ایک شخص کی الہامی واردات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ ان کے بے شمار گمنام مصنفین ہیں، جو ڈیڑھ ہزار سال کی مدت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کی تاریخی حیثیت غیر تسلی بخش ہے اور یہ ہر دور میں اداراتی کاوشوں سے مجروح ہوتی رہی ہیں۔ عہد نامۂ قدیم کی کتابیں قابلِ اعتراض مواد سے لبریز ہیں۔ ان میں عوامی داستانیں بھی ہیں اور ناقص تاریخ بھی۔ خلافِ عقل واقعات، سائنسی نقطۂ نظر سے لغویات، نیم وحشی اخلاقیات، اور غیر اخلاقی بلکہ فحاشی کی حدود کو چھونے والے افسانے بھی ہیں۔ ان کتابوں کی اہمیت صرف اسقدر ہے کہ ان سے وحدانیت کا تصور وابستہ ہے۔ ورنہ ان کی وضعی کہانیوں سے خود عیسائیت پریشان ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنے والے معصوم بچے بڑے ہو کر جب آگاہ ہوں گے کہ یہ سب قصے کہانیاں محض وضعی ہیں تو ان کتابوں پر مبنی مذاہب کا تقدس کس قدر مجروح ہوگا۔ یورپ کے ماہرین تعلیم اس امر کا مشورہ دے رہے ہیں کہ اسکولوں کے نصاب سے عہد نامۂ قدیم کو خارج کر دیا جائے کیونکہ جیسے جیسے انسانی علم کامل ہوتا جاتا ہے، عہد نامۂ قدیم کی کتب کی زبوں حالی بڑھتی جاتی ہے۔

کیا قرآن میں بھی اس قسم کی کوئی کمزوری پائی جاتی ہے؟ ڈاکٹر بوکائی نے اپنی کتاب 'سائنس، بائبل اور قرآن' میں سائنسی نکتہ نظر سے دونوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں جہاں انہوں نے بائبل کو سائنسی نکتۂ نظر سے اغلاط کا مجموعہ قرار دیا ہے، وہیں انہیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ:

"It was only when I examined the text (of Quran) very closely in Arabic and I kept a list of them (scientific statements) that at the end of which I had to acknowledge the evidence in front of me. The Quran did not contain a single statement that was questionable from a modern scientific point of view".

(Dr. Boucaille; The Bible, The Quran and Science, p.viii)

[یہ صرف اسی وقت ہوا جب میں نے قرآن کے متن کا عربی زبان میں ان (سائنسی بیانات) کی ایک فہرست مرتب کرتے ہوئے انتہائی عرق ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا، کہ بالآخر مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ میرے سامنے (الہامی کتاب ہونے کی) گواہی موجود ہے۔ قرآن میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ٹھہرتی ہو۔]

قرآن کے کسی بیان کی اب تک سائنسی نقطۂ نظر سے تردید نہیں کی جا سکی ہے۔ اس کے برخلاف ایسے دعوے بکثرت پائے جاتے ہیں جن کی صحت کی سائنس نے اس صدی [بیسویں صدی] میں تصدیق کی ہے۔

مغرب نے عموماً قرآن پر بڑی سطحی تنقیدیں کی ہیں، مثلاً مضامین قرآن کا دیگر صحف سے مماثل ہونا، انبیاء کا مشترک ہونا، مضامین کی تکرار، موضوعات کی جلد جلد تبدیلی، قرأت میں اکتاہٹ کا احساس، زبان کی سختی وغیرہ۔ اس بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ کسی صحیفہ سماوی سے اگر کوئی ذہن ہم آہنگ نہ ہو سکے تو یہ صرف اس ذہن کا ہی قصور ہو سکتا ہے۔ تاہم کچھ اعتراضات ایسے بھی ملتے ہیں جنہیں وہ حاصلِ کلام تصوّر کرتے ہیں۔

مریم اور میریا کی الجھن: ان میں سے ایک الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ صاحبِ قرآن عہد نامہ کی کتب سے راست واقفیت نہ رکھتے تھے۔ ان کی معلومات کا ذریعہ سنی سنائی باتیں تھیں جس کے باعث ان سے مختلف شخصیات کے بارے میں (نعوذ باللہ) سہو ہوا۔ مثلاً سورہ آلِ عمران میں حضرت مریمؑ کے والد کا اسمِ گرامی عمران بیان کیا گیا ہے جبکہ تورات کی کتابِ پیدائش میں حضرت موسیٰؑ کے والد کا نام عمرام پایا جاتا ہے۔[۳۱] اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی ایک بہن تھیں جن کا نام بھی مریم تھا۔ مغرب اوّل الذکر کو ''میری'' اور ثانی الذکر کو مریم کہتا ہے۔ نیز قرآن میں سورہ مریم کی آیت ۲۸ میں حضرت مریم کو اختِ ہارون کہا گیا ہے۔ ان متفرق اشارات کی مدد سے مغرب نے یہ دعویٰ کیا کہ،

"A confusion seems to have existed in the mind of Mohammed between the virgin Mary and Miriam the sister of Moses".

(E.H. Palmer; The Koran, p.45)

[محمد ﷺ کے ذہن میں (نعوذ باللہ) ایسا لگتا ہے کہ کنواری میری اور موسیٰؑ کی بہن میریم (کی شخصیات) کے درمیان ایک ابہام سا تھا۔]

اس ایک اعتراض میں دو خامیاں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ذہن نبوی خود قرآن کے تابع تھا، قرآن ذہن نبوی کی تخلیق نہیں۔ دوسری خامی یہ ہے کہ مغرب خود اپنی الجھن اور کم فہمی کو ذہن نبوی سے منسوب کرنے کی ناشائستہ جسارت کر رہا ہے۔ بالفرض اگر ہر دو ہستیوں کو ایک تصوّر کیا جا رہا تھا تو اس کے دوررس اثرات کسی نہ کسی اور مقام پر ظاہر ہونے چاہیے تھے۔ ہر وہ فرد جو حضرت مریمؑ کو حضرت موسیٰؑ کی بہن تصور کرتا وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کو ہم عصر سمجھتا، اور نتیجتاً دین عیسوی اور دین موسوی کو ایک ہی دور کے مذاہب قرار دیتا، اور انہیں یا تو ایک ہی مذہب تصور کرتا یا پھر ایک دوسرے کے رقیب۔ اس یکسانیت یا رقابت کے اظہار کے لیے کسی نہ کسی واقعے کا اشارہ تو ملتا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے باہمی تعلقات کا تذکرہ ہوتا۔ لیکن پورے قرآن کے دقیق ترین مطالعے سے بھی اس امر کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس دور موسوی اور دور عیسوی کے بُعد زمانی کا واضح تصوّر ملتا ہے۔ فراعنہ کا زمانہ، مصر و سینا کا ماحول، بنی اسرائیل کی مظلومیت، [حضرت موسیٰؑ کے] ہم عصروں میں حضرت شعیبؑ اور حضرت ہارونؑ کے تذکرے، اس دور کی معاشرتی جھلکیاں، جادو اور سحر، گاؤ پرستی، بے راہ روی، جدوجہد آزادی، خروج، صحرا نوردی، آب و دانہ کی کمیابی، عبادت کا انداز، عبادت گاہوں کی نایابی، شریعت کا نفاذ، لشکر کشی اور فتوحات، ارض کنعاں کی جانب پیش قدمی، یہ ساری تفصیلات دور موسوی کی غیر مبہم تصویر کھینچتی ہیں۔

حضرت عیسیٰ اور انکے دور کی منظر کشی مندرجہ بالا تصویر سے قطعی جدا ہے۔ نہ فراعنہ ہیں نہ مصر و سینا کا ماحول، بنی اسرائیل مظلوم اقلیت یا خانہ بدوش نہیں، بلکہ متمدن شہری ہیں۔ جنکے ہیکل ہیں جہاں خدا رسیدہ لوگ گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب شرع کے مطابق پرسکون انداز میں عبادت کی جارہی ہے۔ [حضرت عیسیٰ کے] ہم عصر بزرگوں میں حضرت زکریاؑ اور ہم عمروں میں حضرت یحییٰ ہیں۔ معاشرتی جھلکیوں میں جادوٹونے کی جگہ طب کا چرچا ہے۔ فوج کشی کی جگہ تزکیہ نفس ہے۔ من وسلویٰ کے بجائے کھجور اور میووں کا چلن ہے۔ خیموں کی جگہ پختہ عمارتیں ہیں۔ الواح کے بدلے کتاب، کسی نئے مذہب اور نئے شرعی احکامات کی جگہ قدیم شرع کی تجدید کی کوشش۔ کیا یہ تفصیلات ایک جداگانہ دور کی منظر کشی کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتیں؟ ان جداگانہ ادوار کے تعین کے بعد شائد ہی کوئی صحیح الدماغ شخص ہو جو یہ کہے کہ مریم بنت عمران اور مریم بنت عمرام دونوں کے تشخص میں کسی قسم کا الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ ناموں کے تلفظ میں اختلاف تو ایک عام سی بات ہے۔ عہد نامہ قدیم و جدید کے بیشتر بزرگ یونانی اور لاطینی تلفظ کے سبب اجنبی سے ہوگئے۔ ابراہام، سیموئیل، جیکب، جوزف، جوڈا، ڈیوڈ، سولومن، ایلیا یا ایلیجا، جاب، جان، موزز اور جیسس یہ سارے تلفظ ابراہیم، اسمٰعیل، یعقوب، یوسف، یہودا، داؤد، سلیمان، الیاس، ایوب، یحییٰ، موسیٰ اور عیسیٰ کے اسمائے گرامی کی بدلی ہوئی شکلیں ہی تو ہیں۔ پھر اگر مریم کو میری یا میریا کر دیا تو اس میں قصوروار کون ہے؟ قرآن نے تو انہیں ان کے صحیح ناموں سے یاد کیا۔ یہ تو مغرب ہے جو اپنے تلفظ کو قدر بنا کر صحیح کو غلط قرار دے رہا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ قرآن نے مریم بنت عمران کو اخت ہارون کیوں کہا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے والد کا نام عمرام تھا، عمران نہ تھا۔ قرآن نے مریم بنت عمرام کو نہیں مریم بنت عمران کو حضرت عیسیٰ کی والدہ کہا ہے، اور ان کو اختِ ہارون کی کنیت سے ایک بلیغ انداز میں یاد کیا ہے۔ اس انداز کی لطافت سے ناآشنا ہونے کے سبب سے ہی زبانِ طعن دراز ہوسکی۔

عرب اور عبر دونوں ہی اپنے آپ کو اپنے اجداد سے منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتے آئے ہیں۔ مشاہیرِ عرب اپنے ذاتی ناموں سے کم ہی معروف ہیں اور زیادہ تر اپنی کنیت سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ابنِ رشد، ابنِ سینا، ابن العربی، ابنِ بیطار، ابن حنبل، ابنِ میمون، ابن ماجہ، ابنِ خلدون سے کون واقف نہیں، لیکن ان کے ذاتی ناموں سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔ ان کے لیے اپنے آباء واجداد سے موسوم ہونا باعثِ افتخار تھا۔ اسی طرح باعزت مخاطبت کے لیے اجداد کی مناسبت دی جاتی تھی۔ مثلاً حضور ﷺ نے اپنی ذاتِ گرامی کے لیے فرمایا،

"أنا دَعوَةُ أبی اِبراھیمَ و بُشریٰ اَخی عیسیٰ"۔

[میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا اور اپنے بھائی عیسیٰ کی بشارت ہوں۔]

(ملاحظہ ہو کہ حضرت ابراہیمؑ کو والد اور حضرت عیسیٰ کو بھائی فرمایا)

حلیمہ سعدیہ سے شقِ بطن کی جو روایت بیان کی جاتی ہے، اس میں حضور ﷺ کے لیے حلیمہ کے بیٹے نے 'اَخِ قریشیٔ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

اس پس منظر میں دیکھنے سے قرآن میں حضرت مریم کے لیے استعمال کیے گئے اختِ ہارونؑ کے الفاظ کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ جب حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی تو،

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا ۝ یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا ۝ (القرآن، سورۃ مریم، آیۃ ۲۷-۲۸)

''(مریم گود میں) انہیں لیے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں۔ لوگوں نے کہا اے مریم یہ تو نے کیا طوفان بپا کیا۔ اے اختِ ہارون! نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا نہ تیری ماں بدکار تھی۔.....''

اس پس منظر میں یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہ جاتی کہ حضرت مریم کی قوم نے جہاں انکا اسمِ ذاتی استعمال کیا وہیں انکو دوسری نسبت سے بھی یاد کیا۔ اب سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دوسری نسبت کی حقیقت کیا ہے؟ کیا انہیں حقیقی اعتبار سے اختِ ہارون کہا گیا یا یہ مجازی اعتبار سے تھا؟

حقیقی اعتبار سے انہیں اختِ ہارون نہیں کہا گیا۔ یہ بات ہمیں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتی ہے جسے مسلم نے روایت کیا اور علاّمہ جلال الدین سیوطی نے 'الاتقان' کی نوع ۸۰ میں سورہ مریم کے متعلق تفسیری احادیث میں نقل کیا۔

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا،

''مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے نجران کی طرف بھیجا تو وہاں کے لوگوں (عیسائیوں) نے کہا، کیا تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ تم لوگ 'یا اختَ ھارون' پڑھتے ہو حالانکہ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ سے اتنے اتنے زمانے قبل گزرے ہیں۔ پھر میں واپس آیا تو میں نے اس بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا تم نے ان کو یہ خبر کیوں نہ دی کہ وہ (بنی اسرائیل) انبیاءِ ماقبل اور صالحین کے ناموں پر ہی بچّوں کے نام رکھا کرتے تھے۔''

اس حدیث کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ دورِ نبوی میں ہی عرب اس امر سے واقف تھے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیان خاصا بُعد زمانی تھا۔ یہ علم خود حضور ﷺ کو بھی تھا۔ لہٰذا یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ان دو شخصیتوں کے تشخص میں کوئی الجھن رہی ہو۔

مزید برآں خود پامر نے سورہ حجرات کی گیارہویں آیت کی شانِ نزول یہ نقل کی کہ امّ المومنین حضرت عائشہؓ نے امّ المومنین حضرت صفیہؓ کو یہودی النسل ہونے کا طعنہ دیا، جسکی شکایت حضرت صفیہؓ نے حضور ﷺ سے کی۔ جس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ ہارونؑ میرے باپ، موسیٰؑ میرے چچا اور محمد ﷺ میرے شوہر ہیں۔

کیا کوئی شخص اس اندازِ بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ چونکہ یہاں صیغہ حال استعمال ہوا ہے لہٰذا یہ ساری شخصیتیں ایک ہی دور کی ہیں۔ یا یہ کہ متکلم کو شخصیتوں کے تشخص میں کوئی غلط فہمی تھی۔ یا یہ کہ اگر حضرت ہارونؑ کی کسی بیٹی کا نام اتفاقاً صفیہ ہوتا تو امّ المومنین صفیہؓ کو حضرت ہارونؑ کی حقیقی دختر تصور کیا جاتا۔ ایسا تصور کرنا یقیناً کم علمی کی دلیل مانا جائے گا۔

ملاحظہ فرمائیے کہ قرآن کا حضرت مریم کو 'یا اخت ہارون' سے خطاب کرنا کس قدر لطافت رکھتا ہے۔

تورات کی کتب خروج، احبار اور گنتی حضرت ہارونؑ کی فضیلت اور تقدس سے بھری پڑی ہیں۔ حضرت موسیٰ کے بعد انہیں سب سے بڑا درجہ حاصل ہے۔ یہود میں ہیکل کی تمام مذہبی خدمات حضرت ہارون کی اولاد کے لیے وقف ہیں۔ اسی طرح کسی کی حضرت ہارونؑ سے نسبت اس کی عالی نسبی، مذہبی تقدس اور علمی فضیلت کے اظہار کے لیے کافی ہے۔ ان کے گھرانے کی ہر خاتون خود کو بنتِ ہارون کہتی ہے۔

حضرت ہارونؑ کی ایک بہن مریم تھیں۔ جنکا تذکرہ تورات کی متعدد کتب مثلاً خروج باب ۱۵- درس ۲۰، باب ۲- درس ۴، قضاۃ باب ۴- درس ۴، میکاہ باب ۶- درس ۴، گنتی باب ۱۲- درس ۱ تا درس ۱۶ میں آیا ہے۔ ان میں بیان کردہ واقعات کے مطابق یہ خاتون نبیہ تھیں (واضح رہے کہ اسلام ان کو یا کسی اور خاتون کو نبی نہیں مانتا)۔ اور اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر دینی کاموں میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتی تھیں۔ یہ واحد خاتون تھیں جو خداوند یہوواکے مسکن میں باریاب تھیں۔ گویا بنی اسرائیل کی خواتین میں انہیں عظیم ترین مذہبی حیثیت حاصل تھی۔ تورات ہی کی کتاب گنتی باب ۱۲ کے مطابق انہیں یہ خیال گزرا کہ جب انہیں اور حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ کے برابر درجہ میسر تھا تو آخر حضرت موسیٰؑ کو ہر معاملے میں کیونکر فضیلت دی جاتی تھی۔ ان کی بدگمانی کے سبب خدا کا قہر ان پر کوڑھ کی شکل میں نازل ہوا، جس کے بعد انہوں نے توبہ کی اور پھر انہیں اس عذاب سے نجات ملی۔

ان واقعات کی روشنی میں اس منظر کا مشاہدہ کیجیے کہ حضرت مریم کی قوم غلط فہمی کی بنیاد پر ان کی مذمت کرنے پر اتری ہوئی ہے۔ اگر قوم کا مافی الضمیر بیان کیا جائے تو یہ حضرت مریم پر تہمت ہوتی اور اگر مافی الضمیر کی جانب کنایہ نہ کیا جائے تو قوم کے جذبات کی عکاسی نہ ہو سکے۔ لطافت و اعجازِ بیان یہی ہے کہ انکی حرمت بھی برقرار رہی اور قوم کے جذبات کا اظہار بھی ہو گیا۔ اختِ ہارون سے تشبیہ دے کر انہیں تقدس و حرمت میں عظیم ترین مقام پر فائز رکھا گیا۔ اور عامیانہ ذہن کی فرسودگی کی نشاندہی بھی کر دی۔ برگزیدہ بندوں کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ فطرتاً معصوم ہوتے ہیں۔ اور بازاری لوگ بے جھجک ان پر بہتان باندھتے ہیں۔ اس پوری کیفیت کا صرف ایک مجاز سے اظہار اپنی مثال آپ ہے۔

ہامان: قرآن میں حسب ذیل مقامات پر ہامان کا ذکر فرعون کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ القصص، آیات ۶ تا ۸ اور ۳۸، سورۃ عنکبوت، آیت ۳۹۔

عہد نامۂ قدیم کی کتاب 'استر' کے ایک کردار کا نام بھی ہامان ہے، جو ایران کے شاہ اخسویرس کا وزیر اور یہود کا سخت دشمن تھا۔ اس نے شہنشاہ سے پوری مملکت میں یہود کے قتل عام کی اجازت حاصل کی لیکن یہودن ''استر'' اور یہودی ''مردوکی'' کے جوڑ توڑ کے باعث ہامان کو اس سولی پر لٹکایا گیا جو اس نے مردوکی کے لیے تیار کی تھی۔ (عہد نامۂ قدیم، آستر، باب ۱-۷)

مستشرقین نے اس نکتہ کو بھی خاصا اچھالا ہے اور نہایت تمسخرانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ 'قرآن نے ہامان کو فرعون کا وزیر اعظم بنا دیا'۔ (E.H. Palmer; TheKoran, p.45)۔ اس ایک جملے میں

پورا ایک تنقیدی باب بند ہے۔ مراد یہ کہ قرآن چونکہ مستشرقین کی نظر میں، انسانی تصنیف ہے، اس لیے اس کے مصنف نے محض اپنی لاعلمی کے باعث بائبل کے اس کردار کو فرعون کا وزیر اعظم بنا دیا۔ گویا تاریخ میں ایک نام کے دو افراد کا وجود ان مستشرقین نے خارج از امکان قرار دے دیا۔

بیسویں صدی کی تحقیقات کی روشنی میں بعض ایسے حقائق سامنے آئے ہیں جن کی بنیاد پر بلا کسی شک و شبہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرعون کے وزیر مذہبی امور کا نام 'ہامان' تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون ''مصر'' کے چند متعلقہ اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

۱- ''۱۹۲۲ء میں مغربی تھیبس کی وادی مقابر شاہان میں ایک صحیح سالم مقبرے کی دریافت نے اخبارات کو شہ سرخیوں سے بھر دیا۔ یہ مقبرہ توتنک ہامان کا تھا۔''

۲- ''آمن دیوتا کا مندر تھیبس میں تھا۔ اس کی پرستش ہر دور میں نظر آتی ہے۔ یہ خدائے شمس تھا۔ یا تو فرعون خود اسکا مہا پجاری ہوتا تھا، یا پھر فرعون کا وزیر کبیر اس عہدے پر فائز ہوتا تھا۔ چنانچہ اخناتن کو اسقدر مذہبی لگاؤ تھا کہ وہ خود ہی آمن دیوتا کا مہا پجاری تھا۔''

۳- ''اخناتن ۱۳۶۲ ق-م کے لگ بھگ مرا۔ اس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ چھ لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اس لیے اس کے بعد اس کے داماد حکمران ہوئے۔ پہلا داماد صرف ایک قلیل مدت ہی حکومت کر سکا۔ دوسرا توتنک ہامان تھا، جسکا مقبرہ ۱۹۲۲ء میں دریافت ہوا۔ اکیسویں خاندان کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ آمن کے مہا پجاری کی قوت اسقدر بڑھ چکی تھی کہ وہ راست فرعون سے ٹکر لے رہا تھا۔''

۴- ''شدید شورش یا شائد خانہ جنگی کے بعد ہیر یہور نے جو آمن کا مہا پجاری، کُش کا وائسرائے اور فوج کا سپہ سالار تھا، رعمیسس کی حیات میں ہی شاہی لقب اختیار کیا۔ اس کے زمانے کا ایک منفرد نوشتہ پایا جاتا ہے جسے تاریخی رومان کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ 'قصہ ون آمن' کہلاتا ہے۔ اس کے مطابق ہیر یہور نے ون آمن کو شام روانہ کیا جہاں اسے پتہ چلا کہ مصر کی ساکھ بیرونی دنیا میں ختم ہو چکی ہے۔''

۵- ''(آمن کے) مہا پجاری کو ملک میں فراعنہ کے بعد سب سے بڑا درجہ حاصل تھا۔ کبھی خود فرعون اس مندر کا مہا پجاری ہوتا تھا۔''

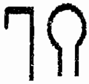
۶- ''فرعون کے بعد ملک کا اہم ترین عہدہ وزارت امور مذہبی کا تھا۔ یہ وزارت ہمیشہ آمن کے مہا پجاری کو تفویض کی جاتی تھی۔''

(For details of the above cited points see; Encyclopedia Britanica, essay 'Egypt', Vol. VIII, pp.33-44)

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ فراعنہ کے وزرائے اعظم آمن کے مہا پجاری ہوا کرتے تھے۔ اور فراعنہ کے بعد مقتدر ترین شخصیت آمن کے ان پجاریوں کی تھی۔ لفظ آمن کا استعمال کبھی کبھی مرکب شکل میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً آمن-رے۔ مصری زبان میں رے یا را سورج کو کہتے تھے۔ سورج بذات

خود دیوتا تھا۔ لہٰذا محسوس ہوتا ہے کہ لفظ آمن دیوتا کے علاوہ کسی وصف کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جیسے مذہب، قانون، امن، طریقہ، اقتدار وغیرہ۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون ہیروگلف کے مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ پجاریوں کو ان کے دیوتاؤں سے نسبت دینے کے لیے لفظ 'ہم' دیوتا کے نام سے پہلے یا بعد میں لگا دیا جاتا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا نے ہم نسر کے معنی 'عبد نسر' بیان کیے ہیں۔

ہیروگلفی تحریر میں ہم نسر کے لیے  اشارات استعمال کیے گئے ہیں۔

NCR HM

اور ماہرین نے اس اشارے کی حسب ذیل تصریح کی ہے۔

'HM - NCR , Servant of God (A type of Priest), written NCR-HM'

(Encyclopedia Britanica; essay 'Hiero Glyphs'. Vol. 11, p.479)

ان معلومات کی روشنی میں یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ جس طرح 'ہم نسر' اس پجاری کو کہا جاتا تھا جو نسر کی خدمت پر مامور تھا اسی طرح دیگر پجاریوں کو بھی انکے دیوتاؤں کے ناموں سے ملقب کیا جاتا رہا ہوگا۔ اس طرح آمن کے پجاری کو 'ہم آمن' کہا جاتا ہوگا، جو رفتہ رفتہ 'ہامان' میں تبدیل ہوگیا ہوگا۔ اگر آمن اسم خاص متصور ہو تو ہامان عبد آمن کے مترادف ہوگا۔ اور اگر آمن کے کوئی وصفی معنی رہے ہوں گے تو ہامان ایک با اقتدار شخصیت نظر آئے گی جو آمن کے تقاضوں کی تکمیل کی ذمہ دار ہو۔

لفظی بحث سے قطع نظر، ہامان ایک نہایت اہم عہدیدار کو کہا جاتا تھا۔ جس کا مرتبہ فرعون کے سوا کسی اور سے کم نہیں تھا۔ یہ محض اتفاق ہے اس نام کا ایک کردار کتاب 'آستر' میں بھی پایا جاتا ہے۔ جس کے سبب اس قسم کے اعتراض کو راہ مل سکی۔ ورنہ حقائق کی روشنی میں ان مستشرقین کا اعتراض انکی اپنی کم علمی کی دلیل ہے۔

جنت اور مغرب: نظریہ ثنویت اور عقیدہ معاد میں ایک گہرا تضاد ہے۔ ثنویت کے مطابق روح پاک اور بدن ناپاک ہے۔ روح کی آزادی بدن کے فنا ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ روح بدن کے پنجرے میں مقید ہے۔ اگر حیات بعد الممات میں روح دوبارہ بدن میں قید ہوجائے تو یہ نجات کے تصور کے منافی ہے۔ جبکہ عقیدۂ معاد کے مطابق بلا بدن کے حیات بعد الممات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ روح لافانی ہے اور غیر مادی ہے۔ اسکے اظہار کے لیے بدن لازمی ہے۔ عیسائیت نے ان دونوں متضاد نظریات کو اپنایا اور اشکال کو دور کرنے لیے یہ تاثر دیا کہ حیات بعد الممات مادی جسم میں نہیں بلکہ ایک غیر مادی جسم میں ہوگی۔ اس تصور کے سبب آخرت کی زندگی میں دنیاوی احتیاجات مثلاً کھانا پینا یا جسمانی مسرت کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

یہی وجہ ہے کہ عیسائی جب قرآن میں ایسی جنت کا تذکرہ پاتا ہے جہاں رہنے کے لیے مکانات، کھانے پینے کے اعلیٰ انتظامات اور عیش جاودانی کے سامان میسر ہیں تو اسے سخت قباحت محسوس ہوتی ہے اور وہ اس

پر تنقید، طنز اور طعن کرتا ہے۔ جنت کے اسباب مسرت کو وہ غیر فطری قرار دیتا ہے اور تان یہاں ٹوٹتی ہے کہ غیر فطری باتیں کسی الہامی کتاب کا جزو نہیں ہو سکتیں۔

یہ تنقید صرف اس لیے کچھ وزنی محسوس ہوتی ہے کہ مغربی قدر کو صحیح بنیاد تقابل کی حیثیت دی جاتی ہے۔ لیکن یہ قدر خود اس کے اپنے مذہب اور کتب سماوی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ غیر مادی جسم کا تصور پال نے یونانی اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے دیا تھا۔ لیکن پال کے اس تصور کی تائید میں عہد نامۂ قدیم یا عہد نامۂ جدید میں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ جبکہ انجیل متی، انجیل لوقا اور انجیل یوحنا میں جنت، اس کے محل اور اسکے مشاغل میں خورد و نوش کا ذکر پال کے نظریے کی واضح تردید ہے۔ وہاں صرف ایماندار ہی نہیں بلکہ خود خدا بھی دعوت میں شریک نظر آتا ہے۔ انجیل متی کے مطابق یسوع نے کہا:

''میں تم سے کہتا ہوں کی انگور کا یہ شیرہ اب اس وقت تک نہ پیوں گا جب تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں دوبارہ نہ پیوں۔'' (متی ۲۶-۲۹)

خدا کی بادشاہت کی توضیح مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے۔ ابتدائی ایام میں یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ جلد ہی دوبارہ نزول کریں گے۔ ان کی آمد قیامت کا پیش خیمہ ہوگی جس کے بعد خدا کی بادشاہت شروع ہو جائے گی۔ صدیوں ورود عیسیٰؑ کا انتظار ہوا، پھر قیامت کا تصور پس منظر میں چلا گیا اور اسکی نئی نئی تاویلیں ہوئیں۔ کبھی اس بادشاہت کو ایمان سے اور کبھی چرچ سے تعبیر کیا گیا۔ اور بالآخر خدا کی بادشاہت آسمانی قرار پائی، جس میں انسان موت کے بعد زندہ ہو کر داخل ہوگا۔

انجیل لوقا کے مطابق یسوع نے کہا، ''تا کہ تم باپ کی میز پر بیٹھ کر کھاؤ پیو۔'' (لوقا-۶۲، ۳۰)

''تمہارا دل نہ گھبرائے۔ تم خدا پر ایمان رکھتے ہو۔ مجھ پر ایمان رکھو۔ میرے باپ کے بہت سے محل اور مکان ہیں۔ اگر نہ ہوتے تو میں تم سے کہہ دیتا۔'' (یوحنا-۱۴، ۱-۲)

مندرجہ بالا اشارات معاد کا یقیناً ایسا تصور پیش کرتے ہیں جس میں ایماندار محلوں میں رہیں گے اور خورد و نوش سے لطف اندوز ہوں گے۔ خدائے پدر کے دسترخوان پر دعوت سے سرفراز ہوں گے۔ معاد کا یہ عقیدہ عیسائیت کے ابتدائی ایام میں مسلمہ تھا۔ چنانچہ سینٹ افرئم متو (۳۷۲ء) نے مقام سعادت کی منظر کشی میں سارے زمینی رنگ استعمال کیے ہیں۔ (G. E. von Grunebaum, Mediaeval Islam, p.13)۔

یونانی اثرات کے تحت جنس کو عیسائیت نے ہر صورت میں سفلی جذبہ تصور کیا ہے لیکن اسلام اسے ایک فطری تقاضہ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنت میں اناث کا ذکر عیسائیوں کو غیر اخلاقی محسوس ہوتا ہے۔

عہد نامۂ قدیم چونکہ یونانی اثرات سے آزاد تھا اس لیے اس میں آدم کے ساتھ جنت میں حوا کی موجودگی موجب عار تصور نہیں کی گئی۔ عیسائیت نے ہر دو یعنی یونانی تصور کو بھی اپنایا اور عہد نامہ قدیم کے تصور کو بھی، اس لیے تضاد پیدا ہوا، جس کے سبب جنتِ قدیم میں تو عورت کا وجود باقی رہا لیکن اس جنت میں جسے عیسائیت نے یونانی تصور کو قبول کرنے کے بعد بپتسمہ دیا، عورت کا وجود غیر اخلاقی بن گیا۔

پس قرآن میں جنّت کی جو تفصیلات پائی جاتی ہیں اور جنہیں مغرب اچنبھے کی نگاہ سے دیکھتا ہے، ساری کی ساری خود عہد نامۂ قدیم و جدید میں مجمل طور پر موجود ہیں۔ خود اپنی کتابوں پر انہیں کوئی استعجاب نہیں ہوتا، لیکن یہی باتیں اگر قرآن میں پاتے ہیں تو انگشت نمائی کرتے ہیں۔ کیا یہ صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ قرآن انکی اپنی مذہبی کتاب نہیں ہے۔ لہٰذا کوشش یہی ہوتی ہے کہ جس طور بھی ممکن ہو اس کی اہمیت کو مجروح کیا جائے۔

متنِ قرآن: متعدد مستشرقین نے متنِ قرآن میں شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نکلسن نے دعویٰ کیا کہ حضور اپنی وحی کو کسی کتاب کا حصہ تصوّر نہیں کرتے تھے۔ [cf. R.A. Nicholson; Introduction to E. H. (Palmer's Translation of Quran)]۔ یہ اس کتاب کے بارے میں کہا جا رہا ہے جس کی ابتدا ہی 'ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ' کے الفاظ سے ہوتی ہے۔

نولدیکی، میور اور سیل نے جمع و تدوینِ قرآن میں تحریف و تصریف کے شبہ سے گریز کیا تاہم یہ الزام ضرور لگایا کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں پورا قرآن مدوّن نہیں ہو سکا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انکا ایڈیشن ملت نے تسلیم نہیں کیا۔ بارِ ثبوت مدّعی پر ہوتا ہے اور بلا ثبوت دعویٰ دیوانے کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ قرآن کو اصحابِ رسول ﷺ نے ابتدا سے ہی محفوظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسکی حفاظت نہ صرف ذہنی یادداشت، بلکہ تحریری ریکارڈ کے طور پر مکّی دور سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے واقعہ میں صراحتاً یہ حقیقت پائی جاتی ہے کہ جب وہ اپنی بہن کے گھر پہنچے تو ان کی بہن اور بہنوئی قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کی دہشت سے انہوں نے اوراق چھپا دیے اور جب حضرت کا غصہ رفع ہو گیا تو انکے طلب کرنے پر یہ اوراق انہیں دیے گئے، جو ان کے ایمان لانے کا باعث بنے۔ اسی طرح نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر اور سورۃ مریم کی تلاوت ابتدائی حفظِ قرآن کی مثال ہے۔ مدنی دور میں سینکڑوں حافظِ قرآن موجود تھے۔ امّ المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس قرآن کا تحریری نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں موجود تھا۔ ان کے عہد کی جنگوں میں بہت سے حافظِ قرآن شہید ہوئے جس کے سبب انہیں فکر پیدا ہوئی کہ حفّاظ کی شہادت سے کہیں قرآن کا کوئی حصّہ محو نہ ہو جائے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے کاتبِ وحی حضرت زیدؓ بن ثابت کو قرآن جمع کرنے کی ذمّہ داری سونپی گئی۔ واضح رہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی مدّت خلافت صرف دو سال کے قریب ہے۔

حضرت عثمانؓ کے عہدِ حکومت میں چونکہ مملکت کی حدود نہایت وسیع ہو چکی تھیں اور لوگ کثرت سے مسلمان ہو چکے تھے اس لیے قرآن کے نسخوں کی بکثرت ضرورت پڑی۔ امکان اس امر کا تھا کہ اگر مناسب انتظام نہ کیا گیا تو اغلاط سے بھرپور نسخے مملکت بھر عام ہو جائیں گے اور مرورِ زمانہ کے بعد صحیح اور غلط کے فتنے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس اہم ضرورت کی تکمیل ۶۵۱ء میں حضرت عثمانؓ نے فرمائی۔ مستند نسخے صوبوں میں روانہ کیے گئے تاکہ وہاں سے انکی نقول جاری ہوں۔

دنیا کی شائد ہی کوئی دوسری کتاب ہو جس کی حفاظت اس اہتمام سے کی گئی ہو۔ مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ پوری امّت نے اس ایڈیشن کو تسلیم نہ کیا، مضحکہ خیز ہے۔ عالمِ اسلام میں ابتدا سے لیکر آج تک صرف ایک

قرآن رائج رہا ہے۔ دنیا میں قرآن کا ایسا کوئی نسخہ نہیں جو اپنے اصل سے مختلف ہو۔ قرآن اسلام کی بنیاد ہے۔ دورِ خلافت میں نبی اکرم ﷺ کا صالح معاشرہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود تھا۔ حضرت عمرؓ جیسے بارعب خلیفہ پر تنقید کرنے کی لوگوں میں ہمت موجود تھی۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ قرآن کی تدوین حضور ﷺ کے وصال کے دوسال کے اندر اندر ہو اور یہ معاشرہ جسے قرآن کا ایک ایک لفظ از بر تھا، کسی غلطی کو روا رکھے۔ حضرت عمرؓ جو حق کے معاملے میں انتہائی بیباک تھے اس بنیادی مسئلے سے کس طرح چشم پوشی کر سکتے تھے؟ کیا یہ وہی صحیفہ نہیں تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جنگ صفین میں اسے نیزوں پر بلند کیا گیا اور صرف اس کی حرمت کے پیشِ نظر بے نیام تلواریں، نیام میں چلی گئیں۔ اگر امت نے اس صحیفے کو تسلیم نہ کیا ہوتا تو جنگ صفین، جسمیں مسلم امت کے دو مخالف گروہ آپس میں برسرِ پیکار تھے کبھی نہ رک سکتی تھی۔ گروہِ معاویہؓ حضرت عثمانؓ کے قصاص کا طلبگار تھا، اور گروہِ ثانی اس سے گریزاں تھا۔ اگر قرآن پر اس مخالف گروہ کا ایمان نہ ہوتا تو اس کی خاطر تلواریں میان میں نہ جاسکتی تھیں۔

قرآن کے مختلف ایڈیشن اور ان میں کمی بیشی کا شاخسانہ، صرف اپنی مذہبی کتابوں سے مماثلت پیدا کرنے کی ایک مذموم کوشش ہے۔ عہد نامہ قدیم کا تعلق تیرہویں چودھویں صدی قبلِ مسیح یا اس سے بھی پہلے کے دور سے ہے۔ یہ کتاب متعدد بار ضبطِ تحریر میں آئی۔ اسکے مصنفین میں بادشاہوں سے لیکر چرواہے تک شریک ہیں۔ اس کی تحریر کی مدت کم وبیش ایک ہزار سال پر محیط ہے۔ اس کے اصل نسخے ناپید ہیں۔ مسوراتی عہد نامۂ قدیم کا متن عذرا (عزیر) نے تحریر کیا۔ اور عذرا کی واپسی ۴۰۰ ق م کے لگ بھگ ہوئی۔

(cf. Encyclopedia Britanica; article 'Bible', Vol III, p.570)

موجودہ مسوراتی متن کی تحریر دوسری صدی ق م کی متصور ہوتی ہے۔

(cf. ibid; article 'Text of Old Testament' , Vol III, p.570)

گویا بائبل کے موجودہ نسخے اصل واقعات کے ایک ہزار سال کے بعد تحریر کیے گئے۔ نہ ان کی کوئی تاریخی حیثیت ہے نہ صحت۔ ان کے متعدد نسخے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ عہد نامۂ قدیم میں شامل کتابوں پر بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

سپٹاجنٹ (Septuagint) کے قدیم یونانی نسخوں کی فہرست کتب (Canon)، عبرانی نسخوں کی فہرست سے جداگانہ ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کئی ایسی کتب کو وضعی قرار دیتا ہے، جو کیتھولک بائبل میں شریک ہیں۔

(cf. ibid; article 'Canon and Text' , Vol III, p.576)

بحرِ مردار کے قرب وجوار سے کھدائیوں کے دوران دستیاب ہونے والے خریطوں نے سپٹاجنٹ کے بعض حصوں کی صحت کو واضح کیا تو عبرانی نسخوں کے بعض اجزاء کی صحت غیر معمولی طور پر ثابت کی ہے، گویا یہ دونوں اجزاء جزوی طور پر صحیح اور جزوی طور پر غیر صحیح ہیں۔ گویا دونوں ہی غیر ثقہ ہیں۔

عہد نامۂ جدید میں شامل کتب (Canon) بھی نزاعی ہیں۔ اناجیل کے نام سے کم وبیش پچاس کتابیں ضبطِ تحریر میں آئی تھیں۔ ان سب کی حیثیت صرف سیرتِ عیسیٰ کی ہے۔ کارتھیج (قرطاجنہ) اور اسکندریہ کے

کلیساؤں نے ابتدائی دور (تقریباً ۲۰۰ء) میں اناجیل متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کو مستند اناجیل تسلیم کیا اور باقی ساری اناجیل غیر مستند قرار دی گئیں۔ ان [مفروضہ] مستند اناجیل میں پال کی کئی تحریروں کو بھی شریکِ انجیل کیا گیا۔

۔۔۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون عہد نامۂ جدید میں غیر مسلمہ نزاعی اور اختلافی کتب کی تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ اس مضمون میں ایسوبیس کے حوالے سے بیان کیا گیا کہ کینن (یعنی کتب سماوی کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا عمل) کی تکمیل چوتھی صدی عیسوی میں ہو رہی تھی۔ اور مسلمہ کتب کی اولین فہرست چوتھی صدی کے نصف کے بعد منظرِ عام پر آئی۔ انطاکیہ کے چرچ نے چرچ آف روم کے برخلاف انجیل جیمس، انجیل پطرس اور انجیل یوحنا کو تسلیم کیا۔ ۳۸۲ء میں روم میں ایک مجلس سائنود (Synod) طلب کی گئی جہاں جیروم کے زیرِ اثر کتبِ مقدسہ کی فہرست مرتب ہوئی۔ آخری مرتبہ کینن کے تعین کے لئے ۶۹۲ء میں کونسل منعقد ہوئی جس نے حتمی فیصلہ دیا کہ کونسی کتب شریکِ بائبل ہیں اور کونسی نہیں۔

اس کے باوجود چرچ سے یہ نزاع رفع نہیں ہو سکا کہ کونسی کتابیں مستند ہیں اور کونسی غیر مستند۔ لوتھر نے اپنے دور میں اس مسئلہ کو شدت سے اٹھایا جس کے نتیجے میں موجودہ فہرست ظہور پذیر ہوئی۔ اب بھی کئی نزاعی مسائل باقی ہیں جو طے نہیں ہو سکے۔

(cf. Encyclopedia Britanica; article 'New Testament' , Vol III, p.570)

اس سرسری موازنے کے بعد بیان کرنے کی حاجت نہیں رہ جاتی کہ بائبل میں پائی جانے والی کمزوریوں کو قرآن سے منسوب کرنے کی کوشش کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآن کی عظمت پر کیچڑ اچھالا جائے تاکہ صرف ان کی مذہبی کتب پر ہی انگشت نمائی نہ ہو۔

حیاتِ طیبہ اور مستشرقین

تاریخِ مذاہب کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ جب بھی کسی خطے یا قوم میں کوئی نیا مذہب رونما ہوا تو اسے مروّجہ مذاہب کی جگہ لینے کے لیے شدید کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کشمکش کے باعث گروہ اور فرقے پیدا ہوئے جن میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ متحارب مذاہب کے پیروؤں نے ایک دوسرے پر گندگی اچھالی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا، جب تک دونوں گروہ اپنی اپنی جگہ بااقتدار رہے۔ مصر میں یہ اختلاف پیدا ہوا تو آتن کے پجاریوں نے آمن کے منادر کو ڈھا ڈالا اور آمن کے پجاریوں کو غلبہ میسّر ہوا تو آتن کا وجود مٹ گیا۔ ایران میں مغربی آریوں میں سپتاما، زرتشترا کا مذہب مستحکم ہوا تو انہوں نے مشرقی آریوں کو پسپا کر کے ہندوستان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور قدیم آریا مذاہب کو یکسر منسوخ قرار دیا۔ ان کے دیوتا واہمے کا مجسّمہ بن گئے اور انکے پجاری گمراہ اور بے دین قرار دے دیے گئے۔ ہندی کے لفظ 'دیو' اور فارسی کے لفظ 'دیو' کے معنوں میں بعد المشرقین اسی اختلاف کی یادگار ہے۔ جبکہ ویدوں نے زرتشترا کے آہورہ مزدا کو شیطان کہہ کر خدا کا مخالف ٹھہرایا اور زرتشترا پر اعتراضات کے انبار لگا دیے۔

عیسائیت نے جنم لیا تو یہود بلائے بے درماں بن کر ٹوٹ پڑے۔ عیسائیوں پر جینا دوبھر کر دیا۔ عیسائیوں نے اگر حضرت عیسیٰؑ کو الوہیت کے مقام پر فائز کیا تو یہود نے انکی والدہ محترمہ پر تہمت باندھی۔ عیسائیت کی مسکنت کا دور ختم ہوا تو اس نے دیکھتے دیکھتے قدیم مذاہب کا خاتمہ کر ڈالا۔ پھر اس میں بھی فرقہ بندی ہوئی۔ چھوٹے فرقوں کو بڑے فرقے نگل گئے۔ پھر بڑے فرقے ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ مشرقی اور مغربی عیسائیت نے اپنے اپنے علاقے تقسیم کر لیے۔ ایک دوسرے سے متحارب ہوئے۔ ایک دوسرے کو بے دین، بدعتی اور جہنمی قرار دیا۔ جب مغرب میں پروٹسٹنٹ چرچ ابھرا تو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ چرچ نے دل کھول کر ایک دوسرے پر گندگی اچھالی۔ مذاہب کے اس اختلاف میں نہ صرف مذہبی عقائد اور اقدار زد پر آئے بلکہ ان کے بانیوں کو بھی تضحیک و توہین کا نشانہ بنایا گیا۔ جب عیسائیت اور اسلام دوبدو ہوئے تو تاریخ نے پوری شدت سے اسی قدیم انداز کو دہرایا اور مغرب نے اسلام کی ہر اعلیٰ قدر پر ضرب لگائی۔ اس مہم میں دیگر بانیانِ مذاہب کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا اسکی گرد کو بہت پیچھے چھوڑ دیا گیا۔

وہ عظیم ہستی جس نے تیئیس [۲۳] سال کی قلیل مدت میں بت پرست، بدکردار، خوں آشام، وحشی اور خودسر عربوں کو بطلِ اقوام بنا دیا، روحانیت سے ناآشنا ریگزار جس کے نقشِ پا کے طفیل فرشتوں کی سجدہ گاہ بن گیا، جسکی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر یہ وحشی قوم دنیا کی متمدّن اور مہذّب اقوام کی رہبر بن گئی، جو صحرا ظلمت کدہ تھا،

اور جہاں قانون، انصاف، انسانیت اور روحانی مراتب دیوانے کا خواب تھے، الفت و مروّت، انسانیت و محبّت کا گہوارہ بن گیا، وہ جس نے ایک عظیم تہذیب کی بنیاد رکھی اور ایک قلیل عرصے میں اس تہذیب کو صدیوں کے ارتقائی مراحل سے گزار کر اس مقام پر پہنچا دیا جہاں ہزار ہا سال سے پرورش پانے والی سر بفلک تہذیبیں بونی نظر آنے لگیں، جس نے اقوامِ عالم سے مصری، شامی، ایرانی، تورانی، حبشی اور رومی کے نسلی امتیازات اور کالے گورے کا فرق مٹا کر انہیں ایک ملّت بنا دیا، جس نے انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلائی، جس نے طلبِ علم کا حکم دیکر عالمی تحریکِ علمی قائم کی، وہ جس نے شعورِ انسانی کو اسباب وعلل پر غور کرنے کی راہ پر لگایا، وہ اوّلین شخصیت جس نے تسخیرِ کائنات کی تعلیم دی، وہ جس نے ہر شعبۂ زندگی کو حکمِ خداوندی کے تابع کیا، جس نے سیاست، معاشرت، اقتصادیات، عمرانیات، تہذیب وتمدّن، کردار واخلاق، احساسات وجذبات کو معتدل ضوابط کا پابند کیا، جس نے انسانی مساوات قائم کی، جو قواعد اس نے دوسروں کو دیے خود بھی ان پر پابند رہا، جس نے حق کی خاطر تنِ تنہا حوادثِ زمانہ کا مقابلہ کیا، بے یار و مددگار تھا تو بھی پائے استقامت میں جنبش نہ آئی، اقوامِ عالم کی زمامِ اقتدار ملی تو بھی نا قابلِ تغیر رہا، اس کا مہرِ کردار بے داغ، عمل بے ریا، احساس نزاکتوں سے بھرپور، دل رأفت ورحمت سے لبریز، جس کو کسی دشمن کی دشمنی جادۂ انصاف سے سرِ مو نہ ہٹا سکی، شجاعت وسخاوت جس پر رہتی دنیا تک فخر کرتی رہے گی، جس کے گھر قناعت نے پرورش پائی، استغنیٰ نے جس کی قدم بوسی کی، پیکرِ صدق وصفا، مجسّم تسلیم ورضا، شب بیدار، کم آرام، بے نفس، حق کوش وحق طلب، دستگیر، متّقی، مقدّس، سادگی پسند، دوسروں کی تکلیف میں بے چین ہو جانے والا، رہبر ورہنما، میر کاروانِ ملّت، عالی نسب، والاحسب، ہاشمی ومطّلبی، قریشی ومکّی ومدنی وعربی، قبلۂ دین، کعبۂ ایمان، محمد الرسول اللہ ﷺ، جن کے نام پر فدا ہو جانا ہر مسلمان کے لیے فوزِ عظیم، چرخ گردوں کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ اس ذاتِ والاصفات کا جو خاکہ اس کے مغربی دشمنوں نے اپنی من گھڑت تحریروں میں پیش کیا اس کا حقائق سے دور دور تک کوئی تعلّق نہیں نظر آتا۔

صدیوں تک تو مغرب نے نبوّت کو ہی تسلیم نہیں کیا۔ پھر جب دانشوروں کو انکار میں دقت ہونے لگی تو انہوں نے نبوّت کو مقامی قرار دیا، جو محض بطحا، حجاز یا عربوں تک محدود تھی۔ ہوتی آئی ہے کہ لوگ اپنے عیوب دوسروں سے منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی اسلام کے ساتھ بھی کیا گیا۔ بائبل کے سارے انبیاء یہاں تک کہ یسوع مسیحؑ بھی اپنے دائرہ کار کو صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں تک محدود رکھنے کا اعلان کرتے رہے۔ جو لڑکوں کی روٹی کتوں کو دینے کے قائل نہیں کہے جاتے، ان کی مسیحائی تو عالمی قرار دی جاتی ہے اور جو روزِ اوّل سے عالمی دعوت کے مدّعی ہوں ان کی دعوت کو مقامی ٹھہرایا جائے، کیا یہ بوالعجبی بائبل کی خامی کو قرآن سے منسوب کرنے کی جسارت نہیں ہے؟ (اسلام میں نبوّت کی عالمیّت کے لیے ملاحظہ ہو، قرآن مجید، سورۃ آلِ عمران-۹۶، ۱۰۴؛ سورۃ مائدہ-۶۷؛ سورۃ الانبیاء-۱۰۷؛ سورۃ الفرقان-۱؛ سورۃ صٓ-۸۷؛ سورۃ القلم-۵۲؛ سورۃ التکویر-۹؛ وغیرہ)

قرآن نے آنحضرت ﷺ کی ذات کو مومنوں کے لیے اسوہ حسنہ قرار دیا کیونکہ ان کی ذاتِ گرامی مجسّم اخلاقِ قرآنی تھی۔ لیکن چونکہ مغرب نے ہزار سال سے زیادہ کذب بیانی کی تھی اس لیے یہ کذب اس طرح ان کے رگ و ریشے میں بس گیا تھا کہ جب اسلام کی حقیقت ان کے سامنے آئی تو اسے بھی جھٹلانے لگے۔ انہوں نے جہاں اس بات کو تسلیم کیا کہ متعصب مغربی، اسلام کی تصویر میں غلط رنگ اور بھدّے نقوش عمداً استعمال کرتے ہیں وہیں یہ بھی کہنے سے باز نہ آئے کہ یہ مثالی کردار سیرت اور مغازی کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس تجسیم میں احادیث کا ہاتھ ہے جن کے ذریعے کردار کے اہم پہلو نمایاں کیے گئے ہیں۔ مغربی اسکالرز نے خصوصیت کے ساتھ احادیث کا تنقیدی مطالعہ کیا۔ انہوں نے اس میں تاریخیت کی تلاش کی اور پھر یہ حکم لگا دیا کہ بیشتر احادیث ناقابلِ اعتبار ہیں، شائد اس لیے کہ مغربی تصور کی تائید نہیں کر سکتیں۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں وہ جب کوئی واقعہ پڑھتے ہیں تو منطق کے بل پر کوئی نہ کوئی اعتراض پیدا کر لیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اگر کوئی ایسا واقعہ اناجیل میں نظر آتا ہے جس کی توجیہہ نہ کر سکیں تو اس کے دفاع میں کہتے ہیں کہ،

" Even if Jesus did not act in this way, (say towards the women taken in adultery), this is how his followers must have thought he would have acted." **(M. Wat;, What is Islam, p. 229)**

[اگر یسوع نے ایسا نہیں بھی کیا (مثلاً عورتوں کی بے حرمتی کے معاملے میں) تو یہ وہ عمل ہے جو یقیناً انکے معتقدین نے گمان کیا ہوگا کہ ان حالات میں وہ ایسا ہی کرتے۔]

ایک ہی نوعیت کے معاملات میں مختلف فیصلے منصف کی جانبداری کا بیّن ثبوت ہوتے ہیں اور اور جانبداری کے فیصلے واضح طور پر عدل وانصاف سے مبرّا ہوتے ہیں۔

داعیِ اسلام کی مخالفت کیوں؟ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی انقلاب آفریں فکر کو بلا شدید مخالفت کے تسلیم کر لیا گیا ہو۔ ایسی فکر چونکہ معاشرتی ڈھانچے کو متاثر کرتی ہے، جس کے باعث انفرادی اور اجتماعی مفادات پر ضرب پڑتی ہے، اس لیے معاشرے کا مقتدر طبقہ اس فکر کو بالجبر روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ سقراط کو یونان کا عظیم ترین مفکر سمجھا جاتا ہے، اس کی فکر اگرچہ کوئی عملی تحریک نہیں تھی اس کے باوجود اسے اپنے ہی ہاتھوں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ بائبل کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی تبلیغ کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا، انہوں نے نہ صرف سیزر کو تسلیم کیا بلکہ اس کے حلقۂ اقتدار کو اپنے دائرہِ کار سے خارج بھی کیا، اور اپنے شاگردوں کو طاقت کے استعمال سے حکماً روکا، اس کے باوجود انہیں سزائے موت سنا دی گئی۔ آخر کیوں؟ انکا جرم کیا تھا؟ تلاش جرم وخطا کے لیے ہمیں سیزر کا اندازِ فکر اختیار کرنا ہوگا۔ اس کے علاقے میں صرف اسی کا اقتدار ہوتا ہے۔ کوئی گردن اٹھائے تو خود سر، کوئی زبان کھولے تو باغی۔ ہر شخص کے دل و دماغ میں صرف سیزر کی عظمت کا احساس ہونا چاہیے۔ یہ عظمت کا احساس جس سر میں نہ ہو وہ سبک سر ٹھہرے۔ ہر فرد کو صرف اسی کے قانون کا پابند ہونا چاہیے، اگر پابند نہ ہو تو

قانونی مجرم۔ قانون سازی صرف اسی کا حق ہے، کوئی دوسرا قانون یا قانون ساز اس کی مملکت میں ناقابلِ برداشت۔ حق و صداقت صرف وہ ہے جسے سیزر تسلیم کرلے۔ بااختیار اندازِ گفتگو صرف سیزر کے لیے ہی وقف ہے، کوئی دوسرا اس کی مملکت کی حدود میں یہ انداز اختیار نہیں کرسکتا۔

انبیاء تو کیا مفکّرین بھی مبینہ پابندیوں کو پرکاہ کی حیثیت نہیں دیتے۔ ان کا ایک مقصدِ حیات ہوتا ہے اور اس کی تکمیل انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ وہ سیزر کو نظرانداز کرتے ہیں۔ قیصریت اور نبوت میں چھڑ جاتی ہے۔ کبھی قیصریت بندۂ حق کو راہ سے ہٹانے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو اس کی مخالفت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ان کے افکار کبھی تو پروان چڑھ جاتے ہیں اور کبھی صرف کتابوں کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس طریقۂ کار میں کسی سیزر کو رعایت دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کبھی موسیٰؑ فرعون کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور کبھی ابراہیمؑ نمرود کی مملکت سے ہجرت کرجاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حالات کے مطابق طریقۂ کار جدا ہیں لیکن ان سب میں جو قدرِ مشترک ہے وہ اعلائے کلمۃ الحق ہے۔ اور بے باک، آزاد اور خودمختار اندازِ کلام کو معاشرہ اور اسکا سربراہ برداشت نہیں کرسکتا۔ یہی تحکّمِ کلام انکا جرم بن جاتا تھا۔

حضور ﷺ کا ہر انداز منفرد، بااختیار، بااقتدار اور پرعظمت ہے۔ دیگر انبیاء کی طرح ان کی بھی مخالفت کی گئی۔ اوروں کی مخالفت اس لیے ختم ہوگئی کہ یا تو معاشرہ ان پر حاوی آگیا یا پھر انکی فکر و تعلیمات کو معاشرے نے اپنے مفاد کے مطابق ڈھال لیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ نہ تو مغلوب ہوسکے نہ ہی انکی محکم تعلیمات میں معاشرہ کوئی تبدیلی لاسکا۔

مسلم معاشرے کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا گیا اتنے ہی اجنبی معاشروں سے اسکا واسطہ پڑتا گیا۔ ہر اجنبی معاشرے نے اسلام کو انقلاب آفریں پایا، اور جس معاشرے نے جتنی شدت سے ضرب محسوس کی اسی مناسبت سے اپنے ردِعمل کا اظہار کیا۔

انفرادی اعتراضات

اس عنوان کے تحت وہ اعتراضات درج کیے جارہے ہیں جنکی نوعیت انفرادی ہے، یعنی مختلف مستشرقین نے اپنی انفرادی حیثیت میں کیے ہیں۔ <u>ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد</u>

مغرب کا مثالی مذہبی کردار حضرت عیسیٰؑ کی ذاتِ گرامی ہے۔ نتیجہ یہ کہ انکے یہاں عظمتِ کردار بیکسی، مسکنت، ترکِ دنیا، خود آزاری اور قربانی میں ہے۔ ٹوئن بی اسی ذہنی تیقّن کے باعث کردارِ نبوی ﷺ کے بارے میں (نعوذ باللہ) تحریر کرتا ہے،

"Instead of sealing his prophetic message with his blood by becoming Caesars' victim, it was Mohammed's ironic destiny to compromise and debase his prophetic message by becoming an Arabian Caesar himself." (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. III, p.470)

[بجائے قیصر کا مقہور بن کر اپنی پیغمبرانہ تعلیمات پر اپنے خون سے مہر ثبت کرنے کے، یہ محمد کی بدنصیبی ہی تھی، کہ انہوں نے مفاہمت کی اور خود عرب کے قیصر بن کر اپنی تعلیمات کو گراوٹ سے ہمکنار کیا۔]

گویا ضرورت ہو یا نہ ہو، نبی کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ سیزر سے ایک صلیب تیار کروائے اور اپنے پیرووں کے ہمراہ ایک جلوس کی شکل میں جا کر دھوم دھام سے اس صلیب پر چڑھ جائے۔ دوسری شکل میں، نبی کا فرض، ٹوئن بی کے نظریات کی رو سے یہ ہوا کہ وہ ساری زندگی معاشرے کی تطہیر کرتا رہے، جب معاشرہ پاک و صاف ہو جائے، قوانین مرتب ہو جائیں، لوگ انہیں تسلیم کر لیں تو وہ سیزر کے نام روم کے پتے پر ایک درخواست روانہ کرے کہ اب آپ تشریف لائیں تاکہ جلوس میمنت لزوم کے ساتھ تاجپوشی ہو سکے۔ اور اس کے بعد معاشرے کو سیزر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود کسی غار میں گم ہو جائے۔

بریں عقل و دانش بباید گریخت، کہ اس طاہر معاشرے کی نگرانی اور اسکا مثالی استحکام، مغرب کی دانش کو قیصریت نظر آتی ہے۔

مغربی تصورِ ثنویت نے پیغامِ خداوندی کو پہنچانے اور اس پر عمل درآمد کرانے میں ایک بُعد پیدا کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس پیغام کا پہنچانا تو نبی کا فرضِ منصبی تصور کیا گیا لیکن اس پر عمل درآمد کرانے کی ذمہ داری منصبِ نبوت کے منافی قرار دی گئی۔ ٹوئن بی کے حسبِ ذیل تبصرے کے ہر لفظ میں نظریہ ثنویت جھلکتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

"No doubt when he accepted the invitation to organize a government in Medina, Mohammed assured his own conscience that he was acting as single heartedly as ever in the cause of God. Had not God laid upon him the duty of conveying the revelation of God's truth to his fellow men? And would he not be executing this duty if he embraced this heaven-sent opportunity of providing the new religion whose path had been distracted for ten years, by human force majeure.... No doubt Mohammed reasoned with his conscience thus and no doubt he was deceiving himself, in yielding to his own arguments."

(Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. III, p.471)

[بلاشبہ جب انہوں نے مدینہ میں حکومت قائم کرنے کی دعوت قبول کی، تو انہوں نے اپنے ضمیر کو یہی کہہ کر مطمئن کیا کہ وہ ہمیشہ کی طرح خدا کے راستے میں ہی یکسوئی سے کام کر رہے ہیں۔ کیا خدا نے ان پر لوگوں تک اسکا سچا کلام پہنچانے کی ذمہ داری عائد نہیں کی تھی؟ اور کیا وہ اس خداداد موقع کو استعمال کر کے اس نئے مذہب کو پھیلانے کی

ذمہ داری کو پورا نہیں کر رہے ہیں، جسے دس سال تک انسانی جبری طاقتوں نے اپنی راہ سے ہٹا رکھا تھا۔ بلاشبہ انہوں نے اپنے ضمیر کو ایسے ہی مطمئن کیا اور بلا شبہ وہ اپنے دلائل سے مطمئن ہو کر اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے تھے۔]

زورِ قلم، مہارتِ بیان اور طرزِ استدلال سے قطع نظر بنیادی نکتۂ کلام یہی ہے کہ نبی صرف معلّن ہے، آلہ نشر ہے اور اسکا کام صرف اعلان کرنا ہے۔ خود عمل پیرا ہونا یا پیغامِ حق کو رائج کرنے کے وسائل اختیار کرنا حدودِ نبوت سے متجاوز ہونا ہے۔ یہ ادھورا تصور، نبی کو محض ایک ریڈیو سیٹ بنا دیتا ہے جو فضا سے برقی لہریں وصول کر کے انہیں صوتی شکل دیدے۔ جسے اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ کسی نے سنا بھی یا نہیں۔ جس نے سنا اس پر عمل پیرا بھی ہوا یا نہیں۔ جس نے عمل پیرا ہونے کی کوشش کی اسے کیا دقتیں پیش آئیں اور ان دقتوں کو کیسے دور کیا جائے۔

اسلام مذہبِ عمل ہے۔ اس کی تعلیمات محض علمی نظریات نہیں بلکہ ہدایاتِ عمل ہیں۔ یہاں نجات کا انحصار عمل پر ہے۔ جب تک آزادیِ عمل نہ ہو کوئی معاشرہ اپنے اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔ اسلام معاشرے کو مرتکز کرتا ہے۔ ترکِ دنیا کی تعلیم دے کر فرد کو معاشرے سے منتشر نہیں کرتا۔

مرتکز معاشرے میں مستحکم انتظامیہ ناگزیر ہے۔ اسلامی معاشرہ ایک نظریاتی معاشرہ تھا۔ نظریاتی معاشرے کی انتظامیہ ہمیشہ نظریاتی گروہ کے سرکردہ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ اب ٹوئن بی کے مطابق یہ ہونا چاہیے تھا کہ اسلامی نظریاتی معاشرے کے قیام کے بعد نظریاتی گروہ کے تمام سرکردہ ارکان انتظامیہ کو غیر نظریاتی گروہ کے حوالے کر کے خود اس معاشرے کی تباہی کا تماشا دیکھتے۔

سیاست اور دین، اسلام میں دو جداگانہ عالم نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ مغرب احساسِ برتری میں مبتلا ہے اور تصور کرتا ہے کہ عیسائیت ہی کائناتی سچائی ہے اس لیے اپنی قدروں پر دوسروں کو جانچتا ہے۔ جبکہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جسے جانچا جا رہا ہے اسی کی قدریں بھی پیشِ نظر رہیں۔ اسی بدعنوانی کا نتیجہ ہے کہ اس نے مزید لکھا،

"The truth then seems to be that, in the invitation to Medina, Mohammed was confronted with a challange to which his spirit failed to rise. In accepting the invitation he was renouncing the sublime role of the nobly un-honoured prophet and contenting himself with the common place role of the magnificiently successful statesman. The prospects of effective practical action which the call to Medina opened up for the prophet's long repressed and thwarted practical genius blinded the prophet's vision..........Mohammed had been content with the faithful performance of a prophet's duty, as is shown by his apostrophe to the idolators; as ought to be laid upon God's Messengers but a plain delivery of the messages: This simple understanding and acceptance of his prophetic mission were thrown to winds by the prophet when a new career was offered to him." **(Toynbee A.J; A Study of History, Vol. III, p.472)**

[سچ تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مدینے سے ملنے والی دعوت نے محمد ﷺ کو ایک ایسی آزمائش میں ڈال دیا تھا، جس میں انکی ذات پوری نہیں اتر سکی۔ اس دعوت کو قبول کر کے انہوں نے ’خوار‘ پیغمبر کے کریمانہ کردار کو ترک کر دیا اور خود کو ایک عام سے کامیاب باجبروت حکمراں کے روپ میں ڈھال کر مطمئن ہو گئے۔ موثر عملی اقدامات کی کشش نے، جو مدینے کی دعوت نے ان کی طویل مدت سے رکی ہوئی اور مسدود عملی کارروائیوں کے لیے بیتاب فطرت کے لیے پیدا کر دی تھی، انکے پیغمبرانہ نصب العین کو دھندلا دیا تھا۔ محمد ﷺ (اس سے پہلے) ایک پیغمبر کی سچی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے مطمئن تھے، جیسا کہ انکے بت پرستوں کو للکارنے سے واضح ہے، یعنی سیدھی سادی پیغام رسانی جو ایک نبی کا فرض ہوتا ہے۔ پیغمبرانہ نصب العین کا یہ احساس اور اسکا اقبال، اس وقت پس پشت ڈال دیا گیا جب انہیں ایک نیا کردار ادا کرنے کی دعوت دی گئی۔] (نعوذ باللہ)

ہر وہ شخص جو عیسائی نظریات سے ناواقف ہو، ٹوئن بی کی اس تحریر کا مدّعا سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ مکّے سے مدینے منتقل ہونے کے باعث نبوّت کیسے متاثر ہو گئی؟ ناکامی کے کون سے آثار نظر آئے؟ فرائضِ نبوّت میں کون سی کوتاہی ہوئی؟ ان سب کا جواب یہ ہے کہ یہ سارے دعوے بلا دلیل ہیں۔ یہ الزامات محض اس لیے عائد کیے جا رہے ہیں کہ عیسائی ثنویت کی نگاہ میں ایسا کرنا ثواب کا کام نہیں تھا۔ یہ الگ شان ہے کہ کلیسائے مقدس خود جب تک سیاست پر مسلط رہا اس میں کوئی عیب نہ تھا۔

عیسائیت میں سیاست اور مذہب دو جداگانہ میدان ابتدا ہی سے چلے آتے ہیں۔ یہ عقیدہ اس دور کے حالات کی پیداوار تھا، جب عیسائیت اپنا پرچار رومن ایمپائر میں کر رہی تھی۔ رومن معاشرہ ہر اعتبار سے مستحکم معاشرہ تھا۔ عیسائیت میں یہ دم خم نہ تھا کہ وہ اس معاشرے کی کسی قدر کو للکار سکتی۔ حکومت کی سخت گیری سے محفوظ رہنے کے لیے اسے بحیثیت عقیدہ یہ اعلان کرنا پڑا کہ سیاست اور معاشرتی قدروں سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اور عیسائی دعوت تو محض روحانی تسکین کا بے ضرر ذریعہ ہے، لیکن جب عیسائیت نے قدم جما لیے تو رومن معاشرے کا اقتدار غصب کر لیا۔ لیکن اسلام نے اس قسم کی کوئی سودے بازی نہیں کی۔ اس کا کوئی عقیدہ مصلحت کوشی کا نتیجہ نہ تھا۔ اس نے اپنا معاشرہ خود تعمیر کیا۔ اس کی تہذیب غیر کی منت کش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں خدا اور قیصر کے حصّے کی تقسیم نہیں۔ قیصر کا حصّہ بھی خدا کے تحت ہے۔

سیاست اور مذہب کے جداگانہ تصور کی آڑ میں معاندین نے داعیِ اسلام پر کڑی نکتہ چینی کی ہے، اور انہیں نبی کے بجائے محض دنیادار فاتح کے روپ میں پیش کیا ہے۔

تجارت ونبوّت: ٹوئن بی کے نزدیک حضور ﷺ کی توجہ مذہب کی جانب اس لیے مبذول ہوئی کہ ۶۰۳ء تا ۶۰۹ء شام، ایران کی غارتگری کا شکار رہا۔ اس دور میں شام کو ایران نے معاشی طور پر تباہ کر ڈالا ہوگا۔ ان جنگوں نے یکا یک اور غیر متوقع طور پر سفر شام میں رکاوٹ ڈالی ہوگی اور مکّے کی تجارت کو معطّل کر ڈالا ہوگا۔ عرب میں تجارت ایک چھوٹی سی اقلیت کا پیشہ تھی اور حضور ﷺ اس اقلیت کے فرد تھے جسکا ذریعہ معاش ہی بیرونی تجارت تھی۔ اس نے مزید لکھا کہ داعیِ اسلام اپنی برادری میں کوئی خاص مقام نہ رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ مکّے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس نے یہ بھی تحریر کیا کہ داعیِ اسلام کی حیات کے دو حصے ہیں۔ مکے میں انہوں نے صرف مذہب کے لیے کوشش کی اور دوسرے حصے میں مذہب کو پس پشت ڈالدیا گیا اور سیاسی امور نے غلبہ حاصل کرلیا۔ (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. III, p.478)۔ گویا اسلام کا ظہور بے کاری کا مشغلہ تھا۔ پتہ نہیں اس کے خیال میں دیگر مذاہب کے ظہور میں بے کاری کو کتنا دخل رہا ہوگا۔ اور پھر غالباً ہر بڑا کارنامہ بے کاری کے سبب ہی وقوع پذیر ہوا ہوگا۔ یسوع مسیحؑ اور پال دونوں نے مذہب کو وقت گزاری کا ذریعہ بنایا ہوگا۔ بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ کے لیے بھی کوئی کام دھندا نہیں تھا اس لیے غور وفکر کا مشغلہ لے بیٹھے۔ خود موصوف بھی بے کاری کا شکار تھے کہ مطالعۂ تاریخ لکھنے بیٹھ گئے۔

عرب کی تجارت صرف شام سے وابستہ نہ تھی۔ مصر و یمن، حبشہ و عراق، ہند و چین، اور غزہ کی سینائی پٹی کے ذریعے رومن ایمپائر سے بھی ہوا کرتی تھی۔ اگر تجارت ہی مقصد حیات ہوتا تو دیگر ممالک کی طرف بھی رخ کیا جاسکتا تھا۔ ٹوئن بی جیسا صاحبِ نظر مکی دور کی ناکامی کو معاشرتی مقام سے وابستہ کرے تو حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا کے کسی عالمی مذہب کی کامیابی اس کے بانی کے معاشرتی مقام کی مرہونِ منت نہیں۔ ہر وہ مذہب جو اسکے بانی کی معاشرتی حیثیت کے سبب قائم ہوا، بانی کی موت کے بعد زوال پذیر ہوگیا۔ اکبر کا دینِ الٰہی اس کے بعد نیست و نابود ہوگیا۔ مصر میں فرعون اخناتون نے اپنی معاشرتی حیثیت کے بل بوتے پر آتن کی پرستش کو رواج دیا جو صرف اس کی زندگی تک ہی باقی رہی۔ اس کی موت کے دس سال کے اندر اندر قدیم مذہب امان نے مذہب آتن کی جگہ لے لی۔

رومن شہنشاہوں میں سے بیشتر نے اپنے معاشرتی مقام کے بل بوتے پر سیزر پرستی کروانے کی کوششیں کیں لیکن یہ پرستش روم میں بھی باقی نہ رہ سکی۔ قسطنطین نے رومن کیتھولک عقیدہ تثلیث کو عیسائی دنیا پر مسلط کیا، لیکن یہ عقیدہ مغرب سے باہر بار نہ پا سکا۔ قسطنطین کا شہر قسطنطنیہ تک اسے قبول کرنے کو تیار نہ ہوا۔ بازنطینی شہنشاہ 'لیو' نے اپنے معاشرتی مقام کے بل بوتے پر عیسائیت میں اصلاحات کرنی چاہیں تو پوپ آتش زیرِ پا ہوگیا اور اس نے حقارت کے ساتھ شہنشاہ کی کوششوں کو پامال کردیا۔

اس کے برخلاف ہرمٹ پیٹر جسکا کوئی معاشرتی مقام نہ تھا، جب دوسری صلیبی جنگ کا آتشیں پیغام لیکر مغرب پہنچا تو مغرب پر صلیبی بخار مسلط ہوگیا۔ عالمی مذاہب کے اوصاف میں گہری کشش ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ دل و جان سے ان پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ ان کی مدافعت کے لیے جان لڑا دیتے ہیں۔ یہ مدافعتی جذبہ اسلام ہو کہ عیسائیت، ہر مذہب کے افراد میں شدّت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ مکی زندگی اور مدنی زندگی میں مغربی معاشرے کو جو فرق محسوس ہوتا ہے، وہ محض مغربی ثنویت کا اثر ہے، ورنہ عہد نامہ قدیم کے ہر مقتدر کردار میں مذہب اور سیاست بیک وقت مجتمع نظر آتے ہیں، صرف غیر مقتدر کردار خالص مذہب کے لیے وقف ہیں۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت یوسفؑ، کتاب سیموئیل، کتاب سلاطین، کتاب تواریخ اور

کتاب قضاۃ کے تمام اہم کردار مذہب اور سیاست دونوں میں بیک وقت حصہ لیتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاتا کہ انہوں نے مذہب کو پسِ پشت ڈال کر سیاست کو مطمحِ نظر بنالیا۔

مکّی زندگی اگر مذہبی تھی اور مدنی زندگی محض سیاسی تھی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مذہب اسلام کو مستحکم کس نے اور کب کیا؟ فکرِ مغرب اپنے ذہنی تیقنات کے باعث اس جانب مبذول ہونے سے قاصر رہتی ہے کہ مکّی دور لوگوں کی ذہنی تربیت کا زمانہ تھا جبکہ مدنی دور اس تربیت کو روبکار لانے اور عملی شکل دینے کا دور ہے۔

اسلام ایک دین ہے جو نہ صرف افراد کی تربیت کرتا ہے بلکہ تربیت یافتہ افراد سے نظریاتی معاشرہ بھی ترتیب دیتا ہے۔ اس معاشرے کو اسلامی نظریات پر کاربند رکھتا ہے۔ نظریاتی ریاست اور نظریاتی معاشرے کی سیادت ہمیشہ نظریاتی اکابر کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور جس کی سربراہی ان اکابر کے سربراہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

یہ ہے وہ سیدھی سادی منطق جس کے سبب داعیِ اسلام ﷺ اپنے معاشرے کے سربراہ تھے۔ اس معاشرے میں ان سے عظیم تر کوئی بھی نہ تھا۔ اس معاشرے کی تعمیر اور استحکام ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ان کی موجودگی میں اور کون سربراہی کرسکتا تھا؟ یہ سربراہی بھی جزوِ نبوّت تھی۔ اسلام میں نبوّت و رسالت کا تصوّر عیسائیت اور یہودیت کے تصوّر سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ یہاں صرف پیشین گوئی کرنا ہی نبوّت نہیں ہے، نذارت، بشارت، ہدایت، اخوّت، تعلیم وتربیت، عبادت، شریعت، سیاست، حکومت وعدالت، اقتصاد ومعاش ہر شعبہ نبوّت سے متعلق ہے۔ مغربی تصوّر نبوّت چونکہ محض پیشین گوئی تک محدود ہے اس لیے اس سے بڑا دائرہ کار انہیں غیر متعلق محسوس ہوتا ہے۔

مغربی اہل قلم نے جب داعیِ اسلام کو اسلامی معاشرے کے مرکز کی حیثیت میں دیکھا تو اس ارتکازِ معاشرہ کو انہوں نے دنیاوی اقتدار تصوّر کیا، اور اس غلط فہمی کی بنیاد پر یہ الزام وارد ہوا کہ، (نعوذ باللہ)

"Mohammed was a deliberate propagator of false doctrine, thinking only of increasing his own power." **(Montgomery Watt; What is Islam, p.2)**

[محمد (ﷺ)، صرف اپنی طاقت میں اضافے کے خیال سے، دانستہ جھوٹے عقائد کو پھیلاتے تھے۔]

یہ ساری پریشان خیالی محض خام تصوّر نبوّت کی پیداوار ہے۔ مغرب کو ابھی تک باور نہیں آیا کہ زمان ومکان انکے تصوّرات کے پابند نہیں۔

<u>دوسری ہجرت حبشہ:</u> فان گریونے باؤم **(von Grunebaum)** نے دوسری ہجرتِ حبشہ میں، جس میں ایک سوتراسی [۱۸۳] افراد نے ۶۱۵ء میں حبشہ میں پناہ لی، مہاجرین کی اس تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ ہجرت ابتدائی مسلمانوں میں افتراق ختم کرنے کی کوشش تھی۔ اس نے لکھا، (نعوذ باللہ)،

"Probably this hijra, the immigration to Abyssinia, was motivated to be an attempt to smooth out a split that was beginning inside the community, perhaps between Mohammed and a group, that from his point of view was hyperascetic."

(G.E. von Grunebaum; Classical Islam, p.31)

[غالباً یہ ہجرت، یعنی ہجرتِ حبشہ، مسلم گروہ میں پیدا ہونے والی اس تفریق کو ختم کرنے کی ایک ترغیبی کوشش تھی، جو محمد (ﷺ) اور انکے کچھ ساتھیوں کے درمیان، جو انکے نکتہ نظر سے زیادہ ہی رہبانیت پسند تھے، پیدا ہوگئی تھی۔]

اوّل تو اسلام میں رہبانیت اور ترکِ دنیا کا کوئی وجود ہی نہیں، کہ کسی گروہ کو ہم شدید رہبانیت پسند تصور کر سکیں، اور اگر ایسا تھا بھی تو اسکے معنیٰ یہ ہوئے کہ نعوذ باللہ یہ گروہ داعیِ اسلام ﷺ کا پیرو نہ تھا، بلکہ داعیِ اسلام ﷺ سے اپنی روش منوانا چاہتا تھا۔ اس مرحلے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس گروہ نے اپنی مرضی سے ہجرت کی یا حکمِ رسول ﷺ کی تعمیل کی۔ اگر منشائے رسول کے خلاف ہجرت کی تھی تو پھر حبشہ میں قریش کے وفد کی مخالفت اور اسلام اور داعیِ اسلام ﷺ کی پر جوش حمایت کے کیا معنیٰ ہونگے۔ اور اگر تعمیل حکم تھی تو وہ گروہ جو رسول اللہ ﷺ کے حکم پر گھر بار، ملک و وطن، کاروبار سب کچھ چھوڑ سکتا ہے، وہ اپنے ہادی کی مخالفت پر کس طرح آمادہ ہو سکتا ہے۔

یہ انیج گریونے باؤم کی اس ذہنی خلش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے کہ آخر اصحابِ رسول اللہ ﷺ میں اسقدر یقینِ محکم، غیر متزلزل ایمان اور پابندیِ احکام کیوں تھی؟

غرانیق: واقعہ غرانیق کا ذکر کرتے ہوئے گریونے باؤم نے تحریر کیا، (نعوذ باللہ)

"It is said that he had recognised as the daughters of Allah, the three great Godesses; al-Lat, who was honoured in Taif, al-Uzza who was worshiped in Hakala near Mecca and Manat whose sanctuary lay in Qudaid between Mecca and Medina. This stand he now revoked and made a sharp distinction between the faithful and those who associated Allah with other Gods."(G.E. von Grunebaum Classical Islam, p.31)

[کہا جاتا ہے کہ انہوں نے (محمد ﷺ نے) تین عظیم دیویوں کو اللہ کی بیٹیاں مان لیا تھا۔ یہ لات (جسکی تعظیم طائف میں کی جاتی تھی)، عزیٰ، (جسکی عبادت مکّے کے قریب واقع ہکلہ میں کی جاتی تھی) اور منات (جسکا مندر قدید میں تھا جو مکّے اور مدینے کے درمیان واقع ہے) تھیں۔ اب وہ اس موقف سے پھر گئے اور انہوں نے مؤمنین کے اور ان لوگوں کے درمیان، جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے، واضح امتیاز قائم کیا۔]

غرانیق پر تفصیلی گفتگو ہم بعد میں کریں گے، کیونکہ یہ موضوع مغربی اہلِ قلم کا نہایت پسندیدہ مبحث ہے۔ گریونے باؤم کا تبصرہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ غرانیق گویا ایک مسلّمہ واقعہ ہے۔ اس افسانے میں متذکرہ بالا تین دیویوں کو غرانیق سے تشبیہ دی گئی ہے، اور ان کی شفاعت کو مقبول کہا گیا ہے۔ گریونے باؤم نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ لات و منات وعزّیٰ کو نعوذ باللہ حضور ﷺ نے خدا کی بیٹیاں تسلیم کیا۔ اپنا گناہ دوسروں کے سر۔ عیسائیت نے حضرت مریمؑ کو اگر خدا کی ماں بنایا تو اسلام سے خدا کی بیٹیاں منسوب کر کے اپنی خفت ہی کم کی جائے۔ پھر اس افسانے کو سنگِ میل قرار دیا کہ اس کے بعد مومن اور مشرک میں شدید امتیاز پیدا ہوگیا۔ جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ اس مبینہ واقعے سے پیشتر موحد اور مشرک میں تمیز نہ تھی، یہ دعویٰ محض سوئے ظن

ہی ہے۔ گریونے باؤم نے ثبوت پیش کرنے کی زحمت نہیں کی۔ یہ تمیز تو اسی دن پیدا ہوگئی تھی جس دن غارِ حرا میں داعیِ اسلام ﷺ پر وحی نازل ہوئی تھی۔ ابتدائی تین سال خفیہ تبلیغ کیوں ہوئی؟ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ عرب معاشرے کے اندر نظریاتی تبدیلی پیدا کی جارہی تھی بلکہ اس مبلّغ اور اس پر ایمان لانے والے چھوٹے سے گروہ کو یہ علم تھا کہ مشرک معاشرہ اس تبلیغ کو برداشت نہ کرسکے گا۔ یہ رازداری خود کہہ رہی ہے کہ یہ گروہ خود میں اور معاشرے میں ایک واضح امتیاز سے شعوری طور پر واقف تھا۔

لوٹ : عام مغربی اصحابِ قلم کی طرح گریونے باؤم نے بھی مکّی کاروانوں سے تعارض کو لوٹ کہا ہے۔ اس نے تحریر کیا،

"To accomplish his main task and unite a population torn asendur Mohammed needed the hormonious cooperation of Muhajirun with the Medinian 'helpers', Ansar. This in turn required the economic independence by raids on Meccan caravans."

(G.E. von Grunebaum; Classical Islam, p.35)

[اپنے اصل نصب العین کو حاصل کرنے اور ایک منتشر برادری کو متحد کرنے کے لیے محمد ﷺ کو مہاجرین اور انصار کے مابین ایک ہم آہنگ تعاون چاہیے تھے۔ نتیجتاً اس کے لیے مکّی قافلوں پر حملوں کے ذریعے حاصل کردہ (مہاجرین کی) اقتصادی خودمختاری کی ضرورت تھی۔]

مکّے کے تجارتی کاروانوں سے تعارض پر آئندہ صفحات پر بحث کی جارہی ہے۔ یہاں محلِ غور یہ ہے کہ لوٹ کے ذریعے آزاد معیشت قائم کرنے کے جو مقاصد بیان کیے گیے ہیں وہ کہاں تک پورے ہوسکتے تھے یا ہوئے۔ کیا لوٹ کے ذریعے مہاجرین کی آزاد معیشت قائم ہوئی یا ہوسکتی تھی؟ آیا مہاجرین اور انصار میں خوشگوار تعاون تھا یا نہیں؟ ان ہی سوالات کے پس منظر میں یہ واضح ہوسکے گا کہ اعتراض کس حد تک برمحل یا بے محل ہے۔

ہم نے ٹوئن بی کے تبصرے میں دیکھا، نیز خود گریونے باؤم نے اعتراف کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو مکّے کی رہائش ترک کرکے مدینے میں قیام کی دعوت خود انصار نے دی تھی۔ **[G.E. von Grunebaum; Classical Islam, p.35]**۔ دعوت دینے والے ہجرت سے قبل اسلام قبول کرچکے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی نبوّت تسلیم کرکے انہیں بحیثیت نبی مدینے بلایا تھا۔ ان سے مکّہ کی اسلام سے مخالفت اور دشمنی چھپی ہوئی نہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضور ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے باعث ان کے شہر میں اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں آئے گا۔ یہ نیا معاشرہ عرب کے عام معاشرے سے مختلف ہوگا۔ جس کے سبب قریش اور عالمِ عرب کی دشمنی مول لینا پڑے گی۔ بیعتِ عقبہ ثانیہ کی جو روئداد ہم تک پہنچی ہے اس میں حضرت عبّاس رضی اللہ عنہ بن عبادہ انصاری کی تقریر محفوظ ہے، جسمیں انہوں نے فرمایا،

"اے معشرِ خزرج تم جانتے بھی ہو کہ تم کس بات پر ان صاحب سے بیعت کر رہے ہو؟"
سب نے کہا کہ ہاں ہم جانتے ہیں۔ کہا" یہ بیعت اس بات کی ہے کہ ہر سرخ وسیاہ آدمی سے تم کو لڑنا ہوگا۔ پس اگر تم یہ دیکھو کہ جب تمہارے مال اور اسباب برباد ہونگے اور تمہارے اشراف قتل ہو جائیں گے، اس وقت تم ان کی بیعت سے پھر جاؤ گے تو اسی وقت انکی بیعت کو ترک کر دو۔ قسم خدا کی اگر اس وقت تم نے ایسا کیا تو دنیا اور آخرت کی ذلت تم کو نصیب ہوگی۔ اور اگر تم یہ جانتے ہو کہ چاہے کیسی ہی مصیبت تم کو پہنچے، مال برباد ہو یا اشراف قتل ہوں، تم اپنی بیعت پر قائم رہو گے تو پھر بسم اللہ کر کے بیعت کرو۔"

(سیرۃ ابنِ ہشام [اردو]، ۱۹۶۵ء، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، صفحہ ۲۱۹، لاہور)

تقریر کا ایک ایک لفظ واضح کرتا ہے کہ وہ عواقب ونتائج سے پوری طرح باخبر تھے۔ حضور ﷺ کی ہجرت سے قبل تقریباً تمام مہاجرین ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے جنکا پرتپاک استقبال کیا گیا تھا۔ اس کے یہ معنٰی ہیں کہ انصار اچھی طرح جانتے تھے کہ حضور ﷺ کے ہمراہ انکے اصحاب بھی ہجرت فرمائیں گے۔

پس مہاجرین انصار کے بن بلائے یا غیر متوقع مہمان نہ تھے۔ حضور جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین وانصار میں مواخات کا رشتہ قائم فرمایا جو ان کے لیے ہمیشہ قابلِ فخر رہا۔ اس مواخات کی بدولت مہاجرین اور انصار میں خود بخود ایک خوشگوار تعلق قائم ہو گیا۔

عرب مہمان نوازی اور اخوت کے جذبے سے مغرب ناواقف ہے۔ وگرنہ، گریونے باوم کی زبان پر خوشگوار تعاون کے الفاظ نہ آتے۔ یہاں تو ہر وہ شخص جو قبیلے کے جوار میں آجاتا تھا قبیلے کا فرد متصور رہوتا تھا۔ اور ایسا ہر فرد قبیلے کے لیے اور قبیلہ فرد کے لیے جان دینے پر تیار رہتا تھا۔

اسلام سے پہلے فرد کی وفا کا محور قبیلہ ہوتا تھا۔ اسلام نے اس مرکزِ وفا کو قبیلے سے دین میں منتقل کر دیا۔ انصار اور مہاجرین میں دوہرا رشتہ قائم ہو گیا۔ دین کا اشتراک اور نبی ﷺ کی قائم کردہ اخوت۔ خوشگوار تعاون کی اس سے بڑھ کر کیا بنیاد ہو سکتی تھی؟

پس یہ خیال کہ خوشگوار تعاون کے لیے آزاد معیشت درکار تھی، بر خود غلط ہے۔ مزید برآں مہاجرین معاشی طور پر انصار کے دست نگر نہ تھے۔ مہاجرین سب کے سب قریش تھے جن کا پیشہ تجارت تھا اور انصار زراعت پیشہ تھے۔ انصار کی زرعی معیشت برقرار رہی، اس میں کوئی فرق نہ آیا، جب کہ مہاجرین نے تجارت کو اپنا پیشہ بنایا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے اکابر ملت کے تجارتی مشاغل کا ذکر متعدد کتب میں ملتا ہے۔ حضرت دحیہ کلبیؓ، حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کاروانِ تجارت لے کر شام جایا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ مہاجرین جن کی آزاد معیشت کا گریونے باوم تذکرہ کرتا ہے تعداد میں کل نوے تھے۔ ان میں سے بیشتر تجارت کرتے تھے اور کچھ مزدوری کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ کچھ انصار کے دست نگر بھی رہے ہوں۔ لیکن اس قلیل نفری کے لیے لوٹ کو ذریعہ معاش قرار دینا سراسر زیادتی ہے۔ غرض یہ کہ جن مقاصد کے حصول کے لیے لوٹ کو بنیادی معیشت بیان کیا گیا ہے، وہ سارے مقاصد معاشی سہاروں کے محتاج نہ تھے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ مکّے کے کتنے تجارتی کاروانوں سے تعارض کیا گیا، اور کتنے کاروان ایسے تھے جن سے کچھ مال غنیمت ملا۔ ذیل میں ان تمام مہمات کا جدول پیش ہے جن میں قریش کے خلاف کارروائی کی گئی۔

قریش کے خلاف کارروائیوں کا جدول

شمار	مہم/تاریخ	نتیجہ	شمار	مہم/تاریخ	نتیجہ
۱	سیف البحر ۱ھ	جنگ نہ ہوئی	۱۰	غزوۂ سویق ۲ھ	دشمن فرار ہو گیا
۲	رابغ ۱ھ	جنگ نہ ہوئی	۱۱	سریۂ قردہ ۳ھ	کارواں گرفتار ہوا
۳	الخرار ۱ھ	جنگ نہ ہوئی	۱۲	غزوۂ احد ۳ھ	مسلمانوں کا نقصان
۴	الابوار ۲ھ	مقابلہ نہیں ہوا	۱۳	حمراء الاسد ۳ھ	دشمن پسپا
۵	بواط ۲ھ	مقابلہ نہیں ہوا	۱۴	بدر الموعید ۴ھ	مقابلہ نہیں ہوا
۶	مہم صفوان ۲ھ	دشمن بچ کر نکل گیا	۱۵	غزوۃ الخندق ۵ھ	دشمن ناکام ہو کر چلے گئے
۷	ذوالعشیرہ ۲ھ	مقابلہ نہیں ہوا	۱۶	العیس ۶ھ	کارواں گرفتار
۸	سریۂ نخلہ ۲ھ	مالِ غنیمت ہاتھ آیا	۱۷	حدیبیہ ۶ھ	صلح، کوئی غنیمت نہیں
۹	غزوۂ بدر ۲ھ	شاندار فتح، مال غنیمت	۱۸	فتحِ مکہ ۸ھ	فتح مبین، عام معافی، کوئی غنیمت نہیں

اس جدول پر ایک نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ قریش کے خلاف آٹھ [۸] سالوں میں کل اٹھارہ [۱۸] چھوٹی بڑی کارروائیاں کی گئیں۔ ان میں سے گیارہ [۱۱] مہمات ایسی ہیں جن میں کسی قسم کا مقابلہ ہی نہیں ہوا، لہٰذا غنیمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چار مہمیں (بدر، احد، حمراء الاسد اور خندق) دفاعی نوعیت کی تھیں۔ اگر غنیمت ملی بھی تو بدر میں، کہ احد میں مسلمانوں کی فتح نہیں ہوئی، خندق غیر فیصل جنگ تھی اور حمراء الاسد کی مہم قریش کی احد سے واپسی پر ان کے تعاقب کے لیے تھی۔ بدر کی غنیمت میں مقتولین اور اسیروں کے ہتھیار تھے یا سواریاں تھیں، جنہیں کسی صورت آزاد معیشت کی بنیاد قرار نہیں دیا جاتا۔

اب محض تین مہمیں رہ گئیں جن میں کچھ مالی منفعت حاصل ہوئی۔

۱۔ پہلی مہم نخلہ کی تھی۔ اس مہم میں عبداللہ بن جحش کی سربراہی میں کل نو افراد تھے۔ یہ مہم حوالیِ مکّہ میں قریش کی معاندانہ کارروائی کا پتہ چلانے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ دشمن کے علاقے میں اپنے مرکز سے تین سو میل [پانچ سو کلومیٹر] دور اتفاقاً ایک کارواں سے دوچار ہو گئے۔ اگر اس کارواں کو قابو میں نہ کرتے تو مہم کے شرکاء کی تباہی لازمی تھی کیونکہ یہ کارواں جیسے ہی مکّہ میں داخل ہوتا، قریش پلٹ کر اس مہم پر ٹوٹ پڑتے۔ حفاظت خود اختیاری کے پیشِ نظر اس کارواں کو قابو کیا گیا۔ اس مہم میں جو غنیمت ملی

وہ کشمش، منقیٰ اور چمڑے پر مشتمل تھی۔ یہ غنیمت صرف شرکائے مہم میں تقسیم کی گئی۔ اس غنیمت کے بل بوتے پر انصار کے مقابلے پر مہاجرین کی آزاد معیشت کے قیام کا تصوّر بھی مضحکہ خیز ہوگا۔

۲۔ دوسری مہم حضرت زیدؓ بن حارثہ کی سرکردگی میں روانہ کی گئی۔ اس مہم نے القردہ کے مقام پر قریش کے ایک تجارتی قافلے سے تعارض کیا۔ جنگِ بدر کی ہیبت باقی تھی۔ قریش اپنا سامان چھوڑ کر بھاگے جو ضبط کر کے مدینے پہنچایا گیا۔ اس مہم میں کتنا مالِ غنیمت میسّر آیا اس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ اس مہم کے شرکاء کی تعداد کم از کم ایک سو [۱۰۰] بیان کی جاتی ہے۔ جس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ مہاجرین کے علاوہ انصار نے بھی اس مہم میں شرکت کی تھی۔ لہٰذا مالِ غنیمت کی تقسیم میں مہاجرین اور انصار دونوں شریک تھے۔ یہ غنیمت بھی مہاجرین کی آزاد معیشت قائم کرنے کے مقاصد پورے نہیں کرتی۔

۳۔ مہم العس کچھ اتنی غیر اہم تھی کہ بیشتر کتابوں میں اس کا ذکر تک نہیں ملتا۔ اس کے شرکاء کی تعداد ایک سوستر [۱۷۰] بیان کی گئی ہے، جبکہ مالِ غنیمت کا کوئی تخمینہ نہیں ملتا۔ شرکاء کی تعداد کے پیشِ نظر مہاجرین اور انصار آدھے آدھے رہے ہونگے۔ اس مہم سے بھی مہاجرین کی ایسی معیشت کے قیام کا مقصد پورا نہیں ہوتا جو انصار کی معاشی حالت کے متوازی ہو۔ کیونکہ یقیناً ہر غنیمت انصار کو مہاجرین کے مقابلے میں بہتر معیشت کا حامل بناتی ہوگی۔

لہٰذا یہ نظریہ کہ قریش کے تجارتی کاروانوں کی لوٹ پر مہاجرین کی گزر بسر ہوتی ہوگی یا اس لوٹ کے ذریعے مہاجرین کی معاشی حالت کو بہتر بنایا گیا تا کہ وہ خوشحال انصار کے ہمسر ہوسکیں، اور معاشرے میں انکا درجہ ثانوی نہ رہ جائے یکسر غلط ہے۔ کاروانوں سے تعارض کو اوّل تو کسی طور لوٹ کہنا ہی لاعلمی کی دلیل ہے۔ ثانیاً پوری تاریخ نبوی میں ایک اہم اور دو معمولی کاروانوں کی گرفتاری کو ملّت کی معاشی بنیاد قرار دینا محض تنگ نظری ہے۔ گریونے باوم کا خیال یہ لگتا ہے کہ جیسے مکّے کے تجارتی کارواں قارون کا خزانہ لے کر چلتے تھے، جس پر مسلمان ٹوٹ پڑتے تھے اور یہ کہ مسلمان اسی خزانے پر گزر بسر کرتے تھے، ورنہ نہ انکا کوئی ذریعۂ معاش تھا اور نہ کسب کا انہیں کوئی اور طریقہ آتا تھا۔

قریش گانٹھ کے پورے اور عقل کے اندھے نہ تھے۔ انہیں بھی علم تھا کہ جس راستے سے ان کے کارواں جاتے تھے وہ پر امن نہ تھا۔ وہاں یہ خطرہ موجود تھا کہ قافلہ لٹ جائے۔ ایسی صورت میں عقلِ سلیم کا تقاضا یہی تھا کہ حفاظت کا معقول انتظام ہو اور کارواں کی مالیت ایسی ہو کہ نقصان کی صورت میں اسے بہ آسانی برداشت کیا جاسکے اور فریقِ مخالف کو اس سے کم سے کم فائدہ پہنچے۔

مہاجرین کون تھے؟ کیا یہ مکّہ کے قریش نہ تھے؟ کیا یہ ان صفات سے عاری تھے جو قریش مکّہ میں پائی جاتی تھیں؟ اگر پورا مکّہ محض تجارت پر گزر بسر کرسکتا تھا تو نوّے [۹۰] افراد کے گروہِ مہاجرین کے لیے کونسی رکاوٹ تھی کہ وہ تجارت نہ کرسکیں؟ مدینے میں اسلامی ریاست کے قیام نے مکّے کو شمالی تجارت سے بھی بیدخل کردیا تھا تو اس خلا کو پر کرنے لیے مدینے کے مہاجرین سے بڑھ کر کس کے لیے موقع ہوسکتا تھا؟

یہی مہاجرین تھے جنہیں ہجرت کے دس [۱۰] سال کے اندر اندر پورے عرب پر اور بیس [۲۰] سال کے اندر اندر کسریٰ کی سلطنت پر قبضہ کرنا اور قیصر کو مشرق وسطیٰ سے بیدخل کرنا تھا۔ ان میں سے ہر فرد بیمثال خوبیوں کا مالک تھا۔ کوئی فاتح تھا اور کوئی قائد۔ کوئی بے نظیر منتظم تھا تو کوئی عسکری تاریخ کا منفرد ہیرو۔ ان فاتحین نے ایران اور شام کی فتوحات کے دوران مفتوحین کے ساتھ جس حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا، کیا اس کی کوئی نظیر کسی اور فاتح قوم یا اسکے قائدین میں ملتی ہے؟ کیا یہ لوگ محض لٹیرے تھے؟

عجیب تضاد ہے کہ اپنی قوم کو تو لوٹتے تھے، لیکن جب شام اور ایران کو فتح کیا تو نہ تو کسی کو ناحق قتل کیا اور نہ ہی لوٹ مار کی۔ نہ عورتوں، بوڑھوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھایا، نہ دہشت گردی کی نہ آتش زنی۔ اگر کسی مفتوحہ شہر کو دفاعی حکمت عملی کے تحت چھوڑنا پڑا تو وصول کیا ہوا جزیہ تک لوٹا دیا۔ جب یہ گروہ لٹیرا تھا تو ان سے ایسے معیاری اخلاق کا اظہار کیونکر ممکن ہوا۔

اقتدار اور فتح کا نشہ کسی بدکردار پر اخلاقی قیود نہیں قائم کرتا۔ اس کے برخلاف بے راہ روی کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ اس گروہ کا اخلاقی اقدار پر سختی سے قائم رہنا بنیادی طور پر انکے مضبوط کردار کی دلیل ہے۔

لوٹ کی غلط فہمی

لوٹ کی غلط فہمی خود ہماری کتابوں کے اندازِ بیان سے پیدا ہوئی ہے۔ امام بخاریؒ نے حضرت کعبؓ بن مالک سے جنگِ بدر کی روایت یوں بیان کی ہے۔

اِنِّی کُنْتُ تَخَلَّفْتُ فِی غَزْوَةِ بَدْرٍ وَ لَمْ یُعَاتِبْ اَحَداً تُخَلَّفَ عَنْھا۔ اِنَّما خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُرِیْدُ عِیْرَ قُرَیْشٍ۔

[میں غزوہِ بدر میں پیچھے رہ گیا اور کسی پیچھے رہ جانے والے پر کوئی عتاب نہیں ہوا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ قریش کے قافلے کی نیت سے نکلے تھے۔]

یہ نیت کیا تھی۔ بدقسمتی سے لوگوں نے اسے مکروہ لفظ لوٹ سے منسلک کیا ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مغرب کو اس لفظ سے بڑھ کر کوئی دوسرا لفظ مرغوب نہیں ہوسکتا تھا۔ اس میں تصرّف کرکے 'سراسین' کے معنیٰ 'سارقین' کر دیے گئے۔ قوم لٹیری ٹھہری۔ اس کے سردار ڈاکوؤں کے سردار قرار دیے گئے۔

<u>**عرب دستور:**</u> قبلِ اسلام عرب کا عام دستور تھا کہ وہ اپنے تجاتی قافلوں کے لیے علاقے کے قبائل سے حفاظت طلب کرتے تھے، جس کے لیے مناسب معاوضہ دیا کرتے تھے۔ [Watt, W.M.; Mohammed at Mecca, pp. 1-2] ۔ ہر علاقے میں بسنے والا قبیلہ خود مختار تھا جو اپنے حلیفوں کو اپنے علاقے سے تجارتی قافلوں کو بحفاظت لیجانے کی اجازت دیتا تھا۔ مکّہ کے تاجر تو اپنی جگہ، عرب حکمرانوں تک کو ضرورت

محسوس ہوتی تھی کہ اپنے تجارتی قافلوں کی حفاظت کی ذمہ داری کسی نہ کسی بڑے قبیلے کو سونپیں۔

چنانچہ حیرہ کے عرب حکمراں نعمان بن منذر نے بازار عکاظ میں جب اپنا تجارتی کارواں روانہ کرنا چاہا تو بنی کنانہ اور بنی قیس سے سوال کیا کہ ''تم میں سے ایسا کون بہادر ہے جو بہادری کے ساتھ میرے کارواں کو عکاظ تک لے جائے اور اسکی حفاظت کا ذمہ دار ہو۔ میں اس خدمت کا معقول معاوضہ ادا کرونگا''۔ (سیرۃ ابنِ ہشام [اردو]، ۱۹۶۵، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، صفحہ ۹۲، لاہور)۔ قبیلہ کنانہ کے ایک شخص براض نے یہ ذمہ داری قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص عروہ کھڑا ہوا اور اس نے نہ صرف بنی کنانہ بلکہ پورے عرب کے مقابلے میں ذمہ داری قبول کرنے کا دعویٰ کیا۔ عروہ بنی قیس سے تعلق رکھتا تھا۔ نعمان نے عروہ کی پیشکش قبول کر کے کارواں اسکی نگرانی میں روانہ کیا۔ بنی کنانہ نے عروہ کو قتل کر کے اس کارواں پر قبضہ کرلیا۔ اس کے نتیجہ میں جنگ فجار رونما ہوئی۔ یہ واقعہ بعثتِ نبوی سے بیس بائیس سال پہلے ہوا۔

اس واقعے سے چند نہایت اہم پہلو واضح ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر علاقے پر قبائلی اقتدار مسلّم تھا، اور کسی قبیلے کے علاقے سے کسی دوسرے قبیلے کا تجارتی قافلہ اجازت اور منظوری کے بغیر نہیں گزر سکتا تھا۔ دوم یہ کہ اس اجازت اور منظوری کے عوض معاوضہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس صورتحال کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تجارتی کاروانوں کی آمدورفت کے لیے علاقائی معاہدے ہوتے تھے اور صرف معاہدے کی منظوری اور باقاعدہ معاوضے کی ادائیگی کے بعد ہی بیرونی کاروانوں کو یہ حق پہنچتا تھا کہ علاقائی حدود میں سے گزر سکیں۔

ہجرت کے بعد مدینے میں ایک ریاست قائم ہوچکی تھی۔ اس ریاست کے ساتھ مدینے کے آس پاس کے قبائل الحاق کر چکے تھے۔ اس کی حدود ساحلِ بحر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ قریش اس ریاست کے اقتدار کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس ریاست کے لیے قریش دشمن تھے۔ یہ دشمن کی سینہ زوری تھی کہ ریاست کے حدود کی خلاف ورزی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جب معمولی قبائل کا یہ حق تھا کہ ان کی منظوری کے بغیر ان کے علاقے سے کاروانِ تجارت نہ گزرے تو اسلامی ریاست کو بھی یہ حق تھا کہ وہ دشمن کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے بزورِ شمشیر روکے۔ قریش کے قافلوں کی حیثیت ریاست کے اقتدار سے تعارض، اور قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرنے والے اسمگلروں کی تھی۔ اسلامی ریاست کے پاس تنخواہ دار فوج یا پولیس نہ تھی، لہٰذا ان اسمگلروں کی سرکوبی کے لیے مہاجر و انصار روانہ کیے جاتے تھے۔ ان مہمات میں اکثر اوقات قریش بچ نکلنے میں بھی کامیاب ہوجاتے تھے۔

بدر کے موقع پر انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے جنگ بھی کی، جس میں مہاجرین سے دوگنے انصار نے حصہ لیا۔ بدر سے قبل کوئی قابلِ ذکر کارواں گرفتار بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کی شرکت کی وجہ تحریص کو قرار دیا جائے۔ جنگِ بدر کے بعد دو کارواں گرفتار ہوئے۔ ان کی مالیت سے قطع نظر ان کاروانوں کی گرفتاری ریاست کا نہ صرف حق تھا بلکہ اقتدار کی حفاظت کے لیے ضروری بھی تھا۔ اگر ان کاروانوں سے تعارض نہ کیا جاتا تو ریاست کی کوتاہی ہوتی۔ تجارتی محصول کا دستور صرف عرب قبائل کا ہی نہیں بلکہ متمدّن دنیا کا بھی

مسلّمہ قانون تھا۔ مالِ تجارت بلا اجازت کسی بھی ملک سے نہ گزر سکتا تھا۔ حضور ﷺ کے بزرگوں نے شام، عراق اور حبشہ سے تجارت کے لیے وہاں کی حکومتوں سے باقاعدہ اجازت نامے حاصل کیے تھے۔ رومن امپائر میں مالِ تجارت کی درآمد اور برآمد پر محصول وصول کیا جاتا تھا۔ اناجیل میں محصول وصول کرنے والوں کا جگہ جگہ ذکر آیا ہے۔

غرض یہ کہ کسی ریاست کی حدود میں ناپسندیدہ افراد کا داخلہ اور غیر قانونی تجارتی سرگرمیاں ایک مسلّمہ جرم تھا۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے مجرموں کو گرفتار کرنا یا مالِ تجارت کو بحقِ سرکار ضبط کرنا ایک قانونی کارروائی تھی جسے لوٹ کھسوٹ ریاست کے اقتدار کا مذاق اڑانا ہے۔

موقع پرستی

انیسویں صدی کے مستشرقین نے حضور ﷺ پر موقع پرستی کا الزام بھی لگایا ہے۔ ویبر (Weber) نے لکھا۔

"Mohammed was an opportunist and that the original adherents to Islam were motivated solely in terms of prospects of booty and conquest"
(Quoted by Bryan S. Turner; Weber and Islam, p.23)

[محمد [ﷺ] (نعوذ باللہ) ایک موقع پرست شخص تھے اور اسلام کے ابتدائی ماننے والے صرف اور صرف مالِ غنیمت اور فتوحات کی لالچ میں ان کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔]

حضور ﷺ کی تریسٹھ سالہ زندگی کے دو حصے ہیں، قبلِ نبوّت اور بعدِ نبوّت۔ قبلِ نبوّت کی تفصیلات سے آگاہی بہت ہی کم ہے۔ اس دور کا کوئی واقعہ ایسا نظر نہیں آتا جس سے مغرب کے اس الزام کو کوئی سہارا میسّر آ سکے۔ بعدِ نبوّت کا دور بھی دو حصّوں میں منقسم ہے۔ مکّی دور اور مدنی دور۔ مکّی دور تیرہ برس کی مدّت پر محیط ہے۔ اس پورے دور میں حضور ﷺ کی سرگرمیاں تبلیغ تک محدود رہیں۔ یہ دور انتہائی شدید مصائب اور آزمائش کا دور تھا۔ فردِ واحد بلا نصرتِ غیر، اپنے معاشرے میں خوش آئند تبدیلی پیدا کرنے کی سعی میں مصروف تھا۔ اس کی دعوت کیا تھی۔ خدائے واحد و لاشریک کی الوہیت کا پیغام۔ اس پر ایمان لانے اور اسی کی عبادت کرنے کی تلقین۔ اس دعوت کے نتیجے میں انہیں اور ان پر ایمان لانے والوں کو اذیّت کے سوا معاشرے نے کیا دیا؟ جان و مال خطرے میں پڑے، ہر طرح سے آزمائش کی گئی۔ معاشرے نے ترغیب و ترہیب کا ہر ہتھکنڈہ استعمال کیا۔ آزادی سے جینا دوبھر ہوا اور بالآخر ہجرت کرنا پڑی۔

سابقون الاوّلونؓ اسی دور کے اصحابؓ ہیں۔ ان اصحابؓ نے راہِ خدا میں جس طرح قربانیاں دیں، اس کے پیشِ نظر یہ تصور کرنا بھی دماغی خلل ہے کہ انہوں نے دنیاوی مفاد کے لیے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ مجبور انسان جس کے سینے پر عرب کی تپتی ہوئی ریت پر پتھر رکھے جا رہے ہوں اور وہ پھر بھی احد احد کیے جا رہا ہو، نہ معلوم کس غنیمت اور کون سی کشور کشائی کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ فرد جو ایسے مجبور انسانوں کو خرید خرید کر آزاد کر رہا تھا، خدا معلوم کس سلطنت کا آرزومند تھا۔ وہ شہید جن کا جرم صرف توحید کو قبول کرنا تھا، جب ان کا جسم اونٹوں سے باندھ کر چیرا جا رہا تھا تو نہ جانے وہ کونسی دنیاوی نعمتوں سے بہرہ مند ہو رہے تھے۔

خود سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ ان کی قوم نے کیا کیا۔ تیرہ سال کی طویل مدت شدید صبر آزمائی، کشمکش، بے چارگی، تنگی و عسرت کا دور ہے۔ اس میں اپنے بھی بیگانے ہو گئے۔ معاشرہ دشمن ہو گیا، اپنا شہر دیارِ غیر بن گیا۔ راہوں میں کانٹے بچھائے جاتے، گھر پر پتھر آتے۔ اوباش اوباشی پر دادِ تحسین پاتے۔ کلمۂ حق کے جواب میں سنگ وخشت برستے۔ کیا یہ سب کچھ موقع پرستی تھی۔ کیا کسی موقع پرست سے، حق کے لیے ،ایسی استقامت کا بھی اظہار ہوا ہے؟ حقائق سے چشم پوشی اور بہتان تراشی صرف ان لوگوں کا ہی شیوہ ہو سکتی ہے جو یا تو اصلی کوائف سے ناواقف ہوں یا پھر واقعات کو عمداً مسخ کرنا چاہتے ہوں۔

مکّی دور کے بعد دس سالہ مدنی دور ہے۔ اس میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جنہیں مسخ کر کے معاندین اپنے دعووں کو تقویت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تجارتی قافلوں سے تعارض کو لوٹ کہنا، ثنویّت کے عقیدے کے پیشِ نظر دنیاوی معاملات کو دین سے جدا قرار دے کر عسکری مہمات اور انتظامی امور کو نبوّت کے دائرۂ کار سے خارج قرار دینا، اور پھر ان پر زبانِ طعن دراز کرنا، یہی تو شیوۂ مغرب ہے۔

مدنی دور حضور ﷺ کی ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ مدینے والوں نے ان کی نبوّت کو تسلیم کر کے انہیں اپنے شہر آنے کی دعوت دی۔ ان کی آمد پر والہانہ استقبال کیا۔ ان کے احکامات کی پابندی کرنے پر بیعت کی۔ ان کی حفاظت کا ذمّہ لیا۔ انہیں اپنا عادل و منصف تسلیم کیا۔ مدینے نے اسلامی معاشرے کی تعمیر کا میدان فراہم کیا اور یہاں اس معاشرے کے بنیادی خدّ وخال ابھرنے لگے۔ مکّے کا پیغمبر ﷺ جو صرف تحمید و تمجید، انکساری، عبادت وریاضت، صلح پسندی و صلح جوئی میں مصروف نظر آتا تھا، اب ان تمام صفات کو بہ تمام وکمال قائم رکھتے ہوئے ریاستی انتظام وانصرام، قانون سازی اور عدل گستری، تعلیم وتدریس اور تزویر و دفاع میں بھی متحرّک نظر آتا ہے۔

چشمِ عناد کو زہد وتقویٰ، پنجگانہ با جماعت نمازیں، روزے، شب بیداری، فقر و فاقے، کم آرامی، دل گدازی، جاں سپاری، خوفِ خدا، احساسِ ذمہ داری، رحمت و شفقت، تقدّس و حرمت تو نظر نہیں آتی، انہیں صرف یہ تبدیلی کھٹکتی ہے کہ آخر مسکنت نے اقتدار کیوں حاصل کر لیا۔ زبانی تبلیغ کے بعد اپنے دفاع کے لیے طاقت کیوں استعمال کی گئی اور تلوار کیوں اٹھائی۔ [جس کے نتیجے میں عرب ایک عظیم قوّت بن کر رومی مقبوضات کو آزاد کرا سکے، اور مغرب ہزار سال کے لیے اپنے استبدادی کردار سے محروم ہو گیا۔]

اسی تبدیلی کو موقع پرستی سے تعبیر کیا گیا۔ عناد کی سوچ کریہہ ہوتی ہے، ورنہ یہ سارے مدارج فطری ہیں۔ ان تمام مدارج کو انبیائے سابق نے بھی طے کیا۔ حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغ بے اثر رہی۔ بالآخر انہوں نے بھی ہجرت کی، اور حفاظتِ خود اختیاری کی ضرورت ہوئی تو تلوار بھی اٹھائی۔ حضرت موسیٰؑ نے قوم کو متفق کیا اور فرعون کو صلح و آشتی پر مائل کرنے کی کوشش کی۔ چارۂ کار نہ پایا تو پوری قوم کو لے کر مصر سے نکلے، اس کی تربیت فرمائی۔ قوم گمراہ ہوئی تو اس کے خلاف تلوار استعمال کی۔ ہر قبیلے کے مشرکین کو قتل کروایا، جن کی تعداد تین ہزار [۳،۰۰۰] کے لگ بھگ تھی۔ بقیۃ السیف کو قانون عطا کیا۔ ان کے انتظام و انصرام کی طرف توجہ دی۔ جب معاشرتی امور قابلِ اطمینان ہوئے تو ملکِ موعود کی طرف پیش قدمی کی، مخالفین پر تلوار اٹھائی۔ فتوحات حاصل کیں۔ قضائے الٰہی نے مہلت نہ دی کہ کنعان کو فتح کرتے۔ اگر فتح ان کی حیات میں ہوتی تو یقیناً انتظام و انصرام بھی کرتے، جیسا کہ ان کے جانشینوں نے کیا۔ اس نوزائیدہ مملکت اور نظریاتی معاشرے کو کسی اور کے رحم و کرم پر نہ چھوڑتے۔

حضرت عیسیٰؑ نے کیا کیا؟ صرف تبلیغ فرمائی۔ مگر کس لیے؟ اسی لیے تاکہ ایک صالح معاشرہ پیدا کیا جائے۔ یہ صالح معاشرہ اگر پیدا ہو جاتا تو پھر کیا کرتے؟ کیا اسے منظم و منضبط نہ کرتے؟ آسمانی سلطنت کے قیام کا جو نظریہ اناجیل میں پایا جاتا ہے، کیا حضرت عیسیٰؑ کا نظریہ نہ تھا؟ اگر یہ سلطنت قائم ہو جاتی تو اسکا انصرام کون کرتا؟ کیا ان سے بہتر کوئی اور شخصیت بھی تھی، جو اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دے سکتی؟ کم از کم قیصر اور اسکے نمائندوں کو تو یہ اجازت ہرگز نہ ملتی۔

حضرت عیسیٰؑ کا دورِ نبوّت صرف تین سال ہے۔ اس تمام عرصے میں وہ تبلیغ فرماتے رہے جس کا معاشرے نے خاطر خواہ اثر قبول نہ کیا۔ اس قلیل مدّت میں تبلیغ کو بے اثر دیکھا تو وہ بھی تلوار کا سہارا لینے پر مجبور ہونے لگے۔ انجیل میں ہے،

''اس نے ان سے کہا مگر اب جسکے پاس بٹوہ ہو وہ اسے لے اور اسی طرح جھولی بھی۔ اور جسکے پاس نہ ہو وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدے۔'' (لوقا باب-۲۲، ۳۶)

ان ہی فطری مدارج کو داعیِ اسلام علیہ ﷺ نے بھی طے فرمایا۔ عناد کی زبان اسے موقع پرستی کا نام دیتی ہے۔ جبکہ دیانتدار جائزہ اسے صالح معاشرے کے قیام کی جدّ و جہد کہے گا۔ اسی پرخلوص جدّ و جہد کا اصطلاحی نام جہاد ہے۔ مغرب کی نظر میں جہاد ایک شیطانی فعل ہے، اور محض خونریزی کا چسکہ ہے جس میں سفلی خواہشات کارفرما ہوتی ہیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ داعیِ اسلام علیہ ﷺ کے اصحاب ہمہ وقت انکے گرد و پیش موجود تھے۔ ان کی تعلیمات سے آگاہ اور ان پر صدقِ دل سے عمل پیرا تھے۔ انہیں اللہ کا رسول تسلیم کرتے تھے۔ ان کے ہر لفظ کو سرچشمۂ ہدایت سمجھتے تھے۔ ان کے ہر عمل کو صراطِ مستقیم کی حیثیت حاصل تھی۔ اس حالت میں کوئی سہو یا لغزش جو مقامِ نبوّت سے مناسبت نہ رکھتی ہو، اصحاب کو دل برداشتہ کرنے کے لیے کافی ہوتی۔ آخر وقت تک اصحاب کی گرویدگی اور وصالِ نبوی علیہ ﷺ کے بعد شدّتِ جذبات سے ان کی وارفتگی اس امر کا ثبوت ہے کہ اللہ کا نبی علیہ ﷺ اس

قسم کی ہر کمزوری سے منزہ تھا۔ اس کی ذات اور اسکا کردار اس قدر بلند، مقدّس، پاک اور اور بے ریا تھے کہ اس سے محبت، دیوانگی اور جنون کی حد تک بڑھ چکی تھی۔ عشق و محبّت صرف حسن و خوبی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہی جذبہ ہے جو محبوب کو محبّ کی ذات سے ارفع و اعلیٰ کر دیتا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت محبّ اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ داعیِ اسلام ﷺ، جن کا معاشرہ اپنے محبوب نبی ﷺ پر جان چھڑکتا ہے، اور یسوع، جن کے لیے کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی، مغرب جب ان دونوں کا موازنہ کرتا ہے تو کسی قدر کو مشترک نہیں رکھتا بلکہ دونوں کو اوزان بدل کر تولا جاتا ہے۔ اور پیشگی تعیّن کے مطابق نتائج حاصل کیے جاتے ہیں۔

موقع پرستی کا الزام ہے تو موقع پرستی کے ثبوت کیا ہیں؟ جنگیں موقع پرستی نہیں، باطل کا تدارک تھیں۔ قافلوں کی گرفتاری موقع پرستی نہیں، ریاست کی تادیبی کارروائی تھی۔ معاہدات موقع پرستی نہیں، معاشرے میں قیامِ امن کے اقدامات تھے۔ معاہدات کی خلاف ورزی ملّتِ اسلامیہ نے نہیں بلکہ ہمیشہ فریقِ ثانی نے ہی کی۔ اس خلاف ورزی کے نتائج و عواقب موقع پرستی نہیں، فریقِ ثانی کی شامتِ اعمال تھی۔ فتنہ پرور لوگ شہر بدر کیے گئے تو اپنی بداعمالیوں اور جرائم کی پاداش میں۔ سنگین جرائم، مثلاً مملکت سے غدّاری، ریاست اور معاشرے کے خلاف سازشوں اور نظریاتی انتشار پیدا کرنے کی مذموم حرکتوں، کے مرتکب مجرموں کو سزائیں دی گئیں تو قانون اور سلامتی کے تقاضوں کے تحت۔ غدّاری، جاسوسی، غیر ملک کے لیے اپنے ملک کے مفاد کے خلاف سرگرمیوں میں حصّہ لینا، یہ سب ایسے سنگین جرائم ہیں جنہیں ہر متمدّن معاشرہ ناقابلِ معافی تصوّر کرتا ہے اور ان کی پاداش میں سخت سزائیں دیتا ہے۔

عہدِ نبوی میں معاشرے میں ان سزاؤں کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی۔ مجرمین کے قبائل اور انکے حلیفوں نے بھی ان تادیبی کارروائیوں کو روا رکھا۔ کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ مجرمین ان سزاؤں کے حقدار تھے؟ بنی قینقاع شہر بدر کیے گئے تو دیگر یہود تماشائی رہے۔ بنی نضیر ملک بدر ہوئے تو معاشرے میں کوئی بے چینی پیدا نہیں ہوئی۔ بنو قریظہ گرفتار ہوئے تو انکا فیصلہ ان کے حلیف نے یہود کے قانون کے مطابق کیا۔ پتہ نہیں ان میں سے کونسا عمل تھا جو مغربی مفکّرین اپنے الزام کے ثبوت میں پیش کرنا چاہیں گے؟

مسخ کردہ حقائق

قبلِ ہجرت

حضور ﷺ سے متعلق تاریخی واقعات کو مسخ کرنا، ان میں شبہ پیدا کرنا یا انہیں غلط قرار دینا مغرب کی ایک شعوری کوشش رہی ہے۔ روایات کے مطابق حضور ﷺ کی پیدائش عام الفیل یعنی مکے پر ابرہہ کے حملے کے سال بتائی جاتی ہے۔ چونکہ ابرہہ کے حملے کا سال متعین نہیں ہے اس لیے مختلف اندازوں پر مختلف سنین قیاس کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر ۵۷۰ء کو سالِ پیدائش بیان کیا جاتا ہے۔

شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اس موضوع پر حسبِ ذیل تبصرہ پایا جاتا ہے۔

''سالِ پیدائش ۵۷۰ء مشتبہ ہے کیونکہ روایات ان کی پیدائش عام الفیل میں بتلاتی ہیں، اور ابرہہ کا مکے پر حملہ اس سال سے قبل ہوا ہوگا۔ لیمن نے تاریخِ پیدائش میں بہت سے شبہات اس بنا پر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مدینہ آکر [حضور ﷺ نے] جس فعالیت کا ثبوت دیا ہے وہ کسی معمر اور پچاس سال سے زیادہ عمر والی شخصیت سے متوقع نہیں ہوسکتی۔ (اس قیاس کی بنا پر) اس وقت عمر بیس تیس سال ہونی چاہیے۔''

(Shorter Encyclopedia of Islam; article 'Mohammed', p.390)۔ کیا بوالعجمی ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کے مولفین سنہ پیدائش ۵۷۰ء سے قبل قرار دیتے ہیں تو لیمن فعالیت کی بنیاد پر ہجرت کے وقت بیس سال کے لگ بھگ قیاس کرتا ہے، یعنی سالِ پیدائش (سالِ ہجرت ۶۲۲ء سے بیس [۲۰] سال منفی کرنے پر) ۶۰۲ء یا ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی سنین مقرر کرتا نظر آتا ہے۔ اب اگر تیرہ سالہ مکی دور کو نکالا جائے تو گویا بعثت صرف سات سے سترہ سال کی عمر کے درمیان ہوئی۔ پھر شادی کب ہوئی؟ قبلِ پیدائش یا دو برس کی عمر میں؟ گویا لیمن نے اپنے خود ساختہ مضحکہ خیز نظریے کی بنیاد پر حیاتِ نبوی کی تیئتیس سالہ تاریخ کو بیک جنبشِ قلم ناپید کردیا۔ وہ تمام واقعات جنکا تعلق اس دور سے ہے کالعدم ہوگئے۔ نہ جنگِ فجار ہوئی نہ حلف الفضول وقوع پذیر ہوا۔ نہ عبدالمطلب کا دور پایا نہ زبیر بن عبدالمطلب کی سرپرستی ملی۔ نہ حضرت خدیجہؓ سے شادی ہوئی نہ تعمیر کعبہ کے قضیے میں ثالثی کی۔ لیمن کا نظریہ تاریخ کو مسخ نہیں کرسکتا، ہاں تاریخ کی روشنی میں خود مسخ نظر آنے لگتا ہے۔

مولف مضمون (شارٹر انسائیکلوپیڈیا) کو ابرہہ کا حملہ ۵۷۰ء سے قبل کا واقعہ معلوم ہوتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خود ابرہہ کی کوئی مستند تاریخ نہیں پائی جاتی ہے۔ عرب میں قبلِ اسلام ترتیبِ زمانی کے ساتھ تاریخ

نویسی کا وجود نہ تھا۔ غیر عربوں نے عرب کی کوئی تاریخ نہیں لکھی۔ پس خود ابرہہ کے حملے کے سن کا تعین نہیں، اس لیے کسی غیر معینہ سن کی بنیاد پر معینہ سن کو غلط قرار دینا بجائے خود ایک فاش غلطی ہے۔ سالِ پیدائش کا تعلق اسلام کے کسی مذہبی عقیدہ سے نہیں۔ اگر تحقیق، ۵۷۰ء کو بطور سالِ پیدائش غلط بھی ثابت کر دے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حضور ﷺ کی تاریخِ پیدائش کو اسلام میں وہ اہمیت ہرگز حاصل نہیں ہے جو یسوع کی پیدائش کو عیسائیت میں حاصل ہے۔ ۱۲ ربیع الاوّل عام الفیل، ۲۵ دسمبر ۱ عیسوی نہیں۔ اس دن کو تاریخ مذاہبِ سابق سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ دن یومِ شمس تھا نہ اس دن کسی مذہب کا کوئی خدا پیدا ہوا۔ تاریخِ پیدائش جزوِ عقائد نہیں کہ اس کی تبدیلی سے کوئی انتشار پیدا ہو۔

عالی نسبی: عالی نسبی پر بھی بہت سے مستشرقین نے خامہ فرسائی کی ہے۔ جبکہ تمام ذرائع اس امر کی توثیق کرتے ہیں کہ ان کا نسبی تعلق بنو ہاشم سے تھا۔ اور یہ کہ بنو ہاشم نے ان کو ہمیشہ اپنا تسلیم کیا۔ یہ بات اگر قدیم ذرائع نہ بھی بیان کرتے تو اس حقیقت سے ثابت ہو جاتی کہ حضور ﷺ کو مکہ میں جو حالات درپیش ہوئے ان میں ان کی حفاظت صرف ایک صاحبِ حیثیت قبیلہ ہی کر سکتا تھا۔ یہ قبیلہ بنو ہاشم کا تھا جو خانہ کعبہ کا متولی تھا۔ یہ عزت قریش میں صرف بنو ہاشم کو میسر تھی۔ اور قریش تمام عرب میں معزز ترین تھے۔ پس آپ کا تعلق نسب عرب کے معزز ترین قبیلے قریش اور قریش کی معزز ترین شاخ بنو ہاشم اور بنو ہاشم کے محترم ترین فرد عبدالمطلب سے تھا۔ اس قسم کی خامہ فرسائی محض تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی ایک بچکانہ کوشش ہے۔

ابتدائی حیاتِ طیبہ: مورخین کو شکایت ہے کہ اگرچہ حضور ﷺ وہ واحد نبی ہیں جو تاریخ کے پورے روشن دور میں تشریف لائے مگر ان کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں، خصوصاً ابتدائی حالات کا قطعاً پتہ نہیں چلتا۔ (cf. Phillips K. Hitti; History of Arabs, p.112)۔ کسی مؤرخ کی زبان سے ایسا تبصرہ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بیرونِ عرب تاریخی دور کتنا ہی روشن کیوں نہ رہا ہو، عرب تاریخی اعتبار سے قبلِ اسلام تاریکی کے دور میں ہی تھا۔ اس دور کے عرب کی کوئی تحریری تاریخ نہیں پائی جاتی۔ عرب تاریخ کے دور میں حضور ﷺ کے طفیل میں ہی آیا۔ جب تاریخ لکھنے کا رواج ہی نہ تھا تو تاریخی واقعات کے نایاب ہونے کی شکایت کرنے کا کیا محل ہو سکتا ہے؟

اس سے قطع نظر، تاریخ کا دائرۂ کار اس دور میں کیا تھا؟ صرف عظام اور خصوصاً شاہوں کے واقعات کو قلمبند کرنے کا نام تاریخ تھا۔ آج بھی تاریخ یہی کرتی ہے۔ نکتۂ نظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہاں موضوعات میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ کیا تاریخ غیر اہم واقعات کو محفوظ رکھنے کی زحمت کرتی ہے؟

سوال یہ ہے کہ تاریخ سے مراد کیا ہے؟ تاریخ کیسے مرتب ہوتی ہے؟ کن واقعات اور کیسے افراد کا تذکرہ محفوظ رکھتی ہے؟ تاریخ واقعاتِ گزشتہ کی یادداشت ہی تو ہے، جس میں اس دور کے اہم واقعات درج ہوتے ہیں۔ اور مورخ کے نقطۂ نظر کے پابند ہوتے ہیں۔ اس میں صرف وہی واقعات درج ہوتے ہیں جن کی اہمیت مسلمہ ہوتی ہے۔ اس میں صرف وہی افراد جگہ پاتے ہیں جن کے تذکرے کے بغیر مرقومہ واقعہ تشنہ رہ جاتا ہو۔

تاریخ اپنے دور کی اہم شخصیتوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس وضاحت کے پیشِ نظر اگر حضور ﷺ کی تاریخی شخصیت سے مراد یہ لی جائے کہ انہوں نے کیا کیا، کب کیا اور کیسے کیا، تو انکا کارنامہ اسلام ہے۔ اور کیسے کی مکمل تاریخ موجود ہے۔

عالمی تاریخ انکے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ تاریخ اسلام تو انہی کے گرد گھومتی ہے۔ اب اگر تاریخ سے مراد یہ ہے کہ پیدائش اور بچپن کے واقعات اور نبوّت سے پیشتر حالاتِ زندگی واضح نہیں تو یہی تاریخ کا دستور ہے کہ جب تک کوئی شخصیت تاریخی نہ بن جائے اس کو تاریخ میں جگہ نہیں ملتی۔ سوچیے کہ قریش کے ایک گھرانے میں ایک یتیم بچہ پیدا ہوا۔ گھرانے کے متعلقہ لوگوں کو بھی اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ اس کی تاریخ قلمبند کرتے۔ کسی ملک، شہر یا محلّے میں روزانہ کتنے ہی بچے پیدا ہوتے ہیں اور کتنے افراد ہیں جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان نوزائیدہ بچوں میں مستقبل کے عظام بھی ہیں انکی تاریخ قلمبند کرتے ہیں۔ پھر اس درِ یتیم نے بچپن دوسرے بچوں سے ممتاز اور ممیز ہی کیوں نہ گزارا ہو، پھر بھی انکے ہم عمر ہزاروں تھے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ خصوصیت سے ان کے حالات کو محفوظ کیا جاتا۔

لیکن جب یہ شخصیت تاریخی بنی تو پورا دوران کی شخصیت پر مرکوز ہو گیا۔ اب کوئی مورّخ یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ اس عظیم شخصیت کے تذکرے کے بغیر تاریخ مرتّب کر سکے۔ اب جن لوگوں کو ماضی کے واقعات یاد آتے ہیں، وہ اپنے ذاتی علم کی بنا پر یہ شہادت دیتے ہیں کہ ماضی میں یہ واقعات رونما ہوئے اور اگر کوئی ایسی وجہ نہ ہو جو انکی شہادت کو ناقابلِ قبول بنا دے، تو یہی غیر مرتّب واقعات جزوِ تاریخ بن جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر سوانح عمری اور ہر تاریخ کے اجزائے ترتیبی یہی شخصی شہادتیں اور بیانات ہوتے ہیں۔ جب کلیّہ یہی ٹھہرا تو کسی ایک شخصیت پر اعتراض کرنا ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ ورنہ حضور ﷺ کی دورِ نبوّت کی حیات طیّبہ تو تاریخ میں اسقدر محفوظ اور روشن ہے کہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری خود بھی اسی دور میں پہنچ گیا ہے۔

حضور ﷺ کی شخصیت تو وہ نیّرِ تاریخ ہے کہ ان کی ضیا بار معیّت میں جو آیا منوّر ہو گیا۔ محض انکے تعلق سے ان گنت گمنام شخصیتوں کو تاریخ میں لافانی مقام ملا۔ یہ تعلّق دوستی اور پیروی تک محدود نہیں، بلکہ ایسے لوگ بھی لازوال شہرت پا گئے جن کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے شمعِ رسالت کی مخالفت کی۔ اگر ان مخالفین کے کارناموں سے دشمنی کا عنصر خارج کر دیا جائے تو وہ ایسے ہو جائیں گویا پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔

عرب میں تاریخ نویسی کا دستور نہ تھا۔ صحابہؓ نے کوئی تاریخ نہیں لکھی۔ جب تاریخ نویسی کی طرف توجہ شروع ہوئی تو سیرت نگاروں نے بڑی کاوشوں کے ساتھ حالاتِ زندگی معلوم کیے۔ تفصیلی مستند حالات نبوّت کے بعد کے دور کے میسّر آئے۔ انہیں تفصیل سے لکھا۔ قبلِ نبوّت کے واقعات کم معلوم ہو سکے۔ لہٰذا جو معلوم ہو سکے وہی تحریر کیے گئے۔ حضور ﷺ کا تعلّق معشر الانبیاء سے ہے۔ اور انبیاء میں سے کسی کے قبلِ نبوّت کے تفصیلی واقعات نہیں پائے جاتے۔ وہ صفحاتِ تاریخ پر نبوّت کے بعد آتے ہیں۔ یہی شان رسول اللہ ﷺ کی بھی ہے۔

معراج

حضور ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرنے سے گریز [کی مغربی روش] نے بے شمار پیچیدگیاں پیدا کی ہیں۔ عالمِ بالا سے تعلق، وحی کی کیفیات، روحانی وارداتیں، سب کی سب معرضِ بحث میں آئی ہیں۔ ہر شے تشکک کی نظر سے دیکھی گئی۔ وحی کو لاشعوری واہمہ، وحی کی کیفیات کو صرع، اور روحانی وارداتوں کو مغالطہ کا نام دیا گیا۔ حالانکہ ان تمام حقیقتوں کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ انبیاء ہمیشہ سے مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ عالمی مذاہب کا وجود انکی کامیاب کاوشوں کا مظہر ہے۔ مذاہبِ عالیہ انسانی تہذیب وتمدن کے سرچشمے ہیں۔ انبیاء ہر مذہب کے عظیم اور اعلیٰ ترین افراد ہوتے ہیں۔ ہر نبی نے یہی اعلان کیا کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان واسطہ ہے۔ انہیں روحانی وسیلے سے عالمِ بالا سے پیغام پہنچتا ہے۔ جس پر وہ خود عمل پیرا ہوتے ہیں اور دوسروں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ہر نبی کا تعلق وحی سے پایا جاتا ہے۔ وحی کی کیفیات جدا جدا نظر آتی ہیں۔ کوئی خواب دیکھتا ہے، کوئی صرف آواز سنتا ہے، کوئی وحی لانے والے فرشتے کو مرئی حیثیت میں دیکھتا ہے اور اس سے پیغام سنتا ہے اور کوئی راست خدا سے شرفِ ہمکلامی حاصل کرتا ہے۔ ان جداگانہ کیفیات کے باوجود یہ امر مشترک ہے کہ انبیاء علیہ السّلام کا ایک غیر عام فہم تعلق عالمِ بالا سے ہوتا ہے اور یہ تعلق وحی کہلاتا ہے۔ پس انبیاء اور وحی کا تعلق لازم وملزوم ہے۔ اسی طرح روحانی واردات کا بھی ایک مربوط تسلسل پایا جاتا ہے۔ بارگاہِ ایزدی میں باریابی اور حضوری کے متعدد واقعات سے عہد نامۂ قدیم مزیّن ہے۔ حضرت آدمؑ کی جنّت میں حضوری، حضرت نوحؑ سے قبلِ طوفان ہمکلامی، حضرت ابراہیمؑ تو گویا ہر لمحہ حضوری سے مشرّف تھے۔ نارِ نمرود ہو یا فرزند کی قربانی، ہجرتِ کنعان ہو یا حضرت اسمٰعیلؑ کو جدا کر کے حجاز میں بسانا، قومِ لوطؑ کی تباہی ہو یا سدوم وعمورہ کی بربادی، ہر مرحلے پر شرفِ حضوری حاصل نظر آتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کی معراج: عہدِ یعقوبی تک ہمیں شرفِ حضوری اور ہم کلامی کا پتہ تو چلتا ہے لیکن یہ حضوری عالمِ بالا پر نہیں بلکہ ارضِ خاکی پر ہی نظر آتی ہے۔ کتاب پیدائش کے مطابق، حضرت یعقوبؑ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے عالمِ بالا کا مشاہدہ ایک روحانی واردات کے ذریعے کیا۔

''اور یعقوبؑ بیر سبع سے نکل کر حاران کی طرف چلا۔ اور ایک جگہ پہنچ کر ساری رات وہاں رہا....... اور اسی جگہ سونے کو لیٹ گیا، اور خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک سیڑھی زمین پر کھڑی ہے اور اسکا سرا آسمان تک پہنچا ہوا ہے اور خدا کے فرشتے اس پر سے چڑھتے اترتے ہیں۔ اور خدا اس کے اوپر کھڑا ہوا کہہ رہا ہے کہ میں خداوند تیرے باپ ابرام کا خدا اور اضحٰق کا خدا ہوں''۔ (پیدائش، باب-۲۸، ۱۰ تا ۱۳)

اس رویا کو ہم معراجِ یعقوبی کا نام دے سکتے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ حضرت یعقوبؑ نے صرف فرشتوں کو چڑھتے اترتے دیکھا یا انہوں نے خود بھی اس سیڑھی سے مقامات عالیہ طے کیے۔ تاہم یہ

واقعہ اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ عالم بشریت اور عالم افلاک کے درمیان پائی جانے والی اولین معلومہ کڑی ہے۔

حضرت موسیٰؑ: حضرت موسیٰؑ کا کوہِ طور پر تشریف لے جانا شرفِ ہم کلامی حاصل کرنا اور جلوہ طور دیکھنا، عالم بیداری میں تھا۔ یہاں معراج ایک اور ارتقائی منزل طے کرتی نظر آتی ہے یعنی عالم رویاء بیداری میں تبدیل ہوا۔ بلندی نے فاصلے کم کیے، طور کی چوٹی اور افلاک کا فاصلہ کم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، عبد اور معبود کے درمیانی فاصلے کم ہوئے۔ بشریت حضوری سے فیضیاب ہوئی اور ایک عظیم روحانی واردات وقوع پذیر ہوئی۔

دیگر انبیاءؑ: روحانی وارداتوں کا سلسلہ ہمیں دیگر انبیاء کے واقعات میں بھی ملتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کے مزامیر میں حضوری اور معیت واضح طور پر مترشح ہے۔ حضرت سلیمانؑ سے منسوب غزل الغزلات عشق حقیقی، ہجر و وصال، جذب و مستی اور روحانی وارداتوں سے پُر ہیں۔ یسعیاہ نے اپنی واردات ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ،

''میں نے خداوند کو ایک بڑی بلندی پر اونچے تخت پر بیٹھے دیکھا اور اس کے لباس کے دامن سے ہیکل معمور ہوگئی۔ اس کے آس پاس سرافیم کھڑے تھے۔ جن میں سے ہر ایک کے چھ بازو تھے۔ اور ہر ایک دو سے اپنا منہ ڈھانپے تھا، اور دو سے پاؤں، اور دو سے اڑتا تھا۔ اور ایک نے دوسرے کو پکارا اور کہا قدوس، قدوس، قدوس ربّ الافواج ہے۔ ساری زمین اس کے جلال سے معمور ہے۔ اور پکارنے والے کی آواز کے زور سے آستانوں کی بنیادیں ہل گئیں، اور مکان دھوئیں سے بھر گیا۔ تب میں بول اٹھا کہ مجھ پر افسوس میں تو برباد ہوا۔ کیونکہ میرے ہونٹ ناپاک ہیں اور نجس لب لوگوں میں بستا ہوں۔ کیونکہ میری آنکھوں نے بادشاہِ ربّ الافواج کو دیکھا۔ اس وقت سرافیم میں سے ایک، سلگا ہوا کوئلہ جو اس نے دست پناہ سے مذبح پر سے اٹھالیا، اپنے ہاتھ میں لے کر اڑتا ہوا میرے پاس آیا اور اس سے میرے منہ کو چھوا اور کہا دیکھ اس نے تیرے لبوں کو چھوا، پس تیری بدکرداری دور ہوئی اور تیرے گناہ کا کفارہ ہوگیا۔ اس وقت میں نے خداوند کی آواز سنی جس نے فرمایا میں کس کو بھیجوں؟ اور ہماری طرف سے کون جائے گا؟ تب میں نے عرض کی میں حاضر ہوں، مجھے بھیج۔ اور اس نے فرمایا جا ان لوگوں سے کہہ......'' (عہد نامۂ قدیم، یسعیاہ، باب-٦، ١ تا ٩)

یسعیاہ کی یہ روحانی واردات بھی باعتبارِ مکان زمینی تھی لیکن سوائے اختلافِ مکانی، بقیہ ہر اعتبار سے نہ صرف یہ واردات بلکہ متذکرہ بالا تمام وارداتیں معراج کی سب صفات کی حامل ہیں۔ ایلیاہ یا ایلجاہ کی واردات کی تفصیلات نہیں ملتیں، لیکن وہاں اختلافِ مکانی بھی بلاشک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

''اور وہ آگے چلتے اور باتیں کرتے جاتے تھے کہ دیکھو ایک آتشی رتھ اور آتشی گھوڑوں نے ان دونوں کو جدا کر دیا اور ایلیاہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا۔ الیشع یہ دیکھ کر چلّایا اے میرے باپ! میرے باپ! اسرائیل کے رتھ اور اس کے سوار......'' (سلاطین ٢، باب ٢-١١،١٢)

ایلیاہ کی واردات میں اگر کسی بات کی کسر نظر آتی ہے تو وہ انکی واپسی ہے ورنہ معراج کی جو کیفیت حضرت یعقوبؑ سے شروع ہوئی تھی اس میں مسلسل ارتقائی انداز نظر آتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ: حضرت عیسیٰ حضور ﷺ کے پیشرو انبیاء میں آخری نبی ہیں۔ ان کے دور میں کیفیت معراج مزید واضح ہوئی۔ قرآن کے بیان کے مطابق، ان کے گرد و پیش افراد کو دراصل ان کی مصلوبیت کا دھوکہ ہوا، ورنہ حقیقتاً انہیں آسمان پر اٹھالیا گیا۔ یہ عالم بالا پر جانے کی دوسری مثال ہے۔ اناجیل کے مطابق انہیں مصلوبیت کے بعد دوبارہ حیات ملی اور پھر وہ اپنے جسد مادی کے ساتھ آسمان پر تشریف لے گئے۔ مصلوبیت کے وقوع یا عدم وقوع سے قطع نظر، ہر دو صحف سماوی اس امر پر متفق ہیں کہ وہ افلاک پر تشریف لے گئے۔

انجیل کی روایت کے مطابق شیطان نے آزمائش کرنے اور ترغیب و تحریص کے ذریعے حضرت عیسیٰ کو جادۂ حق سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اور اس غرض سے انہیں زمین سے اتنی بلندی پر لے گیا جہاں سے دنیا کی ساری سلطنتیں پل بھر میں دکھا سکے۔ (انجیل لوقا، باب ۴، درس ۱ تا ۱۳)

فضا میں بلند ہونے کے عام واقعات: جسم انسانی کے بلا کسی بیرونی سہارے کے ہوا میں بلند ہونے کے قصے دنیا کے ہر مذہب میں بیان کیے جاتے ہیں۔ ہندو، کرسچین اور چینی مذاہب میں اس کا ذکر خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ جہاں مادہ پرست اس کے وقوع سے انکار کرتے ہیں وہیں اس کے اثبات کی بے شمار شہادتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ہم ذاتی طور پر اس کی تائید یا تردید کیے بغیر، کچھ حوالے درج کر رہے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون 'Levitation' میں تحریر کیا گیا کہ،

''انیسویں صدی میں اس قسم کے واقعات کی اطلاع ایک عینی شاہد نے دی، جس نے ڈینیل ڈگلس ہومز کو فضا میں تین مرتبہ بلند ہوتے دیکھا۔ اس واقعے کے بارے میں سر ولیم کروکس نے لکھا کہ میں نے تین مختلف مواقع پر اسے کمرے کے فرش سے پوری طرح بلند ہوتے دیکھا۔ ہر موقعے پر مجھے اس وقوعے کو پوری طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی قسم کی رپورٹ ارل آف ڈنراون (Earl of Dunraven) نے دو گواہوں کے ساتھ دی کہ انہوں نے ہومز کو ایک ایسی کھڑکی سے جو ستر فیٹ کی بلندی پر تھی۔ ایک دوسری کھڑکی میں جو سات فیٹ دور تھی منتقل ہوتے دیکھا''۔

(Encyclopedia Britanica; article 'Leviation', Vol. 13, p.1003)۔

ان تحریری شہادتوں کی بنیاد پر، معراج نبوی پر شک و شبہ، حرف گیری یا تمسخر محض لغویت ہی کہلا سکتی ہے۔ ایک عام آدمی کے ہوا میں بلند ہونے کا ناقابل یقین واقعہ صرف اس لیے انسائیکلوپیڈیا میں جگہ پا سکتا ہے کہ اس کے راوی اور شاہد سب کے سب مغربی تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل کی وارداتوں کو صرف اس لیے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ انجیل مقدس میں تحریر ہیں۔ لیکن تمام انبیاء کے سردار کی اس قسم کی واردات اس لیے زیر بحث آتی ہے کہ ان کا تعلق مغربی عقیدے سے نہیں۔ کیا خوب منطق ہے کہ ابلیس تو خداوند یسوع مسیح کو بلندیوں پر لے جا سکتا ہے، لیکن رب العالمین اپنے ایک رسول کو (نعوذ باللہ) معراج سے سرفراز نہیں کر سکتا۔ یہی واقعہ اسلامی لٹریچر میں ہو تو تیوری پر بل پڑنے لگیں، لیکن اگر اسکا چربہ دانتے کا قلم اتارے تو عہد وسطیٰ کا ادبی شہ پارہ کہلائے۔ اس میں کلام نہیں کہ معراج کا تجزیہ سائنسی انداز میں نہیں کیا جا سکتا اور آج کا انسان سائنس کو معراج صداقت تصور کرتا ہے۔ اور ہر وہ قدر جو سائنس کی کسوٹی پر نہ پرکھی جا سکے، اہمیت اور افادیت

سے محروم تصور کر لی جاتی ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ سائنس کا تعلق ذہن انسانی سے ہے۔ انسان، اسکا ذہن اور اسکا علم، کائنات کی وسعت کے مقابلے میں صفر کے برابر ہے۔ ہم جسے علم و سائنس کہتے ہیں، وہ ایک عظیم نامعلوم کائنات کے حقیر سے معلومہ حصّے کا ہی احاطہ کرتی ہے۔ معلوم اور نامعلوم حقائق میں کوئی تناسب بھی قائم نہیں کیا جاسکتا۔ سائنس اس حقیر معلومہ حصّے کے بھی کل سے نہیں بلکہ جزو سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ محض مادّے سے بحث کرتی ہے۔ غیر مادّی معاملات مثلاً جذبات، احساسات، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات اور عالمِ روحانیات وغیرہ سائنس کے دائرۂ کار سے باہر ہیں۔ ابھی ان پر تحقیقات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جب سائنس ان دائروں سے بذاتِ خود لاعلم ہے تو محض اپنی لاعلمی کی بنیاد پر وہ اس معاملے میں کسی فیصلے کو صادر کرنے کی ہرگز مجاز نہیں ہوسکتی۔

غرانیق

ایک موقع پر داعیِ اسلام ﷺ صحنِ کعبہ میں سورۃ النجم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب ان آیات پر پہنچے جن میں لات وعزّیٰ اور منات کی الوہیت کی تردید ہے، تو کسی نے ہانک لگائی ''تلک الغرانیق العلیٰ۔ وانّ شفاعتھن لترتجیٰ۔'' (یہ تو نہایت اعلیٰ دیویاں ہیں اور انکی شفاعت مقبول ہے)۔ کفار قریش نے خیال کیا کہ داعیِ اسلام ﷺ نے ان دیویوں کی الوہیت تسلیم کرلی۔ وہ بھی داعیِ اسلام ﷺ کے ساتھ سجدہ ریز ہوگئے۔ دیکھتے دیکھتے یہ خبر دور دور تک پھیل گئی۔ حضور کو جب اس غلط فہمی کی اطلاع ہوئی تو فرمایا، ان دیویوں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ گڑھی ہوئی مورتیاں ہیں جنہیں قریش کے بڑوں نے غلطی سے مقدس بنا رکھا ہے۔

یہ سادہ سی غلط فہمی خاصی پیچیدگی کی حامل تھی۔ اس کی توجیہات مختلف انداز میں کی گئی ہونگی۔ لوگوں نے قریش کے سرداروں کو حضور کے پیچھے سجدہ ریز دیکھا تو سمجھا ہوگا کہ قریشیوں نے دینِ اسلام قبول کرلیا۔ قریش نے اس کی تردید کی ہوگی کہ نہیں ہم نے نہیں بلکہ داعیِ اسلام ﷺ نے ہماری دیویوں کو تسلیم کرلیا۔ اب وہ پچھلی تبلیغ سے باز آگئے ہیں اور دینِ قدیم کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ ہر گروہ اپنی فکر کے مطابق اس واقعے کی توجیہہ کر رہا ہوگا۔ جو لوگ اس کشمکش کو ختم کرنے کے حق میں ہوں گے انہوں نے اسے مصالحتی اقدام سے تعبیر کیا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ یہ اطلاع حبشہ بھی پہنچی۔ وہاں مقیم مہاجرین نے اطلاعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بالآخر قریش کو بھی حضور ﷺ نے مسلمان کرلیا۔ چنانچہ کچھ حضرات نے رختِ سفر باندھا اور مکّہ واپس آگئے۔

کلائن اور غرانیق: جب یہی واقعہ مغرب کے علم میں آیا تو انہیں ڈرامہ ترتیب دینے کا من بھاتا مواد میسّر آیا۔ کسی نے اسے وقتی جذبۂ مفاہمت سے معنون کیا۔ دوسرے نے اسے اکتاہٹ سے تعبیر کیا۔ تیسرے نے اس کا نام سپردگی رکھا۔ کسی نے موقع پرستی کہا۔ کوئی اس واقعے سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں بلکہ داعیِ اسلام ﷺ کی تصنیف ہے کہ جب چاہا خدا کے نام سے ایک آیت بڑھا دی اور

جب چاہا اسے منسوخ قرار دے دیا۔ چنانچہ ریوینڈ کلائن نے ولیم میور اور نولدیکی کے حوالے سے لکھا،

"One very remarkable instance of the supression of a verse, which Mohammed used to read for some time as part of the Quran is that of the verse ' Those idols (of the Meccan idolators) are the noble beings and verily their intercession may be looked for."

(Klein F. A. Rev.; The Religion of Islam , p. 19)

[کسی آیت کی تنسیخ کا ایک نہایت اہم واقعہ، 'وہ دیویاں معزز ہیں اور انکی شفاعت مقبول ہے' والی آیت کی تنسیخ ہے جسے کچھ عرصے تک محمد [ﷺ] قرآن کے جزو کے طور پر تلاوت کرتے رہے ہیں۔]

کلائن نے اس واقعے کو بت پرستی سے عارضی مصالحت کا نام دیا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۶)۔

منٹگمری واٹ اور غرانیق: گزشتہ صدیوں کی تحریروں کے اثرات اس صدی کے معقول اہل قلم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ منٹگمری واٹ نے اس واقعے کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ حضور نے ان دیویوں کی عبادت کی اجازت دی۔ (عیاذاً باللہ)۔ اس نے لکھا،

"In this connection we must pay attention to the story of the satanic verse. The story must be true in essentials since no muslim would have dared to invent it about Mohammed and indeea confirmation of it is in Quran. The story is that ------- perhaps in about 615 or seven years before Hijra he received a revelation that 'These are the high-soaring ones, whose intercession is to be hoped for'. Mohammed at once announced this revelation and the permission for prayers to these dieties lead all the men in Kaba to join Mohammed in his worship. Later however Mohammed realized that these verses could not be correct and the true continuation of the passage was revealed to him."

(Montgomery Watt; What is Islam, p. 42)

[اس سلسلے میں ہمیں شیطانی آیت کی داستان کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اس قصہ کو بنیادی طور پر درست ہونا چاہیے کیونکہ کوئی بھی مسلمان اسے محمد (ﷺ) کے بارے میں گھڑنے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا، اور بلاشبہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔ قصہ یہ ہے کہ غالباً ۶۱۵ء یعنی ہجرت سے سات سال پہلے ان کے پاس وحی آئی کہ یہ بڑی پہنچ والیاں ہیں اور ان سے شفاعت کی امید ہے۔ محمد (ﷺ) نے فوراً اس وحی کو لوگوں تک پہنچا دیا اور ان کی عبادت کی اجازت نے مکہ کے باسیوں کو محمد (ﷺ) کے ساتھ عبادت میں شریک ہونے پر مائل کردیا۔ بعد میں بہرحال محمد (ﷺ) کو یہ احساس ہوا کہ یہ آیات درست نہیں ہوسکتیں اور پھر ان پر آیتیں صحیح تسلسل میں نازل ہوئیں۔"

واٹ نے اس واقعے سے یہ منطقی نتیجہ برآمد کیا کہ کچھ عرصہ تک داعی اسلام (ﷺ) اور انکے ہمراہی ایک خدا کے ساتھ دوسری دیویوں کی عبادت میں کوئی مضائقہ تصور نہ کرتے تھے۔ (حوالہ بالا)

واٹ نے اس واقعے کا ایک بار پھر تذکرہ کر کے اسے مصالحت کی کوشش قرار دیا اور اسی سانس میں اپنے دعوے کی تردید بھی کی۔ دعوی مخالفین کے لیے اور تردید موافقین کے لیے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی اچھی کوشش ہے۔ تحریر کرتے ہیں کہ،

"Mohammed was attempting to come to some compromise with the leading Meccans. His realization to falsehood of the intruded words was ipso facto a realization that compromise was impossible(Ibid, p.78)

[محمد (ﷺ) مکے کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ کسی مصالحت کی کوششیں کر رہے تھے۔ ان کا مدخولہ الفاظ کی غلطی کا احساس دراصل اس بات کا احساس تھا کہ مصالحت ناممکن تھی۔]

گریونے باؤم اور غرانیق: گریونے باؤم نے واقعہ غرانیق کے بارے میں تحریر کیا،

"It is said that first he had recognized as the daughters of Allah, the three great godesses: Al-Lat, who was honoured in Taif, Al-Uzza who was worshipped in Nakhla near Mecca, and Manat whose sanctuary lay in Qudaid between Mecca and Medina. This stand he now revoked and made a sharp distinction between the faithful and those who associated Allah with other gods.(G.E. von Grunebaum, Classical Islam, p. 31)

[کہا جاتا ہے کہ انہوں (محمد ﷺ) نے تین عظیم دیویوں کو اللہ کی بیٹیاں مان لیا تھا۔ یہ لات (جسکی تعظیم طائف میں کی جاتی تھی)، عزیٰ (جسکی عبادت مکے کے قریب واقع ہنکلہ میں کی جاتی تھی) اور منات (جسکا مندر قدید میں تھا جو مکے اور مدینے کے درمیان واقع ہے) تھیں۔ اب وہ اس موقف سے پھر گئے اور انہوں نے مومنین کے اور ان لوگوں کے درمیان، جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے، واضح امتیاز قائم کیا۔]

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں واقعہ غرانیق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے کفر کی جانب مراجعت کی خواہش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حیات طیبہ کے ابتدائی واقعات بیان کرنے کے بعد اس امر پر بحث کی گئی کہ حضور ﷺ کے خیالات جن میں بیرونی اثرات نمایاں ہیں کس طرح ان تک پہنچے۔ پھر متعدد الزامات کے بعد تحریر کیا گیا کہ،

''ابتدائی اعتقادات کی جھلک اس طرح بھی نظر آتی ہے کہ عربوں کی طرح انہیں بھی جن وشیطان پر عقیدہ تھا۔ مکہ اپنے حرم کے ساتھ ان کے نزدیک بھی مقدس تھا۔ جس کے تقدس اور رسوم کو انہوں نے اپنے مذہب میں باقی رکھا۔ پھر ایک مرتبہ کفر کی طرف لوٹ جانے کی خواہش نے زور کیا جس پر جلد ہی قابو پا لیا۔''

(Shorter Encyclopedia of Islam; edited by H. A. R. Gibbs, p.391)

لین پول: اسٹینلے لین پول نے واقعہ غرانیق کو سیرتِ رسول عربی ﷺ کے جمال کو تاباں کرنے میں استعمال کیا۔ اس نے لکھا،

''سارا مجمع اس مصالحت سے خوش ہو کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ سارے شہر نے اس مشترک مذہب کو قبول کر لیا لیکن صحرا کا یہ رُویا دیکھنے والا، ایسا فرد نہ تھا کہ کسی جھوٹی بات پر توقف کرتا۔ مکّے کا سارا شہر بھی اسکی نذر کر دیا جاتا تو وہ اپنی اندرونی صداقت کو جھٹلاتے رہنے پر راضی نہ ہوتا۔ اس نے برسرِ عام اقرار کیا کہ اس سے لغزش ہو گئی تھی۔ اسے شیطان نے ورغلایا تھا۔ اس نے کھلم کھلا اپنے الفاظ واپس لیے اور کہا کہ جہاں تک ان مورتیوں کا تعلق ہے وہ محض نام ہیں جنہیں انکے آباء واجداد نے وضع کر لیا ہے۔''

(Stanley Lanepoole; Introduction to selection from Quran, p.XLIX)

لین پول کے مندرجہ بالا تبصرے سے اگر توصیفی جملے حذف کر دیے جائیں تو گویا وہ بھی یہ باور کرتا ہے کہ سورۃ النجم میں غلطی سے شیطانی کلمات داخل کر دیے گئے تھے جو بعد میں حذف کر دیے گئے۔ اس کے اس بیان میں اور دیگر معاندین کے بیان میں فرق نہیں رہ جاتا۔ مصالحت، اشتراکِ کفر، پچھتاوا، لغزش، ہر شے کو اس نے خوبصورت الفاظ میں سمیٹ لیا۔

مستشرقین کی تحریروں کی رو سے واقعہ غرانیق کے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ عقیدہ توحید اس وقت تک ارتقائی مدارج طے کر رہا تھا۔ اس کے خد و خال ترتیب پا رہے تھے۔ خود (نعوذ باللہ) ذہن نبوی میں یہ عقیدہ خام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ترمیم و تبدیلی کی گنجائش محسوس کرتے تھے۔

۲۔ قریش کے بتوں کو شریک الوہیت اس لیے کرنا چاہتے تھے تاکہ لات و منات و عزّیٰ کے پرستاروں کی حمایت حاصل ہو سکے اور طائف تا مدینہ انکا اثر و اقتدار قائم ہو جائے۔

۳۔ مسلمان قریش کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے۔ قریش کی جانب سے ایک پیشکش ہو چکی تھی کہ اگر قرآن میں ہماری دیویوں کا مناسب ذکر آ جائے تو ہم آپ کو اپنی محفل میں مناسب مقام دیں گے۔ اس طرح عرب بدّو اچھا تاثر لیں گے۔ لہٰذا قریش سے مراعات حاصل کرنے کے لیے یہ الفاظ سورۃ النجم میں شامل کر دیے۔ اور جب قریش سے مطلوبہ مراعات نہ ملیں تو ان کو منسوخ کر دیا۔

۴۔ نعوذ باللہ خدا نے بغیر سوچے سمجھے یہ آیت نازل کر دی۔

۵۔ اس واقعے سے استنباط کیا جاتا ہے کہ زنیا سازی کی رومیں بہتے بہتے تھم گئے۔

یہ تمام مفروضے صرف اس وقت قابل قبول ہو سکتے ہیں جب بنیادی واقعے کی صحت ثابت ہو جائے۔ اگر اس قسم کے واقعے کا امکان ہی نہ ہو تو پھر ان مفروضات پر غور تضیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ محدثین کبار مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، اور علامہ نووی نے اس واقعے کو باطل اور موضوع قرار دیا ہے۔

لیکن اس واقعے کو طبری کے علاوہ ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر نے بھی نقل کیا ہے اور گو روایتیں اصول مسلّمہ کے خلاف ہیں، لیکن صرف سند کی بنیاد پر انہیں شامل کیا گیا ہے۔

طبری کی روایت: جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ مکّے والے ان کے پیغام سے روگردانی کر رہے ہیں تو ان کی خواہش ہوئی کہ اسلام کو ان (مکّے والوں) کے لیے آسان کریں۔ اس موقع پر سورۃ النجم نازل ہوئی۔ اور جب رسول اللہ ﷺ اس آیت پر پہنچے 'کیا تم نے لات اور عزّیٰ اور تیسری منات کو بھی دیکھا ہے' تو شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ جاری کرا دیے۔ ''تلک الغرانیق العلیٰ، وانّ شفاعتھن لترتجیٰ''۔ یعنی یہ عالی مرتبہ ہنس ہیں اور انکی شفاعت مقبول ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر مکّہ والے بہت مسرور ہوئے اور جب رسول اللہ ﷺ نے سجدہ فرمایا تو سب کے سب ان کے ساتھ سجدے میں شریک ہو گئے۔ اس واقعے کی خبر حبشہ کے مسلمانوں تک بھی پہنچی۔ تب جبرئیلؑ حضور ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے اور ان کی غلطی واضح کی اور یہ آیت منسوخ ہو کر اس کی جگہ بائیسویں آیت نازل ہوئی۔

بعض اہلِ قلم نے واقعہ غرانیق کی تائید میں سورۃ الحج کی مندرجہ ذیل آیت بھی پیش کی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

''اور ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول یا کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا کہ جب اس نے کچھ پڑھا ہو تو شیطان نے اس میں شبہ نہ ڈالا ہو۔ پھر اللہ شیطان کے شبہ کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے۔ اور اللہ خوب علم والا اور حکمت والا ہے۔'' چنانچہ بیشتر مورخین نے اس آیت کو واقعہ غرانیق کے استدلال کے طور پر پیش کیا ہے۔

غور طلب پہلو: یہ واقعہ کب ہوا؟ تاریخ کا تعین نہیں۔ تاہم راویوں نے اس واقعے سے مہاجرینِ حبشہ کی واپسی منسوب کی ہے۔ مہاجرینِ حبشہ نے ۶ نبوی مطابق ۶۱۵ء میں ہجرت کی تھی۔ قریش کی سفارت جب حبشہ سے مہاجرین کی واپسی میں ناکام رہی تو قریش نے ۷ نبوی میں بالاتفاق یہ طے کیا کہ حضور کو اعلانیہ (نعوذ باللہ) قتل کر دیا جائے۔ (خصائص الکبریٰ السیوطی بحوالہ بیہقی و ابونعیم۔ ملاحظہ ہو سیرت رسول عربی از نور بخش توکلی، صفحہ ۵۳، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور)۔ ان کی حفاظت کی غرض سے بنو ہاشم شعب ابی طالب میں پناہ گزین ہوئے۔ جس کے بعد قریش نے اس وقت تک کے لیے بنی ہاشم سے ترکِ موالات کا اعلان کیا جب تک وہ تنگ آ کر حضور کو قتل کے لیے قریش کے حوالے نہ کر دیں۔ (صحیح بخاری باب نزول النبی ﷺ)۔ لہٰذا ۹ نبوی تک، یعنی بائیکاٹ کے اختتام تک، یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ حضور نے صحنِ کعبہ میں قرأت بالجہر فرمائی ہو۔ پس یہ وقوعہ از روئے روایت ۱۰ نبوی یا اس کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

سورۃ النجم کب نازل ہوئی؟: ولیم میور اور نولدیکی نے اس کا نزول مکّی دور کے چوتھے حصے کے اواخر میں قیاس کیا۔ (Muir, The Quran, pp. 43-47; Noldeke, Dictionary of Islam, p.45)

[علامہ عنایت اللہ مشرقی نے تکملہ، جلد اول، صفحہ ۶۷ پر نولدیکی کے حوالہ سے سورۃ النجم کی ترتیب نزولی ۲۸ ویں اور وقتِ نزول یکم سنہ نبوی سے چار سنہ نبوی کے درمیان بیان کیا ہے۔ بشکریہ علامہ قمر عینی صاحب]۔ ان کے نزدیک یہ دور ۶ نبوی سے ۱۰ نبوی تک کا ہے۔ علمائے ازہر کے مطابق یہ سورۃ ترتیب نزولی کے اعتبار سے تیئیسویں [۲۳] ہے۔ (القرآن، مکتبۃ الجمہوریۃ العربیۃ، ۱۹۷۲)۔ جبکہ سورۃ مریم چوالیسویں [۴۴] ہے۔
ہم جانتے ہیں کہ دربارِ حبشہ میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے سورۃ مریم کی آیات کی تلاوت فرمائی تھی۔ لہٰذا یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہجرتِ حبشہ تک چوالیس سورتیں نازل ہو چکی تھیں۔ اور تیئیسویں سورۃ النجم ہجرتِ حبشہ سے کئی برس پہلے اتر چکی تھی۔ چھ سال میں چوالیس سورتوں کا اوسط سات سورتیں سالانہ بنتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سورۃ النجم نبوت کے تیسرے یا چوتھے سال اتری ہوگی۔ اب یہ بات قرین قیاس نہیں کہ وہ سورۃ جو تیسرے یا چوتھے سال نازل ہوئی ہو، دسویں سال تک اسکی تلاوت نہ کی گئی ہو، یا اس میں دسویں سال ترمیم کی ضرورت محسوس کی گئی ہو۔ قرآن اس لیے اترتا تھا کہ اسے لوگوں کو سنایا جائے، لہٰذا حضور ﷺ نے اس سورۃ کی تلاوت اس کے نزول کے بعد بلا تاخیر کی ہوگی۔ اس اعتبار سے اس کی تلاوت ۴ نبوی میں ہی قرینِ قیاس ہے۔ یہی وہ دور ہے جب آپ نے اعلانیہ تبلیغ توحید فرمائی۔ اور توحید کے معنیٰ ہی بت پرستی اور شرک سے اجتناب کے ہیں۔ اسلام کی ابتداہی کلمہ توحید سے ہوتی ہے۔ اس کلمہ کا جزوِ اوّل ہی ''لا الٰہ'' ہے۔ جس کا مفہوم اور مقصود ہی بتوں اور ذواتِ خلق غیر اللہ کی نفی ہے۔ اس تنزیہہ کے بعد ذات اللہ کا اقرار ہے۔ لہٰذا تبلیغ کی ابتدا ہی غیر اللہ کی الوہیت کے انکار سے ہوتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ تبلیغ کی ابتدا میں ہی رؤسائے قریش نے ابو طالب سے فرمائش کی کہ حضور ﷺ کو منع کریں کہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں۔ اسی موقع پر ابو طالب نے کمزور پڑ کر حضور ﷺ سے کہا کہ ایسے کام کی مجھے تکلیف نہ دو جس کی مجھ میں طاقت نہیں۔ جس پر حضور ﷺ نے یہ تصور فرمایا کہ اب ان کے چچا بھی ان کی مدد نہیں کر سکیں گے اور آبدیدہ ہو کر فرمایا،

''اے میرے چچا۔ اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں، تب بھی میں اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہاں تک کہ اللہ اس کام کو پورا کر دے یا میں خود اس کوشش میں ہلاک ہو جاؤں۔''

بلاشبہ یہ واقعہ ابتدائے نبوت کا ہے اور اس کے بعد ہی ابو طالب نے داعیِ اسلام ﷺ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس واقعے کے بعد بھی متعدد بار قریش نے تحریص و ترغیب، اور بعدۂ ترہیب کے ذریعے توحید سے باز رکھنے کی کوشش کی، جس میں انہیں قطعاً ناکامی ہوئی۔

حضور ﷺ کے اندازِ فکر میں اس قدر واضح تضاد کا امکان ہی نہیں۔ توحید نکتۂ اوّل ہے۔ پوری تحریک اسلام اسی مرکز پر گردش کرتی ہے۔ ایک عام مسلمان بھی کبھی اس نکتے سے منحرف نہیں ہوتا۔ یہ تصور کرنا کہ عظیم ترین مفکر اس عقیدے سے متزلزل ہو سکتا ہے، مجموعی فکرِ انسانی کی توہین ہے۔ حیاتِ طیبہ اس امر پر شاہد ہے کہ اصولوں پر ہر مصلحت کو قربان کیا گیا ہے۔ کبھی بھی مصلحتاً کسی اصول کو تبدیل نہیں کیا گیا۔

اگر واقعہ غرانیق ہجرتِ حبشہ سے پیشتر نہیں ہوا تو پھر کبھی ظہور پذیر نہیں ہوا۔ ۱۰ نبوی تک طوفان اپنی انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ شرک و توحید میں دس سال رسہ کشی ہو چکی تھی۔ لوگ اس عقیدے پر اس قدر مستحکم ہو چکے تھے کہ وہ اس کے خلاف کہنا تو کجا سوچنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ مغرب کی یہ ہرزہ سرائی کہ خدائے واحد کے ساتھ دیویوں کی عبادت میں مضائقہ نہ سمجھا جاتا تھا، اگر کوئی مان بھی لے تو بلالؓ کی صدائے احد، یاسرؓ کے اجزائے بدن کا انتشار، امِ عمار کی نیزے سے شہادت، خود داعیِ اسلام علیہ السلام اور ان کے قبیلے پر مصائب، یہ سب کیا تھے اور کیوں تھے؟ قریش تو خود بھی اللہ اور دیگر بتوں کو مانتے تھے۔ اگر اسلام میں بھی یہی کچھ تھا تو وجہِ مخالفت کیا تھی؟ لوگوں پر مکے کی زمین کیوں تنگ ہو رہی تھی۔ موحدین اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر حبشہ کیوں جا رہے تھے۔

سورۃ الحج کی آیات: غرانیق کے موید ین سورۃ الحج کا حوالہ دیتے ہیں کہ اس واقعے کی تائید میں قرآنی آیات موجود ہیں۔ پھر کیسے انکار؟ شاید یہی آیت تھی جس کے باعث موید ین کو جراتِ انکار نہ ہو سکی۔ لیکن یہ تو خیال فرمایئے کہ یہ سورۃ بذاتِ خود کب نازل ہوئی؟ کیا اس واقعے کے فوراً بعد؟ جی نہیں! یہ سورۃ مدنی ہے۔ ترتیب نزولی کے اعتبار سے یہ ایک سو ساتویں [۱۰۷] سورۃ ہے۔ مدینہ میں کل اٹھائیس سورتیں نازل ہوئیں۔ اس سورۃ کا نزول طوال سورتوں کے بعد ہوا، جب نصف سے زیادہ مدنی دور گزر چکا تھا۔

اگر واقعہ غرانیق کسی شکل میں ہوا بھی تھا تو اس کو کم از کم بارہ سال گزر چکے تھے۔ اگر یہ آیات تائید میں نازل ہوئی تھیں تو کیا اس واقعہ کی تائید کی ضرورت بارہ سال کے بعد محسوس ہوئی تھی۔ اگر یہ لغزش تھی تو لغزش کے اثرات کو دور کرنے کے لیے اس سورۃ کی متعلقہ آیات اسی دور میں نازل ہونی چاہیے تھیں۔ قرآن کی ایسی تمام آیات جو کسی واقعے کے تعلق سے نازل ہوئیں، ہمیشہ موقع پر ہی نازل ہوئیں۔ ذرا سورۃ الحج کی آیات پر خالی الذہن ہو کر غور فرمایئے۔ اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ شیطان انبیاء کی زبان سے کلماتِ خبیثہ ادا کرواتا ہے۔ اس میں تو ایک کائناتی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ،

”جب رسول اور نبی پیغامِ حق لوگوں تک پہنچاتے ہیں تو شیطان اس کام میں وسوسے اور شبہات پیدا کرتا ہے۔ اپنی جانب سے کچھ آمیزش کرتا ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے پیغام کو ان شیطانی شبہات، وسوسوں اور آمیزشوں سے منزّہ کرتے ہیں کہ وہ علیم و حکیم ہیں۔“

یہ آثارِ مقدسہ تو تاریخِ نبوت اور اصولِ ابلاغِ حق بیان کر رہی ہیں کہ آدمؑ کے بعد ان کی تعلیمات، نوحؑ کے بعد ان کی تعلیمات اور اسی طرح دیگر انبیاء کی تعلیمات کو شیطان نے مسخ کیا۔ اور جب بھی تعلیمِ حق مسخ ہوئی اللہ تعالیٰ نے محکم تر آیات نازل فرمائیں۔ اور اپنی تعلیمات کو شیطانی آمیزش سے پاک کیا۔ یہ تو اس امر کی اطلاع ہے کہ آخری رسول علیہ السلام کی تعلیمات کو بھی شیطان اسی طرح مسخ کرنے کی کوشش کرے گا۔ جسے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے ذریعے سے محفوظ رکھیں گے۔ ان آیات کو واقعہ غرانیق سے متعلق کرنا اگر دیدہ دلیری نہیں ہے تو بھی غلط فہمی ضرور ہے۔

سورۃ النجم: ''قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہونے لگے۔ یہ تمہارے صاحب نہ تو گمراہ ہیں نہ غلط راستے پر۔ نہ ہی آپ کوئی بات اپنے جی سے کہتے ہیں۔ وہ تو وہی کچھ کہتے ہیں جو ان پر وحی آتی ہے۔ ایک شدید القویٰ انہیں تعلیم کرتا ہے جو فطرتاً زور آور ہے۔ وہ نمودار ہوا اور اس طرح کہ افق کی بلندیوں پر چھایا ہوا تھا۔ پھر وہ نزدیک ہوا، اور نزدیک۔ یہاں تک کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔ اپنے بندے پر جو وحی کرنی تھی، اللہ نے کی۔

قلب نے مشاہدے میں کوتاہی نہ کی۔ تو کیا (اے مخاطبین) ان کے مشاہدے کے بارے میں نزاع کرتے ہو۔ انہوں نے اسے ایک دفعہ اور بھی دیکھا۔ سدرۃ المنتہیٰ کے قریب۔ جس کے پاس جنت الماویٰ ہے۔ جبکہ مرتکز ہونے والے (انوار) سدرۃ پر مرتکز ہو رہے تھے۔ نہ تو نگاہ ہٹی اور نہ ہی بڑھی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے۔ پس کیا تم نے (بھی) لات اور عزیٰ اور تیسری منات کے (اسی قسم کے انوار) دیکھے۔ کیا تمہارے لیے (تو) فرزند اور اللہ کے لیے بیٹیاں (ہوں)۔ یہ تو بڑی ہی بے ڈھنگی تقسیم ہے۔ یہ تو نرے نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء نے (ان دیویوں کو) دے رکھے ہیں۔ یہ لوگ محض ظن اور نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں۔ درآنحالیکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی ہدایت آچکی ہے۔ بھلا کہیں انسان کی تمنا پوری ہوسکتی ہے؟ نہیں۔ بلکہ ہر تمنا اللہ کے اختیار میں ہے۔ خواہ آخرت کی ہو یا دنیا کی۔ اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں لیکن ان کی سفارش کام نہیں آسکتی۔''

خط کشیدہ آیات قرآنی کی جگہ اگر ہم مبینہ عبارت داخل کر کے دیکھیں تو مسخ عمد کی بدترین شکل پیدا ہوگی۔ سیاق و سباق سے جدا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نظر آئے گا۔ نہ وہ لفظی و صوتی رعنائی، نہ وہ اعجازِ بیان، نہ ہی کسی قسم کی معنوی مناسبت۔ کہاں احسن الکلام اور کہاں بے ربط ہذیان۔ یہ تصور کرنا کہ خط کشیدہ آیات کی جگہ ''تلک الغرانیق العلیٰ۔ وان شفاعتھن لترتجیٰ'' کے الفاظ تھے، عقل و خرد کا دیوالیہ پن ہوگا۔

ذرا سورۃ کی ابتدا پر غور کیجیے۔ صاحب کے مقاماتِ عالیہ کا تذکرہ کر کے ان کی عظمت کا اظہار کیا گیا۔ عالمِ بالا سے انکے تعلق کا ذکر کیا گیا۔ ان کے مشاہدات کی تصدیق کی گئی۔ اس عظیم تعارف کے بعد کلام ہوا کہ یہ جس بات کی دعوت دیتے ہیں، جس عالم کی خبر دیتے ہیں، جس ہستی کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے ہیں اس سے تو انہیں ذاتی تعلق ہے۔ اس کے عجائبات کا تو وہ ذاتی مشاہدہ کر چکے ہیں۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ کیا تم نے بھی ایسی کوئی بات ان دیویوں میں دیکھی....

تم نے ان سے شفاعت وابستہ کر رکھی ہے۔ صرف اس لیے کہ تمہارے نزدیک یہ مقدس ہیں۔ تم جانتے ہو کہ آسمان کے فرشتے مسلمہ طور پر مقدس ہیں لیکن انہیں بھی شفاعت کا یارا نہیں۔ لات و منات و عزیٰ سے جو تمنائیں تم نے وابستہ کر رکھی ہیں، ان کی کیا حقیقت، کہ ساری تمناؤں کی تکمیل صرف قادرِ مطلق کی رضا پر ہی منحصر ہے۔

کیا یہ سیاق وسباق ان دیویوں کی الوہیت کے اقرار کی کوئی گنجائش چھوڑتا ہے۔ یہاں اگر ذکر صریح نہ بھی ہوتا تو بھی ان کی مذمت کے سوا کسی اور پہلو کی گنجائش نہیں۔ اس سورۃ سے دیویوں کی الوہیت کے اثبات یا لات ومنات وعزیٰ کی خدا سے رشتہ داری وابستہ کرنے والوں کی عقل وخرد کے ماتم کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے۔

وقوعے کا امکان: اگر ہم اس دور کے حالات پر غور کریں اور اس امر پر نظر رکھیں کہ ایسے وقوعے کا کیا امکان ہوسکتا ہے تو چشمِ تصوّر میں واقعات کچھ اس طرح سے ترتیب پائیں گے۔

ترکِ تعلقات کا دور شروع نہیں ہوا۔ علانیہ تبلیغ شروع ہوچکی ہے۔ خانہ کعبہ حرم ہے۔ اس میں ہر شخص کو عبادت کی آزادی ہے۔ لوگوں نے ابھی تک اسلام کو اپنے لیے حقیقی خطرہ تصور کرنا شروع نہیں کیا ہے۔ داعیِ اسلام ﷺ کے بارے میں عام لوگوں کی رائے بٹی ہوئی ہے۔ لوگ انہیں صادق وامین مانتے ہیں لیکن یہ نیا پیغام ان کے لیے قابلِ فہم نہیں ہے۔ معاشرے میں بحیثیت مجموعی نبوّت کا کوئی تصوّر نہیں۔ قرآن کے ذریعے انہیں نبوّت کے تصوّر سے آگاہ کیا جارہا ہے۔ نبی کو کوئی کاہن سمجھ رہا ہے، کوئی شاعر اور کوئی مجنوں۔ کسی کا خیال ہے کہ گمراہ ہوگئے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے کہ غلط راستے پر گامزن ہیں۔ کسی نے سمجھا کہ شائد آسیبی قوت نے تسلط حاصل کرلیا ہے۔ یہ ساری کیفیات ابتدائی دورِ نبوّت سے تعلق رکھتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی گئیں۔

سورۃ النجم ان تمام لغویات کی تردید کرتی نظر آتی ہے، اور ایک نئی حقیقی کیفیت پیش کرتی ہے کہ تمہارے صاحب نہ گمراہ ہیں نہ غلط راستے پر۔ وہ مہبطِ وحی ہیں۔ وحی ایک عظیم فرشتہ پہنچاتا ہے۔ اب تک دوبارہ اس فرشتے کو اس کے ملکوتی جلال میں دیکھ چکے ہیں۔ تم بھی کیسے نادان ہو کہ ان کی باتوں پر جھگڑتے ہو۔ گو کہ وہ ان اسرار کے شاہد ہیں اور تم ناواقف۔

نبوّت کے اس تصوّر سے آگاہ کرنے کے لیے یقیناً یہ سورۃ موقع بہ موقع حرم میں تلاوت کی جاتی تھی۔ قرآن کا اسلوب فصاحت وبلاغت، شوکت وعظمتِ بیان، اور پھر قرأتِ نبوی عربوں کا دل اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ کلام کو سجدہ گاہ سمجھنے والا عرب مسحور ہورہا ہے۔ لیکن یہ کیا؟ اس میں تو بتوں کی نفی کی جارہی ہے۔ کلام کی خوبیوں کے باوجود اگر دیویاں ناراض ہوگئیں تو قسمت پھوٹ جائے گی۔ رزق بند ہوجائے گا۔ شفاعت سے محروم ہوجائیں گے۔ لوگ شور مچاتے ہیں۔ طے پاتا ہے، کہ یا تو سنا ہی نہ جائے یا پھر دورانِ تلاوت اس قدر شور مچایا جائے کہ سنائی نہ پڑے۔ کشش کلام بے چین کرتی ہے۔ معاشرے کی پابندی اذنِ سماعت نہیں دیتی۔ لیکن ایسے بھی ہیں جو چھپ کر غلافِ کعبہ میں گھس جاتے ہیں اور روح کو کلام سے تسکین دیتے ہیں۔

پھر ایک دن حضور ﷺ صحنِ کعبہ میں تشریف لاتے ہیں۔ اپنے معینہ مقام پر کھڑے ہوکر نماز شروع فرماتے ہیں۔ تلاوت بالجہر ہے۔ سورۃ النجم زبان پر جاری ہے۔ لوگوں کا ہجوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ طائف کے رؤساء بھی شریکِ محفل تھے جنکے علاقے میں لات کا استھان تھا۔ دیگر عرب بدّو بھی تھے۔ سورۃ النجم سنی ہوئی تھی۔ لات وعزیٰ اور منات کا بھرم کھلنے والا تھا۔ خانہ کعبہ میں اہلِ طائف کی دیوی کی توہین قریش کی موجودگی میں ہونے والی تھی۔ سیاسی اور تجارتی مفادات زد پر تھے۔ قریش نہ صرف طائف بلکہ تمام عرب کو منہ دکھانے کے

قابل نہ رہ جاتے۔ اہل طائف کی موجودگی میں ان دیویوں کو تختِ الوہیت سے اتارا جانے والا تھا۔ کیا کیا جائے؟ کس طرح روکیں؟ اگر صرف ایک آیت نہ پڑھی جائے یا نہ سنی جا سکے تو کام بن سکتا تھا۔

حضور ﷺ کی نماز کے باعث کفار قریش کا طواف تو بند نہ ہوا تھا۔ ان کے شعار پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ لوگ طواف میں مصروف تھے۔ رہ رہ کر آواز بلند ہوتی تھی،

''اللات والعزیٰ ومنوۃ الثالثۃ الاخریٰ۔ تلک الغرانیق العلیٰ۔ وانّ شفاعتھن لترجیٰ''۔ (یاقوت کی معجم البلدان میں عزیٰ کی تشریح دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ قریش کا شعار تھا کہ طواف کرتے وقت یہ فقرے بلند آواز سے بطور تلبیہ ادا کرتے تھے۔)

کوئی شاطر منصوبہ ساز اٹھا اور غلافِ کعبہ میں جا کر چھپ گیا تا کہ آواز دینے والا نظر نہ آسکے۔ (ابنِ ہشام نے رؤسائے قریش کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ، قرآن کی کشش کے سبب، رات کے سناٹے میں تلاوت قرآن سننے کے لیے غلافِ کعبہ میں چھپ کر حضور کے قریب پہنچتے اور گھنٹوں کلام ربانی سماعت کرتے)۔ یا پھر طواف کعبہ کرنا شروع کر دیا اور جب حضور ﷺ اس آیت پر پہنچے جو لات وعزیٰ ومنات کی تردید کرتی ہے یعنی ''اَفَرَئَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی'' تو منصوبہ ساز نے آواز میں آواز ملائی اور اسی انداز میں ہانک لگائی ''تلک الغرانیق العلیٰ۔ وانّ شفاعتھن لترجیٰ''۔ یہ ہانک کوئی نئی بات نہ تھی۔ نہ تو اس سے عبادت میں خلل پڑا نہ اس جانب توجہ گئی۔ عام سا دستور تھا لیکن اس سے قریش کا منشاء پورا ہو گیا۔ ان کے نزدیک معاملہ بحسن وخوبی سلجھ گیا۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ سب کے سب سجدہ ریز ہو گئے۔ معاملہ اتنا سنگین نہ ہوتا تو اتنی سی بات پر سجدہ ریز نہ ہوتے کہ دیویوں کی الوہیت تسلیم کر لی گئی۔ یہ تو انکے نزدیک پہلے ہی مسلمہ تھی۔

جب حضور ﷺ کو پتہ چلا کہ وہ ہانک بے مقصد اور معمولاتِ قریش میں سے نہ تھی بلکہ ایک منصوبے کی کڑی تھی اور اس سے لوگ اسلام کی بنیادی قدر توحید کو مجروح کر رہے ہیں تو فطرتاً آپ نے اپنی برأت کا اظہار فرمایا۔ اس فعل کو شیطانی، اس کے فاعل کو شیطان اور اس کلمے کو شیطانی کلمہ قرار دیا۔

طبری نے عروہ بن زبیر کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان (۶۵ھ تا ۸۶ھ) کے نام لکھا۔ اس میں انہوں نے تحریر کیا کہ طائف کے رؤساء جو اس موقع پر مکہ میں موجود تھے حضور ﷺ کی تردید سے بے حد برہم ہوئے۔ اس برہمی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تردید میں تاخیر نہیں ہوئی تھی۔ ثانیاً یہ کہ اس وقت تک طائف والوں کو بھی حضور ﷺ کے عقایدِ توحید سے آگاہی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ واقعہ اگر ہوا تو نبوت کے ابتدائی دور میں ہی پیش آیا ہوگا۔ تردید میں تاخیر کے نہ ہونے سے مغرب کے ان تمام الزامات کا خود بخود بطلان ہو جاتا ہے کہ کچھ عرصے داعیِ اسلام ﷺ نے اس شیطانی کلمے کو سورۃ والنجم میں شامل رکھا اور پھر اثراتِ مابعد کو محسوس کر کے اسے منسوخ کر دیا۔ یا یہ کہ خدا کے ساتھ دیویوں کی شرکت میں مضائقہ نہ سمجھا جاتا تھا یا ان دیویوں کی پرستش کی اجازت تھی۔ ابتدائی دور کے اس واقعے کا جو کسی سازشی ذہن کی پیداوار تھا، کسی طور مہاجرینِ حبشہ کی واپسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

واقعے کے محرّکات: اس پس منظر سے واضح ہوتا ہے کہ اس واقعے سے اگر کسی کے اغراض و مقاصد پورے ہو سکتے تھے تو وہ صرف قریش کے۔ خاکم بدہن اگر حضور ﷺ نے دانستہ ایسا کیا ہوتا تو اس کے محرّکات کیا ہو سکتے تھے؟ وہ کون سے اغراض و مقاصد تھے جو اس سے حاصل کیے جا سکتے تھے؟

ا۔ مفاد: مالی مفاد کے لیے کردار نبوی میں کوئی گنجائش نہیں، دولت کی پیشکش قریش کی طرف سے بارہا ہوئی، جسے ہمیشہ رد کیا گیا۔ زندگی سادگی اور فقر و فاقہ میں بسر ہوئی۔ دولت کے انبار آتے رہے اور چشم زدن میں تقسیم کر دیے گئے۔

سیاسی مفاد کے لحاظ سے، قریش کو جو سیاسی استحکام میسر تھا اس میں وہ اپنے ہم مذہب حلیفوں کو بھی جگہ دینے پر تیار نہ تھے۔ مسلمان قلیل اقلیت تھے۔ انہیں اگر سیاسی مقام میسر بھی آ جاتا تو وہ اس میدان میں قریش سے بازی نہ لے جا سکتے تھے۔ قریش کو بے بس کیے بغیر سیاست میں تبدیلی ممکن نہ تھی۔ پھر حضور ﷺ کی جانب سے مذہبی مصالحت کے عوض بادشاہت بھی ٹھکرائی جا چکی تھی۔

تجارت و معیشت کا کوئی مفاد بھی اس مصالحت سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ مکّے کی معیشت تجارت تک محدود تھی۔ اور تجارتی اجارہ داری خود قریش کے ہاتھ میں تھی۔ جس کے آپ خود بھی رکن تھے۔ کسی پر یہ دروازہ بند نہ تھا۔

۲۔ مسلمانوں پر مظالم: مسلمانوں پر مظالم کے سدّ باب کو واقعہ کا محرّک تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن راویوں کے بقول اگر یہ واقعہ ہجرتِ حبشہ کے بعد کا ہے تو یہ جذبہ بھی محرّک باقی نہیں رہ جاتا۔ کیونکہ جب ۱۳ نبوی میں مکّے کے (مرد) مہاجرین کی تعداد نوّے تھی، تو ۵ نبوی کے قریب تو یہ تعداد اس سے کم ہی رہی ہوگی۔ اور ان میں سے تراسی افراد حبشہ ہجرت کر چکے تھے۔ باقی صرف سات افراد رہ گئے تھے، جن میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ بن حارثہ، حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص جیسے اکابرین شامل تھے۔ ان میں سے ہر فرد کفار کی دسترس سے باہر تھا۔ پس مظالم کا سدّ باب بھی اس واقعہ کا سبب نہیں ہو سکتا تھا۔

اور یہ واقعہ اگر قبلِ ہجرتِ حبشہ ظہور پذیر ہوا تب بھی مظالم قریش اس واقعے کے محرّک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اوّل تین سال خفیہ تحریک کا سلسلہ رہا۔ علانیہ دعوت ۴ نبوی میں شروع ہوئی۔ اس کے بعد جب اسلام کسی طور قریش سے نہ تھما تب مظالم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر وہ مسلمان جو کسی طاقتور قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، گو کہ قبیلے کی مرضی کے خلاف مسلمان ہوا تھا لیکن اسے اپنے قبیلے کی حفاظت بدستور حاصل تھی۔ قبیلہ خود جو چاہتا تادیبی کارروائی کرتا، لیکن فرد، غیر قبیلے سے بہر حال مامون تھا۔ نیز جب یہ مظالم بڑھنے لگے تو ان کا تدارک ہجرتِ حبشہ کے ذریعے کیا گیا۔ جس کے سبب اصولوں پر سودے بازی کی نوبت کبھی بھی آ ہی نہیں سکی۔

نفسیاتی اثرات: پس کوئی مصلحت ایسی نظر نہیں آتی جس کے لیے اس قسم کے اقدام کی ضرورت محسوس کی جاتی۔ اب اگر کوئی بات رہ جاتی ہے تو صرف یہ کہ ذہنی انتشار، مایوسی، ناامیدی یا اعصابی دباؤ تھا، اور شدائد کے مقابلے کی سکت نہ رہ گئی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے اس دور کے کارنامے اس مفروضے کی تردید کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر فرد استقامت کا پیکر تھا۔ صرف وہ فرد ایمان ظاہر کرنے کی جرأت کرتا تھا جو معاشرے کی ہر زیادتی کو برداشت کرنے کی ہمت رکھتا تھا۔ عرب کا ماحول ہر قسم کی سختی برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ جسمانی صلاحیت کے ساتھ اگر ذہن بھی سختی برداشت کرنے کو تیار ہو جائے تو پھر کوئی زیادتی اسے جھکا نہیں سکتی۔ کردارِ نبوی عظیم ترین کردار ہے جس میں ایک لمحے کے لیے ایسا کوئی مقام نظر نہیں آتا جہاں پائے استقلال میں جنبش پیدا ہوئی ہو۔ عزم و استقامت، صبر و برداشت کی جو جو مثالیں آپ ﷺ کی زندگی میں پائی جاتی ہیں اسکا عشرِ عشیر بھی کسی اور انسان کی زندگی میں نہیں ملتا۔ مکی دور کے آخری سنین اس سے بھی زیادہ صبر آزما تھے۔ سفر طائف سنگین ترین تھا کہ اس وقت سوائے ذاتِ باری کے کوئی سہارا نہ رہ گیا تھا۔ اگر ذہنی تکان کا اظہار ہو سکتا تھا تو اسی مقام پر ہو سکتا تھا۔ مدنی دور میں بدر، احد، خندق یا حنین ان میں سے ہر واقعہ عام آدمی کے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی ہے۔

حیاتِ طیبہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی وحدانیت تسلیم کرانے اور اسلام کی اشاعت کے لیے وقف تھی۔ کلمہ لا الٰہ دنیا کے ہر دیوی دیوتا اور باطل خدا کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ اور اس حوصلے کے ساتھ بلند کیا گیا تھا کہ عالمی طاغوت کا مقابلہ کیا جائے گا۔ اس عزم کا اظہار بعثت کے فوری بعد ابو طالب کے سامنے کیا گیا۔

"یا عمّ واللّٰہ لو وضعوا الشّمس فی یمینی والقمر فی یساری علیٰ ان اترك ھٰذا الامر حتّٰی یظھرہ اللّٰہ او اھلك فیہ ما اترکتہٗ"

[اے چچا، اللہ کی قسم، خواہ میرے دائیں (ہاتھ پر) سورج اور بائیں (ہاتھ پر) چاند ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے، کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں، میں اسے نہیں چھوڑوں گا، جب تک اللہ اسے غالب نہ کردے یا میں اس (کام) میں ہلاک نہ ہو جاؤں۔]

جب ابتدا اس عزم محکم سے ہوئی اور انتہا اسی عزم کے مطابق ہوئی تو درمیان میں یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ عزم متزلزل ہو گیا۔ وہاں تو منزلِ مقصود ہی کامیابی یا اس کامیابی کے لیے مر مٹنا تھا۔ جو منفرد نعرہِ توحید بلند ہوا تھا وہ مذہبِ اسلام کا اہم ترین عقیدہ تھا۔ مذہبی عقائد کبھی آسانی سے نہیں بدلے جا سکتے۔ ان کی تبدیلی مذہب میں تفرقہ پیدا کر دیتی ہے۔ لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔ شکوک و شبہات یقین کا شیرازہ بکھیر دیتے ہیں۔ سعی رائگاں ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کیفیت دورِ نبوی میں پیدا نہیں ہوئی تو یقیناً اس قسم کی لغویات محض وضع کردہ ہیں۔ حضور ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات سے ایسا شرک وابستہ کرنا بذاتِ خود ایک شیطانی فعل ہے۔

مسخ کردہ حقائق - مدنی دور

مسلمانوں نے جن حالات میں ہجرت کی تھی ان کے پیشِ نظر وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کفار و مشرکین انہیں مدینے میں چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔ مدینے والوں پر ممکنہ دباؤ ڈالیں گے کہ مہاجرین کو اپنے شہر میں بود و باش نہ اختیار کرنے دیں۔ اور اس مقصد کے لیے مدینے پر حملے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ چنانچہ میثاقِ مدینہ کی متعدد دفعات اس خدشے کی پیش بینی کی تائید کرتی ہیں۔

دفعہ ۱۷ کی رو سے شرکائے معاہدہ میں سے کوئی فرد یا جماعت قریشِ مکّہ کو اپنی پناہ میں نہ لے سکتا تھا۔ اور نہ ہی قریش کے کسی حلیف کی حمایت کر سکتا تھا۔

دفعہ ۱۸ کے مطابق مدینے پر حملے کی صورت میں شرکائے معاہدہ میں سے ہر فرد اور جماعت حملہ آور کے خلاف مدافعت کرنے کا پابند تھا۔ (میثاقِ مدینہ کی دفعات کے لیے ملاحظہ ہو ''سیاسی وثیقہ جات'' از ڈاکٹر حمید اللہ خان، صفحہ ۱۹، لاہور، ۱۹۶۰ء)

یہ معاہدہ ہجرت کے پہلے سال ہوا۔ اور اس میثاق کے ذریعے مدینے کے دو بڑے اکثریتی قبائل اوس اور خزرج میں قدیم دشمنی مٹا کر ان میں خیر سگالی پیدا کی گئی۔ مدینے کی تیسری طاقت یہود کی تھی۔ یہ یہود متذکرہ بالا انصار قبیلوں میں سے کسی نہ کسی کے حلیف تھے۔ اور ان کے توسط سے شریکِ معاہدہ کیے گئے۔ اس طرح حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی پر مدینے کا معاشرہ متفق ہو گیا اور وہاں اسلامی معاشرے کی بنیادیں استوار ہونے لگیں۔

قریش نے مدینے پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ ان کے خط اور پیغامات انصار کے پاس پہنچنے لگے۔ جن میں دھمکی آمیز مطالبے تھے کہ مہاجرین کو شہر بدر کیا جائے۔ ورنہ مدینے پر حملہ کر کے اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ قریش کے حملے کے خدشے کے پیشِ نظر مدینے کے آس پاس کے قبائل سے حضور ﷺ نے امن کے معاہدات فرمانے شروع کیے۔ چنانچہ ابتدائی دور کی جس نقل و حرکت کو جنگی مہمات تصور کیا جاتا ہے وہ سب کی سب قیامِ امن کی مساعی تھیں۔ یہ مساعی سات ماہ جاری رہیں۔ اس دور میں جن قبائل کے ساتھ معاہدے ہوئے ان کے متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معاہداتِ صلح تھے۔ چنانچہ بنو ضمرہ اور بنو مدلج سے معاہدہ اس امر کا تھا کہ،

''طرفین میں سے کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرے گا۔ اگر کوئی بیرونی دشمن کسی فریق پر حملہ کرے گا تو دونوں اس کے مدِ مقابل ہوں گے اور دونوں دشمن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔'' (Tubqat-e-Ibn-Saad, quoted by Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.4)

حضور کی ان مساعیِ امن کو مغرب دیدہ و دانستہ قریش کو مشتعل کرنے کا نام دیتا ہے (Ibid, p.4)۔

اسی دوران قریش کے قافلوں سے بھی تعارض ہونے لگا، جسے مستشرقین کی جانب سے لوٹ اور گزر بسر کا ذریعہ کہا گیا۔ اس موضوع پر بحث اسی باب میں ہو چکی ہے۔ جب مدینے اور اس کے نواح میں

صورت امن پیدا ہوگئی تو حضور ﷺ نے مکے کی جانب توجہ مبذول فرمائی تا کہ ان کے عزائم کا پتہ چلایا جا سکے۔ آپ نے آٹھ تا بارہ افراد پر مشتمل ایک مختصر جماعت نواحِ مکہ کی طرف روانہ فرمائی تا کہ قریش کی جنگی تیاریوں کے بارے میں تفصیلات مل سکیں۔ اس جماعت کے دو افراد راہ بھٹک گئے۔ جس کے باعث ان کی نفری اور بھی کم ہوگئی۔ یہ مختصر جماعت وادی نخلہ میں قریش کے ایک چھوٹے سے قافلے سے دو بدو ہوگئی۔ اپنی حفاظت کی خاطر انہیں اس قافلے کو قبضہ میں کرنا پڑا۔ بصورتِ دیگر کسی فرد کے زندہ بچ جانے کا امکان نہ رہ جاتا۔ اس اتفاقی واردات کو یورپ منصوبہ بند حملہ قرار دیتا ہے اور حضور ﷺ نے جو مکتوب گرامی حضرت عبداللہؓ بن جحش کو عنایت فرمایا تھا اس کے معنی مسخ کر کے بیان کرتا ہے۔ ابنِ ہشام نے احکاماتِ نبوی کے جو الفاظ روایت کیے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

"اذا نظرت فی کتابی ھٰذا فامض حتّٰی تنزل نخلة بین مکّة و الطّائف فترصدو بها قریشاً و تعلم لنا من اخبارهم"

[جب تم اس تحریر کو دیکھو تو یہاں تک چلو کہ مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ اترو۔ پھر قریش کی دیکھ بھال کرو اور ان کی خبروں سے ہمیں مطلع کرو۔]

ان واضح احکامات کے بارے میں واٹ نے لکھا:

"The essential part of Mohammed's orders to Abdullah bin Jahash was to go to Nakhla and ambush a caravan of Quraish."

(Watt, Montomery, 'Mohammed at Medina' , p. 6)

[عبداللہؓ بن جحش کو جاری کردہ محمد ﷺ کے احکامات کا بنیادی حصہ یہ تھا کہ وہ نخلہ جائیں اور کسی قافلے پر حملہ کریں۔]

حقیقت کو اس طرح مسخ کیا جا رہا ہے کہ جس بات کا کوئی شائبہ تک نہیں اسے بنیادی حصہ بتایا جا رہا ہے اور جس بات کا صریح حکم موجود ہے اس سے دانستہ اعراض برتا جا رہا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ کامیابی کے باوجود عبداللہؓ بن جحش کو مدینے میں مطعون کیا گیا۔ اگر مقصد چھاپہ مارنا ہوتا تو عبداللہ کا یہ کارنامہ قابل داد ہوتا۔ وہ مطعون تو اسی لیے ہوئے کہ منشائے نبوی کے خلاف عمل پیرا ہوئے تھے کیونکہ ان کو صرف سراغرسانی کے لیے مامور کیا گیا تھا۔

جنگ بدر: واقعہ نخلہ سے قریش مشتعل ہوگئے اور انہوں نے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ قریشی قافلے مسلسل سلطنتِ اسلامیہ کی حدود کی خلاف ورزی کر رہے تھے اور ان سے تعارض کیا جا رہا تھا۔ ابوسفیانؓ کا قافلہ تجارت فلسطین سے آنے کو تھا۔ قریش کو یقیناً یہ اندازہ تھا کہ اس قافلے سے بھی تعارض ہوگا۔ انہوں نے اس قافلے کی حفاظت کے بہانے مدینے کے خلاف فوجی کارروائی کا منصوبہ بنایا۔ وقت اور فاصلے اس منصوبے کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حجاز کے نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ بدر اگر مدینے سے نوے میل [ایک سو پچاس کلومیٹر] کے فاصلے پر ہے تو مکے سے اس کا فاصلہ اس سے تقریباً دوگنا ہے۔ لہٰذا یہ مسافت طے کرنے کے لیے مکہ والوں کو مدینہ والوں سے دوگنی مدت درکار ہوگی۔ ہمیں علم ہے کہ جنگِ بدر

۱۷ رمضان ۲ھ کو ہوئی۔ مجاہدینِ اسلام میدانِ بدر میں ۱۶ رمضان کی شام کو پہنچے تھے۔ مدینے سے ان کی روانگی چار یوم قبل یعنی ۱۲ رمضان کو ہوئی، اور ۱۶ رمضان کی شام کو قریشِ مکہ بھی بدر کے نواح میں پہنچے۔ لہٰذا وہ کم از کم آٹھ نو دن قبل مکہ سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ اس اعتبار سے قریشِ مکہ ۷ یا ۸ رمضان کو، یعنی مجاہدین کی نقل و حرکت سے کم از کم پانچ روز قبل اپنی پوری مسلح قوت کے ساتھ روانہ ہوئے۔

ابو سفیانؓ کے دھمکی آمیز پیغامات اور مکہ سے رازداری کے ساتھ مسلح فوج کی پیش قدمی، جنگی منصوبے کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہ منصوبہ فوری نہ بنا ہوگا۔ فوجی قوت کی فراہمی اور نقل و حرکت کے انتظامات کے لیے درکار وقت کو بھی اس میں شریک کر لیا جائے تو یہ منصوبہ ایسے وقت تیار کیا گیا جب ابو سفیانؓ کا قافلہ ابھی شام سے روانہ بھی نہ ہوا تھا۔ نخلہ کی مہم کو اگر اس منصوبے کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اس منصوبے کی تصدیق کے لیے ہی حضرت عبداللہؓ بن جحش کی سرکردگی میں جماعت روانہ کی گئی ہوگی۔

بہر کیف یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ عامۃ القریش کو اس منصوبے کا پورا علم نہیں تھا۔ انہیں صرف قافلۂ تجارت کی حفاظت کی خاطر دعوتِ شرکتِ جنگ دی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قافلۂ تجارت کے بچ نکلنے کے بعد مکے کے بعض قبائل نے جنگ میں حصہ لینے کے بجائے بدر سے واپسی اختیار کی۔ اب وجہ جنگ صرف عمرو بن حضرمی مقتولِ نخلہ کا خون تھا۔ عتبہ بن ربیعہ اس کا خون بہا ادا کر کے جنگ ٹالنے کو تیار تھا لیکن ابو جہل اور اسکے ہم خیال گروہ نے جنگ ملتوی کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بنایا کیونکہ اس سے اصل منصوبے کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ مکے کی پوری جنگی قوت مجتمع تھی۔ ہیجان بپا تھا۔ بنو کنانہ سے بھی اسی موقع کے لیے کسی نہ کسی طرح یہ یقین دہانی حاصل کر لی گئی تھی کہ وہ مکے پر حملہ نہیں کریں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سازگار حالات میں وہ شخصیت اپنے مٹھی بھر جانثاروں کے ہمراہ وہیں موجود تھی جس کے خلاف گزشتہ پندرہ سال سے ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ کامیابی یقینی نظر آتی تھی۔ ایسے حالات بار بار پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ ابو جہل ابتدا سے ہی حضور ﷺ کی جان کا دشمن تھا۔ وہ اس موقعے پر مسلمانوں کا قلع قمع کر دینا چاہتا تھا۔

قرآن مجید کی سورۃ آلِ عمران کا مطالعہ یہ امر واضح کرتا ہے کہ حضور نہ صرف اس پورے منصوبے سے آگاہ تھے بلکہ مدینے سے روانگی سے قبل انہیں علم تھا کہ نہ صرف ابو سفیان کا قافلہ تجارت آ رہا ہے بلکہ قریشی افواج بھی مکے سے روانہ ہو چکی ہیں۔ مجاہدین کی پیش قدمی بیک وقت ان دونوں کے خلاف تھی۔ ان تمام نا مساعد حالات کے باوجود جنگِ بدر میں اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو فتح عطا کی۔

یہ فتح مستشرقین کو بڑی ناگوار گزرتی ہے۔ لیمن نے فتح بدر کی وجوہات یہ تحریر کی ہیں کہ مکہ والے حقیقتاً جنگجو نہ تھے۔ انہیں جنگی امور میں کوئی تجربہ نہ تھا۔ جنگوں میں انکا دارومدار ''احابیش'' پر تھا، جو حبشی (نیگرو) غلاموں کی فوج تھی، جس میں بدوؤں کی باقاعدہ فوج بھی شریک تھی [Attributed to Lammens, H.)

[by Montgomery Watt.; Mohammed at Mecca, p. 156)

مستشرقین اس مرحلے پر صرف یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ جنگِ بدر میں تین سو تیرہ مسلمانوں کی ایک ہزار [۱،۰۰۰] مشرکینِ قریش پر کامیابی کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں ہے، بلکہ قریش کے حالات اور کیفیت کے مطابق ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔

انہیں شرکائے بدر میں احابیش کا تذکرہ ملا تو یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ یہ حبشی غلاموں کی کرائے کی فوج تھی۔ بھلا اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ دلجمعی سے لڑتی، حالانکہ ''احبش'' ایک وادی کا نام ہے۔ وہاں ایک معاہدہ ہوا جسمیں بنی الحارث (کنانہ)، بنی خزیمہ (مدرکہ) اور بنی المصطلق (خزاعہ) شریک تھے۔ یہ سارے کے سارے عرب تھے۔ مستشرقین کو بعض رؤسائے قریش صلح پسندی پر مائل نظر آئے تو انہیں بزدل قرار دیا۔ جبکہ بزدلی سے بڑھ کر شائد ہی کوئی دوسرا عیب عرب کے نزدیک مکروہ ہو۔ یہ لفظ بزدلی ہی تھا، جس کا طعنہ ابوجہل نے عتبہ کو دیا تھا، جس کے نتیجہ میں جنگِ بدر ٹلنے کے بجائے بھڑک اٹھی۔ قریش بزدل نہ تھے۔ فریقین میں ہر دو جانب قریشی ہی لڑ رہے تھے۔ سارے مہاجر مسلمان قریشی تھے۔ اسلام نے جب عرب سے باہر پیش قدمی کی تو ایران اور سلطنتِ روما سے نبرد آزما ہونے والے سارے ہیرو قریشی ہی تھے۔ بنو امیہ ہوں کہ بنو عباس، سب کے سب قریشی ہی تھے۔ بدر سے قبل، تاریخِ عرب میں ایک واقعہ بھی ایسا نظر نہیں آتا کہ کوئی گروہ قریش پر غالب آیا ہو۔ جنگِ بدر میں قریش کے بعض معمر رؤساء بھی شریک نظر آتے ہیں۔ جس کی بنیاد پر یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ قریش کمزور اور بوڑھے تھے اور مسلمان اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بوڑھے لڑ نہ سکیں گے۔ اسی لیے اپنی عددی کمتری کے باوجود وہ اس فوج سے بھڑ گئے۔ گویا قریشی فوج میں چن چن کر صرف بوڑھے بھیجے گئے تھے تاکہ وہ اپنی مدافعت کیے بغیر ہی قتل ہو جائیں۔ فوج کا یہ تصور بھی نرالا ہی ہے۔

میدانِ بدر میں مسلمانوں اور مشرکین کی آمنے سامنے کی کیفیت بھی عجیب عجیب طرح سے پیش کی جاتی ہے۔ کوئی یہ باور کراتا ہے کہ مسلمانوں کو خلافِ توقع قریش سے سابقہ پڑ گیا۔ کوئی یہ باور کراتا ہے کہ مدینے کی مختلف فوجی نقل و حرکت کا مدعا ہی یہ تھا کہ قریش مشتعل ہو کر چڑھ دوڑیں اور انصار اپنی مدافعت کے لیے مجبوراً مہاجرین کے دوش بدوش صف آرا ہوں، تاکہ اس طرح حضور ﷺ کی سیاسی قوت میں اضافہ ہو سکے۔ اس قسم کے دعوے برخود غلط ہیں۔ اس لیے کہ اوّلاً جب انصار نے حضور ﷺ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی تو اس میں یہ وعدہ بھی شریک تھا کہ انصار حضور ﷺ کی حفاظت کے ذمہ دار ہونگے۔ بدر کے موقع پر تین سو تیرہ [۳۱۳] جانثاروں میں مہاجرین کی تعداد چھیاسی [۸۶] تھی۔ یعنی دو سو ستائیس [۲۲۷] انصار اس لشکر میں شریک تھے۔ جنگ سے پیشتر حضور ﷺ نے ان سے مشورہ فرمایا تو بیک زبان انہوں نے اعلان کیا کہ وہ کلیتاً حضور ﷺ کی منشاء کے تابع ہیں۔ اگر انصار کی وفاداریاں متزلزل ہوتیں تو اس قسم کی غیر مشروط اطاعت کا امکان بھی نہ تھا۔ دورِ نبوی میں مدینے کا معاشرہ محض سیاسی معاشرہ نہ تھا بلکہ بنیادی طور پر ایک مذہبی معاشرہ تھا جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا چکا تھا اور اور رسول اللہ ﷺ کا حکم اس معاشرے میں اللہ کے حکم کے مترادف تھا۔

جس سے سرگردانی دین و دنیا دونوں میں موجبِ گمراہی تھی۔ انہوں نے خون، نسل، قبیلہ، وطن اور قومی عصبیّت کو قربان کر کے اسلامی برادری اختیار کر لی تھی۔ اب کسی کمتر مفاد کے لیے ملّی مفاد کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

انیسویں صدی کی تحریروں کے زیرِ اثر بیسویں صدی کے بعض اہلِ قلم ایسے بھی ہیں جو ایک ہی وقت میں دو متضاد باتیں کر گزرتے ہیں۔ منٹگمری واٹ نے جنگِ بدر کے سلسلے میں اسی قسم کی تضاد بیانی سے کام لیا ہے۔ اس نے اوّلاً کہا،

''مسلمان نکلتے وقت یہ تصوّر بھی نہ کرتے ہونگے کہ جنگ درپیش ہے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو شائد حیلوں بہانوں سے اس جنگ کو ٹال جاتے۔ جب انہیں قریش کی آمد کا علم ہوا تو وہ اس قدر قریب تھے کہ بھاگنے کی گنجائش بھی نہ تھی۔'' (Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.12)۔

ایک طرف وہ یہ تاثر پیدا کر رہا ہے کہ لاعلمی میں مسلمان نرغے میں آ گئے تھے۔ مجبوراً جنگ اختیار کرنا پڑی۔ جرأت کا فقدان تھا۔ مسلمان راہ فرار اختیار کرنا چاہتے تھے لیکن یہ راہیں مسدود ہو چکی تھیں اور دوسرے ہی لمحے وہ کروٹ لیتا ہے اور اپنے ہی بیان کی تردید کرتا ہے کہ،

''محمد ﷺ نے پانی پر قبضہ کر کے دشمن کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق جنگ لڑے۔ قریش پر چھاپہ نہیں مارا گیا۔ انہیں اس موقف میں رکھا گیا کہ وہ جنگ کرنے پر مجبور ہو گئے۔''

(Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.12)

عجیب متضاد منطق ہے کہ وہ فریق جو نرغے میں پھنس گیا تھا، جنگ کو حیلوں بہانوں سے ٹالنا چاہتا تھا، اور اپنے لیے راہِ فرار تلاش کر رہا تھا، وہی فریق اپنے قوی تر دشمن کو جنگ پر مجبور کر رہا تھا۔ یہ تضاد محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ دو مختلف نظریات کو بیک وقت پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک نظریہ تو یہ کہ اسلام کی وسعت تلواروں کی مرہونِ منّت ہے۔ دوسرا نظریہ یہ کہ بدر کی فتح محض اتفاقی تھی۔ جس کے زیرِ اثر اسے مسلم صفوں میں بے چینی کا فرضی نقشہ کھینچنا پڑا۔

جنگِ احد: جنگِ بدر کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا تھا۔ اس پر مستشرقین کے تبصرے اس انداز اور نوعیت کے ملتے ہیں جن کے ذریعے جنگجوئی، خوں ریزی، جارحیّت اور انتقامی کارروائی کے الزامات کو تقویّت مل سکے۔ لیکن چونکہ جنگِ احد مسلمانوں کے حق میں نہ تھی اس لیے اس سے متعلّق تبصروں میں طعن و شماتت کے جذبات جھلکتے ہیں۔

جنگِ احد کے بارے میں عام مغربی اندازِ فکر یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو عبرت ناک شکست ہوئی تھی۔ وہ باور کرتے ہیں کہ ابتدائی روایات میں اس جنگ سے ہونے والی تباہی اور اسکے اثرات کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ کہ اس شکست نے مسلمانوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا تھا کہ جب اللہ نے فتح کا وعدہ کر لیا تھا تو یہ شکست کیوں ہوئی؟ جنگ احد میں ابتدائی کامیابی کا دعویٰ بھی اس شکست کو چھپانے کی محض ایک کوشش ہے۔ ورنہ اس عبرت ناک شکست نے سارا بھرم کھول دیا تھا۔

دیکھنا یہ ہے کہ حملہ آور کون تھے؟ ان کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور یہ اغراض و مقاصد کس حد تک پورے ہوئے؟ شکست و فتح کا اندازہ اسی سے ہو سکے گا کہ قریشِ مکہ اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے اور مدینے کو اس جنگ کے نتیجے میں کیا نقصانات اٹھانے پڑے۔

اغراض و مقاصد: قریشِ مکہ شمعِ رسالت کو بجھانے کی کوشش ہجرت سے قبل بھی کر رہے تھے۔ اسی غرض سے انہوں نے جنگِ بدر برپا کی۔ شکست نے اس مطمحِ نظر میں تبدیلی نہ پیدا کی ہوگی، بلکہ یقیناً جذبۂ انتقام نے مزید اشتعال پیدا کیا ہوگا۔ لہٰذا انکا اولین مقصد مسلمانوں کی قوت کا قلع قمع کرنا ہوگا۔ اور اسی لیے وہ مکہ سے تین ہزار [۳،۰۰۰] کی فوج کے ساتھ، جس میں سات سو [۷۰۰] زرہ پوش اور دو سو [۲۰۰] گھوڑے تھے، مدینے پر حملہ آور ہوئے۔

اگر یہ تصور کیا جائے کہ جنگِ احد میں مسلمانوں کو عبرت ناک شکست ہوئی تو کون سی قوت مانع تھی جس کے سبب قریش اپنے مقصد کو حاصل کیے بغیر واپس لوٹ گئے۔ درست کہ مسلمانوں کا شدید جانی نقصان ہوا لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ قریش ایک بھی جنگی قیدی حاصل نہ کر سکے۔ واپس ہوتے ہوئے قریش نے مقابلے سے گریز کیا لیکن مسلمانوں نے ان کے کم از کم تین افراد کو گرفتار کیا۔ نہ جانے قریش کو کیا جلدی تھی کہ بلا توقف اپنے خیمے تہہ کر کے شام سے پہلے ہی میدانِ جنگ سے کوچ کر گئے۔ جبکہ مسلمان دیر تک وہاں موجود رہے، شہداء کی لاشیں دفن کیں، زخمیوں کی دیکھ بھال کی اور اطمینان سے نہ صرف مدینے لوٹے بلکہ دشمن کے تعاقب میں بھی روانہ ہوئے۔ عجب تماشا ہے کہ خون کا پیاسا دشمن جو شاندار فتح حاصل کر چکا ہے، آگے آگے بھاگا چلا جا رہا ہے اور وہ فریق جس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اسے عبرت ناک شکست ہو چکی ہے دشمن کا تعاقب کر کے اس کے آدمی گرفتار کر رہا ہے۔ رات ہوتی ہے تو مبینہ شکست خوردہ فریق اپنے کیمپ میں جگہ جگہ آگ روشن کرتا ہے تاکہ دشمن کو اس کی موجودگی کا پتہ چل سکے۔ اور سکت ہو تو مقابلے کے لیے لوٹ آئے۔ یا اپنے قیدی ہی چھڑا لے جائے۔ ان واقعات کی روشنی میں تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جنگِ احد کروٹ لے رہی تھی۔ قریش کا پلہ ایک مرحلے پر بھاری ہوا۔ مسلم فوج میں انتشار پیدا ہو گیا، لیکن پھر یہ منتشر فوج ایک بار پھر مجتمع ہونے لگی۔ پیشتر اس کے کہ یہ منتشر قوت مجتمع ہو سکے قریش نے عافیت اسی میں سمجھی کہ میدانِ جنگ چھوڑ کر فتح کے نعرے لگاتے ہوئے روانہ ہو جائیں۔ تاکہ اہلِ عرب کو یہ باور کرا سکیں کہ بدر کا انتقام لے لیا گیا اور بدر کے نتیجے میں ان کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا تھا اسے بحال کر سکیں۔

واقدی نے عمروؓ ابن العاص سے جنگِ احد سے واپسی کی جو روایت کی ہے [عمروؓ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے] وہ بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کی روشنی میں قریش کی نام نہاد فتح چارلس مارٹل کی فتح طورس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ عمروؓ ابن العاص نے کہا،

''جب ہم نے ان کے خلاف دوبارہ حملہ کیا تو ان کی خاصی بڑی تعداد ٹھکانے لگا دی اور وہ چہار جانب منتشر ہو گئے۔ پھر ان کی ایک جماعت نے صف بندی کر لی، تو قریش نے مشورہ کیا اور کہا کہ فتح ہماری ہو گئی ہے لہٰذا ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ابن ابی ایک تہائی فوج کے ساتھ لوٹ گیا تھا۔ اور کچھ اوس وخزرج

ایسے بھی تھے جو اس جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے۔ ہمیں یہ اطمینان نہ تھا کہ یہ لوگ ہم پر حملہ نہ کریں گے۔ پھر ہمارے آدمی بھی خاصے مجروح تھے۔ گھوڑے تیروں کے زخموں سے چور تھے لہذا ہم واپس روانہ ہو گئے۔ ابھی ہم الروحاء بھی نہ پہنچے تھے کہ ان میں سے خاصی تعداد ہمارے تعاقب میں آ پہنچی اور ہمیں سفر جاری رکھنا پڑا۔

(Waqdi; Kitab-ul-Maghazi, chapter 'Uhad', translated by Welhousen, Kolkata, 1856)

گویا قریش خود موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ لہٰذا یہ تصور کرنا کہ مسلمانوں کو ایسی عبرت ناک شکست ہوئی کہ انکا ایمان متزلزل ہو گیا تھا محض خود فریبی ہے۔ ورنہ یہ جنگ نتائج کے اعتبار سے غیر فیصل جنگ تھی۔ مسلمانوں کا استیصال تو کجا، قریش کو خود اپنے استیصال سے محفوظ رہنے کے لالے پڑ گئے تھے۔

مسلمانوں کی ابتدائی کامیابی: مسلم افواج کی ابتدائی کامیابی پر بھی شکوک وشبہات کا اظہار کیا جاتا ہے، اور اسے صرف احد میں شکست کو کم کر کے دکھانے کی کوشش قرار دیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی بعض تفصیلات ایسی ہیں جن کا تجزیہ یہ ثابت کرتا ہے کہ جنگ کے ابتدائی مرحلے میں مسلمانوں کا پلہ یقیناً بھاری تھا۔

قریش کا علم عبدالدار کے گھرانے کے ہاتھ میں تھا۔ اس جنگ میں یکے بعد دیگرے نو علمبردار مارے گئے۔ اور جب علم اٹھانے والا کوئی اور نہ رہا تو اس گھرانے کے ایک غلام نے علم سنبھالے رکھنے کے لیے اپنی جان دیدی۔ عرب طریقۂ جنگ میں علمبردار کا مقام قلبِ لشکر میں ہوتا تھا۔ یہاں تک مخالف فوج کی رسائی اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب گھمسان کا رن پڑے اور اس جنگ مغلوبہ میں فوج اس طرح پریشان ہو جائے کہ اپنے علم کی حفاظت سے بھی قاصر ہو۔ نو علمبرداروں کا مارا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ قریش ایک ایسی جنگ مغلوبہ میں مصروف تھے کہ اپنے علم کی حفاظت بھی نہ کر سکتے تھے۔

قریش کی اصل طاقت ان کا سوار دستہ تھا۔ مسلم فوج کے لیے ایسا مقام منتخب کیا گیا تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے قریش کے سوار دستے کو ایک تنگ راستے سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس راستے پر تیر اندازوں کی ایک مستعد جماعت ان کا راستہ روکنے کے لیے متعین تھی۔ اس جماعت کو یہ حکم تھا کہ کسی بھی صورت میں اپنی جگہ کو نہ چھوڑیں۔ چنانچہ اس جماعت نے سوار دستے کے ابتدائی حملوں کو پسپا کیا۔ جس کے سبب قریش کی سوار فوج عضوِ معطل ہو کر رہ گئی۔ جنگ مغلوبہ میں یہ سوار حصہ نہ لے سکتے تھے۔ سواروں کے حملے کے پیش نظر تیر انداز دستے کو اپنی اہمیت کا پورا احساس رہا ہوگا۔ اس نازک مقام سے ان کا ہٹ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک جنگ کا فیصلہ ہونے ہی والا تھا۔ اور اب اس مقام پر ان کی موجودگی کی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا تھا جب قریشی فوج میں انتشار اور بدنظمی کے آثار پوری طرح نظر آنے لگے ہوں۔ تیر اندازوں کے ہٹنے کے بعد مسلم فوج کی پشت سے قریش کے سوار دستے کے حملے نے عارضی طور پر جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔

رؤسائے قریش اپنے ہمراہ اپنی خواتین کو بھی میدانِ جنگ میں لائے تھے۔ یہ خواتین لڑنے کے لیے نہیں، بلکہ روائتی طور پر، لڑنے والوں کی غیرت وحمیت کو ابھارنے کے لیے آئی تھیں، تاکہ کوئی شخص بزدلی

نہ دکھا سکے۔ ابن ہشام نے حضرت زبیرؓ بن عوّام سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت ابودجانہؓ کو، جو حضور ﷺ کی عطا کردہ تلوار لیے جنگ میں مصروف تھے، دیکھا کہ انہوں نے کسی کے سر پر وار کرنے کے لیے تلوار اٹھائی ہی تھی کہ روک لی۔ بعد میں حضرت ابودجانہؓ نے یہ وضاحت کی جس پر تلوار اٹھائی تھی وہ ہندؓ بنت عتبہ یعنی ابوسفیانؓ کی بیوی تھیں [جو فتحِ مکہ کے موقع پر ایمان لائیں]۔ اور یہ کہ انہوں نے ایک عورت کے خون سے شمشیر نبوی کو آلودہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم حملہ اس قدر شدید اور کاری تھا کہ قریشی فوج اپنی سربرآوردہ خواتین کو بھی بچانے کے قابل نہیں تھی۔ یہ کیفیت صرف اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب فوج کے کس بل نکل چکے ہوں اور وہ سخت ابتری کا شکار ہو۔

اسی طرح جنگ احد کے بارے میں ابنِ اسحٰق نے جو اشعار جمع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوسفیانؓ کو حضرت حنظلہؓ نے نرغے میں لے لیا تھا، قریب تھا کہ فیصلہ کردیتے کہ اس درمیان ابنِ شعوب (شدّاد ابن الاسود) نے مداخلت کی اور ابوسفیانؓ کی جان بچائی۔ ابنِ شعوب نے اپنے ایک شعر میں ابوسفیانؓ پر اپنے اس احسان کو جتایا تو انہوں نے جواب میں جو اشعار کہے ان میں یہ شعر بھی پایا جاتا ہے،

ولو شئتُ نجتنی کُمیتٌ ملمّۃ ولم احمل النّعماء لابنِ شعوب

(میں چاہتا تو میرا برق رفتار گھوڑا مجھے بچالے جاتا۔ اور ابنِ شعوب کا احسان مجھے نہ اٹھانا پڑتا)

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قریش کا سپہ سالار تک مسلم افواج کی دسترس سے باہر نہ تھا۔ واپسی سے پہلے ابوسفیانؓ کو طعن و تشنیع کے دوران یہ علم ہوچکا تھا کہ نہ صرف حضور اکرم ﷺ صحیح و سلامت تھے بلکہ حضرات حمزہؓ و مصعبؓ اور عبداللہؓ بن جحش کے سوا باقی تمام مہاجرینِ عظام بھی محفوظ و موجود تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے آئندہ سال میدانِ بدر میں ایک اور جنگ کی دعوت دے کر بعجلت واپسی اختیار کی۔ یہ عجلت بے سبب نہیں تھی۔ جس طرح ابتدائی جنگ میں قریش منتشر ہوکر پھر سنبھل چکے تھے، اسی طرح انہیں ممکن نظر آرہا تھا کہ مسلمان سنبھل کر جوابی کارروائی شروع کریں گے۔ انہیں اس ممکنہ کارروائی سے پہلے ہی میدانِ جنگ سے مراجعت میں عافیت نظر آئی۔ یہ ذہنی کیفیت صرف اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب ابتداءً مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

پس مقصد کے اعتبار سے مسلمانوں کی مکمل تباہی میں قریش کو سخت ناکامی ہوئی۔ دوسرا ممکنہ مقصد یہ ہوسکتا تھا کہ شاہ راہِ تجارت محفوظ کرلی جائے۔ لیکن اس میں بھی قریش کو کامیابی نہیں ہوسکی۔ یہ شاہراہ صلحِ حدیبیہ سے قبل قریش استعمال نہ کرسکے۔

تیسرا مقصد جنگِ بدر کا بدلہ ہوسکتا تھا، تو بدر قطعی عبرت ناک شکست تھی، جبکہ احد ایک غیر فیصل جنگ تھی۔ اگر قریش کو کچھ کامیابی ہوئی تو صرف یہ کہ انہوں نے مقتولین کی تعداد تقریباً برابر کرلی تھی۔

ا۔ جنگ بدر میں مسلمان شہداء [۱۴]، اور قریش کے مقتولین [۷۰] اور اسیر بھی [۷۰] تھے۔

(سیرت ابن ہشام، باب ۱۰۴، شہدائے بدر اور مقتولین قریش)

۲۔ جنگِ احد میں مسلمان شہداء [۷۰]، اور قریش کے مقتولین [۲۲] اور اسیر [۳] تھے۔
(سیرتِ ابنِ ہشام، باب ۱۱۶، شہدائے احد اور مقتولینِ قریش)

دونوں جنگوں میں مسلمان شہداء کی کل تعداد [۸۴] تھی، جبکہ مقتولینِ قریش کی کل تعداد [۹۲] تھی۔ ان جنگوں میں [۷۳] قریشی اسیر ہوئے جبکہ کسی مسلمان اسیر کا تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ اس اعتبار سے بھی قریشِ مکہ کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی۔ قریش کے مقتول بیشتر ان کے سربرآوردہ لوگ تھے، جبکہ مسلم سربرآوردہ لوگوں میں صرف حضرت حمزہؓ، حضرت مصعبؓ اور حضرت عبداللہؓ بن جحش ہی ہیں۔ چونکہ قریش کو اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوسکی اس لیے یہ جنگ بے نتیجہ تھی۔ [آنے والے سال میں ایک اور جنگ کی دعوت اسی لیے تھی۔] اسے مسلمانوں کی عبرت ناک شکست قرار دینا اور قریش کی عظیم فتح تصوّر کرنا محض طفل تسلّی ہے۔

جنگِ احزاب: بدر کے لیے جنگ کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ اپنے قافلے کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ جب قافلے کا بہانہ نہ رہ گیا تو عمرو بن الحضرمی کے خون کے بدلے کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اور جنگِ احد اس لیے برپا ہوئی کہ بدر کی شکست کا بدلہ لینا تھا۔ جب احد میں قریش نے بدلہ لے لیا تو جنگِ احزاب یا خندق آخر کیوں ہوئی؟

قریش اور یہود نے نہ صرف اپنی پوری طاقت بلکہ اپنے حلیفوں اور غیر متعلق بدوی قبائل کو بھی اس جنگ کے لیے مجتمع کرلیا۔ قریش اور انکے حلیف دس ہزار [۱۰،۰۰۰]، بنوغطفان چار ہزار [۴،۰۰۰]، بنوفزارہ ایک ہزار [۱،۰۰۰]، بنواسد تین ہزار سے زیادہ [۳،۰۰۰+]، بنواشجع، بنومرّہ اور بنوسلیم ڈیڑھ ہزار [۱،۵۰۰] تھے۔ یہود نہ صرف خود شریک تھے بلکہ بنوغطفان کو بھی خیبر کی نصف پیداوار کی اجرت کے وعدے پر گھسیٹ لائے تھے۔ اتنی بڑی تعداد جو بیس تا تیس ہزار [۲۰،۰۰۰-۳۰،۰۰۰] بتلائی جاتی ہے آخر کس مقصد سے جمع ہوئی تھی۔ کیا اس کے سوا کوئی اور مقصد تھا کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کردیا جائے۔ اور تلواروں کے بل پر اسلام کو نیست و نابود کرڈالا جائے۔ اس طاقت کے مقابلے پر صرف تین ہزار [۳،۰۰۰] مسلمان تھے جو مدینہ کی مجموعی قوّت تھی۔ قریش کی یہ پیش قدمی بے کار ثابت ہوئی کیونکہ اس مرتبہ طرزِ دفاع یکسر تبدیل کردیا گیا تھا۔ ہر وہ سمت جدھر سے گھڑسوار حملہ کرسکتے تھے، خندق کھود کر ناقابلِ عبور بنادی گئی تھی۔

[اتنی بڑی خندق کا کھودنا بذاتِ خود ایک معجزہ تھا۔ خندق کی کل لمبائی کم از کم تین [۳] کلومیٹر تھی، چوڑائی اوسطاً دو [۲] میٹر اور گہرائی بھی اوسطاً اتنی ہی تھی۔ اس طرح ایک مسلم سپاہی کے حصے میں کم از کم چار [۴] مکعب میٹر زمین کی کھدائی آئی تھی، جسے چند دنوں میں مکمّل کرنا تھا۔ نامناسب اور ناکافی اوزاروں، پتھریلی زمین اور فاقہ کش فوج کے ساتھ جس میں بوڑھے اور بیمار بھی شامل تھے، اس کام کی بروقت تکمیل بہت بڑی بات تھی۔ اس میں زمین کھودنا اور فی کس تقریباً بارہ ٹن [۱۲] مٹی کو خندق سے باہر نکالنا بھی شامل ہے۔]

کہتے ہیں کہ عرب کے لیے خندق ایک نئی چیز تھی اور اس کا خیال ایک ایرانی غلام [سلمانؓ فارسی] نے دیا تھا۔ لیکن یہ دعویٰ صحت سے قریب یوں نہیں معلوم ہوتا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب سیاسی وثیقہ جات میں دو خطوط بہم پہنچائے ہیں۔ ایک میں ابوسفیانؓ نے حضور ﷺ کو خندق کی تیاری پر طعنہ دیا اور کہا کہ ''آپ تو یہ طریقہ

نہیں جانتے تھے۔'' (ڈاکٹر حمید اللہ خان، سیاسی وثیقہ جات، خط-۲۰، لاہور، ۱۹۶۰)۔ حضور ﷺ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ ''اور یہ جو تم نے لکھا کہ مجھے خندق کا طریقہ معلوم نہ تھا تو یہ طریقہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس وقت القاء فرمایا جب تمہارے ہمراہیوں کا غیظ و غضب اس قدر بڑھ گیا کہ تم لوگ مدینے کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تل گئے۔'' (ڈاکٹر حمید اللہ خان، سیاسی وثیقہ جات، خط-۷، لاہور، ۱۹۶۰)۔

خندق نے قریش اور غطفان کے چھ سو گھڑ سواروں کی حربی اہمیت ختم کر دی۔ قریش اپنے پیدل آگے بڑھانے سے ہچکچاتے رہے۔ اس محاصرے نے طول پکڑا۔ دو ہفتے گزرے تو خوراک اور چارے کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ میدانی جنگ نے معاشی جنگ کی کیفیت اختیار کر لی۔ اب صرف ایک امید باقی رہ گئی تھی چاروں طرف سے بیک وقت ہلہ بول دیا جائے۔ مدینے کے جنوب میں یہودی قبیلہ بنو قریظہ باقی تھا۔ اسے آمادہ کیا گیا کہ وہ جنوب کی سمت سے حملہ کر دے۔ ان کی جانب توجہ مبذول ہونے سے خندق پار کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس ریشہ دوانی کی اطلاع مسلمانوں کو بھی مل گئی۔ بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ سردارانِ اوس نے حقیقتِ حال کی دریافت کے لیے بنو قریظہ سے رابطہ قائم کیا تو وہاں آنکھیں بدلی پائیں۔

بنو قریظہ مسلمانوں کے معاہد تھے۔ یہودِ خیبر اور قریش نے انہیں غداری اور بدعہدی پر آمادہ کر لیا تھا۔ نعیمؓ بن مسعود بنو غطفان کے قبیلے بنو اشجع کے ایک فرد تھے۔ ان کے اسلام سے ابھی ان کی قوم بھی واقف نہ ہوئی تھی۔ ان کے تعلقات بنو قریظہ سے بھی تھے۔ انہوں نے بنو قریظہ کو قریش سے غیر متعلق کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ نعیمؓ بن مسعود نے بنو قریظہ کو سمجھایا کہ ان کی حالت اور قریش کی حالت میں فرق ہے۔ قریش کے بال بچے مدینے سے دور مکے میں محفوظ ہیں۔ جبکہ بنو قریظہ قطعاً مدینے کے رحم و کرم پر ہیں۔ اگر قریش اور انکے حلفاء جیت جائیں گے تو مدینے میں لوٹ مار ہوگی جس سے خود بنو قریظہ بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ اور اگر قریش ہار گئے تو خود تو چلے جائیں گے اور تمہیں چھوڑ جائیں گے۔ اور اس طرح تم قطعاً بے دست و پا ہو کر رہ جاؤ گے۔ لہٰذا قریش اور بنو غطفان کا ساتھ دینا کسی طرح سے بھی تمہارے مفاد میں نہیں ہے۔

نعیمؓ بن مسعود کی یہ باتیں کسی بھی طرح حقیقت سے بعید نہ تھیں۔ بنو قریظہ نے جب معاملے پر غور کیا تو انہیں اپنی نازک پوزیشن کا احساس ہوا۔ کئی ہفتے گزر چکے تھے لیکن جنگ کا تعطل قائم تھا۔ محاصرہ مزید قائم رہنے کے امکانات کم تھے۔ آثار پیدا ہو چکے تھے کہ یہ لاحاصل محاصرہ ختم ہونے والا ہے۔ بنو غطفان قریش سے ٹوٹ جانے کے لیے تیار تھے۔ بشرطیکہ انہیں مدینے کی نصف یا تہائی پیداوار کی پیشکش ہو۔ احزاب میں پھوٹ پڑ رہی تھی جسکا نتیجہ اگر آپس میں مناقشت نہ بھی ہو تو رجعت ضرور ہوگا۔ بنو قریظہ غداری کے مرتکب ہو چکے تھے، اور اب اپنی حفاظت کی ضمانت قریش سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ نعیمؓ نے مشورہ دیا کہ ضمانت میں قریش کے اشراف طلب کیے جائیں۔ پھر انہوں نے قریش اور غطفان کو بنو قریظہ کی پشیمانی سے آگاہ کیا اور کہا کہ وہ تمہارے اشراف بطور ضمانت طلب کرنے والے ہیں تاکہ انہیں مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔

بے عملی اور تعطل کے عالم میں شکوک وشبہات تیزی سے پروان چڑھنے لگے۔قریش نے بنوقریظہ کو اعلانیہ شرکتِ جنگ کی دعوت دی۔ بنوقریظہ نے حفاظت کی ضمانت قریش سے طلب کی۔اس مطالبے نے ایک دوسرے کا ربط ختم کر دیا۔ بنوقریظہ نے اندرونی محاذ نہ کھولا تو قریش اور انکے حلیفوں نے ڈیرا اٹھایا اور اپنے اپنے گھروں کولوٹ گئے۔

معاند مستشرقین نے جنگِ احزاب پر متعدد انداز سے تبصرے کیے ہیں۔

ان کا مشترک اندازِ نظر یہ ہے کہ نعیمؓ بن مسعود کی وہ کوششیں جو انہوں نے بنوقریظہ کو مدینے پر حملہ آور ہونے سے باز رکھنے کے لیے کیں، گویا ایک جرم تھا۔ یہ عمل صرف اسی شخص کے نزدیک جرم ہوسکتا ہے جو ذہنی اعتبار سے کفارِ قریش کا حلیف ہو۔قریش نے کس کس جتن سے مدینے کی تباہی کے انتظامات کیے۔ بیرونی حملہ آوروں کو خندق نے روک دیا تو آخری امّید یہ رہ گئی کہ مدینے میں موجود یہودی قبیلہ معاہد ہونے کے باوجود پانچواں کالم ثابت ہوگا اور بوقتِ ضرورت مدینے کے اندر ایک نیا محاذ کھولے گا۔اس محاذ کی جانب رجوع کرنے کے باعث خندق پر مدافعت کمزور ہوگی۔جس کے بعد بیرونی افواج، خصوصاً چھ سو [۶۰۰] سواروں کا دستہ پیش قدمی کر کے تین ہزار [۳،۰۰۰] افراد پر مشتمل دفاعی قوت کو پاش پاش کر دے گا۔اگر ایسا ہوجاتا تو یہ واقعہ تاریخِ اسلام کا آخری باب ہوتا۔نعیمؓ بن مسعود نے اللہ کی رضا سے اس پورے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔بنوقریظہ متحرک نہ ہوسکے۔ احزاب بے بسی کے عالم میں لوٹ گئے اور اسلام پر سے ہر دباؤ ختم ہوگیا۔اس کے بعد اسلام نے عالمگیری شروع کی۔

یہ سب کچھ نعیمؓ کی کارروائی کا نتیجہ تھا۔اور پھر اتنے بڑے بڑے نتائج صرف چند الفاظ کے خرچ پر حاصل کیے جائیں۔نعیمؓ بن مسعود کا یہ کارنامہ صرف تعصّب کی نظر میں ہی جرم ہوسکتا ہے۔ورنہ فریقِ ثانی [اور غیر جانبدار ماہرینِ تزویر] اسے جس قدر سراہے کم ہے۔نعیمؓ بن مسعود بدّو تھے۔تازہ تازہ دولتِ ایمان سے سرفراز ہوئے تھے۔ ان کے ایمان کی خبر خود انکی قوم کو نہ تھی۔انہوں نے بنوقریظہ کے سامنے آنے والے واقعات کا جو نقشہ کھینچا وہ بعدہٗ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ یہ بنوقریظہ کی ناکامی تھی کہ وہ قریش سے اپنی حفاظت کی ضمانت نہ حاصل کر سکے۔

ضمانت میں افراد کو یرغمال بنانا اس عہد کا دستور تھا۔ چنانچہ اسی واقعۂ احزاب میں ہم دیکھتے ہیں کہ بنوقریظہ کو بدعہدی پر آمادہ کرنے کے لیے مدینے کے جلاوطن یہودی قبیلے بنونضیر کا سردار حیی بن اخطب خود پہنچا تھا۔ اور جب تک اس نے یہ یقین دہانی نہیں کرائی کہ وہ بنوقریظہ کے ہی قلعے میں مقیم رہے گا اور ان کے اچھے برے میں شریک رہے گا اس وقت تک بنوقریظہ مسلمانوں سے غداری پر تیار نہیں ہوئے۔ قلعے میں بنوقریظہ کے ساتھ قیام کی شرط گویا کہ یرغمال کی ہی ایک شکل تھی۔پس بنوقریظہ کا قریش سے یہ مطالبہ کہ وہ اپنے سربرآوردہ سرداروں کو حفاظت کی ضمانت کے طور پر یرغمال میں دیں کوئی نئی بات نہ تھی۔شکوک وشبہات کی فضا میں اس مطالبے کو قریش نے سازش تصور کیا۔یہی باور کرانا نعیمؓ کی کامیابی تھی۔

یرغمال بنانے کی ایک اور مثال ہمیں واقعہ نخلہ میں ملتی ہے کہ اسیران نخلہ کو اس وقت تک مدینے میں بطورِ یرغمال روکے رکھا گیا جب تک حضرت سعدؓ ابن وقاص اور حضرت عتبہؓ بن غزوان صحیح سلامت مدینے واپس نہیں پہنچ گئے۔

صلح حدیبیہ: ذیقعدہ ۶ھ (مارچ ۶۲۸ء) میں حضور ﷺ نے ادائیگیِ عمرہ کا قصد فرمایا اور لوگوں کو اس عمرہ میں شرکت کی دعوتِ عام دی۔ بہت سے اہلِ بادیہ نے تاخیر کی۔ تاہم چودہ سو [۱۴۰۰] سے سولہ سو [۱۶۰۰] تک زائرین نے اس سفر میں شرکت کی۔ یہ سارے زائرین عمرے کے لباس میں ملبوس تھے اور قربانی کے جانوران کے ساتھ تھے۔ جب قریش کو پتہ چلا تو انہیں بڑا شاق گزرا۔ دقت یہ تھی کہ اوّل تو زیارتِ بیت اللہ سے کسی کو روکا نہ جا سکتا تھا۔ ثانیاً یہ ماہِ حرام تھا، جس میں جنگ و جدال کی ممانعت تھی۔ اس کے باوجود اگر وہ مسلمانوں کو زیارت کر لینے دیتے تو اس کے معنیٰ یہ لیے جاتے کہ قریش میں اب اتنی سکت بھی نہ رہ گئی تھی کہ وہ اپنے دیرینہ دشمن کو روک سکیں۔ قریش پر قومی عصبیت و حمیت غالب آ گئی اور انہوں نے طے کیا کہ مسلمانوں کو حدودِ حرم میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ چنانچہ قریشِ مکہ جنگ کے ارادے سے نکل آئے۔ مسلمانوں نے حدیبیہ کے مقام پر خیمے نصب کیے، دونوں جانب سے وفود آنے جانے لگے، اور بالآخر ایسی شرائط پر صلح ہوئی جو بظاہر مسلمانوں کے حق میں نہ تھیں۔ صلح کے بعد حدیبیہ میں ہی قربانی کے جانور ذبح کیے گئے اور مدینے واپسی عمل میں آئی۔

مغرب اس واقعے کو مختلف طریقوں سے مسخ کرتا ہے۔ اوّل تو عمرے کو ہی ایک سیاسی بہانہ قرار دیتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ حج اور عمرے کا ذکر قرآنی تعلیمات میں اس واقعے سے قبل نہیں ملتا۔ اس نکتے پر بحث گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے کہ خانہ کعبہ کو ابتدا سے ہی بیت اللہ کی حیثیت حاصل تھی اور قربانی کی رسم بھی برقرار تھی، جس کا تعلق صرف حج اور عمرے سے ہے۔ حالات کے پیشِ نظر ۶ھ تک حج یا عمرہ ادا نہ کیا جا سکا تھا۔ بعض لوگوں کو عمرہ مذہبی مصالحت نظر آتی ہے اور وہ اس عمرے کا مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ عربوں پر یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اسلام کوئی بیرونی مذہب نہ تھا بلکہ اصلاً عرب مذہب تھا جس کا مرکز مکہ میں ہی تھا۔ اور اس قسم کا مظاہرہ گویا مکہ والوں کو یہ باور کرانے کے لیے تھا کہ اسلام مکے کی عظمت کا دشمن نہ تھا۔

اس قسم کا دعویٰ تو صرف اس وقت قابلِ غور ہوتا جب اسلام کو کسی مرحلے پر کسی نے بیرونی مذہب تصور کیا ہوتا۔ اسلام میں داخل ہونے والے سب کے سب عرب تھے اور کسی نے اسلام قبول کرنے سے قبل یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ یہ مذہب ملکی ہے کہ بیرونی۔ اسلام ایک صداقت کا نام ہے۔ نہ یہ عربی ہے نہ عجمی۔ یہ ایک عالمی مذہب ہے۔ صداقت جب تسلیم کی جاتی ہے تو اسے اس لیے نہیں قبول کیا جاتا کہ اس کا تعلق کسی خطے یا نسل سے ہے، بلکہ صرف اس لیے قبول کی جاتی ہے کہ یہ صداقت ہے۔ اسلام کو دینِ ابراہیمی کہا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ بیرونِ عرب رہتے تھے۔ اس اعتبار سے کسی نے بھی یہ اعتراض نہ کیا کہ یہ بیرونی مذہب ہے لہٰذا قابلِ قبول نہیں۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ آیا قریش کی دشمنی اس لیے تھی کہ اسلام کے باعث مکہ کی عظمت کو خطرہ تھا۔ دشمنی کی سب سے بڑی وجہ مذہبی عصبیت تھی۔ اسی عصبیت کے تحت مکے میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے گئے اور لوگوں کا جینا دوبھر کیا گیا۔ قریش مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہوئے اور انہوں نے مدینے پر پے در پے حملے کیے۔

صلح حدیبیہ تک قریش مسلمانوں کے مٹانے کے درپے تھے۔ ان کو کسی بھی مرحلے پر یہ خدشہ نہ تھا کہ مسلمان مکّے کی عظمت کے لیے خطرہ ہیں۔ لہٰذا عمرے کے مقصد کو سوائے عبادت کے کچھ اور بیان کرنا محض حقیقت کو مسخ کرنا ہے۔

ایک طنز یہ بھی کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کے عمرہ کرنے کا خواب اگر صحیح تھا تو اس خواب کی تعبیر غلط نکلی۔ اس بات کا یہ پہلو ہے کہ انبیاء کے خواب الہامی ہوتے ہیں اور اس خواب کے پورا نہ ہونے کا مطلب نبوّت پر حرف آنا ہے۔ جہاں تک خواب کا تعلق ہے دنیا کے کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ کسی کے خواب کی تکذیب کرے۔ خواب کا تعلق صرف اس کے دیکھنے والے سے ہوتا ہے اور اس مشاہدے کا کوئی دوسرا شاہد نہیں ہوسکتا۔ جس طرح خواب کی تصدیق کے لیے شہادت نہیں پیش کی جاسکتی اسی طرح اس کی تکذیب کے لیے بھی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ دنیا کا ہر خواب صرف اس کے دیکھنے والے کے بیان پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس پر شبہ کا اظہار کرنا کہ خواب واقعی دیکھا بھی گیا یا نہیں، خلل دماغی کے سوا کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔

اب رہ گئی یہ بات کہ اس کی تعبیر غلط نکلی، صرف اس وقت مانی جاسکتی ہے جب اس خواب میں عمرے کے لیے کسی مدّت کا تعین ہوتا۔ انبیاء کے کتنے ہی خواب ہیں جو عرصہ دراز کے بعد پورے ہوئے۔ صرف اس لیے کہ ان کی مدّت متعیّن نہ تھی۔ حضرت یوسفؑ کا معجزہ ہی یہ تھا کہ وہ خواب کی صحیح تعبیر بیان فرماتے تھے۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ چاند، سورج اور گیارہ ستارے انہیں سجدہ کررہے ہیں۔ یہ خواب پورا تو ہوا لیکن کب؟ کیا اسی دن، اسی مہینے یا اسی سال۔ نہیں بلکہ کم از کم پچیس سال کے بعد۔ حضرت دانیالؑ نبی نے جو خواب دیکھے وہ کب پورے ہوئے؟ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ ان کے خوابوں کو تعبیر ملنے میں صدیاں لگ گئیں۔ یوحنا کے مکاشفات کا کیا عالم ہے۔ ہزاروں سال گزر گئے اور وہ اب تک پورے نہیں ہوپاتے۔ تو پھر ختمی مرسلت ﷺ کا خواب اگر اسی وقت پورا نہ ہوا تو کون سی نئی بات ہوگئی۔ حرف گیری اور انگشت نمائی تو اسی وقت ہوسکتی تھی جب یہ خواب پورا ہی نہ ہوتا۔ قرآن نے اس خواب کا ذکر رویتِ صادقہ برحق کے طور پر کیا اور یہ ضمانت بھی دی کہ ضرور بالضرور پرامن طور پر عمرے کی ادائیگی ہوگی۔ نہ صرف اس کی تعبیر صحیح ہوگی بلکہ ادیانِ عالم پر اسلام کو سبقت حاصل ہوگی۔ قرآن کی پیشینگوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

ایک طرف یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ عمرہ محض بہانہ تھا اور اصل مقصد محض مکّہ پر چڑھائی تھا۔ دوسری ہی سانس میں یہ کہا جاتا ہے کہ بدوی قبائل کو اس مہم میں لوٹ کی کوئی امید نہ تھی۔ نیز یہ کہ وہ مسلمانوں کی فتح تو کجا بقا کی بھی امید نہ رکھتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے شرکت سے گریز کیا۔ یہ دونوں مفروضے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر جنگ کی نیت ہوتی تو فتح اور شکست کا سوال پیدا ہوتا۔ اور اس سے بدوی قبائل کو لوٹ کی توقع پیدا ہوسکتی تھی۔ بدوی قبائل کی عدم شرکت اگر صرف اس وجہ سے تھی کہ لوٹ کی توقع نہ تھی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قبائل اچھی طرح سے جانتے تھے کہ یہ سفر جنگ کے لیے نہیں بلکہ محض عمرے کے لیے ہے۔

کچھ لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسلمانوں نے یہ معاہدہ قریش سے دب کر کیا تھا کیونکہ صلح حدیبیہ کی شرائط مسلمانوں کے حق میں نہ تھیں۔ یہ اندازِ نظر سطحی ہے۔ اگر حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ پر بیعتِ رضوان

ہوسکتی ہے، جو کہ محض ایک فرد کا معاملہ تھا، تو دینی اور ملّی مفادات کی حفاظت کے لیے تلوار کا نہ اٹھانا بعید از قیاس ہے۔
صلح کی تمام شرائط صرف امن کی خاطر قبول کی گئی تھیں۔ مکّے سے بھاگ کر مدینہ آنے والوں کی واپسی کی شرط قریش کے احساسات کی پاسداری کے لیے تھی۔ [جبکہ اسلام کے ماننے والوں کا مکّہ میں موجود رہنا، خود اسلام کے حق میں تھا، کیونکہ ان سے بات چیت کر کے، اور انکی استقامت سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوسکتے تھے]۔ قبائل کو اپنے حلیف اختیار کرنے کی اجازت مشترک تھی۔ دس سالوں تک جنگ نہ کرنے کی شرط دونوں فریقوں پر عائد ہوتی تھی۔ اور ایک دوسرے کے خلاف تلخی کا اظہار نہ کرنے کی پابندی بھی دونوں فریقوں پر تھی۔

نبی اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد قریش پر سے تجارتی پابندیاں ختم کر دیں۔ حالانکہ یہ شرط صلح نامہ میں موجود نہ تھی۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ قریش کے ساتھ فراخ دلانہ سلوک کیا جا رہا تھا۔ اور نہ صرف ان کی شرطیں قبول کی گئیں بلکہ انہیں وہ بھی عطا ہوا جس کا مطالبہ نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا یہ معاہدہ دباؤ کے تحت نہیں کیا گیا بلکہ اس میں بھی بالادستی کی شان پنہاں تھی۔ مدینے سے کسی مسلمان کے فرار ہو کر مکّے میں پناہ لینے کا کوئی امکان ہی نہ تھا لہٰذا یہ شرط محض زینتِ قرطاس تھی۔ قریش اپنے آدمیوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتے تھے، پس انکی درخواست قبول کر لی گئی۔

صلح حدیبیہ کے بعد جب مسلمانوں نے مکّے سے آ کر مدینے میں پناہ حاصل کرنا چاہی تو انہیں معاہدہ کے مطابق قریش کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن جب ایک خاتون امِ کلثومؓ بنت عقبہ نے ہجرت کی اور ان کے دو بھائی ان کے تعاقب میں مدینہ پہنچے تو خاتون کو واپس کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ معاندین کو یہ انکار معاہدے کی خلاف ورزی نظر آتی ہے۔ حالانکہ یہ غلط فہمی ہے اور محض عربی زبان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ متنِ معاہدہ میں صرف مردوں کا ہی تذکرہ ہے۔ عربی متنِ شرط حسبِ ذیل ہے:

”علیٰ انّه من اتیٰ محمّدٍ من قریش بغیر اذن ولیّهٗ ردّهٗ علیهم“

[اور یہ کہ جو کوئی [مرد] محمد ﷺ کے پاس اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آئے گا، اس [مرد] کو انہیں لوٹا دیا جائے گا۔]

اس شرط کی تمام ضمیریں مذکّر کے لیے استعمال ہوئی ہیں اور عورتوں پر ان ضمیروں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ عورتیں اس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر انہیں بھی شامل تصوّر کیا جاتا تو ان کے لیے صراحت ہوتی یا جدا گانہ ضمیریں استعمال کی جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ امِ کلثومؓ کی واپسی کے لیے قریش نے اصرار نہیں کیا۔

مردوں کی واپسی کی شرط بھی قریش کو مہنگی پڑی۔ کیونکہ قریش کے مسلمان مفرورین نے جب یہ دیکھا کہ مدینے میں انہیں پناہ نہیں ملتی تو مکّے سے فرار ہو کر انہوں نے مقامِ عیص کو اپنی پناہ گاہ بنالیا۔ جہاں سے انہوں نے قریش پر حملے کر کے انہیں عاجز کیا۔ قریش کی اپنی درخواست پر یہ شرط منسوخ ہوئی اور عیص سے یہ گروہ مدینے پہنچا۔ معاندین کو اس گروہ کی کارروائیوں میں مدینے کی شہہ نظر آتی ہے حالانکہ یہ گروہ مکّیوں کا تھا۔ قریش کے سلوک سے تنگ آ کر یہ لوگ ایک ایک کر کے فرار ہوئے تھے۔ مدینے کے دروازے ان پر بند تھے۔

انہوں نے فطری طور پر اپنی کارروائیوں کا نشانہ قریش کو بنایا۔ ان کی پشت پناہی کا کوئی بھی ثبوت نہیں پایا جاتا۔ محض قیاس کی بنیاد پر ایسا الزام مہمل ہے۔

شاہانِ عالم کے نام خطوط: صلح حدیبیہ کے بعد حضور ﷺ نے شاہانِ عالم کے نام تبلیغی خطوط اپنے سفیروں کے ہاتھ روانہ کیے۔ ان میں نجاشی (حبشہ)، مقوقس (مصر)، ہرقل (بازنطین) اور کسریٰ (ایران) سرِ فہرست تھے۔ خطوط کے متن، سفیروں کے نام اور ان کی سرگزشتیں محفوظ ہیں۔ یہ سب کے سب مغربی مستشرقین کے نزدیک محض ایک کہانی ہے۔ ان کے لیے یہ امر نا قابلِ یقین ہے کہ مدینے جیسی چھوٹی سی ریاست کا حکمراں، صلح حدیبیہ کی معمولی کامیابی حاصل ہونے پر ہرقل ا ر کسریٰ جیسے شہنشاہوں کو دعوتِ اطاعت دے۔ اور یہ کہ کسریٰ، قیصر اور نجاشی جیسے حکمرانوں کے بارے میں یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اس قسم کے پیغامات کو کوئی اہمیت دی ہوگی یا ان کے جوابات دیے ہونگے۔ خطوط کی تاریخی حیثیت مسخ کرنے کے لیے یہ بھی بیان کیا گیا کہ وہ خط جو کسریٰ کو لکھا گیا اس تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ۶۲۸ء میں کسریٰ کا انتقال ہو چکا تھا۔ نتیجتاً کسریٰ کے دربار کے واقعات اور باذان کے فرستادوں کی دربارِ نبوی میں آمد وغیرہ کے سارے واقعات محض افسانے بن کر رہ جاتے ہیں۔

دوسرے گروہ کے نزدیک خطوط کی روانگی مسلّم ہے لیکن وہ متن کے بارے میں شکوک پیدا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ خطوط تبلیغی نہ تھے، بلکہ حقیقی نکتہ نظر سیاسی رہا ہوگا۔ ان خطوط کے ذریعے مدینے کی اسلامی ریاست کو سرسری طور پر متعارف کرایا گیا ہوگا یا پھر ان کے ذریعے اس پروپیگنڈے کی تردید کرنا مقصود ہوگا جو قریش نے ان ممالک میں کیا ہوگا یا ان حکومتوں کو قریش کی مدد سے باز رکھنا مقصد رہا ہوگا۔

یوں ہوا ہوگا یا یوں نہ ہوا ہوگا۔ یہ سب مفروضات ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں۔ ہم شاہانِ عالم کو اس قدر بے خبر تصور نہیں کر سکتے کہ ۶۲۸ء تک انہیں یہ بھی خبر نہ ملی ہو کہ ان سے ملحقہ ملک عرب میں گزشتہ اٹھارہ انیس سال سے کیا عظیم انقلاب برپا ہو رہا ہے۔ اس انقلاب کی حقیقی نوعیت کیا تھی اور اس کی کامیابی خود ان کے ملک کو کس انداز سے متاثر کر سکتی تھی۔

قیصر ہرقل جب ایران کے ہاتھوں شکست پر شکست کھا رہا تھا تو ۶۱۴ء میں بیت المقدس مع مقدس صلیب کے اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد سورۃ روم اتری جس میں بشارت دی گئی کہ روم اگرچہ مغلوب ہو گیا لیکن چند برسوں میں پھر غلبہ حاصل کر لے گا۔ یہ بشارت کوئی راز نہ تھی اور اس بشارت میں سب سے بڑھ کر خود ہرقل کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ نو دس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ہرقل تک یہ بشارت نہ پہنچی ہو۔ اور پھر جب ۶۲۲ء سے اس نے ایران کو پے در پے شکستیں دینا شروع کیں اور ۶۲۸ء میں اس نے آخرکار کسریٰ کو دست گرد سے بھی نکال باہر کیا تو اسے اس بشارت کی صداقت کا کس قدر شدت سے احساس ہوا ہوگا۔ اور اگر اسے اس ذات کی طرف سے ایک خط ملے جس کے توسط سے یہ بشارت ملی تھی تو اس کا ردِعمل سوائے عزت و تکریم کے اظہار کے اور کیا ہو سکتا تھا۔

اسی طرح کسریٰ کو بھی قرآن کی ان آیات کی اطلاع مل سکتی تھی جن میں اس کے مخالف کی کامیابی کی بشارت دی گئی تھی۔ جب تک اسے شکست نہ ہوئی ہوگی، اس وقت تک وہ اسے افواہ سمجھتا رہا ہوگا لیکن شکستوں کے بعد جب تلخ حقیقت سامنے آئی تو کڑوے گھونٹ پینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا ہوگا۔ ایسے میں اگر اسے کوئی خط ملے تو اس نے تلخی کے اظہار کے سوا اور کیا کیا ہوگا۔

رہی یہ بات کہ خطوط لکھے گئے کہ نہیں، تو یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ تحریر ہوئے تھے۔ اسی خط کے جواب کے ساتھ مقوقس، والیِ مصر، نے متعدد تحائف اور دو معزز قبطی خواتین بھی بھیجیں جن میں سے ایک امّ المومنین حضرت ماریہؓ قبطیہ تھیں۔ جب ایک خط کی تاریخی حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا تو دیگر خطوط کی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا ہونا چاہیے۔

اب رہی یہ بات کہ ان خطوط کا مضمون کیا رہا ہوگا تو واضح رہے کہ حضور ﷺ کا مشن اسلام کی تبلیغ تھا۔ قرآن کے الفاظ میں مقصد بعثت اور مدعائے نزولِ قرآن یہ تھا،

لِیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا وَّ یَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ٥

(تاکہ متنبہ کرو ہر اس شخص کو جو زندہ ہو، اور ثابت ہو بات منکروں پر) (سورۃ یٰسٓ)

لہٰذا اگر شاہانِ عالم کو تبلیغی خطوط نہ تحریر ہوتے تو تبلیغ کا حق ادا نہ ہوتا۔ جب مشن ہی تبلیغِ حق تھا تو ان خطوط کی نوعیت تبلیغی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخر بادشاہوں کو دعوتِ حق دینے میں کیا امر مانع ہو سکتا تھا۔ جلالِ شاہی، اجنبیت، فاصلے، معاشرتی تفاوت، انتقامی کارروائی کا خدشہ، یہی تو وہ کیفیات ہو سکتی ہیں جو پیغامِ حق پہنچانے میں رکاوٹ بن سکتی تھیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی سربراہ اس قسم کے ہر احساسِ کمتری سے بلند تر ہوتے ہیں۔ رعبِ شاہی انہیں اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں رکھ سکتا۔ حضرت ابراہیمؑ و نمرود، حضرت موسیٰؑ اور فرعون، حضرت دانیالؑ اور بخت نصر، سمسون اور شاہ فلسطی، حضرت یحییٰؑ اور ہیرود، حضرت عیسیٰؑ اور پیلاطس، ان میں سے ہر ایک کے درمیان سارے کے سارے تفاوت موجود تھے، لیکن شاہوں کا جلال نبوت کی عظمت کو نہ گہنا سکا۔ ان کی فوجی طاقت اعلائے کلمۃ الحق کو روکنے سے قاصر رہی۔ ان کی انتقامی کارروائیوں کے خوف سے تبلیغ متاثر نہ ہوئی۔ جلالِ خداوندی کے آگے جلالِ شاہی گرد ہوتا ہے۔ معاشرتی تفاوت بے معنی سی شے ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حضوری اور معیت جو مقام عطا کرتی ہے اس کے آگے دنیا اور اس کا ہر معاشرتی نظام ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔

پچھلے ابواب میں ہم نے دیکھا کہ عہدِ وسطیٰ کا پوپ خود کو شہنشاہ سے اعلیٰ و برتر تصور کرتا تھا۔ پاپا کا کوڑا شہنشاہوں کی پیٹھ پر صدیوں چٹختا رہا۔ وہاں معاشرتی تفاوت، شاہی جلال اور اس کی انتقامی کارروائیوں کا خدشہ رکاوٹ کیوں نہ بنا؟ شاید اس کا جواب یہ ہو کہ پوپ کے لیے یہ شہنشاہ اجنبی نہیں تھے۔ اگر ایک شہنشاہ مخالف بھی ہو جاتا تو معاشرہ پوپ کی حفاظت کرنے کے لیے تیار تھا۔ معاشرے کی جانب سے مکمل تحفظ نبی اکرم ﷺ کو بھی حاصل تھا۔ لہٰذا بات صرف اجنبیت کی رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ ایسی کوئی شے نہیں جو تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ سلطان محمد فاتح ہر اعتبار سے انٹیس سلویئس کے لیے اجنبی تھے۔ ان دونوں میں متذکرہ بالا تفاوت پوری شدت

سے پایا جاتا تھا۔ سلطان فاتح تھا اور یورپ کی ہر طاقت اسکے آگے سرنگوں ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود پوپ انیئیس سلویئس نے انہیں عیسائیت قبول کرنے کے لیے جو خط لکھا وہ گزشتہ باب میں نظروں سے گزر چکا ہے۔ لہٰذا اجنبیت اور معاشرتی تفاوت ایسی کوئی شے نہیں جس کے باعث یہ باور کیا جاسکے کہ شاہانِ عالم کو خطوط نہیں لکھے جاسکتے تھے۔

کسریٰ کے نام خط: کسریٰ کو لکھے گئے خط کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ کسریٰ کو نہیں مل سکا تھا۔ کیونکہ جس وقت یہ خط روانہ کیا گیا اس وقت تک کسریٰ کو قتل کیا جا چکا تھا۔ کسریٰ کا قتل ۶۲۸ء کے موسمِ خزاں میں (cf. Encyclopedia Britanica; article 'Heraclius', Vol. 4, p.520)۔ تاہم خزاں کے کس مہینے میں ہوا اس کا تعیّن نہیں ہے۔ حسب ذیل قرائن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ماہ اکتوبر کے اواخر یا نومبر کے اوائل میں ہوا ہوگا۔

۱۔ یروشلم پر قبضے کے بعد کسریٰ نے اصلی صلیب جس پر حضرت عیسیٰ کا [مفروضہ] مصلوب ہونا بیان کیا جاتا ہے، مدائن منتقل کردی۔ جس کے باعث عیسائی دنیا میں کہرام برپا ہوگیا۔ اسی کی بازیابی کے لیے ۶۲۲ء سے شدید جنگیں شروع ہوئیں۔

(cf. Encyclopedia Britanica; article 'True Cross', Vol. 22, p. 273)

۲۔ پے در پے شکستوں کے باعث جنوری ۶۲۸ء میں کسریٰ اپنا شاہی محل دست گرد اور پایہ تخت مدائن چھوڑ کر اصفہان منتقل ہوگیا۔ اس کے بعد عوام اور فوج میں بددلی پھیلنے لگی۔ اور بالآخر اسے اپنے بیٹے کے حق میں تاج و تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے چار دن کے بعد اسے قید خانے میں قتل کر دیا گیا۔

(cf. Encyclopedia Britanica; article 'Khosrau II Pervez', Vol 13, p.334)

۳۔ کسریٰ کے جانشین قباد (دوم) یا شیرویہ کی مدتِ حکومت صرف چھ ماہ ہے۔ اس نے اس درمیان روم سے صلح کی اور وہ صلیب جو کسریٰ پرویز لے آیا تھا معاہدے کی رو سے واپس کی جسے ایک بڑی تقریب میں ہرقل نے ۶۲۹ء میں وصول کر کے بیت المقدس میں نصب کیا۔

(مقبول بیگ، تاریخِ ایران، صفحہ-۲۲۷، لاہور، ۱۹۶۷)

مارچ ۶۲۹ء میں ہرقل نے اپنے آپ کو فاتح پایا لیکن ایرانیوں سے بازنطینی علاقے خالی کرانے کی بات چیت کہیں جون ۶۲۹ء میں مکمل ہوسکی (Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.114)۔ اور ستمبر میں ہرقل کی فتح کا جلوس قسطنطنیہ میں داخل ہوا۔

چونکہ یہ صلح قباد دوم نے کی تھی، اور اس کا عہدِ حکومت چھ ماہ تھا، اگر یہ سمجھا جائے کہ بازنطینی علاقے خالی کرانے کی بات چیت اس کے عہد میں ہوئی تھی تو وہ جون ۶۲۹ء میں زندہ تھا۔ اس اعتبار سے اس کی تخت نشینی اور کسریٰ کی موت دسمبر ۶۲۸ء میں ہوئی ہوگی اور اگر یہ تصور کیا جائے کہ اس نے صرف ہرقل کو فاتح تسلیم کیا تو بھی وہ مارچ ۶۲۹ء کے بعد مرا۔ اور اس اعتبار سے اس کی تخت نشینی اور کسریٰ کی موت اکتوبر، نومبر ۶۲۸ء یا اس کے بعد ہوئی ہوگی۔

صلح حدیبیہ مارچ ۶۲۸ء کا واقعہ ہے۔ اور کسریٰ کو خط صلح حدیبیہ کے بعد تحریر کیا گیا تھا۔ پس صلح حدیبیہ کے بعد کسریٰ سات سے نو ماہ تک زندہ رہا۔ اگر اس کی موت کا زمانہ خزاں کا موسم تسلیم کر لیا جائے تو بھی اکتوبر ۶۲۸ء تک اس کا زندہ رہنا ثابت ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے نامہ مبارک کا اس تک نہ پہنچنا تعجب انگیز ہے۔ نامہ مبارک کا چاک کرنا اس کی پریشان حالی، شکست خوردگی اور جھنجھلاہٹ کا نتیجہ تھا۔ اگر یہ نامۂ مبارک کسریٰ تک نہ پہنچا ہوتا تو خط کی توہین کی کہانی کم از کم کوئی مسلمان تو نہ گھڑ سکتا تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ کسریٰ نے اپنے یمنی گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ ارسال کنندہ کو گرفتار کر کے روانہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس مقصد کے لیے ایک چھوٹا دستہ مدینہ بھیجا جس نے اپنی آمد کی غرض بھی خدمتِ نبوی میں بیان کی۔ یہ واقعہ اگر حقیقی نہ ہوتا تو کسی اعتبار سے اس قابل نہ تھا کہ اسے نبی کریم ﷺ سے منسوب کیا جاتا۔

فتح مکہ: صلح حدیبیہ کی ایک شرط کے مطابق بدوی قبائل کو یہ آزادی تھی کہ مسلمانوں یا قریش میں سے جسے چاہیں اپنا حلیف مقرر کر لیں۔ چنانچہ بنوبکر نے قریش کے اور بنوخزاعہ نے مسلمانوں کے حلیف ہونے کا اعلان کیا۔ یہ صلح دس سال کے لیے ہوئی تھی اور اس میں دشمنی کے ہر اظہار سے گریز کا طرفین نے عہد کیا تھا۔ معاندین نے اس صلح کو ختم کرنے کا الزام مسلمانوں پر لگایا ہے، حالانکہ یہ صلح خود مکے والوں نے ختم کی تھی۔ اس قسم کا الزام تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی دانستہ کوشش ہے۔

بنوخزاعہ پر، جو مسلمانوں کے حلیف تھے، بنوبکر نے شب خون مارا اور حدودِ حرم میں انکا قتلِ عام کیا۔ بنوبکر کا یہ شب خون نہ صرف قریش کے علم میں تھا بلکہ ان کی شہہ پر ہی مارا گیا تھا۔ اس میں بنومخزوم کے سر برآوردہ افراد نے بھیس بدل کر حصہ لیا۔ اس حملے کے لیے نوفل بن معاویہ (عدی) نے خفیہ طور پر ہتھیار فراہم کیے اور یہ ہتھیار قریش کے تھے۔ اس سازش میں قریش کے رؤساء میں سے سہل، عکرمہ بن ابوجہل اور صفوان بن امیہ بھی شریک تھے۔ قتل و خونریزی کے بعد قریش نے دکھاوے کے لیے بیچ بچاؤ بھی کیا، جنگ بند کرائی اور بنوبکر کو شہر سے نکالا۔

خزاعہ نے مدینہ پہنچ کر شب خون کی اطلاع حضور ﷺ کو دی۔ معاہدۂ صلح کی خلاف ورزی کر کے قریش نے اس کا احترام ختم کر دیا تھا۔ اب صورت یہ رہ گئی تھی کہ،

۱۔ مقتولین کا خوں بہا ادا کیا جاتا، بشرطیکہ قریش کا غرور اسکی اجازت دیتا اور یہ بنوخزاعہ کے لیے بھی قابلِ قبول ہوتا۔

۲۔ قریش بنوبکر کے حلف سے دست برداری کا اعلان کرتے تا کہ مسلمان ان کو ان کے کیے کی سزا دیتے۔

۳۔ قریش ہتھیار ڈال دیتے یا جنگ کرتے۔

پہلی دو صورتیں قریش کے لیے قابلِ قبول نہیں تھیں۔ تیسری صورت یعنی جنگ کی قریش میں سکت نہ رہ گئی تھی۔ اسی لیے ابوسفیانؓ بلا تاخیر مکے سے مدینے پہنچے تا کہ کسی نہ کسی صورت اس صلح نامہ کی تجدید کر سکیں۔

ابوسفیان کی تجدیدِ صلح کے لیے مدینے آمد اس امر کا ثبوت ہے کہ قریش نے جارحیت کی تھی اور ان کے ہاتھوں معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی تھی، اور وہ اس کے نتائج کو ٹالنا چاہتے تھے۔ ان حقائق کی روشنی میں معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام مسلمانوں پر لگانا محض ناانصافی ہے۔

وفدِ طائف: فتحِ مکہ، جنگِ حنین اور محاصرہ طائف کے بعد عرب کے گوشے گوشے سے خدمتِ نبوی میں وفود حاضر ہونے لگے۔ یہ سارے وفود ان عرب قبائل کے تھے جو مکمل طور پر دائرۂ اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے۔ گو ان سب کا مقصد اطاعت قبول کرنا تھا، لیکن اپنی جاہلی حمیت کے باعث اطاعت قبول کرنے سے پیشتر کچھ نہ کچھ مراعات کے طلب گار تھے۔ چنانچہ وفد طائف نے جو مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی ان میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ کچھ عرصے کے لیے ان کے بتوں کو باقی رہنے دیا جائے، اور ارکانِ عبادت میں انہیں رخصت دی جائے۔ اس وفد کی حاضری اور اسکے مکالموں کو معاندین نے ایک بدترین ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ جسے ہم اسپرنگر کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

''طائف کے بنوثقیف نے اسلام لانے کے لیے چند شرائط پیش کیں۔ اوّل یہ کہ ان کا بت 'لات' تین سال تک باقی رہنے دیا جائے۔ اور اس مدت میں انہیں نماز کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔

محمد [ﷺ] نے جواب دیا کہ یہ مدت بہت طویل ہے۔ مزید برآں نماز کے بغیر دین ہی کیا ہے۔ اس پر نمائندوں نے اپنے مطالبات میں نرمی پیدا کی۔ اور آخرکار کافی ردّوقدح کے بعد معاہد فریقین میں یہ شرائط طے ہوئیں کہ بنوثقیف عشر ادا نہیں کریں گے، جہاد میں حصہ لینے سے مبرا ہوں گے اور نماز میں سجدہ نہیں کریں گے۔ ان کا بت 'لات' ایک سال تک باقی رہنے دیا جائے گا۔ اور اس مدت کے بعد انہیں مجبور نہ کیا جائے گا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اسے تباہ کریں۔

لیکن ...... کو اب بھی تذبذب تھا۔ وہ رائے عامہ سے خوفزدہ تھے۔ اس پر وفد کے نمائندوں نے کہا کہ اس خیال کو آپ اپنے فیصلے میں رکاوٹ نہ بننے دیجیے۔ اگر عرب آپ سے پوچھیں گے کہ آپ نے اس قسم کا معاہدہ کیسے کیا تو آپ کو تو صرف یہ کہنا ہے کہ ایسا اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا گیا ہے۔ یہ استدلال اس نبی کو قابلِ قبول نظر آیا۔ اور انہوں نے حسبِ ذیل رسمی معاہدہ املا کرانا شروع کیا۔

'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ رسول اللہ [ﷺ] اور بنوثقیف کے درمیان یہ معاہدہ طے پایا ہے کہ موخر الذکر عشر و زکوٰۃ ادا کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ نہ ہی وہ جہاد میں حصہ لیں گے۔ اور نہ.......'

لیکن جب وہ یہ الفاظ ادا کر رہے تھے تو شرم وندامت نے سلسلۂ کلام منقطع کر دیا۔ ثقیف کے ایک نمائندے نے فوراً لقمہ دیا کہ 'اور نہ ہی وہ نماز میں سجدہ ادا کریں گے۔'

لیکن جب .... پھر بھی خاموش رہے تو نمائندے نے کاتب سے کہا کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں لکھو۔ کیونکہ یہ بات طے ہو چکی ہے۔ کاتب نے نبی کی طرف دیکھ کر ان کا حکم جاننا چاہا۔ لیکن اس درمیان عمرؓ، جو اب تک خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے، غیض وغضب میں اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی تلوار بے نیام کر کے چلّائے 'تو نے

رسول اللہ [ﷺ] کے دل کو ملدرز کر دیا۔ اللہ تم لوگوں کو واصل جہنم کرے۔' ثقیف کے نمائندے جز بز ہو کر بولے 'ہمارا خطاب تم سے نہیں، ہم تو محمد [ﷺ] سے مخاطب ہیں۔'

'نہیں'، .... نے آخر کار کہا 'میں اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں کروں گا۔ تمہیں یا تو بلا کسی شرط و رخصت اسلام قبول کرنا ہوگا یا پھر جنگ کے لیے تیار رہو جاؤ'۔ بنوثقیف نے درخواست کی کہ 'اچھا ہمیں صرف چھ مہینے کی مہلت دیجیے کہ لات کو باقی رکھیں'۔

'نہیں!'، 'صرف ایک ماہ' اور اس کے بعد 'ایک گھنٹے کے لیے بھی نہیں'۔ یہ وفد اپنے قبیلے میں اس عالم میں پہنچا کہ اس کے ساتھ مسلمان سپاہی تھے جنھوں نے خواتین کی آہ و بکا کی فضا میں لات کو تباہ کر ڈالا۔''

(Springer; Life of Mohammat, p.186: Dozy R.; Spanish Islam, pp.18-19)

اسپرنگر نے یہ ڈرامہ اسٹیج کر کے عہد وسطیٰ کی تمام خرافات کو جمع کر دیا۔ ایک ایسی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ گویا ایک نبی گفتگو نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک سوداگر قسم کا آدمی سودے بازی کر رہا ہے، جس کے نزدیک دین کی کوئی اہمیت نہیں۔ ذاتی اقتدار کے لیے دین تک میں ردّ و بدل کرنے کے لیے تیار ہے۔ وحی محض ایک بہانہ ہے، جسے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ زبان کا کوئی پاس نہیں۔ استقامت کا کوئی وجود نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ ساری کارروائی مجمعِ عام میں ہو رہی ہے۔ گویا عام لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام اور رسالت کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے باوجود وہ سب منسلک ہیں۔ گویا اس پورے مجمع میں ایک بھی مخلص نہیں۔ مذہب کی آڑ میں نفس پرستوں کا ایک گروہ ہے جو بے بسوں کو مجبور کر رہا ہے کہ ان کی اطاعت کریں۔ حضرت عمرؓ کا جو کردار پیش کیا گیا ہے اس سے تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس گروہ کو خائف کیے ہوئے ہیں اور اپنی ہیبت کے ذریعے حکمتِ عملی کی راہ متعین کرتے ہیں۔ رسالت اس گروہ کی قیادت نہیں کرتی بلکہ گروہ کے زبردست افراد رسالت کی رہنمائی کرتے ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ یوں جبراً اسلام قبول کرنے والے بنوثقیف موقع ملنے پر اسلام سے منحرف کیوں نہیں ہوئے۔ وصالِ نبوی کے بعد جب عرب قبائل عام طور پر منحرف ہوئے تو ثقیف اسلام پر کیوں استقامت کے ساتھ قائم رہے؟ اگر ان واقعات میں ذرا سی بھی صداقت ہوتی تو ثقیف کو انحراف کرنے والوں کی صفِ اوّل میں ہونا چاہیے تھا۔ اس ڈرامے کی بھی وہی اصلیت ہے جو واقعہ غرانیق کی ہے۔ جس طرح غرانیق کی آڑ میں یہ کہا گیا کہ کفر کی حالت کی طرف لوٹ جانے کی خواہش تھی، اسی طرح یہاں الفاظ استعمال کیے بغیر وہی دعویٰ دہرایا جا رہا ہے۔ غرانیق کے حق میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ ناکامیوں، مظالم اور بے بسی کے باعث وقت کے تقاضوں سے صلح کرنے کی خواہش تھی، لیکن فتح مکہ کے بعد جب اقتدار قدم بوسی کر رہا تھا، اس قسم کی مصلحت کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

کردارِ نبوی

اخلاقی الزامات

دنیا کی کسی اور عظیم شخصیت کو اس قدر متہم نہیں کیا گیا جتنا مغرب نے سرکارِ دوعالم ﷺ کو کیا۔ اس کی وجوہات ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس کی تہہ میں صرف نفرت، دشمنی اور انتقام کارفرما ہے۔ منفی جذبات ہمیشہ انصاف کا خون کرتے ہیں۔ مغرب کو حضور ﷺ کے بارے میں حقائق کا علم ہو چکا ہے لیکن تعصب اور دشمنی ابھی تک ذہن سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اس کے باعث اس صدی میں بھی ایسی تحریروں کی کمی نہیں جن میں اخلاقی الزامات دہرائے گئے ہیں۔

اخلاقی الزامات کی فہرست طویل ہے۔ ہر صاحب قلم نے اس میدان میں ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے ایسے الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں جن کی صحت کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے۔ مثلاً ڈوزی نے نسل پرستی کی تہمت لگائی اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ حضور ﷺ یمنی قبائل سے متنفر تھے۔ (R. Dozy; Spanish Islam, pp.16-17)۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں تحریر کیا کہ کسی نے یہ شعر پڑھا کہ "میرے آباء واجداد نہ مضر کی اولاد ہیں نہ ربیعہ کی"، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "تیری بدبختی کہ تیرا نسب تجھے اللہ اور اسکے رسول سے محروم کرتا ہے"۔ نہ جانے اس جملے میں نسل پرستی یا یمنی قبائل کی دشمنی کا پہلو کہاں سے ملا۔ شعر کے مفہوم اور ارشادِ نبوی کی مناسبت سے مترشح ہوتا ہے کہ مخاطب نے یہ شعر اسلام سے گریز کی خاطر پڑھا۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں یا میرے آباء واجداد مضر یا ربیعہ کی اولاد تو ہیں نہیں کہ میں کسی قریشی نبی پر ایمان لے آؤں۔ ہاں اگر یہ دعویٰ نبوت کوئی ایسا شخص کرتا جو میرے قبائل کا ہوتا تو میں اسے قبول کر لیتا۔ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے نسل پرستی کو بدبختی فرمایا۔ کیا ستم ہے کہ تاریخِ انسانی میں جس شخص نے سب سے پہلے نسل پرستی اور نسلی غرور کی بیخ کنی کی، اسی پر نسل پرستی اور قبائلی منافرت کی آبیاری کی تہمت دھری جا رہی ہے۔

اسی طرح اس نے یہ بھی افترا پردازی کی کہ حضور ﷺ نے طبقاتی منافرت کا اظہار فرمایا، اور وہ کسانوں سے نفرت کرتے تھے۔ اور یہ کہ ہجرت کے بعد اس نفرت کو ترک کرنا پڑا۔

(R. Dozy; Spanish Islam, p. 17)

اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ طبقہ اشرافیہ کے طرفدار تھے۔ (حوالۂ بالا، صفحہ ۲۵)۔ ڈوزی کی یہ پریشان خیالی حقائق سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ کیونکہ عرب معاشرہ طبقات میں نہیں بلکہ قبائلی سسٹم میں

منقسم تھا۔ اشرافیہ یا کسان نام کے کسی طبقے کا کوئی وجود نہ تھا۔ معاشرے کی تقسیم پیشے کے اعتبار سے نہیں تھی۔ شرافت کا تعلق پیشے سے نہ تھا بلکہ ذاتی کردار سے تھا۔ عدل و انصاف، شجاعت و جواں مردی، ایثار و مروّت، مہمان نوازی، ایفائے عہد اور قبائلی عصبیّت وہ جوہر تھے جو شرافت کی تعمیر کرتے تھے۔ یہ ساری قدریں انفرادی ہیں، جن کا تعلق کسی طبقے سے نہیں ہوتا۔ [مغربی معاشرے میں یہ خصوصیات صرف شرفاء یعنی جاگیرداروں میں ہی متوقع ہوتی تھیں۔] معاندین کے یہ الزامات محض اس معاشرہ سے لاعلمی کی پیداوار ہیں۔

اس قسم کے انفرادی الزامات سے قطع نظر اجتماعی انداز کے الزامات کو چار بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ صدق وخلوص کی نایابی

۲۔ خوں ریزی

۳۔ عیش کوشی

۴۔ عیش کوش مذہب کا اجراء

آنے والے صفحات میں ان الزامات کا تفصیلی جائزہ لیا جا رہا ہے۔

خلوص

عدم خلوص کے لیے مغرب نے بہروپ یا جعل (Imposture) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انیسویں صدی تک یہ الزام تواتر کے ساتھ ملتا ہے۔ کارلائل نے اس الزام پر انیسویں صدی میں کاری ضرب لگائی۔ جس کے بعد اہلِ قلم اس الزام کی تردید پر مائل ہونے لگے۔ تاہم یہ الزام پوری طرح ساقط نہ ہو سکا۔ اس الزام کا لبِ لباب یہ ہے کہ حقیقی وحی کا وجود نہ تھا۔ یہ عمداً تصنیف کر لی جاتی تھی۔

جب معاندین کے لیے برہنہ حرف ادا کرنے کی گنجائش نہ رہ گئی تو انہوں نے پرانی شراب نئی بوتلوں میں انڈیلی اور اسی پرانے نظریے کو نئے الفاظ عطا کر کے کہا کہ یہ وحی کوئی بیرونی القاء نہ تھی، بلکہ لاشعور کی پیداوار تھی جسے غلط فہمی کی بنا پر ملکوتی پیغام تصوّر کیا گیا۔ عہدِ وسطیٰ میں جو کام بہروپ کے لفظ سے لیا جاتا تھا عہدِ حاضر میں وہی کام عدم خلوص کے الفاظ سے لیا گیا۔ لیکن مقصدِ کلام وہی رہا کہ وحی، نبوّت، قرآن اور دین، ہر شے کو مسخ کیا جائے۔

خلوص ایک ذہنی کیفیت ہے، جس کی تصدیق کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ مدّعی کے قول و فعل کا جائزہ لیا جائے۔ ان کے اثرات کے احاطے کی کوشش کی جائے۔ اور پھر اس سے جو نتائج حاصل ہوں ان کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کی جائے۔ لیکن اس معاملے میں جو دقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے تصوّرِ عظمت میں بعد المشرقین ہے۔ مغرب اپنی عیسائی قدروں پر دیگر عظام کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر عظیم آدمی کو گوری رنگت کا ہونا چاہیے۔ مذہباً وہ عیسائی ہو اور صرف عیسائی ہی نہیں کیتھولک عیسائی ہو۔

اس کی زبان لاطینی ہو، اس کی فکر افلاطونی ہو۔ رہن سہن مغربی ہو، کردار افسانوی ہو۔ اگر یہ سب اس میں نہ ہوتو اس کی عظمت ناقابلِ تسلیم رہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان خود ساختہ پیمانوں پر کوئی غیر مغربی پورا اتر ہی نہیں سکتا۔ یہ خامی پیمانے کی ہے، اور جب تک پیمانے کی خامی دور نہ ہوگی، پیمائش کی صحت کا تصوّر بھی نہیں پیدا ہوسکتا۔ اس خود پرستی کے پیشِ نظر عدم خلوص کا دعویٰ ایک کھوکھلا نعرہ ہے۔ حضور ﷺ جس معاشرے سے تعلّق رکھتے تھے اس میں انہیں اور ان کے گھرانے کو باعزّت مقام حاصل تھا۔ وحی کے نزول کے بعد انہیں گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وحی نے ان کی جان و مال، عزّت و آبرو کو آزمائش میں ڈالا۔ انہیں معاشرے سے منقطع کر کے محض چند افراد پر مشتمل مظلوم اقلیّت بنا دیا۔ ان حالات میں بظاہر وحی نے کوئی دنیاوی فائدہ نہیں پہنچایا۔ نہ مقتدر طبقوں کی نظر میں عزّت میں کوئی اضافہ ہوا۔ نہ کوئی مالی یا معاشی سہولت پیدا ہوئی۔ اس کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ اپنے مسلک پر سختی سے قائم رہے۔ مکّی زندگی کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کی استقامت کون سا جذبہ عطا کر رہا تھا۔ کیا خلوص کے سوا کوئی دوسری قوّت تھی جو ان مصائب کو بطیب خاطر جھیلنے کی طاقت عطا کر رہی تھی۔ تنِ تنہا پورے معاشرے سے وہی شخصیت ٹکرا سکتی ہے جو اپنے مشن سے بے پناہ مخلص ہو۔

مکّی دور کے بعد مدنی دور بھی ایک پرآشوب دور تھا۔ ہر طرف سے بیرونی دباؤ پڑ رہا تھا جسے ہر قیمت پر برداشت کیا جا رہا تھا۔ ان متحارب قوّتوں میں نکتۂ اختلاف کیا تھا۔ محض مذہب۔ اگر اس میں کسی مرحلے پر ذرا سی لچک پیدا کر دی جاتی تو اختلافات نہ رہ جاتے۔ اصولوں کی سربلندی کے لیے جان کی بازی سوائے خلوص کے اور کوئی دوسرا جذبہ نہیں لگا سکتا۔ اس مشن کی ابتدا اللہ کے نام سے ہوئی، اور دمِ واپسیں بھی زبان پر اللہ اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ بعثت تا وصال ہر لمحہ اللہ کی بندگی میں بسر ہوا۔ مکّی دور ہو کہ مدنی، پوری حیاتِ طیّبہ اسلام کی ترویج و استحکام کے لیے وقف رہی۔ اسلام ہی مقصدِ حیات تھا۔ نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے اہل و عیال، اور اپنے متبعین کی ساری توانائیاں اسی مقصد کے حصول کے لیے صرف ہوئیں۔

دوستی اور دشمنی کا معیار اسلام تھا۔ کامیابی اور ناکامی کا تعیّن اسی میزان سے ہوتا تھا۔ جو قانونِ شریعت نازل ہوتا وہ صرف امّت کے لیے ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ آپ ﷺ خود اس پر سب سے زیادہ سختی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔ ان کا ہر عمل امّت کے لیے مثال بن گیا۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے، بات چیت، تخاطب، آداب، اخلاق، کردار، عبادت، ریاضت، حسنِ سلوک، غرضیکہ زندگی کی معمولی سے معمولی جزدیات میں ان کی پیروی باعثِ سعادت ہوئی۔

یہ ان ہی کی عملی زندگی کا نمونہ تھا جسے اپنا کر ایسے لوگ سامنے آئے، جن کی عظمت، تقدّس اور بلند کرداری ناقابلِ تردید ہے۔ جنہوں نے مسلسل ایک ہزار سال تک عالمِ انسانیت کی مثالی قیادت کی۔ تہذیبِ انسانی سے ارتقائی منازل طے کرائیں۔ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اسوۂ حسنہ آج تک ہر مسلمان کے لیے، اور بہت سے غیر مسلموں کے لیے بھی، معراجِ کردار ہے۔ آج بھی عالمِ اسلام کردارِ نبوی میں وہی

تقدس محسوس کرتا ہے جو قرونِ اولیٰ میں محسوس کیا جاتا تھا۔ آج بھی ان کے نام پر مرمٹنا، ہر مسلمان کے لیے باعثِ افتخار ہے۔ اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرنا زندگی کا ماحصل ہے۔ ذاتِ نبوی کا، اور ان کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا مطمحِ نظر دنیا نہیں بلکہ ہمیشہ آخرت رہا۔ آخرت کے لیے کسی ایسے عمل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس میں خلوص نہ ہو۔

حسنِ عمل کی تابانی اگر نظارہ سوز ہے تو جلوہِ اقوال دنیائے فکر کو منور کیے ہوئے ہے۔ ذاتِ نبوی کے سوا دنیا کا کوئی فرد ایسا نظر نہیں آتا جس کا بولا ہوا ہر لفظ محفوظ رکھا گیا ہو۔ جس کے ہر قول کو تقدس اور حجت بالغہ کی حیثیت حاصل ہو۔ انہوں نے جس بات سے منع فرمایا وہ حرام ہوگئی۔ جس بات کا حکم دیا وہ واجب ہوگئی۔ جس کا حکم نہ دیا لیکن روا رکھا وہ جائز ہوگئی۔ جس بات پر چہرہ مبارک پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے وہ مکروہ ہوگئی۔ نگاہِ شوق جن کی جنبشِ ابرو پر ہر دم لگی رہتی۔ نظمِ ہستی جن کی آنکھوں کے اشاروں سے بنتا اور بکھرتا۔ جن کا تکلم قانون، جن کی خاموشی تکلم، جن کی چشم پوشی جوازِ اباحت، جن کی توجہ حاصلِ دوعالم، جن کا ارجاءِ اشارہ محرومی، جن کا تبسم بہاروں سے گراں بہا، جن کی تیوری کے بل تقدیرِ آدم کی شکن۔ کیا رسولِ عربی ﷺ کے علاوہ بھی دنیا کے کسی اور شخص کے افعال و اقوال کو یہ مرتبہ میسر آسکا؟

یہ سب محض اس لیے ہوا کہ پیغمبر اسلام ﷺ خلوص کا پیکر تھے۔ انہیں جو پیغام ملا وہ پیغامِ حق تھا۔ ان کی لازوال حقانیت عبدِ حقیر کے شک وشبہ سے بلند و بالا تھی۔ ان پر ایمان لانے والے لاکھوں تھے جو ان پر دل و جان سے فدا تھے۔ انہیں کسی لمحہ یہ گمان بھی نہ گزرا کہ کردارِ نبوی کے کسی پہلو پر شک وشبہ کی کوئی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ اگر خلوص محلِ غور ہوتا تو یہ لوگ اس غیر متزلزل ایمان کے حامل نہ ہوتے جو اصحابِ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ ہے۔ اصحابؓ کے بعد کروڑوں فرزندانِ توحید نے اپنے رسول ﷺ کے اقوال و افعال کو مشعلِ راہ بنایا۔ ان پر قلبِ صمیم کے ساتھ عمل پیرا ہوئے۔ بلا کسی تشویش کے انہیں متاعِ ایمان بنائے رکھا۔ اسلامی معاشرہ اندھی تقلید کرنے والوں کا معاشرہ نہیں بلکہ علماء، عقلاء اور حکماء کا معاشرہ رہا ہے۔ یہ علماء، عقلاء اور حکماء سب کے سب اصحابِ فکر و نظر رہے ہیں۔ یہی مغرب کے حقیقی اساتذہ ہیں۔ ان میں سے ایک بھی فرد نہیں جس نے کبھی خلوصِ نبوی پر شک وشبہ کیا ہو، اس کے برعکس انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ وحی کو علم و حکمت سے برتر تسلیم کیا۔ ان کے ادنیٰ غلام ہونے پر فخر کیا کہ عقل و حکمت حقانیت سے جنم لیتی ہیں، اور حقانیت کے سرچشمے صرف انبیاء کرام ہوتے ہیں۔ ان کے خلوص پر شک وشبہ حقانیت پر شک وشبہ کے مترادف ہے۔

عدمِ اخلاص کی تہمت جس معاشرے نے باندھی، یہ اب وہاں بھی قابلِ اعتناء نہیں رہ گئی ہے۔ تاریخ انسانی کی ہر تہذیب متوازن فکر کے بل بوتے پر پروان چڑھی ہے۔ یہ فکر مذاہب نے فراہم کی۔ چنانچہ تمام عالمی تہذیبیں مذاہبِ عالیہ کی مرہونِ منت ہیں اور مذاہبِ عالیہ مذاہبِ وحی ہیں۔ مذاہبِ عالیہ کے ابطال نبی اور رسول کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ہر بطل نے مذہبی فکر کو وحی قرار دیا۔ اب اگر دیگر انبیاء پر وحی آتی تھی اور یقیناً آتی تھی، کیونکہ اس کی تردید انسانیت کی توہین ہوگی، تو کوئی وجہ نہیں کہ عظیم ترین عالمی مذہب کے

بطلِ اعظم پر نزول وحی نہ ہوتا ہو۔ اگر دیگر مذاہب کے انبیاء کو اپنی وحی کی صداقت پر یقین تھا اور انکی وحی داخلی نہیں بلکہ خارجی تحصیلِ حقانیت تھی تو کسی ایک عالمی مذہب کو اس سے مستثنیٰ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔

وحی کا مدعا ہمیشہ تعمیر انسانیت ہوتا ہے۔ وہ وحی جس نے عظیم ترین تعمیری کارنامہ انجام دیا، کیسے نظر انداز ہوسکتی ہے۔ وحی کے وجود اور اسکے تعمیری کردار سے صرف وہ شخص انکار کرسکتا ہے جس کا ذہن صرف مادّہ کی حدتک محدود ہو۔ لیکن دیگر انبیاء کے لیے وحی کے قائل کی زبان سے محمد ﷺ کے لیے اس کی تردید باعثِ حیرت ہوتی ہے۔ یہودیت اور عیسائیت، دونوں ہی مذاہب وحی ہیں۔ کیا حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا مقصد سوائے فلاح و بہبود کے کچھ اور تھا؟ ان میں کون سی ایسی بات پائی جاتی ہے جس کے باعث انہیں تو نص تسلیم کیا جاتا ہے اور آنحضرت ﷺ ان سے کس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان کے خلوص پر شبہ کیا جائے۔ ان دونوں کی جدّ و جہد سے کہیں زیادہ سخت جدّ و جہد رسول عربی ﷺ کی ہے۔ کامیابی کے اعتبار سے سابقہ تمام انبیاء سے کامیاب ترین۔

اگر ناکامی سے خلوص متاثر نہیں ہوسکتا تو کامیابی کیسے خلوص کو متاثر کرسکتی ہے۔ سب نے صعوبتیں برداشت کیں، سب ایک ہی منزل کے راہی تھے۔ سب مذاہب عالیہ کے بانی ہیں۔ سب نے ان کے قیام کے لیے اپنی اپنی زندگی وقف کی۔ سب ایک خدا کے قائل، اسکے احکام کے پابند۔ سب کی تعلیمات مشترک، سب انسانیت کے عظیم محسن، ان کے بغیر انسانیت نامکمل، پھر کسی کے ساتھ انفرادی سلوک کیوں۔ اگر ایک پرخلوص ہے تو اسی راہ کے دوسرے مسافر کے خلوص پر شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہرگز نہیں ہوسکتی۔

خوں ریزی

کردارِ نبوی پر دوسرا اتہام خونریزی کا ہے۔ اس لفظ کو ایسے عامیانہ انداز میں استعمال کیا جاتا ہے جو خونِ ناحق اور خونِ برحق کی تمیز مٹا ڈالتا ہے۔ اس الزام کے ضمن میں معاہدہ شکنی، دھوکہ دہی اور سفاکی جیسی گھناؤنی تہمتیں بھی لگائی جاتی ہیں۔

اس الزام کا محرک عیسائیت میں کارفرما ثنویت ہے۔ جس کے باعث دنیاوی اور دینی دائرہ کار جدا جدا تصور کیے گئے ہیں۔ دنیاوی مشاغل اور افکار کو دین سے جدا اور منافی سمجھا جاتا ہے۔ لشکرکشی، جہاد، کشورکشائی اور بندوبستِ مملکت کو جزوِ سیاست قرار دیا جاتا ہے۔ اور سیاست کو دین سے خارج کر کے کلیتاً دنیا سے متعلق کیا جاتا ہے۔ جبکہ اسلام میں یہ سارے امور دین سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ اقدار کا یہ تضاد فیصلوں کے اختلاف کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔

عیسائیت کو امن پرست مذہب کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کے دو جداگانہ رخ ہیں۔ دنیا میں جس قدر خونریزی عیسائیت نے کی ہے اس کے آگے چنگیز اور اس کے جانشینوں کی خونریزی گرد ہے۔

عیسائیت نے دو جداگانہ صحائف کو اپنا رکھا ہے۔ عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید۔ ان دونوں کی تعلیمات اور عقائد میں شدید قسم کا تضاد پایا جاتا ہے۔ عہد نامۂ قدیم کا خدا 'ربُّ الافواج' ہے۔ اس کے تمام احکامات جنگی نوعیت کے ہیں۔ وہ اپنے اور اسرائیل کے دشمنوں کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ مفتوحہ علاقوں میں قتلِ عام، لوٹ مار اور آتش زنی کا حکم دیتا ہے۔ جبکہ عہد نامۂ جدید کو خونریزی اور آدم کشی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ عہد نامۂ جدید کا خدا امن وسلامتی کا نشان ہے۔ مسکنت اور مظلومیت کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک رخسار پر تھپڑ کھانے والے کو اپنا دوسرا رخسار بھی پیش کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اس تضاد سے عیسائیت بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔ مغرب کی ہر قوم جنگجو ہے۔ جنگوں میں غالب آتی ہے تو عہد نامۂ قدیم کے احکامات کی تعمیل میں ممکنہ خونریزی سے باز نہیں رہتی۔ اور اگر مغلوب ہوتی ہے تو عہد نامۂ جدید کے احکامات یاد آتے ہیں۔ فریقِ غالب پر خونریزی کے الزامات عائد کر کے عیسائی اصولوں کی خلاف ورزی کا واویلا کرتی ہے۔ اسی دورخی کا شاطرانہ استعمال مستشرقین نے اسلام کے خلاف کیا۔ مغربی خونریزی پر شادمانی کا اظہار کیا اور اسے خداوند کی نصرت اور یسوع کی فتحمندی سے تعبیر کیا۔ عیسائیت کی سربلندی کا نام دیا۔ اپنی جنگوں کو اوران میں کی جانے والی بے پناہ خونریزی کو مقدّس جنگ کہا۔ لیکن دوسروں کی مقدّس جنگ کو عہد نامۂ جدید کی روشنی میں سنگین جرم قرار دیا۔

عہدِ نبوی کی جنگیں

یہ درست کہ عہدِ نبوی میں جنگیں ہوئیں، جن میں طرفین کے افراد کام آئے۔ لیکن ان میں سے کوئی جنگ اس لیے نہیں ہوئی کہ اسلام کو خونریزی مطلوب تھی۔ جنگِ بدر تا جنگِ احزاب، ساری کی ساری جنگیں مدافعانہ تھیں۔ سب کی سب جنگیں، یا تو مدینے کے قریب یا خود مدینے میں لڑی گئیں۔ مقامِ جنگ اس بات کا ثبوت ہیں کہ حملہ آور مشرکین تھے، جو اسلام کے مٹانے کے ارادے سے آئے تھے۔ مدافعت کا حق دنیا کا ہر قانون تسلیم کرتا ہے۔ خود عیسائی کتب مقدّسہ اس حق سے انکار نہیں کرتیں۔ عہد نامۂ قدیم کی رو سے فیصلہ کیا جائے تو پورا مشرک عرب گردن زدنی قرار پائے گا۔ خود عہد نامۂ جدید کی رو سے مسلمانوں کو مدافعت کا پورا پورا استحقاق میسّر تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آخری ایّام میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کو مسلّح ہونے کی تلقین فرمائی تھی۔ یہ تلقین یقیناً مدافعت کے لیے تھی۔ چنانچہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاگردوں نے اس تلقین پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیا تھا۔

اناجیل میں تلوار یا مدافعت کا عمومی طور پر کوئی ذکر نہیں، لیکن حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری کے موقع پر نہ صرف شاگردوں کے پاس تلوار نظر آتی ہے، بلکہ ایک شاگرد حضرت کی مدافعت میں حملہ آور ہوتے بھی نظر آتا ہے۔

''اور دیکھو یسوع کے ساتھیوں میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر اپنی تلوار کھینچی اور سردار کاہن کے نوکر پر چلا کر اس کا

کان اڑا دیا۔ اور یسوع نے کہا کہ اپنی تلوار میان میں کر لے کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کیے جائیں گے۔" (متی ۲۶، ۵۱-۵۲)

اس سے یہ تو ثابت ہے کہ یسوع کے شاگرد ہتھیار بند ہونے لگے تھے۔ اور ان میں سے ایک نے مدافعت میں پیش قدمی بھی کی۔ لیکن امنِ عامہ کے پیشِ نظر حضرت عیسیٰؑ نے اسے روک دیا، کہ گیارہ شاگردوں کی مدافعت قطعی بے اثر ہوتی، اور اسے رومی حکومت بغاوت کا رنگ دے کر بے گناہ عوام کا قتلِ عام کر ڈالتی۔

اسلام کی ان مدافعتی جنگوں کے بعد دیگر جنگیں بھی جارحیت نہ تھیں، بلکہ وقت کی ضرورت تھیں۔ فتحِ مکہ قریش کی عہد شکنی کا نتیجہ تھی، جو بلا خونریزی کے حاصل ہوئی۔ اور فتح کے بعد بجائے خونریزی کے دشمنوں کو امن و سلامتی کا تحفہ عطا ہوا۔ اور ساتھ ہی دنیا کی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہوا کہ مفتوح خود فاتح افواج کے ساتھ شامل ہو کر انتہائی جوش و خروش کے ساتھ مشترکہ دشمن کے خلاف جنگ میں حصہ لینے اور اپنی جانیں قربان کرنے لگے۔ جنگِ حنین بھی مدافعتی جنگ تھی۔ صحرائی قبائل اور طائف کے باشندوں نے اجتماع کر کے بلا کسی جواز کے مکے پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ مسلمانوں کے لیے تو تھا ہی، خود مشرکینِ مکہ کے لیے بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ مشرکینِ مکہ نے بھی رضا کارانہ اس جنگ میں شرکت کی۔

فتحِ مکہ کے بعد قبائلی وفود کی آمد شروع ہوئی، جنہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد عرب میں اسلام کی عملی مخالفت ختم ہو گئی۔ اس دور میں جتنی مہمات قبائل کی طرف روانہ کی گئیں، ان کی نوعیت تادیبی کارروائیوں کی تھی۔ انہیں پولیس ایکشن کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان مہمات میں شرکاء کی تعداد دس [۱۰] سے لیکر تین سو [۳۰۰] تک پائی جاتی ہے۔ اس قلیل تعداد کی مہم سے جنگ کا تصوّر تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس دور میں صرف ایک جنگی مہم تبوک کی نظر آتی ہے، جس کے شرکاء کی تعداد تیس ہزار [۳۰،۰۰۰] بیان کی جاتی ہے۔ لیکن یہ مہم بھی جارحانہ نوعیت کی نہ تھی۔ کیونکہ اطلاع ملی تھی کہ سرحد پر روم کی افواج مجتمع ہو رہی ہیں۔ اور جب لشکر تبوک پہنچا تو وہاں دشمن کا کوئی اجتماع نہ پا کر واپس آ گیا۔ اگر یہ اقدام مدافعتی نوعیت کا نہ ہوتا تو پرامن طور پر واپسی کے بجائے شام کی طرف پیش قدمی ہونی چاہیے تھی۔

یہود سے برتاؤ: خونریزی کی تہمت کے ثبوت میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، وہ یہودِ مدینہ سے برتاؤ اور خصوصاً بنو قریظہ کے خلاف سخت کارروائی کے واقعات ہیں۔ ان واقعات کے محرّکات کو مسخ کر کے اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا یہودِ مدینہ بے قصور، معصوم اور پرامن شہری تھے، اور ان پر صرف خونریزی کے چسکے میں ظلم توڑے گئے تھے۔

ہجرت کے وقت مدینہ میں اور آس پاس بہت سے یہود آباد تھے۔ کچھ یہودی قبائل ایسے تھے جو نسلاً عرب تھے اور غالباً انہوں نے صرف یہودی اعتقادات اپنا لیے تھے۔ مثلاً بنو مرثد (شاخ بنو بلی)، بنو معاویہ (شاخ بنو سلیم)، بنو ناغسہ اور جذمہ (یمنی عرب)، بنو ثعلبہ (غسان)، بنی زعورہ (غسان) وغیرہ۔ یہودی النّسل قبائل عام طور پر صرف تین تسلیم کیے گئے ہیں۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ بقیہ سب کے سب نسلاً عرب تھے۔

عرب یہود میں اہم ترین قبیلہ بنو ہذیل کا تھا، جو بنو قریظہ کا ہمسایہ بھی تھا۔ بنو قینقاع صنعت اور تجارت پیشہ تھے، جبکہ بنو قریظہ اور بنو نضیر زراعت پیشہ اور باغبان تھے۔ مدینے میں یہود کی مضبوط دفاعی حیثیت تھی۔ ان کے [۵۹] قلعے یا اطم تھے۔ جبکہ اوس و خزرج کے قلعوں کی تعداد صرف پندرہ [۱۵] تھی۔ ان یہودی قبائل کے معاہدات اوس و خزرج سے تھے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر عبد اللہ بن ابی یعنی خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ کا معاہدۂ حلف اوس کے ساتھ تھا۔ عربوں میں حلف کی حیثیت برادری میں شمولیت کے برابر تھی۔ وہ اپنے حلیف کی مدد ہر قیمت پر کرتے تھے۔ خود یہود میں وجہِ اشتراک ان کا مذہب تھا۔ پس مدینے کے یہود خود اپنی قوّت اور حلیفوں کی قوّت کے پیشِ نظر کسی طور کمزور پوزیشن میں نہ تھے۔

ہجرت سے قبل، اوس اور خزرج کی آپس میں ٹھنی رہتی تھی، جس میں انہیں شدید جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہود نے اپنے حلف کے باوجود کبھی ان میں سے کسی کے ساتھ جنگ میں شرکت نہیں کی۔ کہا یہی جاتا ہے کہ یہود آپس میں ملے ہوئے تھے اور ان کی سیاست یہ تھی کہ عرب آپس میں لڑتے رہیں اور سیاسی اور معاشی طور پر ان کے زیرِ نگیں رہیں۔ اس مقصد کے لیے یہود اپنی جوڑ توڑ کی مہارت کو پورے طور پر کام میں لاتے تھے۔

ہجرت کے بعد، مدینے کی حدود میں یہود کی یہ سیاست ختم ہوگئی۔ اوس و خزرج کا اتحاد اور الحاق، ان کے لیے ایک صدمہ ہی تھا۔ پھر بھی انہیں یہ امید تھی، اور اس کے لیے انہوں نے سازشیں بھی شروع کر دی تھیں، کہ جلد ہی قریش مدینے پر حملہ کر کے اسلام کا قلع قمع کر دیں گے۔ اسی لیے انہوں نے خود اسلام کی عملی مزاحمت کی زحمت نہیں کی۔

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے فوراً بعد ہی یہود کے ساتھ امن سے رہنے کا معاہدہ، جو میثاقِ مدینہ کہلاتا ہے اور جس کا تذکرہ پچھلے ابواب میں ہو چکا ہے، کر لیا تھا۔ اس معاہدے پر یہود اس لیے مجبور تھے کہ اوس اور خزرج* کے ساتھ انکے پرانے معاہدے چلے آ رہے تھے، اور میثاقِ مدینہ انہی کی تجدید تھا۔ یہودی ان معاہدوں کی تجدید سے صرف اس لیے انکار نہیں کر سکتے تھے، کہ اوس و خزرج کی قیادت انکے ایک نئے معاہد (رسول اللہ ﷺ) کے پاس آ گئی تھی، یا انہوں نے بت پرستی ترک کر دی تھی۔

جنگ بدر میں قریش کی فیصلہ کن شکست، جہاں سارے عرب کے لیے ایک حیران کن بات تھی، وہیں یہودِ مدینہ کے لیے بھی مایوس کن تھی۔ انکی ساری امیدیں خاک میں مل گئی تھیں، لیکن انہیں پھر بھی یہ امید تھی کہ شاید آئندہ برس، جس کا اعلان قریش کر گئے تھے، ان کی مراد بر آئے۔ یہود کی معیشت چونکہ مقامی عربوں کے ساتھ لین دین پر قائم تھی، اس لیے خود عملی اقدام کر کے وہ اسے تباہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال انہوں نے اپنی ریشہ دوانیاں جاری رکھیں، اور اس ضمن میں قریش کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھا۔

بنو قینقاع کا اخراج: بدر کے بعد آنحضرت ﷺ نے یہود کو دعوتِ اسلام دی، جس میں فرمایا کہ "اے یہود، اللہ سے خوف کرو اور اسلام اختیار کرو۔ کہیں تمہارا حشر بھی قریش جیسا نہ ہو۔ فرمانِ نبوی کے یہ

الفاظ ظاہر کررہے ہیں کہ یہود کی معاندانہ حرکتیں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ وہ بھی قریش کے حشر کے سزاوار ہو چکے تھے۔ ورنہ اسلام لانے کے لیے کبھی کسی پر دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ اس دعوت کے جواب میں بنی قینقاع نے جو الفاظ استعمال کیے وہ ہتک آمیز اور بغاوت کے مترادف تھے۔ انہوں نے کہا:

''اے محمد [ﷺ]، تم سمجھتے ہو کہ ہم بھی تمہاری قوم (قریش) کی طرح ہیں۔ تم اس دھوکے میں نہ رہنا۔ تم نے ایسے لوگوں سے مقابلہ کیا جنہیں جنگ سے کوئی واقفیت نہ تھی، اسی لیے ان پر قابو پالیا۔ ہماری حالت یہ ہے کہ واللہ اگر ہم تم سے جنگ کریں گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم خاص قسم کے لوگ ہیں۔''

مملکت کے سربراہ کی تنبیہ پر یہ جواب سوائے اعلانِ بغاوت کے اور کچھ نہ تھا۔ پھر جلد ہی ایک نہایت شرمناک واقعے نے فساد کی صورت اختیار کر لی۔ ایک عرب خاتون قینقاع کے بازار میں خرید و فروخت کرنے آئی۔ ایک یہودی سنار نے اس کا چہرہ بے نقاب کرنا چاہا۔ جب اس خاتون نے انکار کیا تو اس شریر نے اس خاتون کے لبادے کا سرا کسی چیز سے کچھ اس طرح باندھ دیا کہ وہ جب اٹھی تو کپڑا ہٹ گیا۔ اس طرح اس کی سرِ بازار رسوائی ہوئی۔ خاتون کی فریاد پر وہاں موجود ایک مسلمان صحابی رضی اللہ عنہ مشتعل ہو گئے اور انہوں نے سنار پر حملہ کر کے اسے قتل کر ڈالا۔ ردِّ عمل میں یہود نے ان مسلمان کو شہید کر ڈالا۔ فضا کشیدہ تھی ہی، مقتول مسلمان کے اقرباء اور ان کے حلیف بگڑے تو پوری یہودی آبادی مسلم آبادی پر ٹوٹ پڑی۔

اس فساد کو ختم کرنے کے لیے بنوقینقاع کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی تو انہوں نے قلعہ بندی کر کے حالتِ جنگ پیدا کر دی۔ ان کا محاصرہ کر لیا گیا، جس کے بعد بنوقینقاع نے ہتھیار ڈالے اور انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔ بنوقینقاع کے مدنی حلیفوں میں عبداللہ بن ابی، عبادہؓ بن صامت، المنذر بن قدامہ، محمدؓ بن مسلمہ اور سعدؓ بن معاذ تھے۔ سوائے عبداللہ بن ابی کے بقیہ تمام حلیفوں نے اعلانیہ اظہارِ برأت کیا۔ عبداللہ بن ابی نے اس قبیلے کے حق میں وکالت کی اور خدمت نبوی میں اپیل کی کہ بنوقینقاع کے ساتھ نرم سلوک کیا جائے۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی شہ پر بنوقینقاع شیر ہو رہے تھے۔ اسے توقع رہی ہو گی کہ یہود جب فساد برپا کریں گے تو بنوقینقاع کے عرب حلیف ان کی مدد کو اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس طرح یہود، خزرج اور اوس کی مجموعی قوت کے سامنے مہاجرین بے بس ہو جائیں گے اور مدینے کا اقتدار ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ لیکن قینقاع کی سرکشی اس قدر قابلِ مذمت تھی کہ نہ تو دوسرے یہود نے ان کا ساتھ دیا اور نہ ہی کوئی عرب حلیف ان کی مدد کو پہنچا۔ سعدؓ بن معاذ اور عبادہؓ بن صامت (سردارانِ اوس) کے اعلانِ برأت نے اوس کے حلف کو ختم کر دیا۔ جس کے باعث عبداللہ بن ابی بے دست و پا ہو گیا کہ اگر وہ اپنے قبیلے خزرج کے ہم خیال افراد [منافقین] کو یہود کی مدد کے لیے صف آرا کرتا بھی ہے تو مسلمانوں کے آگے اس کی پیش نہ جاتی۔ اس لیے وہ بھی دبک گیا۔ بنوقینقاع کو جب خلافِ توقع عرب حلیفوں سے کوئی مدد نہ مل سکی تو انہیں ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔

کعب بن اشرف کا قتل: کعب کا باپ بنو طے کا ایک عرب اور اسکی ماں بنونضیر کی ایک یہودن تھی۔ اس کا قیام مدینے کے جنوب میں ایک گڑھی میں تھا۔ مسلمانوں سے سخت عناد رکھتا تھا۔ بدر میں قریش کی شکست،

اور روسائے قریش کے قتل ہونے کی خبر پہنچی تو رنج والم کا مجسمہ بن گیا۔اس نے کہا کہ بخدا اگر محمد (ﷺ) نے قریش کے ان لوگوں کو قتل کر دیا ہے تو زمین کا شکم اسکی پشت کی بہ نسبت بہتر ہے۔پھر جب اس خبر کی تصدیق ہوگئی تو مکّے پہنچا۔مقتولینِ بدر کے پرسوز مرثیے کہے۔قریش کے قبائل میں انتقام کی آگ بھڑکائی اور مسلمانوں کی ہجو کی۔ پھر مدینہ لوٹا تو اس درمیان بنوقینقاع کا اخراج ہو چکا تھا۔

بنوقینقاع نے فساد کی ابتداء ایک خاتون کی بے حرمتی سے کی تھی۔کعب نے بھی اپنے اشعار کا موضوع مسلم خواتین کو بنایا۔ان سے متعلق مکروہ اشعار لکھے اور ہر ممکنہ حدتک دل آزاری کی۔چند ماہ پیشتر بنوقینقاع کے اخراج کے باعث جو فساد رفع ہوا تھا کعب اسی فتنے کو پھر ہوا دے رہا تھا۔کعب بن اشرف کی ہر حرکت بغاوت اور غدّاری کے مترادف تھی۔

غدّاری کے جرم کی سزا، رومی قانون سے لے کر برطانوی قانون تک ہر دور میں موت رہی ہے۔ برطانیہ کے مرڈر ایکٹ ۱۹۶۵ء کے تحت موت کی سزا منسوخ کردی گئی لیکن غدّاری کے جرم پر سزائے موت میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں مختلف ادوار میں غدّاری کی جو تعریفیں بیان کی گئی ہیں ان کی رو سے حسبِ ذیل افعال غدّاری متصوّر ہوتے تھے۔

(cf. Encyclopedia Britanica; article 'Treason', Vol. II, p.197)

۱۔ کسی قوم یا حکمراں سے ایسے فعل کے ذریعے دغا کرنا جو اسکی سلامتی کے لیے خطرناک ہو۔

۲۔ کسی آئینی حکومت کے خلاف بغاوت کی تنظیم کرنا یا ترغیب دینا۔اپنے فعل، تحریر و تقریر کے ذریعے لوگوں کو مشتعل کرنا۔

۳۔ نویں صدی کے قانون کی رو سے ہر وہ فرد سزائے موت کا مستحق تھا، جو بادشاہ (سربراہ) کی جان کے خلاف کسی کارروائی میں ملوّث ہو۔

۴۔ غدّاری کی صحیح تعریف چودھویں صدی سے قبل متعین نہ تھی۔اس لیے اس کا انحصار بادشاہ اور اس کے منصفین کے فیصلے پر تھا۔

۵۔ انگلینڈ میں ۱۳۴۸ء کے قانون میں بغاوت اور غدّاری کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی رو سے بادشاہ کے دشمنوں سے وفاداری، دشمنوں کو مدد یا سہولت بہم پہنچانا غدّاری کی تعریف میں آتا ہے۔

۶۔ امریکی قانون کی رو سے ریاست کے خلاف جنگ، دشمنوں سے وفاداری، دشمنوں کو کسی قسم کی مدد یا سہولت بہم پہنچانا غدّاری کی تعریف میں آتا ہے۔

غدّاری کے لیے نیّت بھی ضروری نہیں۔لاعلمی اور سادگی میں سرزد ہو جانے والے اعمالِ غدّاری کا شمار بھی غدّاری میں ہی ہوتا ہے۔دشمنوں کو غذا پہنچانا بھی غدّاری کی تعریف میں آتا ہے۔

غدّاری کو عرب بھی ناقابلِ معافی جرم سمجھتے تھے۔ ابو رغال ثقفی نے ابرہہ کے لشکر کی رہنمائی کی ذمّہ داری قبول کی اور مکّہ پہنچنے سے پہلے ہی مر گیا۔ اس غدّار کی قبر کو صدیوں سنگسار کیا جاتا رہا۔ (ابنِ ہشام، صفحہ ۴۴)

خود مغربی قوانین قدیم و جدید کی رو سے کعب بن اشرف ایک غدّار تھا جس کی سزا موت تھی۔ یہ سزائے موت اسے ایک ایسی مملکت نے دی جس کے پاس، اس وقت تک نہ اپنی باقاعدہ فوج تھی نہ پولیس۔ نہ جیلخانے تھے نہ محکمہ جاتِ دار و گیر۔ اگر سزا کی تعمیل کا ذریعہ ہو سکتا تھا تو یہی کہ مجرم کی سزا کا اعلان کر دیا جائے اور اس پر عملدرآمد کروانے کے لیے رضا کاروں کی خدمات طلب کی جائیں۔ کعب بن اشرف کے معاملے میں ایک دقت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اسے گرفتار بھی نہ کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس کا قیام ایک قلعے میں تھا۔ اس قلعے پر گرفتاری کے لیے حملہ پورے قبیلے کو جنگ میں ملوّث کر دیتا۔ ایک فرد کے جرم میں قبیلے کو سزا نہ دی جا سکتی تھی۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ سزا دی جائے۔ جلد اور فوری سزا۔ شور و غوغا ہو نہ نقضِ امن۔ حفاظت و بہبود کا تقاضا تھا کہ اسے قتل کیا جائے۔ پس اسے انصار کی پانچ افراد کی جماعت نے قتل کر کے سزا دے دی۔ [آج بھی ساری دنیا کی حکومتیں اپنے مفرور مجرموں کو جیسے بن پڑے سزا دیتی ہیں، اور اس میں اخلاقیات کہیں بھی حائل نہیں ہوتی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہودیوں نے نازیوں کا پچاس سال تک پیچھا نہیں چھوڑا۔]

ابورافع سلام بن ابوالحقیق: ایک اور یہودی ابورافع سلام بھی کعب بن اشرف کے ہم پلّہ مفسد اور سرکش تھا۔ اس نے آس پاس کے قبیلوں کو بھڑکا کر مسلمانوں کے خلاف صف آرا کیا۔ اس کی غدّاری اور بغاوت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے بھی کعب کے انداز میں سزائے موت دی گئی۔

ان دونوں غدّاروں کے قتل کا حکم چونکہ خود حضور ﷺ نے صادر فرمایا اور لوگوں کو انکے قتل کرنے کے لیے روانہ کیا اس لیے انصاف کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے مغرب ان واقعات کو مکروہ رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اگر اس قسم کے واقعات مغرب میں پیش آتے تو انہیں انصاف کا نام دیا جاتا۔ یورپ کے اکثر ممالک، خصوصاً انگلستان کا قانون، باغی اور غدّار کے قتل کا اختیار ہر شہری کو عطا کرتا ہے۔ سولن نے اپنے شہر کی حفاظت کے لیے یونانیوں کو مختار کیا کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا کریں۔ لیکن یہی عمل اگر مسلمان اپنے معاشرے اور اپنی ریاست کی حفاظت کے لیے اختیار کریں تو یہ ایک جرم قرار دیا جاتا ہے۔

بنو نضیر کا اخراج: بنو قینقاع کے ایک سال بعد یہود کا دوسرا قبیلہ بنی نضیر بھی مدینے سے شہر بدر کیا گیا۔ میثاقِ مدینہ کی رو سے خوں بہا کی ادائیگی تمام شرکائے میثاق کی مشترکہ ذمّہ داری تھی۔ جنگِ احد (مارچ ۶۲۵ء) کے بعد عرب قبائل نے مدینے کے خلاف کارروائیاں کرنی شروع کیں۔ بنو عامر (شاخِ بنو سُلیم) کے رئیس ابوالبراء کی درخواست پر مدینے سے مبلّغین کی ایک جماعت جو تقریباً چالیس افراد پر مشتمل تھی، روانہ کی گئی۔ یہ جماعت جب بئرِ معونہ پر پہنچی تو بنو سُلیم کے قبائل، ذکوان، رعل وغیرہ نے اس جماعت پر حملہ کر کے ایک فرد عمروؓ بن امیہ کے سوا سب کو شہید کر ڈالا۔ بقیۃ السیف عمروؓ بن امیہ نے مدینہ لوٹتے ہوئے راستے میں بنو عامر کے دو افراد کو پایا اور انہیں اپنی جماعت کے قتل کے انتقام میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چونکہ بنو عامر جماعتِ مبلّغین

کے قتل میں شریک نہ تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کے دونوں مقتولین کا خوں بہا دینا طے فرمایا۔ خوں بہا کی رقم شرکائے معاہدہ سے فراہم کی جانے لگی۔ بنونضیر سے بھی انکے حصے کی رقم طلب کی گئی۔ ابنِ ہشام کے بیان کے مطابق بنونضیر اور بنو عامر ایک دوسرے کے حلیف بھی تھے، جس کے باعث بنونضیر کے تعاون سے یہ قضیہ آسانی کے ساتھ طے ہوسکتا تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ اپنے اصحابؓ کے ساتھ بنونضیر کے پاس گئے۔

اس واقعے سے آٹھ ماہ قبل کعب بن اشرف، جو بنونضیر کا سردار تھا، قتل کیا جاچکا تھا۔ بنونضیر اس واقعے کو بھولے نہیں تھے۔ اپنی بستی میں رسول اللہ ﷺ کو موجود پایا تو بنونضیر نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ حضور ﷺ کو ایک دیوار کے سائے میں بٹھایا اور حامی بھری کہ آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی کیا جائے گا۔ پھر یہود مشاورت کے بہانے سے کھسک لیے۔ جیسے جیسے دیر ہوتی گئی یہود کی نقل وحرکت مشتبہ ہونے لگی، اور آخرکار یہ یقین ہوگیا کہ یہ تاخیر محض کسی سازش کا حصہ تھی۔

سازش : قدیم سیرت نگاروں نے اس سازش کی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ چنانچہ ابنِ ہشام نے تحریر کیا،

"پھر بنونضیر نے تخلیہ میں یہ مشورہ کیا کہ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ لگے گا۔ محمد [ﷺ] کو زندہ نہ چھوڑو۔ چنانچہ ایک شخص عمرو بن جحاش کو اس کام پر آمادہ کیا کہ جس دیوار کے نیچے حضور ﷺ تشریف رکھتے تھے، دوسری طرف سے اس دیوار پر چڑھ کر وہ ایک بڑا پتھر حضور ﷺ پر گرادے، تاکہ وہ (نعوذ باللہ) شہید ہوجائیں۔"

(سیرت ابن ہشام، باب بنونضیر کی جلاوطنی، صفحہ ۴۰۵، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی)

جب تاخیر حد سے بڑھی تو حضور ﷺ بغیر کسی کو اطلاع دیے مدینے کی طرف روانہ ہوگئے۔ کسی شخص نے انہیں مدینے میں داخل ہوتے دیکھ کر ان اصحاب کو جاکر اطلاع دی جو بنونضیر کی بستی میں ہی آپ ﷺ کے منتظر تھے۔ اصحاب کی واپسی کے بعد آپ ﷺ نے محمدؓ بن مسلمہ کے ذریعے تحدیدی پیغام روانہ فرمایا کہ بنونضیر دس [۱۰] دن کے اندر مدینہ خالی کردیں۔ پرامن طور پر مدینہ خالی کرنے کی صورت میں بنونضیر کو یہ رعایت بھی دی گئی کہ ان کے باغات پر ان کی ہی ملکیت تسلیم کی جائے گی اور ان کی پیداوار پر ان ہی کا حق ہوگا۔

بنونضیر میں مدینہ خالی کرنے کے معاملہ میں اختلاف پیدا ہوا۔ سلام بن مشکم اطاعت کے حق میں تھا، جبکہ حیی بن اخطب اس کے خلاف تھا۔ ابھی فیصلہ نہ ہو پایا تھا کہ رئیس المنافقین ابن ابی کا پیغام پہنچا کہ گھبرانا نہیں، ہم تمہارے ساتھ ہیں، اور بدوی قبائل مدینہ پر حملہ کرنے کو تیار ہیں۔ لہٰذا یہود نے تحدیدی پیغام کو مسترد کرکے قلعہ بندی کرلی۔ محاصرہ ہوا جو پندرہ دن قائم رہا۔ بنونضیر نے دیکھا کہ ابنِ ابی کچھ نہیں کررہا اور کوئی بدوی قبیلہ مسلمانوں کے خلاف نہیں اٹھ رہا تو ان کی ہمت پست ہوگئی۔ ادھر مسلمانوں نے ان کے باغات کے کھجور کے درخت کاٹنے شروع کردیے۔ ابھی صرف چھ درخت ہی کٹے تھے کہ بنونضیر کو اپنی شہ رگ کٹتی نظر آنے لگی کیونکہ باغات کے بغیر وہ زندہ نہ رہ سکتے تھے۔

مجبوراً انہوں نے باغات کی ملکیت باقی رکھنے کی شرط پر مدینے سے نکل جانے پر رضامندی ظاہر کی۔

لیکن چونکہ یہ رعایت یہود ابتدا میں ہی مسترد کرچکے تھے اس لیے اس کے اعادہ سے انکار کیا گیا۔ پھر ان کی درخواست

پر یہ اجازت دی گئی کہ اسلحہ کے سوا، جائیداد منقولہ لے کر اونٹوں پر نکل جائیں۔ یہود نے اپنا مال و اسباب، یہاں تک کہ کھڑکی دروازے تک اکھاڑ کر اونٹوں پر لاد دے، اور جان بچ جانے کی خوشی میں، جشن مناتے ہوئے گاتے بجاتے مدینہ چھوڑ گئے۔

صورتحال کا تجزیہ: اس واقعے کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن پر معاندین سخت تنقید کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو وجوہاتِ جنگ بیان کی جاتی ہیں وہ نہایت بودی اور کمزور ہیں، کہ سازش کا کوئی ثبوت نہیں، اور الزام کی بنیاد محض وحی ہے۔ [حالتِ جنگ میں کون سی مملکت اپنے دشمنوں کے خلاف کارروائی کے لیے ثبوت فراہم کرتی ہے؟] گویا وحی جو ہمارے لیے سب سے معتبر ذریعہ ہے، ان کے لیے غیر معتبر ہے۔ تعصب اگر انہیں وحی پر یقین کی اجازت نہ دے تو اس میں کسی غیر کا قصور نہیں۔ ہمیں بہرحال انبیائے بزرگ اور حضرت عیسیٰؑ کی وحی پر کوئی شک وشبہ نہیں کہ انہیں اپنی زندگی کے آنے والے ایام کے بارے میں جو علم ہوا وہ بذریعہ وحی ہوا۔ اگر دانیال نبی کی پیشینگوئیاں اور یوحنا عارف کے مکاشفات جو صدیوں کا احاطہ کرتے ہیں، صحیح ہو سکتے ہیں تو سازش کے بارے میں یہ وحی بھی غلط نہیں ہو سکتی۔

وحی سے قطع نظر کئی شواہد ایسے ہیں جو اس سازش پر پوری پوری روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۔ حضور ﷺ خوں بہا کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ دوسرا مقصد جو بیان کیا جاتا ہے کہ حلیف ہونے کی حیثیت میں بنونضیر اپنے حلیف بنو عامر سے اس قضیہ کو طے کرانے میں مدد دیں۔ ان دونوں معاملات میں صرف ہاں یا نا کا ایک لفظ کافی تھا۔ تاخیر کیوں کی گئی؟ یہ تاخیر کتنی زیادہ تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کافی انتظار کے بعد حضور ﷺ مدینے واپس تشریف لے آئے اور مدینے سے ایک شاہد نے جا کر اصحاب نبی کو انکی واپسی کی اطلاع دی۔ وہ بھی واپس آ گئے لیکن یہود کی یہ مشورت ختم نہیں ہوئی۔ یہودی ذہن اور سازش میں جو مناسبت ہے اس کے پیشِ نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ صرف وقت حاصل کیا جا رہا تھا کہ کچھ کر گزرنے کا کوئی موقع ہاتھ آ جائے، اور اس کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔

۲۔ دیوار پر سے پتھر گرا کر ہلاک کرنے کا طریقہ کار خالص یہودی طریقۂ کار ہے۔ جس کی مثالیں خیبر اور قریظہ کے محاصرے میں بھی ملتی ہیں۔ بنونضیر کے لیے الٹی میٹم غیر متوقع نہ تھا۔ ان میں دو گروہ تھے۔ ایک یقیناً اس سازش سے متفق نہ تھا اور اس کی مخالفت کے باعث ہی یہ تاخیر ہوئی ہوگی۔ لیکن دونوں گروہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کے ارادوں سے اگر مسلمان واقف ہو جائیں گے تو کیا ہوگا۔ اچنبھا تو انہیں صرف یہ ہوا ہوگا کہ راز مسلمانوں تک کیسے پہنچ گیا۔ اگر صورتحال غیر متوقع ہوتی یا یہود خود کو مجرم تصور نہ کرتے تو گفت وشنید کے ذریعے مصالحت کی کوشش ضرور کرتے۔ سلام بن مشکم اور حیی بن اخطب کے درمیان اطاعت قبول کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ زیرِ بحث نہ آتا۔

۳۔ مغربی تجزیہ نگاروں کے نزدیک صلحِ حدیبیہ تک حضور ﷺ کی پوزیشن مدینے میں مضبوط نہیں تھی۔ دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ،

''بدر اور جنگِ خندق کا درمیانی عرصہ ان کے لیے خاصا گراں رہا ہوگا۔قرآن میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم، کم از کم چالیس مرتبہ دیا گیا ہے۔شائد بار بار حکم کے باوجود لوگ پوری طرح اطاعت پر تیار نہ تھے اور اس پر اس لیے اصرار کیا جاتا رہا کہ اقتدار ان کے ہاتھوں میں پوری طرح مرکوز ہو جائے۔''**(Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.233)**۔

وہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ انصار کے رؤساء اب بھی مقتدر تھے۔اگر تجزیہ نگاروں کا تجزیہ درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔احد میں شکست ہو چکی ہے۔عرب قبائل دشمنی پر آمادہ ہیں۔ مدینے میں مسلم قوت کی ساکھ کو دھچکا لگ چکا ہے۔مسلمانوں میں بھی اقتدار ابھی مرکوز نہیں ہے۔ ان نازک حالات میں بنونضیر پر بلاوجہ فوج کشی کیسے ممکن ہو سکتی تھی۔خود یہودِ مدینہ، یہودِ خیبر، اور یہود کے بدوی اور مدنی حلیف اس زیادتی کو برداشت کیسے کر گئے۔یقیناً بنونضیر کے جرائم اس سازش کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔جس کے باعث ان کے خلاف اس کارروائی پر کوئی ردِّ عمل نہیں ہوا۔ اس کارروائی کے باعث مسلمانوں کا اقتدار مضبوط ہو رہا تھا، تو نہ صرف یہود بلکہ مشرکینِ قریش، منافقینِ مدینہ اور بدوی قبائل کے مفادات بھی مجروح ہو رہے تھے۔ان سب کی خاموشی اس امر کی دلیل ہے کہ بنونضیر اس سزا کے مستحق تھے۔خود بنونضیر بھی اپنے آپ کو مجرم سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ سلام بن مشکم اطاعت کا حامی نظر آتا ہے۔

۴۔ اس سازش کی تصدیق بنونضیر کے ایک فرد کے اس اقدام سے ہوتی ہے جو اس نے مسلمان ہونے کے بعد کیا۔ابنِ ہشام کے مطابق بنونضیر کے دو افراد نے اسلام قبول کیا۔ان میں سے ایک یامینؓ بن عمیر بن کعب تھے۔ایک موقع پر حضور نے یامینؓ سے کہا: ''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے [چچازاد] بھائی عمرو بن حجاش [بن کعب] نے میرے ساتھ کیا ارادہ کیا تھا''۔اس پر یامینؓ نے ایک شخص کو کچھ دے دلا کر عمرو بن حجاش کو قتل کروا دیا۔

(سیرۃ ابنِ ہشام، باب 'بنونضیر کی جلاوطنی' صفحہ ۲۰۷، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، لاہور، ۱۹۶۵)

پس وجوہات اتنی کمزور نہ تھیں جتنی مغربی علماء تصور کرتے ہیں۔منافقین کے گروہ ان ہی یہود کی شہہ پر قائم رہے۔پھر جیسے جیسے یہود کی قوت ختم ہوتی گئی، منافقین بھی کمزور ہوتے گئے۔بنونضیر کی دشمنی کا اندازہ کرنے کے لیے اتنا کافی ہوگا کہ مدینے سے اخراج ان کے لیے سبق نہ بن سکا۔انہوں نے خیبر میں قیام کیا اور وہاں سے مدینے کی تباہی کے سامان کیے۔انہوں نے جنگِ احزاب میں غطفان کو خیبر کی آدھی پیداوار کے عوض مدعو کیا۔ اس قبیلے کے سردار حییٰ بن اخطب نے مدینے کے آخری یہودی قبیلے بنوقریظہ کو حضور ﷺ سے غداری پر اکسایا اور بنوقریظہ کے ساتھ ان کے قلعے سے گرفتار ہو کر مارا گیا۔

بنوقریظہ کی غدّاری : بنوقریظہ بھی میثاقِ مدینہ کے شرکاء میں سے تھے۔مدینے کے جنوب میں ان کے قلعے تھے۔بنوقینقاع اور بنونضیر کے برخلاف ان کا معاہدۂ حلف اوس کے ساتھ تھا۔بنونضیر کی سرکشی کے درمیان

بنوقریظہ نے بھی حصہ لیا تھا لیکن اس وقت انہیں معاف کر دیا گیا تھا۔ جنگِ احزاب میں ابتداءً ان کا رویہ مصالحانہ تھا۔ خندق کی کھدائی کے لیے اوزار فراہم کر کے انہوں نے مسلمانوں کی مدد کی تھی۔ جنگِ احزاب میں مسلمانوں کو ان کی جانب سے حملے کا خدشہ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی پوری دفاعی قوّت احزاب کے مقابلے میں تعینات تھی۔ جنوب کی سمت بنوقریظہ اور مدینہ کے درمیان کسی رکاوٹ یا دفاعی قوّت کی تعیناتی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی۔ یہ صورتِ حال بنوقریظہ سے معاہدے پر دلالت کرتی ہے۔

جب احزاب نے مدینے کا محاصرہ کر لیا اور انہیں پیشقدمی کے لیے راہ نہ مل سکی تو جلاوطن قبیلہ بنونضیر کے سردار حُیَی بن اخطب نے اپنے ہم مذہب بنوقریظہ سے رابطہ قائم کیا اور انہیں کسی نہ کسی طرح غدّاری پر آمادہ کر لیا۔ حُیَی کے مقاصد ڈھکے چھپے نہ تھے۔ احزاب کا اجتماع اس کی اور قریش کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ تھا۔ شمالی قبیلہ غطفان اور اس کی شاخوں فزارہ، ثعلبہ، اشجع اور سُلیم کو وہی جنگ میں گھسیٹ کر لایا تھا۔ اس کی ساری محنت پر خندق نے پانی پھیر دیا تھا۔ ایسا عظیم اجتماع دوبارہ نہ ہو سکتا تھا۔ کامیابی کی شکل صرف یہ رہ گئی تھی کہ بنوقریظہ مدینے کے جنوب میں ایک نیا محاذ کھول دیں۔ یہ سمت صرف معاہدے کی بنیاد پر غیر محفوظ چھوڑ دی گئی تھی۔ چنانچہ بنوقریظہ نے احزاب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے گروہ مدینے کے گردونواح کا جائزہ لینے لگے۔ ایسا ہی ایک گروہ حضرت حسانؓ بن ثابت، شاعرِ نبوی کے قلعے تک جا پہنچا، جہاں عورتیں اور بچے مقیم تھے۔ اس کے ایک فرد کو جو قلعے کی دیوار تک آ پہنچا تھا، حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب نے ٹھکانے لگایا۔

بنوقریظہ کی عہد شکنی کی اطلاع حضور ﷺ کو ملی تو آپ نے ان کے حلیف قبائل کے سرداروں کو دریافتِ حال کے لیے بنوقریظہ کے پاس بھیجا۔ جب یہ لوگ پہنچے تو گفتگو دور دور سے ہی ہوئی۔ بنوقریظہ قلعے کے اوپر تھے اور ان کے حلیف قلعے سے باہر۔ یہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ بنوقریظہ اپنے حلیف سرداروں سے بھی منحرف ہو چکے تھے۔ انصار کے سرداروں نے بنوقریظہ کو یاد دلایا کہ ان کا حضور ﷺ سے معاہدہ ہو چکا ہے جس پر عملدرآمد کے وہ پابند تھے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ کون سے معاہدے کی بات کی جا رہی ہے اور یہ کس کے ساتھ ہوا تھا۔ محمد [ﷺ] کون ہیں۔ ان کے تو نام سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ [cf. Muir; Life of Mohammed, Vol III, p.259)۔ اس گفتگو نے صورتحال میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہنے دیا۔

وہ قبیلہ جو اپنے شہر کی مدافعت سے بے پروا رہا، جس کے قلعے میں حُیَی بن اخطب جیسا جنگی مجرم موجود تھا، جو مملکت کے سربراہ سے بھی ناواقف تھا، ایسا سربراہ جس نے سب سے پہلے امن وامان قائم کرنے کے لیے نہ صرف مدینے کے قبائل بلکہ گردونواح کے مشرک قبائل سے بھی معاہداتِ امن کر رکھے تھے، اس کے ساتھ کیے گئے معاہدے سے لاعلمی کا اظہار، مدینے کی اس نازک صورتحال میں یہودِ بنوقریظہ کی تخریبی سرگرمیاں، خود اپنے حلیفوں سے طعن وتشنیع، یہ ساری باتیں غدّاری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

چنانچہ احزاب کی پسپائی کے فوراً بعد بنو قریظہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ تاخیر کا نہ ہونا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ یہ محاصرہ صرف اس جنگ کی صورتحال کا نتیجہ تھا۔ پچیس دن کے محاصرے کے بعد بنو قریظہ نے اپنے قابلِ اعتماد حلیفوں سے مشورے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔

قبیلہ اوس سے بنو قریظہ کا معاہدہ حلف تھا۔ اس واضح غداری کے باوجود اوس کے کچھ لوگوں نے بنو قریظہ کی سفارش کی۔ حضور ﷺ نے بنو قریظہ کے مقدمے کو ان کے حلیف اوس کے سردار سعدؓ بن معاذ کے حوالے کیا تاکہ ان کے فیصلے کو اوس کے فیصلے کی حیثیت حاصل رہے اور مجرم کے حق میں یہ نہ کہا جا سکے کہ فیصلہ غیر جانبداری سے نہیں کیا گیا۔ جس طرح بنو قینقاع اور بنو نضیر کے معاملے میں خزرج کا خیال رکھا گیا تھا اسی طرح بنو قریظہ کا معاملہ اوس کے سپرد فرمایا۔

حضرت سعدؓ ابنِ معاذ جنگِ احزاب میں شدید زخمی ہو چکے تھے اور علالت کے باعث زخمیوں کے خیمے میں زیرِ علاج تھے۔ اوس نے جب ان کے حَکَم قرار پا جانے کا اعلان سنا تو ان کے خیمے میں پہنچ کر انہیں سواری پر بٹھایا اور مجمع عام میں لائے۔ راستہ بھر بنی اوس ان سے کہتے رہے کہ اے ابو عمر اپنے حلیفوں کے معاملے میں اچھا فیصلہ کرنا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اسی لیے حَکَم بنایا ہے کہ آپ ان کا اچھا فیصلہ کریں۔

جب ان کا اصرار بہت بڑھ گیا تو حضرت سعدؓ نے فرمایا ''درحقیقت سعدؓ کا وقت آ گیا ہے کہ وہ اللہ کے معاملے میں لوگوں کی ملامت کی پروانہ کرے''۔ (سیرۃ ابنِ ہشام، غزوہ بنو قریظہ، صفحہ ۴۲۵)۔ ان کا یہ جواب سن کر بہت سے لوگ اسی وقت کھسک لیے اور حضرت سعدؓ کے فیصلے سے قبل ہی بنو قریظہ کے قتل کی خبر مشہور کر دی۔ حضرت سعدؓ نے حاضرین سے اپنے فیصلے پر من وعن عمل درآمد کرنے کا وعدہ لیا اور پھر فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے مردوں کو قتل کیا جائے اور ان کے بچوں اور عورتوں کو قیدی بنا لیا جائے۔ یہ فیصلہ اسی دن ہوا جس دن بنو قریظہ نے ہتھیار ڈالے تھے، اور اس پر عملدرآمد دوسرے دن ہوا۔ قتل کیے جانے والوں میں حیی بن اخطب بھی تھا۔

ابنِ ہشام کے برخلاف دوسرے مورخین و محدثین (ابن سعد اور امام بخاری) نے تحریر کیا کہ حضرت سعدؓ کو خود بنو قریظہ نے اپنا حَکَم بنایا تھا۔ کچھ مغربی اہلِ قلم نے اس فیصلے پر سخت لے دے کی ہے۔ انہوں نے فیصلے کو وحشیانہ اور غیر انسانی قرار دیا ہے۔ یہ تہمت بھی دھری ہے کہ سعدؓ بن معاذ کا انتخاب محض مطلق العنانی کو چھپانے کے لیے کیا گیا تھا۔ نیز یہ کہ ان کا فیصلہ آزاد نہیں تھا بلکہ دباؤ کے تحت تھا۔ یہ سب محض انکی ذہنی اپج ہے۔ ورنہ یہود قبائل کے فیصلوں میں ہمیشہ ان کے حلیف انصار قبائل کی رائے کا احترام کیا گیا۔ حضرت سعدؓ کا آخری وقت تھا۔ آخری وقت میں انسان کے پیشِ نظر دنیاوی مصلحتیں نہیں رہ جاتیں، بلکہ صرف آخرت کی مصلحت ہوتی ہے۔ لہٰذا حضرت سعدؓ نے وہی فیصلہ کیا جو ان کے نزدیک انصاف تھا۔ نیز ایسی کوئی سند نہیں ملتی کہ ثالث مقرر کیے جانے کے بعد سے فیصلے کے اعلان تک حضور ﷺ نے حضرت سعدؓ سے ملاقات فرمائی ہو، جب کہ اس تمام عرصے میں اوس انہیں گھیرے رہے۔ اور حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے ہی اوس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ حضرت سعدؓ کیا فیصلہ کرنے والے تھے۔ فیصلے کے بعد بنو قریظہ کو قتل کرنے کی ذمہ داری

بھی اوس نے ہی پوری کی۔ بنو قریظہ کو جو سزا دی گئی وہ خود ان کی شریعت نیز مروّجہ عالمی قوانین کے عین مطابق تھی۔

[صلحِ حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کے طرزِ عمل سے، جس میں انہوں نے حضور ﷺ کے قربانی کرنے کے حکم کو نظر انداز کیا، جس سے حضور ﷺ دل گرفتہ ہوئے، نیز فتح مکہ کے بعد مولّفۃ القلوب کو مال دینے پر انصار کے طرزِ عمل سے یہ بات انتہائی واضح ہے، کہ عربوں کو اپنے جذبات کے اظہار پر قابو نہیں تھا، اور وہ ایسے معاملات میں بھی جو واضح طور پر اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی جانب سے تھے، احتجاجی رویّہ اپنا سکتے تھے۔ پس اگر یہودِ بنی قریظہ کے ساتھ کوئی زیادتی ہو رہی ہوتی تو ان کے مسلمان حلیف یقیناً احتجاج کرتے۔ بعض مسلمانوں کی طرف سے یہود کے حق میں سفارش صرف اوس کی ناک اونچی رکھنے کے لیے تھی، ورنہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ انکا جرم کتنا قبیح تھا۔]

بنو قریظہ کے انجام کے ساتھ ہی مدینے سے بدامنی اور فساد کا قلع قمع ہو گیا۔ یہود اب بھی مدینے میں باقی تھے، لیکن وہ پرامن شہری تھے جن سے کبھی کوئی تعارض نہ کیا گیا۔ یہودِ مدینہ کے خلاف جو بھی کارروائی کی گئی، وہ امن وامان کے قیام اور حالات کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے تھی۔ اس کے پیچھے کوئی متعیّنہ پالیسی یا نسلی دشمنی وغیرہ کے جذبات نہ تھے۔

فتحِ خیبر: خیبر مدینے کے شمال میں پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر یہود کی ایک بستی تھی جو کئی مضبوط قلعوں پر مشتمل تھی۔ مسلمانوں نے خیبر کے معاملات میں کبھی کوئی مداخلت نہ کی تھی۔ اس کے برعکس خیبر نے ہر طرح سے مدینے کے معاملات میں دخل اندازی کی۔ جب مدینے کے یہود خاموش ہوئے تو خیبر کے یہود مخالفت میں پیش پیش ہو گئے اور مدینے کی تباہی کے منصوبے بنانے لگے۔ ان کے وفود قریش کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ہی اجتماعی حملے کا منصوبہ بنایا اور قریش کو اپنے حلیفوں کے ساتھ مدینے پر حملہ کرنے پر آمادہ کیا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ جنگِ خندق سے قبل قریش اپنی بت پرستی پر توحید کی فضیلت محسوس کرنے لگے تھے، اور یہی احساس جنگی کارروائی میں حائل ہو رہا تھا۔ محض شعلۂ جنگ بھڑکانے کے لیے اہلِ خیبر نے قریش کو یہ باور کرایا کہ ان کی بت پرستی توحید سے اعلیٰ اور ارفع تھی۔ جب قریش کا جنگی پروگرام مرتب ہو چکا تو یہ خیبر لوٹے۔ اپنی دولت پانی کی طرح بہائی کہ ہمسایہ عربوں کو جنگ پر ابھار کر مدینے کو تاخت وتاراج کریں۔

یہودِ خیبر نے غطفان کی چار ہزار کی جمعیت کے ساتھ احزاب میں شرکت کی۔ قریش کے ساتھ ساتھ انکا مدینے پہنچنا، جنگی پروگرام سے واقفیت اور اس کی ترتیب میں شرکت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ انہوں نے نہ صرف بیرونی عوامل سے مدینے پر حملہ کرانے کی منصوبہ بندی کی بلکہ مدینے میں موجود یہودِ بنو قریظہ کو بھی غداری پر آمادہ کیا۔ اگر اللہ تعالیٰ انکا منصوبہ ناکام نہ بنا دیتا تو اسلام کی بیخ کنی میں انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

انہیں بھی پورا پورا اندازہ تھا کہ ان کی یہ بے راہروی ایک نہ ایک دن رنگ لائے گی۔ اس صورتحال کے پیشِ نظر یہودِ خیبر نے یہ طے کیا کہ بدوی قبائل سے مدینے پر حملے کروائے جائیں، تاکہ مدینے کو خیبر کی طرف

رخ کرنے کی فرصت نہ مل سکے۔ بنو سعد اور بنو غطفان کو لالچ کے بل پر اپنا ہمنوا کیا۔ چنانچہ بنو غطفان کے چھاپے مدینے پر پڑنے لگے۔ عیینہ بن حصن فزاری کے سواروں نے مدینے کی چراگاہ پر چھاپا مارا، حضور ﷺ کے اونٹ پکڑے، اونٹوں کے نگراں کو قتل کیا اور اسکی بیوی کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد بنو غطفان کے متعدد عسکری اجتماعات کی اطلاعات ملیں جن کی سرکوبی کے لیے الغابہ، امِ قرفہ، الجموم، وادی القریٰ اور فدک کی مہمیں روانہ کی گئیں۔

صلح حدیبیہ کے بعد شمال سے حملے کے خدشات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ جب حضرت عمرؓ کو ان کے ہمسائے نے واقعہ ایلاء کی اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ غضب ہو گیا تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ کیا بنو غطفان نے حملہ کر دیا؟ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بات چیت کے ذریعے خیبر والوں کو امن قائم کرنے کی دعوت دی۔ خیبر سے یہود کا ایک وفد بات چیت کے لیے اسیرم یا یسیرم نامی فرد کی سرکردگی میں حضرت عبداللہؓ بن انیس کے ہمراہ روانہ ہوا۔ راستہ میں اسیرم نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کی تلوار چھیننا چاہی جس کے باعث نزاع پیدا ہو گیا۔ وفد کے ارکان اور مسلمانوں میں لڑائی ہوئی، جس میں اسیرم اور اس کے ساتھی ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد ہی اطلاع ملی کہ بنو غطفان کا اجتماع ہو رہا ہے چنانچہ خیبر کی جانب تیزی سے اقدام کیا گیا۔ قبیلہ سعد پر چند ماہ پہلے ہی حملہ ہو چکا تھا جس کے باعث اس کے کس بل نکل چکے تھے چنانچہ وہ تو مدد کو نہ پہنچا۔ بنو غطفان اپنی جمعیت لے کر خیبر کی جانب بڑھے، لیکن مسلمانوں کی عسکری نقل و حرکت کچھ اس قسم کی دیکھی کہ اپنے ہی علاقے کی مدافعت کرنے کے لیے الٹے پاؤں لوٹے اور مسلمانوں نے خیبر کے تمام قلعے یکے بعد دیگرے فتح کر ڈالے۔

اس طرح یہودِ خیبر نے خود اپنی تباہی کے بیج بوئے، اس کی آبیاری کی اور پھر اسکا ثمر انہیں مل گیا۔ انہوں نے نہ صرف عرب سیاست میں خود غرضانہ حصہ لیا بلکہ بلاوجہ اسلام کی راہ میں حائل ہوئے۔ دینِ اسلام سے تو وہ متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے عقیدے کی رو سے بنی اسرائیل سے باہر کوئی نبی نہیں آ سکتا تھا۔ تاہم وہ خود کو اسلام دشمنی سے باز ضرور رکھ سکتے تھے۔ جب وہ اسلام کو مٹانے کے درپے ہوئے تو اسکے نتیجے میں مسلمانوں نے ان کے خلاف کارروائی کی۔ وہ اسلامی معاشرے اور اسلام کے لیے خطرہ بن کر ابھرے اور کیفرِ کردار تک پہنچے۔ وہ اپنی تباہی کے خود ذمہ دار تھے۔ اس میں کسی اور کو ملوث کرنا محض ایک خود فریبی ہے۔

واقعاتِ خیبر کا تجزیہ: یہی وہ واقعات ہیں جنہیں مغرب توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے، اور خونریزی کی تہمت لگاتا ہے، سنگدلی کا طعنہ دیتا ہے، جس کی بنیاد یہود کے ساتھ سلوک پر رکھی جاتی ہے۔ سنگدلی کی تہمت لگانے والوں کی نظروں میں یہود کی حرکتیں معیوب نہیں ہیں۔ بدر کے اسیروں، بنو قینقاع اور بنو نضیر کی جاں بخشی، مکہ کی پرامن فتح اور حنین کے اسیروں کے ساتھ فراخدلانہ برتاؤ، بچوں کے ساتھ شفقت، اور لوگوں کی سنگین خطاؤں سے درگزر کے واقعات جو اس امر کا ثبوت ہیں کہ فطرتِ نبوی کو سنگدلی اور خونریزی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، انہیں نظر نہیں آتے۔ دیرینہ دشمنوں کی معافی کسی سنگدل کا کام نہیں ہو سکتا۔

عجیب منطق ہے کہ جو عمل وہ خود اپنے لیے جائز قرار دیتے ہیں وہی عمل مسلمانوں کے لیے ناجائز ہوتا ہے۔ مغرب نے خود ساختہ قوانین بنا رکھے ہیں اور ان خود ساختہ قوانین کی ہی روشنی میں وہ دوسروں کو

جانچتے ہیں۔ مقدمے کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیتے ہیں اور بقیّہ کارروائی محض فیصلے کی صحت ثابت کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ کبھی انکی مذہبی اقدار کو قانون کا درجہ میسّر آ جاتا ہے تو کبھی سیاست اور فلسفہ کی اقدار بنیاد بنائی جاتی ہیں۔ کبھی مغربی اخلاق کسوٹی بن جاتے ہیں۔ مقصد صرف ایک ہوتا ہے کہ بہرطور ایک شخصیّت کو مطعون کیا جائے۔ اگر ان ہی کی منطق کا ان کے اپنے بزرگوں پر اطلاق کیا جائے تو کوئی شخصیت بھی حاشا وکلا انسانیت کے معیار پر پوری نہ اتر سکے گی۔

خونریزی جو ناحق و بدونِ استحقاق کی جائے، بلا شبہ ایسا فعل ہے جسے سراہا نہیں جا سکتا۔ لیکن باطل کی قوّت سے ٹکرانا اور اسے بزورِ بازو دفع کرنا اور حق کے لیے سینہ سپر ہو جانا خونریزی کی تعریف میں نہیں آتا۔ اگر یہ بھی خونریزی کی تعریف میں آتا ہے تو بلا استثنیٰ عہد نامۂ قدیم کے تمام کردار متّہم ہوں گے۔ دونوں عہد ناموں کا خدا ایک ہی ہے۔ عہد نامۂ قدیم میں وہ رب الافواج ہے۔ نہ صرف جنگ کا حکم دیتا ہے بلکہ خود بھی اس میں حصّہ لیتا ہے۔ جوشِ مخالفت میں کیا خود اپنے خدا کو متّہم کرنے کی حماقت کی جا سکتی ہے؟ خدا کا حکم ابدی ہوتا ہے اور عام ہوتا ہے۔ اگر وہ حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کو اذنِ جہاد دیتا ہے تو یہی اذنِ جہاد ختمی مرسلت ﷺ کے لیے کیوں باعثِ تعجب ہے؟ عیسائیّت کو اگر یہ اذن میسّر نہیں تھا تو کلیسا نے اس کی کمی دور کر دی۔ پتہ نہیں کلیسا کا یہ عمل ان کے خدا کی مرضی کے مطابق تھا یا اس کے خلاف۔

عیش کوشی

عیش کوشی اور نفس پرستی کے شدید اتہامات سے مغربی لٹریچر پُر ہے۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی کی جس غلیظ زبان میں یہ اتّہامات قلمبند کیے گئے ہیں ان کا اعادہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بے بنیاد الزامات اس کثرت اور شدّت سے پائے جاتے ہیں کہ کارلائل کو کہنا پڑا،

"We shall err widely if we consider this man as a common voluptuary; intent mainly on base enjoyments,nay on enjoyment of any kind."

(Thomas Carlyle; On heroes and Hero-Worship, p. 65)

[ہم بہت بڑی غلطی کریں گے اگر ہم ان صاحب کو ایک ایسا عام لذّت پسند شخص گردانیں گے، جو بنیادی طور پر گھٹیا عیش کوشی پر مائل ہو (جبکہ وہ) کسی بھی قسم کی لطف اندوزی سے گریز کرتے تھے۔]

معاندین نے یہ نظریہ عام کیا کہ ابتدا ہی سے مطمحِ نظر دنیاوی اقتدار تھا۔ اور جب یہ اقتدار میسّر آ گیا تو (نعوذ باللہ) ممکنہ دادِ عیش دی۔ یہ دعویٰ اور نظریہ ہی بنیادی طور پر بے حقیقت ہے۔ ختمی مرتبت ﷺ کا دورِ رسالت شروع ہوا تو عمر شریف چالیس [۴۰] سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ عیش کوشی کی عمر تو چالیس [۴۰] سال سے قبل کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد تو ایک عام شخص کے کردار میں بھی پختگی آ جاتی ہے۔ بدکردار افراد کے کردار میں بھی ٹھہراؤ

آ جاتا ہے۔ نیک کردار پختہ ہو جاتا ہے اور اس میں کسی کجی کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ تیرہ سالہ [۱۳] مکی دور معاندین کو بھی تاباں نظر آتا ہے۔ اس پورے دور میں ایک جانکاہ جدّ وجہد کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہجرت کے بعد کم از کم چھ [٦] سال یعنی صلحِ حدیبیہ تک بادِ مخالف کے تند و تیز طوفان اٹھتے رہے، جنہوں نے سکون درہم برہم کر رکھا تھا۔ ایک طرف معاشرے کی تطہیر و تعمیر، دوسری جانب قلیل وسائل کے ساتھ اس جدید معاشرے کا اندرونی اور بیرونی خطرات سے دفاع، ایسے مشاغل تھے جو ایک لمحے کی مہلت نہ دیتے تھے۔ صلحِ حدیبیہ ہی حیاتِ طیبہ کا وہ سنگِ میل ہے جس کے بعد حالات پوری طرح قابو میں نظر آتے ہیں۔ اس وقت عمر شریف انسٹھ [۵۹] سال کی ہو چکی تھی۔ اگر کسی عیش و عشرت کا امکان ہو سکتا ہے تو اس کے بعد کے آخری ایام میں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آخری ایام بھی شدید جدّ و جہد کے ایام ہیں۔ فتحِ خیبر، فتحِ مکہ، جنگِ حنین، محاصرہِ طائف، جعرانہ کی مصروفیات، غزدہِ تبوک، کئی چھوٹی مہمات، وفودِ عرب، حجۃ الوداع، جیشِ اسامہ کی تیاری، یہ سب آخری چار برسوں کی مصروفیات ہیں۔ نہ جانے ان ایام میں معاندین کو عیش و عشرت کے کون سے آثار ملے جن کی بنیاد پر انہیں اس دعوے کی جرأت ہوتی ہے۔

عہدِ نبوی کے تمام راوی، ابتدائی مورّخین و محدّثین و سیرت نگار اس امر پر متفق ہیں کہ حضور ﷺ کی زندگی سادگی کا پیکر تھی۔ تمام گھریلو کام دستِ مبارک سے انجام پاتے تھے۔ اپنا لباس خود پیوند فرماتے۔ اپنے نعلین کی خود مرمّت کر لیتے۔ گھر میں امّہات المومنین خود اپنے ہاتھوں سے کام کاج کرتیں۔ دخترِ دلبند کے ہاتھ چکّی پینے سے خوں چکاں رہتے۔ رہائش گاہ تک پختہ نہ تھی۔ سخت اور کھردرے بستر پر آرام فرماتے۔ کھجور کی چھال بھرا تکیہ اور گدّا سامانِ راحت تھا۔ کھجور کی چٹائی فرشِ استراحت تھی۔ کبھی شاہانہ لباس نہ استعمال فرمایا۔ ریشم کو نہ صرف اپنی ذات بلکہ تمام مسلمان مردوں کے لیے ممنوع قرار دیا۔ اوڑھنے کے سامان میں ہمیشہ کالی کملی کا ہی تذکرہ کیا گیا۔ سفر کے لیے صرف ایک خیمہ تھا۔ غسل خانے میں صرف ایک برتن پتھر کا اور ایک ٹب لکڑی کا تھا۔

دربارِ نبوی میں آرائش و تزوین نام کی کوئی شے نہ تھی۔ نہ تخت تھا نہ تاج۔ کچی مسجد کے ناپختہ صحن میں زمین پر یہ دربار لگتا۔ فخرِ سلاطین فرشِ زمین پر، کھجور کے ستون کے سہارے جلوہ فرما ہوتے۔ نہ فرش تھا نہ پردے۔ مسجد اور حجروں کی چھت کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی جو بمشکل سات فیٹ بلند ہوگی۔ ریاستی خزانے کا کوئی وجود ہی نہیں تھا تو خازن و نگراں کا کیا سوال۔ دولت آتی تو صحنِ مسجد میں ڈھیر کر دی جاتی جو فی الفور مستحقین میں تقسیم کر دی جاتی۔ مطبخِ شاہی نام کی کوئی شے نہ تھی۔ زندگی فقر و فاقے میں بسر ہوئی، ہر آنے والا دن رزق اپنے ساتھ لے کر آتا۔ وصال ہوا تو ترکے میں ایک درہم نہ چھوڑا۔ گھر میں کھانے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ ورثے میں چند تلواریں، زرہیں، نیزے، خود، ڈھال اور چند مویشی چھوڑے۔ نہ کوئی ذاتی جائداد تھی نہ مال و دولت۔ صرف ایک نام اللہ کا تھا جو اپنے ورثاء کے لیے چھوڑ گئے۔

عیش و عشرت کا ثبوت سامانِ تعیّش ہوتے ہیں، جن کا حیاتِ پاک میں کوئی وجود نہیں ملتا۔ مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں سوائے فقر و بے نیازی کے کسی اور کیفیت کا تصوّر تک نہیں پیدا ہوتا۔ کیا یہی

وہ عیش تھا جس کی خاطر اقتدار کی طلب تھی اور جسے حاصل کرنے کے لیے ساری زندگی جدّ و جہد کی گئی۔ اس قسم کا ہر دعویٰ محض کذب، افتراء، بہتان، اور تہمت تراشی ہے۔

کثرتِ ازدواج

جنس کے بارے میں عیسائی نظریات یہ ہیں کہ جنس ہر صورت میں ایک سفلی جذبہ ہے۔ تاہم انسانی فطرت کی کمزوری کے پیشِ نظر نکاح کی صورت میں قابلِ معافی ہے۔ سینٹ آگسٹائن اس معاملے میں اس قدر شدّت برتتا ہے کہ اس کے نزدیک مباشرت خواہ منکوحہ کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، ناجائز اور سفلی حرکت ہے۔ (Radhakrishnan; Religion in a Changing World, p.114)۔ سینٹ پال کا عقیدہ ہے کہ انسانی محبت خدا کی محبّت کی رقیب ہے اور اسے خدا کے قرب و معیّت سے محروم کرتی ہے۔ جنس کے معاملے میں اسی شدّت کے باعث ینگ کو کہنا پڑا کہ عظیم مذاہبِ عالم میں عیسائیت کو حقیقی طور پر 'دشمنِ حیات' مذہب قرار دینا چاہیے۔

(Radhakrishnan; Religion in a Changing World, p.115)

اس شدّت کا عہد نامۂ قدیم و جدید سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔ اس کے برعکس عہد نامۂ قدیم افزائشِ نسل کی ہمّت افزائی کرتا ہے اور قطعِ نسل کو ایک قابلِ تعزیر گناہ قرار دیتا ہے۔

''تب یہوداہ نے اونان سے کہا کہ اپنے بھائی کی بیوی کے پاس جا اور دیور کا حق ادا کر، تا کہ تیرے بھائی کے نام کی نسل چلے۔ اور اونان جانتا تھا کہ یہ نسل میری نہ کہلائے گی۔ سو یوں ہوا کہ جب وہ اپنے بھائی کی بیوی کے پاس جاتا تو نطفہ کو زمین پر گرا دیتا کہ مبادا اس کے بھائی کے نام سے نسل چلے۔ اور اس کا یہ کام اس کے بھائی کی نظر میں بہت برا تھا۔ اس لیے اس نے اسے بھی ہلاک کیا۔'' (پیدائش، باب ۳۸، ۹ تا ۱۱)

عیسائیت کی اس شدّت کا تعلّق جب ان کی مذہبی کتب سے نہیں تو یہ نظریات یا تو معاشرتی ہیں یا پھر قدیم بت پرست مذاہب سے مستعار لیے گئے ہیں۔ مغرب کے پس منظر میں ہم نے دیکھا کہ رومن معاشرہ، ثقافت کے اعتبار سے یونان کا شاگرد تھا۔ رومی مذہب کی کوئی تحریری کتاب نہیں تھی۔ انہوں نے یونانی فکر کو اپنے عقائد کی بنیاد بنایا۔ رومی دیوی دیوتاؤں کا جو تذکرہ لاطینی شعراء نے کیا ہے وہ سب کے سب یونان سے مستعار ہیں۔ (Montgomery Watt; Truth in the Religions, p.31)۔ جب دیوی دیوتا مستعار لیے گئے تو ان سے متعلّق عقائد و تعلیمات بھی در آئیں۔ یونان میں ازمنۂ قدیم سے تجرّد کو ایک صفتِ عالیہ کا درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ مورّخ ہیرودوتس نے ایک فرقے 'اگریپائی' کا ذکر کیا ہے، جو عیسائیت سے بہت قبل ایروشیائی علاقوں میں پایا جاتا تھا اور رہبانیت کی زندگی بسر کرتا تھا۔

(Herodotus, quoted by Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. II, p.28)

ایروشیا کی سرزمین کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ یہی علاقہ آریہ نسل کا وطن تھا۔ یہیں سے آریہ مختلف سمتوں میں پھیلے۔ یہیں سے ایک شاخ ایران اور اس کے بعد ہندوستان پہنچی اور ایک اور شاخ نے مغرب کا رخ کیا جن کی نسل سے یونانی اور جرمن اقوام ہیں۔ چونکہ آریہ [کے مذہبی طبقے] تجرد اور ترکِ دنیا کے سختی سے قائل تھے اس لیے وہ جہاں کہیں گئے وہاں ان نظریات کو مذہبی حیثیت ملی۔ چنانچہ ہندوستان میں سنیاس، ایران میں مانکیت اور مغرب میں رہبانیت، یہ سب قدیم بت پرست آریاؤں کے اثرات ہیں۔ آریائی بت پرست مذاہب میں تجرد کو تقدس کا لازمہ تصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ سامی مذاہب میں ترکِ دنیا اور تجرد کو مذہبی تقدس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

چھٹی صدی قبلِ مسیح میں جب بخت نصر نے یہود یہ کو فتح کیا تو یہود کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو اسیر کر کے بابل لے گیا جہاں سے ان کی واپسی پچاس [۵۰] سال کے بعد ہوئی۔ اس عرصہ میں ایک پوری نسل ختم ہوگئی، دوسری نسل بھی بوڑھی ہوگئی اور تیسری نسل جوان ہوئی۔ جوان نسل کا مقامی فکر و نظریات سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ یہود میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا جو عقیدے کے اعتبار سے قدیم مذہب یہود سے قطعاً مختلف تھا۔ یہ فرقہ ایسینی (Essene) کہلاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے دور میں بحرِ ملح کی ترائیوں میں یہ لوگ بکثرت پائے جاتے تھے۔

یہ فرقہ سورج کی پرستش کرتا تھا۔ بستیوں کی بود و باش ترک کر کے جنگلوں میں زندگی بسر کرتا تھا۔ ان میں کسی عورت کا گزر نہ تھا۔ ان کے عقائد و نظریات، اغراض و مقاصد، راز ہائے سربستہ تھے۔ بدترین تشدد بھی ان کے لب وا نہ کرا سکا۔ تجرد، خود آزاری، نفس کشی اور جذبات سے بیگانگی ان کے اصول تھے جن پر یہ سختی سے کاربند رہتے تھے۔ ان اصولوں کی خلاف ورزی کی سزا، ذات برادری سے اخراج تھی۔ جس کے بعد مجرم صرف جڑی بوٹیوں پر گزر بسر کر سکتا تھا اور آہستہ آہستہ موت سے ہمکنار ہونا اس کا مقدر ٹھہرتا تھا۔

(cf. Fouard, Abbe Constant; The Christ The Son Of God, p.8)

اس فرقے کو عقائد اور عمل کے اعتبار سے عہد نامۂ قدیم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ سورج پوجا، سنیاس، جذبات کشی، تجرد، یہ سب کے سب آریائی مذاہب کے عناصر ہیں۔ پس یہود کے اس فرقے نے بابل کے قیام کے دوران مانکیت سے یہ اثرات قبول کیے ہونگے۔

۱۹۴۷ء میں بحرِ ملح کے خریطوں کی دریافت نے یہ واضح کر دیا ہے کہ عیسائیت حقیقتاً یہودی فرقے ایسینی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ **(Radhakrishnan; Religion in a Changing World, p.38)**۔

لہٰذا کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ تجرد اور رہبانیت محض معاشرتی اثرات اور بت پرستوں سے مستعار نظریات ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰ مجرد اور محصور تھے۔ ورنہ ان کی اپنی تعلیمات کا ان نظریات سے کوئی تعلق نہیں۔ حضرت عیسیٰ کے برعکس تمام انبیائے بنی اسرائیل متاہل تھے، اور تجرد کی جانب عہد نامۂ قدیم میں کوئی اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔

یک زوجگی : تجرد سے گہرے شغف کی بدولت عیسائیت کے ارباب حل وعقد نے بادلِ ناخواستہ معاشرے کو یک زوجگی کی اجازت دی۔ یہی معاشرتی قدر رفتہ رفتہ عقیدے کی شکل اختیار کر کے جزوِ مذہب بن گئی۔ تاریخی اعتبار سے ایام قدیم میں یک زوجگی کو مشرقِ وسطیٰ، مصر، ایشیائے کوچک اور یونان میں معاشرتی یا قانونی حیثیت حاصل نہ تھی۔ تعددِ ازواج بزرگانِ بنی اسرائیل میں عام بات تھی۔ قدیم یونان میں اس کا تذکرہ پلوٹارک نے کیا ہے۔ افلاطون نے تعددِ ازدواج کی حمایت کی ہے۔ [John Davenport; An Apology for Mohammed and Quran, p.154] صرف قدیم رومن تھے جو یک زوجگی کے قائل تھے، تاہم ان میں بھی تعدد پر پابندی نہ تھی۔ متعدد شاہانِ روم کی ایک سے زیادہ بیویاں پائی جاتی ہیں۔ تعددِ ازواج کو روم میں قانوناً ۳۹۳ء میں ممنوع قرار دیا گیا۔ (Ibid, p.155)۔ لیکن شہنشاہ ولنتائین کے عہد میں ایک فرمان کی رو سے مملکت کے باشندوں کو پھر سے تعددِ ازواج کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ نویں صدی عیسوی تک مغربی شہنشاہوں کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوا کرتی تھیں۔ پپاں اور شارلمین کی ایک سے زائد بیویاں بیان کی جاتی ہیں۔

کلیسا کی قدغن : یک زوجگی یا تعددِ ازواج کے مسئلے پر تمام اناجیل گنگ ہیں۔ اناجیل سے جس مسئلے کا حل نہیں ملتا اصولاً اس مسئلے کے حل کے لیے عہد نامۂ قدیم سے رجوع کرنا چاہیے۔ پال کے خطوط، (گلتیون، باب ۳، درس ۱۰)، (رومیوں، باب ۳، درس ۲۱-۲۲) اور (باب ۶، درس ۱۵) وغیرہ سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ نے خود کوئی شریعت نہیں دی، بلکہ شریعت سے نجات دلائی۔ پال بانگِ دہل شریعت کو لعنت قرار دیتا ہے۔ پال کے برخلاف حضرت عیسیٰ نے فرمایا،

''یہ نہ سمجھو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ تورات سے ہرگز نہ ٹلے گا'' (متی، باب ۵، درس ۱۷-۱۸)

پس اگر پال کو صادق مانا جائے تو عیسائی شریعت کا وجود نہیں لہٰذا یک زوجگی کو شرعی عقیدے کی حیثیت حاصل نہیں ہوسکتی اور اگر حضرت عیسیٰ کے فرمان کے مطابق شریعتِ تورات منسوخ نہیں بلکہ اس کا ایک ایک لفظ رائج ہے تو شریعتِ تورات میں تعددِ ازواج کی واضح اجازت موجود ہے۔

(استثناء، باب ۲۱، درس ۱۵-۱۶)، کی تحریر حسبِ ذیل ہے۔

''اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں، ایک محبوبہ اور دوسری غیر محبوبہ، اور دونوں سے لڑکے ہوں اور پہلوٹا بیٹا غیر محبوبہ سے ہو، تو جب وہ اپنے بیٹوں کو مال کا وارث کرے تو وہ محبوبہ کے بیٹے کو غیر محبوبہ کے بیٹے پر، جو فی الحقیقت پہلوٹا ہے، فوقیت دے کر پہلوٹا نہ ٹھہرائے''۔

اسی طرح ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت (خروج، باب ۲۱، درس ۱۰)، سے بھی ثابت ہے کہ ''اگر وہ دوسری عورت کرلے تو بھی اس کے کھانے اور کپڑے کے فرض سے قاصر نہ ہو''۔

ایک سے زیادہ بیویوں کا شرعی جواز تو مندرجہ بالا حوالوں سے ناقابلِ تردید ہے، لیکن ان کی تعداد کے بارے میں عہد نامۂ قدیم نے کوئی حد مقرر نہیں کی۔ صرف (استثناء، باب ۱۷، درس ۱۷) میں بادشاہ کے لیے ممانعت ہے کہ، "اور وہ بہت سی بیویاں نہ رکھے تا نہ ہو کہ اس کا دل پھر جائے اور نہ وہ اپنے لیے سونا چاندی ذخیرہ کرے"۔

خط کشیدہ الفاظ میں کس قدر لچک ہے، گویا فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔ عام آدمی ظاہر ہے کہ اپنی حیثیت سے تجاوز نہیں کر سکتا، لہٰذا صرف بادشاہ پابند کیے گئے ہیں۔ جس طرح سونے چاندی کے ذخیرہ کی مقدار کا تعین نہیں ہے اسی طرح حقیقتاً شریعتِ موسوی میں تعددِ ازواج کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جدولِ ذیل انبیائے بنی اسرائیل کی تعدادِ ازواج کی کیفیت کو نمایاں کرنے میں ممد ہوگا۔ یہ تعداد عہد نامۂ قدیم کی روایات پر مبنی ہے۔

جدولِ ازواجِ انبیائے بنی اسرائیل

اسمِ گرامی	تعدادِ ازواج	اسمائے ازواج	کیفیت وحوالہ
حضرت ابراہیمؑ	۳	بی بی ہاجرہ، بی بی سارہ اور بی بی قطورہ	پیدائش، باب ۲۱ اور باب ۲۵
حضرت یعقوبؑ	۴	بی بی راخیل، بی بی لیاہ، کنیز بلہاہ اور کنیز زلفہ	پیدائش، باب ۲۹، ۲۵ تا ۲۸
حضرت موسیٰؑ	۲	بی بی صفورہ اور ایک کوشی خاتون؛ کنیزیں نامعلوم، جنگی اسیروں میں سے حسبِ منشاء خواتین کو کنیز بنانے کی اجازت تھی۔	خروج، باب ۲، ۲۲؛ گنتی، باب ۱۲، ۱ استثناء، باب ۲۱، ۱۰ تا ۱۳
حضرت داؤدؑ	۱۰	شومیت ابیشاگ؛ میکل، اخنویم؛ یزرعیلی، ابجیل، معکہ؛ حجیت، ابیطال، عجلا دسویں کا نام معلوم نہیں؛ بہت سی ایسی تھیں جنکی تفصیل نہیں ملتی (سموئیل باب ۵-۱۳) ان کے علاوہ دس حرم تھیں۔	سلاطین، باب ۱-۳ سموئیل، باب ۱۹-۱۱؛ باب ۲۷-۲ سموئیل، باب ۲-۲ و باب ۲-۳ سموئیل، باب ۲، ۴ تا ۵ تعداد کے لیے سموئیل، باب ۱۵-۱۶ سموئیل، باب ۲۰-۳
حضرت سلیمانؑ	۷۰۰	سات سو بیویاں اور تین سو حرم	سلاطین، باب ۱۱-۳

حضرت عیسیٰؑ کے تجرد سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی نگاہ میں تعددِ ازواج مکروہ تھا۔ انجیل متی باب ۲۵ میں انہوں نے ایک تمثیل بیان فرمائی جس میں ایک دولہا سے پانچ کنواریوں کی شادی کا ذکر پایا جاتا ہے۔

باب ۲۳ ، میں ایک اور طویل تمثیل بیان ہوئی جس میں خود یہواہ دو بہنوں آہولہ اور آہولیبہ کو امتثالاً اپنی بیویاں قرار دیتا ہے۔ یہ تمثیلیں واشگاف الفاظ میں واضح کرتی ہیں کہ خدائے تورات یہواہ اور حضرت عیسیٰ کے نزدیک تعدّدِ ازواج میں کوئی کراہت نہ تھی۔

ثابت ہوا کہ یک زوجگی کا حکم نہ تو حضرت عیسیٰ نے دیا اور نہ ان سے قبل کسی اور نبی نے دیا۔ یہ ایک خانہ ساز بدعت ہے جسے کلیسا نے رائج کیا۔ اسے مغرب میں معاشرتی قانون کی حیثیت حاصل تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ غیر موثر ہو رہا تھا۔ اس قانون کو ثنویت کے اثرات کے تحت کلیسا کی سرپرستی حاصل ہوئی، کیونکہ ثنویت جسم دشمنی کی تعلیم دیتی ہے۔ جب اپنے بدن سے نفرت ہوئی اور خود آزاری کو عبادت کا درجہ حاصل ہوا تو جسم کی آسائش اور اسبابِ آسائش سے گریز لازم و ملزوم ہوا۔ عورت سے گریز نے نفرت کی شکل اختیار کی۔ نفرت نے جنس کو فطری جذبے کے بجائے سفلی جذبے کا مقام دیا۔ اس نے ہی نفسیاتی الجھن پیدا کی۔ نظریاتی اعتبار سے یک زوجگی عقیدہ بنی لیکن جو ابتری مغربی معاشرے میں پائی جاتی ہے اس کا عشرِ عشیر بھی کسی اور معاشرے میں نہیں ملتا۔

عیسائی مفکرینِ مذہب نے عورت سے گریز کی یہ تاویل پیش کی کہ وہ خدا سے دور کرتی ہے۔ گویا بیوی نہ ہوئی خدا کی رقیب ہوگئی۔ بیوی کو آقا یا خدا کا درجہ کسی دور میں نہیں ملا۔ وہ محض انسان ہے۔ اگر انسان کی محبت خدا کی رقیب ہے تو دوستوں، رشتہ داروں، والدین اور اولاد کی محبت پر بھی یہی حکم لگے گا اور سب سے نفرت لازم قرار پائے گی۔ آدم بیزاری خدا پرستی کی شرطِ اوّلین ٹھہرے گی جبکہ دینِ عیسوی کا اہم ترین دعویٰ انسان دوستی اور خدمتِ خلق ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ تجرّد اور یک زوجگی کو تعلیماتِ عیسوی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظریہ بھی دیگر متضاد نظریات کی طرح محض کلیسا کی خانہ ساز ایجاد ہے۔

ازواجِ نبوی : اس خانہ ساز قانون کی آڑ میں مستشرقین کی طرف سے تعدادِ ازواجِ نبوی پر شدید قسم کی دریدہ دہنی کی گئی ہے۔ ان لوگوں کو عناداً اس جانب توجّہ کی اجازت نہیں دیتا کہ قانون کی غیر موجودگی میں کوئی بھی عمل جرم تو کیا الزام بھی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ مغرب میں یک زوجگی کا ایک مستعار معاشرتی قانون نافذ ہے، اس لیے انہیں تعدّدِ ازدواج ناگوار گزرتا ہے۔ لیکن جس شخصیّت پر اعتراض کیا جا رہا ہے وہ مغربی قانون کی ہرگز پابند نہ تھی۔ وہ ایک عرب شخصیّت تھی اور اس دور کے عرب قانون کی رو سے تعدّدِ ازدواج باعثِ شرف تھا۔ تمام اشرافِ عرب کثرتِ ازدواج پر عمل پیرا تھے۔ شریعتِ موسوی کی طرح زمانہ قبل از اسلام میں عربوں میں تعدادِ ازواج کی کوئی حد مقرّر نہیں تھی۔ پیغمبرِ اسلام نے اس کی حد مقرّر کی۔ اور ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کی مشروط اجازت دی۔ اس کے باعث ان لوگوں کو جن کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں، زائد بیویوں کو طلاق دینا پڑی۔

مغرب جس انداز سے کثرتِ ازدواج پر اعتراض کرتا ہے اس کا حق اسے اپنی معاشرتی قدر کی بنیاد پر قطعی نہیں پہنچتا۔ ہاں شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں معترض ہوں تو کہہ سکتے ہیں کہ نبی ﷺ نے قرآن کی متعیّن کردہ حدود سے تجاوز کیا۔ ہمارا یہ جواب کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک خصوصی رخصت تھی

کسی غیر مسلم کو مطمئن نہیں کرتا۔ اس اعتراض کو رفع کرنے کے لیے ہمیں اعداد و شمار اور تاریخی حقائق کی طرف رجوع کرنا پڑے گا تاکہ کثرتِ ازدواج کی حقیقت واضح ہو سکے۔

حضور کی ازواجِ مطہرات کی تعداد پر تمام سیرت نگاروں اور مورخین کا اتفاق ہے کہ بارہ [۱۲] تھیں۔ ان کی کیفیت درجِ ذیل جدول سے ظاہر ہے۔ (منٹگمری واٹ نے ضعیف اور موضوع روایت کے بل بوتے پر چھتیس [۳۶] خواتین کے نام گنوائے ہیں، [Montgomery Watt; Mohammed at Medina, pp.394-397] اور یہ باور کرایا ہے کہ یہ سب کی سب ازواج نبوی تھیں، اور یہ دریدہ وہنی بھی کی کہ نعوذ باللہ شادی شدہ خواتین سے بھی تعلقات تھے)۔

جدولِ ازواجِ مطہرات، رسول اللہ ﷺ

شمار	سنہ نکاح	عمر شریف	اسمائے گرامی امہات المومنین	کیفیت	بیک وقت تعداد
۱	۱۵ قبلِ نبوت	۲۵ سال	حضرت خدیجہؓ بنت خویلد، قرشیہ	بیوہ تھیں، چالیس سال کی عمر میں حضور ﷺ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں اور پچیس سال تک حضور کی واحد شریکِ حیات رہیں	۱
۲	۱۰ نبوی	۵۰ سال	حضرت سودہؓ بنت زمعہ، قرشیہ	بیوہ، نکاح کے وقت پچاس سال کی تھیں۔ حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد گھر کی دیکھ بھال کے لیے نکاح فرمایا۔	۱
۳	۲ ہجری	۵۵ سال	حضرت عائشہؓ صدیقہ بنت حضرت ابوبکرؓ، قرشیہ	کنواری؛ رخصتی کے وقت عمر چھ تا دس سال بیان کی جاتی ہے، تاہم حضرت اسماءؓ کی عمر کے اعتبار سے قیاساً سولہ سال کی تھیں۔	۲
۴	۳ ہجری	۵۶ سال	حضرت حفصہؓ بنت حضرت عمرؓ، قرشیہ	بیوہ؛ عمر اٹھارہ سال؛ حضرت عمرؓ انکے نکاح کی درخواست صحابہ کبار سے کر رہے تھے کہ حضور ﷺ نے خود منظور فرمالیا۔	۳
۵	۳ ہجری	۵۶ سال	حضرت زینبؓ بنت خزیمہ، ہلالیہ	بیوہ؛ عمر تیس سال؛ نکاح کے تین ماہ بعد انتقال فرما گئیں، کل تعداد پھر تین رہ گئی۔	۴ پھر ۳
۶	۴ ہجری	۵۷ سال	حضرت ام سلمہؓ بنت ابی امیہ، قرشیہ	بیوہ؛ معمر	۴
۷	۵ ہجری	۵۸ سال	حضرت زینبؓ بنت جحش، اسدیہ	مطلقہ؛ عمر پینتیس سال؛ حضرت زید نے طلاق دی تو انکے علوئے مرتبت کے لیے نکاح فرمایا	۵

۸	۵ھ ہجری	۵۸ سال	حضرت جویریہؓ بنت حارث، خزاعیہ	بیوہ؛ عمر بیس سال؛ انکا نکاح اسیرانِ غزوۂ بنو مصطلق کی رہائی کا باعث بنا۔	۶
۹	۶ھ ہجری	۵۹ سال	حضرت ام حبیبہؓ بنت ابوسفیانؓ، قرشیہ	مطلقہ؛ عمر پینتیس سال؛ ہجرت حبشہ میں شریک رہیں؛ مصلحت دینی کے تحت نکاح فرمایا۔	۷
۱۰	۶ھ ہجری	۵۹ سال	حضرت ماریہؓ قبطیہ، مصری	مقوقس شاہِ مصر نے بحیثیت کنیز روانہ کیا جنہیں قبول فرمایا گیا۔	۸
۱۱	۷ھ ہجری	۶۰ سال	حضرت صفیہؓ بنت حیی، اسرائیلیہ	بیوہ؛ عمر اٹھارہ سال؛ اسیرِ خیبر تھیں؛ علوئے مرتبت کی خاطر نکاح فرمایا۔	۹
۱۲	۷ھ ہجری	۶۰ سال	حضرت میمونہؓ بنت حارث، ہلالیہ	بیوہ؛ معمر؛ حضور ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس کی خواہش کے احترام میں نکاح فرمایا۔	۱۰

۷ھ کے بعد حضور ﷺ نے اور کوئی نکاح نہ فرمایا۔ تعداد تو دس ہی رہی، مگر حکمِ شرع کی مطابقت میں چار کے سوا دیگر ازواجِ مطہرات سے ارجاء فرمایا گیا۔ (دیگر مسلمانوں کو تحدید ازدواج کے بعد زائد ازواج کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا تھا، یہی اصول ازواجِ نبی پر بھی لاگو ہونا چاہیے تھا، مگر چونکہ ان کو امہات المومنین کا اعزاز حاصل تھا اور انہیں نبی کے بعد کسی سے بھی نکاح کرنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے انہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جا سکتا تھا)۔

جدولِ بالا سے ظاہر ہے کہ ایک وقت میں ازواج کی زیادہ سے زیادہ تعداد، کنیزوں کو ملا کر، دس تک پہنچتی ہے، جو سنّتِ داؤدی سے مطابقت رکھتی ہے۔ عمر شریف کی جانب توجہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ پچپن سال کی عمر تک صرف ایک شریکِ حیات کے ساتھ گزارا فرمایا۔ اس عمر میں منطقہ حارّہ کا ایک آدمی بھی اپنے جذبات پر پوری طرح قابو پالیتا ہے۔ اس عمر کے بعد شادیاں خواہشات کے تحت نہیں کی جاتیں۔ یہ شادیاں دینی مصلحت، تالیفِ قلوب، عامۃ النّاس کی فلاح و بہبود یا علوئے مرتبت کی خاطر کی گئیں۔

چنانچہ حضرت سودہؓ سے نکاح اس لیے فرمایا کہ گھر کی دیکھ بھال اور بچّوں کی تربیت متاثر نہ ہو۔ حضرت سودہؓ کی کہولت اس دعوے پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ سے نکاح سے حضرت ابوبکرؓ صدیق اور حضرت عمرؓ سے رشتے استوار کرنا اور انکی دلجوئی مقصود تھی۔ (واضح رہے کہ حضرت عائشہؓ سے نکاح مکّے میں ہی ہو گیا تھا، مگر وہاں کے حالات میں جان پر بنی ہوئی تھی، رخصتی آسان نہ تھی۔ اس کے علاوہ مدینے میں مہاجروں کے لیے ہم کفو رشتوں کا ملنا آسان نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کی پریشانی اور صحابہ سے درخواستیں اس کی غمّاز ہیں)۔

حضرت جویریہؓ سے نکاح کے باعث ہزاروں اسیرانِ بنی مصطلق کو رہائی ملی، جو اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کا باعث بنی۔ اسی حسنِ سلوک کے باعث ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد بنوخزاعہ قریش سے ٹوٹ کر مسلمانوں کے

حلیف بنے۔واضح رہے کہ بنو مصطلق بنوخزاعہ کی ہی ایک شاخ تھے۔بنوخزاعہ اسلام کی دشمنی بھلا کر جاں نثار دوست بن گئے۔ان کا اسلام ، مسلمانوں کے لیے ایک گراں بہا قوّت ثابت ہوا۔حضرت زینبؓ اور حضرت امِ سلمہ کو زوجیت میں قبول فرمانا ان کی تالیف قلب کے لیے تھا۔حضرت امِ حبیبہؓ سے نکاح قریش کے دو نہایت اہم خاندانوں بنو ہاشم اور بنوامیّہ کے آپس کے اختلافات کو مٹا کر خوشگوار تعلّقات قائم کرنے کے لیے تھا۔ (اس نکاح کے بعد حضرت ابوسفیانؓ کا رویّہ کافی تبدیل ہوگیا تھا)۔حضرت صفیہؓ سے نکاح ان کی خاندانی عظمت کو قائم رکھنے کے لیے تھا۔غرضیکہ ہر نکاح میں کوئی نہ کوئی عظیم مصلحت درپیش تھی۔

ارجاء : تعدّدِ ازدواج کا طریقہ عرب معاشرے میں عام تھا۔اسے قانونی حیثیت حاصل تھی۔ شریعتِ اسلامیہ نے ابھی اس پر کوئی حکم نہیں لگایا تھا اس لیے قومی دستور کے مطابق تعددِ ازدواج میں قباحت کا کوئی پہلو نہیں تھا۔بلکہ انبیائے سابق کی پیروی کے اعتبار سے یہ ایک عملِ صالح تھا۔پھر واقعہ ایلاء پیش آیا جس سے عامّۃ المومنین میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔چنانچہ مسلمہؓ نے روایت کی کہ حضرت عمرؓ کے انصاری رفیق نے واقعہ ایلاء کی خبر اس تشویش ناک انداز میں دی کہ حضرت عمرؓ نے قیاس فرمایا کہ شائد غسانیوں کا حملہ ہوگیا ہے۔ اس بات کی اطلاع ملتے ہی حضرت عمرؓ انتہائی تیزی سے دریافتِ حال کے لیے خدمتِ اقدس میں پہنچے جہاں یہ پتہ چلا کہ کسی امّ المومنین کو طلاق نہیں دی گئی ہے۔(صحیح مسلم، باب۱۶۴، بیان تخییر لامراتہ)۔ یہ تشویش اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ معاشرے کے نزدیک کثرتِ ازدواج مرّوجہ دستور تھا۔اس کے برعکس طلاق کی خبر باعثِ تردّد تھی۔

قران میں ازواجِ مطہرات کے بارے میں حکم آیا،

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۝ (سورۃ احزاب، آیت ۲۸)

''اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا کی زندگانی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ فائدہ دوں اور خوش اسلوبی سے رخصت کردوں''۔

چنانچہ حضور ﷺ نے فرداً فرداً ہر زوجۂ مطہرہ کو پیشکش فرمائی کہ وہ چاہیں تو اللہ کے رسول ﷺ کو منتخب کریں اور چاہیں تو باعزّت علیحدگی اختیار کرلیں۔تمام ازواجِ مطہرات نے حضور ﷺ سے رشتے کو برقرار رکھنے کی سعادت کو منتخب فرمایا۔یہ آزادانہ انتخاب ظاہر کرتا ہے کہ اس معاشرے کے طبقۂ نسواں کے لیے بھی کثرتِ ازدواج کا دستور ناپسندیدہ نہ تھا۔جب ازواجِ مطہرات نے حضور ﷺ کو اختیار کرلیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن میں حضور ﷺ کو یہ حکم ملا کہ آپ بھی ان پر دوسری عورتوں کو اختیار نہ کریں۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ

''اس کے بعد آپ کے لیے اور عورتیں حلال نہیں ، اور نہ یہ کہ آپ ان سے اور بیویاں تبدیل کریں، چاہے ان کا حسن آپ کو بھائے مگر وہ جو آپ کی ملکیت ہوں''۔ (سورۃ الاحزاب، آیت ۵۲)

قرآن نے ان ازواجِ مطہرات کی حیثیت تبدیل کرنے کی ممانعت کی۔ انہیں امہات المومنین کا لقب عطا فرما کر(وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ... سورۃ الاحزاب)انہیں معاشرے کی دیگر خواتین سے ممتاز ومحترم قرار دیا۔امتِ مسلمہ پر ماں کی حیثیت سے ان کا نکاح حرام کیا۔ (وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ط سورۃ الاحزاب)۔

ان حالات میں بیک وقت چار سے زیادہ نکاحوں کی ممانعت نازل ہوئی۔طلاق کی رخصت نہ تھی اور چار سے زیادہ نکاح کی ممانعت بھی تھی۔پس آپ ﷺ نے ان احکامات کی پیروی اس طرح فرمائی کہ ازواجِ مطہرات میں سے چار کو یعنی حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت امِ سلمہؓ اور حضرت زینبؓ کو اختیار فرمایا اور دوسروں سے عملاً کنارہ کشی (ارجاء) اختیار کی۔خود امہات المومنین نے اپنے اپنے حقوق مقرب ازواج کو تفویض کیے۔

اقتدار وازدواج : ایک قیاسی الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ جب تک اقتدار میسر نہ آیا تھا، ایک ہی شریک حیات پر اکتفا کیا گیا۔لیکن جیسے جیسے اقتدار مستحکم ہوتا گیا، اس تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔بعض معاندین نے نفسیات کی آڑ لے کر اس تعداد ازدواج کو ابتدائی دور کی محرومیوں کا ردِ عمل قرار دیا۔ یہ سارے قیاسات محض نقش بر آب ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اقتدار کب مستحکم ہوا؟ مغربی تجزیہ نگاروں کے 'مطابق' مدینے کے نصف دور کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کی حیثیت وہاں مضبوط نہ تھی۔ [M. Watt; Mohammed at Medina, p.229)]۔ ''۶۳۱ء کے بعد محمد (ﷺ) کا اقتدار مسلمہ ہو گیا۔ اور اب ان کے حکم کی خلاف ورزی ممکن نہ تھی''۔(Ibid, p.325)۔

حضور ﷺ کا وصال ۶۳۲ء میں ہوا۔پس مغربی تجزیہ نگاروں کے مطابق مسلمہ اقتدار صرف آخری ایک سال رہا۔اگر ان [نام نہاد اتھارٹیز] کا تجزیہ درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ مفروضہ قطعاً غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ تعددِ ازدواج اقتدار کا نتیجہ تھا۔ہم دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ۷ھ (مطابق ۶۲۸ء) کے بعد کوئی نکاح نہیں فرمایا۔اگر نظریہ اقتدار درست ہوتا تو تعددِ ازدواج آخری ایام میں بڑھ جانا چاہیے تھا، جبکہ آخری چار سالوں میں ازواج کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ہاں اگر کثرت کا تعلق اقتدار سے ہی ہے تو پھر معاندین کو یہ مان لینا چاہیے کہ یہ اقتدار مدنی دور کی ابتدا میں ہی مسلمہ ہو چکا تھا۔

لفظ اقتدار سے جبر واکراہ کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے۔اس لفظ کا استعمال ہی بغض وعناد کا اظہار ہے۔اقتدار کے سہارے کس سے نکاح کیا گیا؟ حضرت عائشہؓ سے نکاح مکی دور میں ہو چکا تھا اور مکی دور میں اقتدار کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا۔ ان کی رخصتی مدینے میں ہوئی۔حضرت سودہؓ سے بھی مکے میں ہی نکاح ہو چکا تھا۔ حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں۔ انکی آہنی شخصیت کے سامنے جبر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ خود اپنی صاحبزادی کے رشتے کی خواستگاری صحابہ کبار سے کر رہے تھے، اور انکی خاموشی سے کبیدہ خاطر ہو رہے تھے کہ حضور ﷺ نے احسان فرما کر انہیں گرویدہ فرمایا۔حضرت امِ حبیبہؓ، حضرت ابوسفیانؓ کی

صاحبزادی تھیں، اور حبشہ میں تھیں جہاں ان کا نکاح حضور ﷺ سے ہوا۔ فاصلہ اور جگہ کا حلقۂ اقتدار سے باہر ہونا اس تصور کی اجازت نہیں دیتا کہ اس میں کوئی جبر و اکراہ شامل رہا ہو۔ حضرت میمونہؓ کا نکاح مکّہ میں ہوا۔ ان دنوں مکّہ فتح نہیں ہوا تھا۔ قریش خنجر بکف تھے۔ دشمن کے شہر میں اور ان کے زمانۂ اقتدار میں، سوائے رضا و رغبت کے کوئی اور عنصر کارفرما نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت امّ سلمہؓ نے نکاح سے قبل کچھ شرائط پیش کیں، جنہیں قبول کیا گیا۔ شرائط اور جبر کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ امّ المساکین حضرت زینبؓ بنت خزیمہ، حضرت عبداللہؓ بن جحش کی بیوہ تھیں۔ حضرت عبداللہؓ جنگِ احد میں شہید ہو گئے تو ان کی توقیر کے لیے نکاح فرمایا۔ حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ دونوں اسیرانِ جنگ تھیں اور حضرت ماریہؓ قبطیہ کنیز تھیں۔ ان تینوں سے نکاح انہی کے علوئے مرتبت کا باعث ہوا۔

حضرت زینبؓ بنت جحش : یہ حضور ﷺ کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی صاحبزادی تھیں۔ مغرب ان کے نکاح پر زبانِ طعن دراز کرتا ہے اور پوری طرح دل کا غبار نکالتا ہے۔ واقعات کو توڑ مروڑ کر مغربی ذہن کے عین مطابق پیش کرتا ہے۔ حضرت زینبؓ اپنے بھائیوں کے ہمراہ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائی تھیں۔ پھوپھی زاد بہن ہونے کی حیثیت سے حضور ﷺ کے لیے اجنبی نہ تھیں۔ اگر مغربی اندازِ فکر درست ہوتا تو ان سے ابتدائی دور میں ہی رشتۂ مناکحت استوار ہو جاتا۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس کے برخلاف حضور ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زیدؓ بن حارثہ سے کر دیا۔ اس نکاح کے لیے حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی ذہنی طور پر تیار نہیں تھے، لیکن فرمانِ نبوی کے احترام میں سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت زینب، حضرت زیدؓ کو اپنا ہم کفو تسلیم نہ کرتی تھیں۔ ذہنی تفاوت نے نباہ مشکل کر دیا۔ حضرت زیدؓ نے حضور ﷺ سے شکایت کی، جس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس قسم کی باتوں پر طلاق نہیں دیا کرتے۔ پھر بھی نباہ نہ ہو سکا تو حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔ جس کے بعد حضور ﷺ نے بحکمِ خداوندی حضرت زینبؓ سے نکاح فرمایا۔ اس نکاح پر حضرت زینبؓ ہمیشہ فخر کیا کرتی تھیں۔

نکاح کا یہ واقعہ سنہ ۵ ھ میں پیش آیا۔ اس وقت تک مدینے میں منافقین کا خاصا زور تھا۔ اسی مہینے میں واقعہ افک پیش آیا جسے منافقین نے بڑے زور و شور کے ساتھ اچھالا۔ اگر واقعہ نکاح میں اختلاف کی کوئی گنجائش ہوتی یا کوئی پہلو اخلاق سے متصادم ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ منافقین اس پر شدید ردِّ عمل ظاہر نہ کرتے۔ لوگوں کو اگر کوئی بات ناگوار گزری تھی تو صرف یہ کہ متبنیٰ کی مطلقہ بیوی سے نکاح نہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ ایامِ جاہلیت میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس نکاح کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ ایامِ جاہلیت کے تخیل پر ضرب لگائی جائے اور واضح کیا جائے کہ منہ سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے شریعت کی نظر میں وہ بیٹا نہیں ہو جاتا۔ بیٹا اسی کا ہے جس کے صلب سے وہ پیدا ہوا ہے۔ اس تصورِ جاہلیہ پر اگر اسی وقت ضربِ کاری نہ لگائی ہوتی تو شاید منہ بولے بیٹے کا بیٹا وراثتِ نبوی کا بھی دعویدار ہوتا اور وصالِ نبوی کے بعد ہی نوزائیدہ مملکتِ اسلامیہ خانہ جنگی اور دھڑے بندیوں کا شکار ہو جاتی۔ دین کا ارتقاء تھم کر اسلامی معاشرہ فطری نمو سے محروم ہو جاتا۔ غالباً یہی وہ مصلحتیں تھیں جن کے باعث قرآن نے اعلان کیا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط

(سورۃ الاحزاب، آیت ۴۰)

''محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں''۔

اس آیت مبارکہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسا مقام آ گیا تھا جہاں منہ بولے رشتے کا نبوت کے ساتھ تعلق ختم کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ جب حضور مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے تو مردوں میں سے کوئی ان کا بیٹا بھی نہ تھا۔ جب یہ بنایا ہوا رشتہ ہی نہ رہ گیا تو اس رشتے کے تعلق سے ہر حرمت ختم ہو گئی۔

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس حرمت کے اختتام کے لیے یہ شادی ہوئی یا اس کے برعکس اس شادی کے لیے یہ حرمت ختم کی گئی۔ قرآن، احادیث، کردارِ نبوی اور قرائن سب کے سب اوّل صورت کی تائید کر رہے ہیں۔ مفروضۂ ثانی محض معاندین کی دریدہ دہنی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا،

وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآئَكُمْ اَبْنَآءَ كُمْ ط ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ط (سورۃ الاحزاب، آیت ۴)

''اور تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے نہیں بنایا، یہ تمہارے منہ کی باتیں ہیں''۔

ظاہر ہوا کہ موضوعِ سخن لے پالک کو بیٹا سمجھنے کی مذموم رسمِ جاہلیہ ہے، جو ضرورت سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ اس اہمیت کے ڈانڈے غالباً رسالت و نبوت سے ملنے لگے تھے۔ اسی باعث، اسی ضمن میں حضور ﷺ کی ختمِ نبوت کا بھی اعلان کیا گیا۔ پھر حضور کا ارشاد 'نحن معاشر الانبياء لا نورث و لا نرث' کہ ہم گروہِ انبیاء نہ کسی کو وارث کرتے ہیں نہ کسی سے وراثت پاتے ہیں، ہر مدعیِ وراثت کے دعوے کو ختم کرنے کے لیے تھا۔

کردارِ نبوی کا تابناک ترین پہلو یہ ہے کہ حضور ﷺ اصولوں کے خلاف کسی قیمت پر مصالحت نہیں فرماتے تھے۔ حیاتِ طیبہ کے ہر گوشے میں یہ پہلو پوری طرح جلوہ گر ہے۔ کوئی معمولی سے معمولی واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ کسی مصلحت کو اصولوں پر ترجیح دی گئی ہو۔ بس یہ تصور کرنا کہ حضرت زینبؓ کے معاملے میں یہ اصول برقرار نہ رہ سکا محض بدگمانی ہوگی۔

عیش کوش مذہب

عیسائیت کے بنیادی عقائد سے اختلاف کے باعث، عالمِ عیسائیت نے اسلام کو ایک جداگانہ مذہب پایا۔ ان کے مذہب میں گناہِ آدم کے باعث ہر شخص پیدائشی گناہگار تھا جبکہ اسلام میں انسان پیدائشی معصوم ہے، جو اپنے اعمال کے سبب گناہگار یا نیکوکار بنتا ہے۔ ازلی گناہ کے بوجھ سے آزاد ہونے کے باعث اسلام میں اس عقیدے کی گنجائش نہیں کہ خدا انسان کے پیکر میں زمین پر اترے، اپنی ہی قربانی اپنے ہی حضور پیش کرے اور

اس کی یہ قربانی انسان کی نجات کا وسیلہ بنے۔ اسلام نے ثنویّت کو مسترد کر کے وحدانیت کی تعلیم دی۔ جسم روح کا مقبرہ نہ رہا۔ خود آزاری فعلِ عبث ہوا۔ رہبانیت غیر پسندیدہ ٹھہری۔ تجرّد غیر فطری عمل قرار پایا۔ خالق و مخلوق میں راست تعلّق قائم کیا گیا، جس کے باعث مذہب پیشہ گروہ کا واسطہ غیر ضروری ہو گیا۔ کلیسا قسم کے ادارے کا قیام عمل میں نہ آ سکا۔ معبود سے راست تعلّق کی بدولت ہدایت عام ہوئی اور ہر شخص اس ہدایت کی روشنی میں دنیاوی زندگی بسر کر کے، آخرت میں نجات کا حقدار ہوا۔ نجات پانے والوں کو ہر قسم کے آرام و آسائش کی ضمانت دی گئی اور جو اس ہدایت کی خلاف ورزی کریں انہیں تنبیہ کی گئی کہ وہ آخرت میں نجات سے محرومی کو مقدر سمجھیں اور آرام و آسائش سے محرومی اور شدید تکالیف و مصائب کو اپنا انجام جان لیں۔

ان بنیادی اختلافات کے باعث اسلام اور عیسائیت کی راہیں ہر مرحلے پر جدا ہوتی گئیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف مذہب نظر آنے لگے۔ سب سے بڑا اختلاف توحید اور تثلیث کا تھا۔ مغربی تثلیث کو عالمِ عیسائیت پر رومی شہنشاہ نے مسلّط کیا تھا۔ اسے پورے عالمِ عیسائیت میں قبولیت عام میسّر نہ آ سکی۔ عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے شدّت سے اسکی مخالفت کی۔ نسطوری اور ایرین فرقوں کے عقائد تثلیث سے کہیں زیادہ توحید سے قریب تھے۔ ان کے عقائد نے عیسائی معاشرے میں شدید انتشار پیدا کیا جسے شدید خونریزی کے ذریعے دبا دیا گیا۔

چونکہ مغربی تثلیث کے مقابلے میں ہر عقیدے کو بدعت کا نام دیا گیا اور ابتدائی ایّام میں مغرب نے رسول عربی ﷺ کو عیسائی ہی تصوّر کیا اس لیے اسلام ان کی نظر میں بدعت قرار پایا، جسے کیتھولک مخالف عقیدے کے عیسائیوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اسلام کی تیز رفتار فتوحات اور اسکا استحکام بھی ایک مسئلہ رہا تھا، جس کا سبب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کچھ نے کہا تلوار، کچھ نے کہا فریب۔ اور آخر میں یہ خیال کیا گیا کہ اسکا سبب اسلام کی سطحی تعلیمات تھیں۔ جنگجوئی، لوٹ، کثرتِ ازدواج، زندگی کے عیش اور پرکشش جنّت کے وعدے اوّلین پیروکاروں کے لیے رغبت کا باعث ہوئے۔

ان بے سروپا نظریات کے باعث ایک اور اعتراض یہ وارد ہوا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ایک عیش پرست مذہب رائج کیا۔ اس تیقّن کے باعث بے شمار عیسائی اہلِ قلم ایسے ہیں جن کی تحریروں کا مقصد ہی اسلام کو توڑنا اور غلط رنگ میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اسلام کی تفہیم کی رفتار انیسویں صدی کے آغاز تک نہایت سست رہی لیکن بیسویں صدی کے نصف کے بعد اس میں خاصی تبدیلی ہوتی نظر آتی ہے۔

جب کسی مذہب کی کامیابی کا ذکر کیا جاتا ہے تو حقیقتاً ان نظریات کا ذکر ہوتا ہے جو بیشتر انسانی زندگی کی تسکین کا باعث ہو چکے ہوں۔ یہ کامیابی اتّفاقات، جبر و زیادتی، یا مکر و فریب کے باعث نہیں ہوتی۔ انسانی ارتقاء کسی ایسی فکر کا مرہونِ منّت نہیں ہوتا جو بر خود غلط ہو۔ یہ ایک معتدل اور مستحکم فکر ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے کی کامیابی اور استقرار، اور اسکا استحکام یہ یقین کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اسلامی تعلیمات اور عقائد اتنے مستحکم فعّال اور تسلّی بخش ہیں کہ جہاں کہیں انہیں اپنایا گیا وہاں صدیاں گزر گئیں لیکن کسی دوسرے

عقیدے کو بار نہ مل سکا۔ اسلامی معاشرہ اپنے عقائد و نظریات سے مطمئن ہے اور اسلام ان کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں کسی اور عقیدے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اسلام دنیا کا جدید ترین مذہب ہے۔ باقی تمام مذاہب اس سے پہلے کے ہیں۔ اسلام ایک ایسا ترقی یافتہ مذہب ہے جو ہر علاقے، ہر نسل اور ہر دور کے لیے ہے۔ یہ نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ زندگی کی مسرتوں کا بھی ضامن ہے۔ یہ مذہب کی انتہائی ارتقائی شکل ہے۔ مغرب کو اسلام میں نہ جانے کون سی عیش کوشی کی شکلیں نظر آتی ہیں۔ فحاشی یہاں ممنوع؛ نشہ آور اشیاء یہاں حرام؛ سادہ زندگی کی تلقین؛ ہنسنے پر رونے کو ترجیح؛ ارتکازِ دولت کی ممانعت؛ دولت کو معاشرے پر [اہلِ کلیسا یا مسجد پر نہیں] خرچ کرنا عین ثواب؛ فخر و نمائش پر پابندی؛ دولت پیدا کرنے کا کہیں تذکرہ نہیں؛ دولت کو اپنی ذات پر نہیں بلکہ غرباء، یتامیٰ اور مساکین، بیوگان اور دیگر مستحقین پر خرچ کرنے کی تاکید؛ آمدنی پر حلال و حرام کی پابندی؛ لہو و لعب کی ممانعت؛ وقت اور زندگی کا مصرف عبادت اور تزکیہ نفس؛ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے اللہ کو یاد کرنے کا حکم؛ دن رات میں پانچ مرتبہ ادائیگیِ صلوٰۃ کا حکم جس کے لیے بدن کی پاکیزگی شرطِ اوّل؛ سال میں تیس دنوں کے روزے اور تراویح، زندگی میں ایک بار حج لازم؛ ضرورت ہو تو مذہب کے لیے جان قربان کر دینے کا حکم؛ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تمام زندگی پابندی؛ مہد سے لحد تک حکمِ الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین؛ کم خوری، کم خوابی اور کم گوئی شعار؛ گفتگو میں احتیاط؛ بدگوئی گناہ؛ عیب جوئی، غیبت اور بدظنی جرم؛ گناہوں سے پرہیز اور نیکی کی کوشش مومن کی شان؛ شہوت پرستی کا شرک کے بعد سب سے بڑے گناہ کا مقام؛ شہوت کی نگاہ سے دیکھنا آنکھ کا گناہ؛ شہوت کی باتیں سننا کان کا گناہ؛ ایسی باتیں کرنا زبان کا گناہ؛ ان سب پر سخت گرفت کی تنبیہ؛ ناجائز جنسی تعلق کی سزا درّے؛ چوری کی سزا عبرتناک؛ کسی پر تہمت لگانا قابلِ تعزیر؛ کسی کے عیب بیان کرنا سخت مکروہ؛ حسد ممنوع؛ عدل و انصاف معاشرے کی روح؛ قوانین وقتی اور خود ساختہ نہیں بلکہ ازلی اور ابدی جو شاہ و گدا پر یکساں لاحق؛ دوستی اور دشمنی کا معیار حق؛ قرآن ہر شخص پر اور ہر شخص کے لیے ہر وقت حجّت؛ معیار برتری دولت و اقتدار کی جگہ صرف تقویٰ؛ متقی مسکین غیر متقی شہنشاہ سے برتر؛ علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فریضہ؛ دیانت اس کا طرّہ امتیاز؛ والدین بزرگوں اور علماء کا احترام و عزت جزوِ ایمان؛ دل آزاری چاہے غیر مسلم کی ہی کیوں نہ ہو گناہ؛ یہاں تک کہ جھوٹے خداؤں کو بھی برا کہنے کی اجازت نہیں کہ اس سے بھی دل آزاری ہوتی ہے؛ عبدیت سب سے بڑی شان، جو عجز و انکسار کی انتہا ہے؛ تکبر صرف ذوالکبریاء کے لیے؛ بندے کی ذات کو اس سے کوئی علاقہ نہیں؛ دنیا کی زندگی نیابت خداوندی، وہ بھی چند روزہ اور فانی؛ زندگی کا مقصد عقبیٰ کو سنوارنا؛ مقصود حقیقی دنیا کی جگہ آخرت؛ زندگی ایک مسلسل امتحان، جس کے نتائج پر آخرت کا دارومدار؛ زندگی کی ذمہ داریوں سے گریز غیر مستحسن، ان کی بحسن و خوبی ادائیگی مذہبی فریضہ؛ ہر عمل کی نیت خوشنودیِ الٰہی لازم؛ وہ اعمال جن سے اللہ کی خوشنودی مقصود نہ ہو رائگاں؛ ہر عمل کی جواب دہی کا تصوّر، جس کے عوض جنت یا جہنم ٹھکانہ۔

یہاں جنت کی بشارت بھی بے راہ روی پر مائل نہیں کرسکتی۔ اس مذہب میں دوزخ کا خوف بھی اعتدال سے تجاوز وگریز کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک عظیم اعتدال ہے جو اسلام کے عقائد اور تعلیمات کے سبب قائم ہوتا ہے۔ یہاں نہ دنیا ترک ہونے پاتی ہے نہ دین سے بے تعلقی پیدا ہوسکتی ہے۔ نجی معاملات ہوں کہ ملّی، معاشرتی ہوں کہ تمدنی، سیاسی ہوں کہ مذہبی، علمی ہوں یا روحانی، اقتصادی ہوں کہ ثقافتی، اخلاقی ہوں یا فکری سب کے سب دین کے تحت ہیں۔ اسلام زندگی کی مسرّتوں، اقتدار، عظمت وسربلندی، علو اور ارتقاء کا مخالف نہیں، لیکن ان سب کی حدیں مقرّر کرتا ہے۔ ان حدود میں رہتے ہوئے ہر طرح کی مسرّتوں کی اجازت دیتا ہے اور ان حدود سے تجاوز کرنے پر پابندی عائد کرتا ہے۔

یہ ہے اس مذہب کی اجمالی کیفیت جو پیغمبرِ اسلام کے توسّط سے دنیا کو ملا۔ اس میں عیش کوشی کا تصوّر تک نہیں۔ یہاں فکر وعمل میں یکسانیت ہے۔ کہنے کی باتیں الگ اور کرنے کی باتیں الگ نہیں۔ مغرب کی منطقی اقدار کچھ اور، اور عملی اقدار کچھ اور ہیں۔ وہ اسلام کو اپنی منطقی اقدار پر جانچتے ہیں، جس کے باعث انہیں مایوسی ہوتی ہے۔ مغرب میں تجرّد ورہبانیت کتنے فی صد لوگ اختیار کرتے ہیں؟ یک زوجگی اگر معاشرتی حل ہے تو مغرب جنسی انتشار میں کیوں مبتلا ہے۔ بہشت میں اگر آرام وآسائش میسّر ہے تو اس میں قباحت کیا ہے۔ ابدی زندگی کو آسائشوں سے مبرّا کیوں ہونا چاہیے۔ اسلام میں اعراف ایک ایسا مقام ہے جو بہشت سے کمتر ہے اور اعراف سے ارذل جہنّم ہے۔ اگر مغرب کا آئیڈیل اعراف ہے اور اسلام اعراف سے برتر مقام کو آئیڈیل بناتا ہے تو اس میں کلام کیوں؟

اصل بات مابعد الطّبیعاتی نظریات کی ہے۔ ان کے خیال میں جسم میں روح قید ہے۔ اگر حیاتِ ثانیہ میں روح پھر قید ہوگئی تو یہ نجات تو نہ ہوگی۔ لہٰذا روح آزاد رہے گی اور جسم کا وجود نہ ہوگا۔ جب جسم نہ ہوگا تو جسمانی آسائش کا خیال مضحکہ خیز ہوجاتا ہے۔ اس اعتبار سے صرف جنّت ہی کیوں موردِ الزام ہے، جہنّم کا وجود بھی تو بے معنی ہوجاتا ہے کہ روح اگر لذّت سے ناآشنا ہوگی تو جسمانی کرب سے بھی ناآشنا رہے گی۔ جب جنّت دوزخ نہیں تو عذاب وثواب کا کیا تصوّر؟ جب ثواب وعذاب نہیں تو پھر اعمال کی تخصیص کیوں۔ عبادت کس لیے اور نیکی کیا کام آئے گی اور بدی سے کیا نقصان پہنچے گا۔ پھر مذہب کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ آزاد روح چاہے نیک کی ہو یا بد کی یا تو آوارہ پھرتی رہے گی یا اپنے مستقر تک پہنچ جائے گی۔ یہ محض فلسفیانہ اندازِ فکر ہے اسے وحی سے کوئی تعلّق نہیں۔

فکری مذاہب میں ایسے تضاد عموماً پائے جاتے ہیں۔ اور عیسائیت کی بنیادوں میں فلسفیانہ فکر کو خاصا دخل ہے۔ یہ مشرکانہ رسوم، مذاہبِ وحی اور مذہبِ فکری کا آمیزہ ہے۔ اور اسی سبب سے الجھنوں سے دوچار ہے۔

داعیِ اسلام پر تمام تر اعتراضات سطحی، بے بنیاد اور وضعی ہیں۔ نفرت، دشمنی اور تعصّب کی پیداوار ہیں۔ عیسائیت کے دفاع کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ انکی مجروح انا کی تسکین کا سامان ہیں۔ ان اعتراضات کی آبیاری صدیوں کی گئی ہے۔ اس پر مغرب نے بڑی توانائیاں خرچ کی ہیں۔ بہترین دماغ اس کے لیے وقف کردیے گئے۔ وقت اور سرمایہ بے دریغ خرچ کیا گیا تب یہ کذب بافی ممکن ہوسکی۔ لیکن اب اس کا ملمّع اتر رہا ہے اور دنیا پر کھل رہا ہے کہ محسنِ انسانیت ﷺ کا دامن ان تمام آلائشوں سے پاک ہے۔

باب ششم

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام

ہر معاشرہ کچھ خاص فکری بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، جس میں مذہب مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ جب کسی مستحکم معاشرے میں کوئی نیا مذہب جنم لیتا ہے تو یہ نیا مذہب معاشرے میں تبدیلی اور انقلاب پیدا کرتا ہے۔ یہ انقلاب مقتدر طبقہ کے حق میں نہیں ہوتا۔ اس لیے نئے مذہب کو خود اپنے ہی معاشرے کے اندر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک معاشرے کا انقلاب ہمسائے معاشرے کے لیے تشویش کا باعث بن جاتا ہے۔ جب کوئی انقلابی فکر ایک معاشرے میں کامیابی سے ہمکنار ہو کر دوسرے معاشروں کی طرف رخ کرتی ہے تو وہاں اسے اور بھی شدید مزاحمت پیش آتی ہے۔ دوسرا معاشرہ جتنا زیادہ مہذّب اور مستحکم ہوگا یہ مزاحمت اتنی ہی شدید ہوگی۔

دیگر عالمی مذاہب کی طرح اسلام کو بھی عالمِ عرب میں نظریاتی انقلاب پیدا کرنے کے لیے شدید جدّ وجہد کرنی پڑی۔ اپنے معاشرے میں کامیابی کے بعد جب اسلام 'ہیلینک' معاشرے میں پہنچا تو اس معاشرے کے محکوم سامی عناصر نے تو اسے خوش آمدید کہا، لیکن مقتدر یونانی اور رومی عناصر نے امکان بھر اسکی مخالفت کی۔

رومن معاشرے کی نظر میں عرب غیر مہذّب اور نیم وحشی تھے۔ اسلام کو انہوں نے ایک غیر مہذّب قوم کے فکر و نظریات سے تعبیر کیا۔ مہذّب اقوام کبھی بھی غیر مہذّب اقوام کی فکر کو آسانی سے قبول نہیں کرتیں۔ اسلامی عقائد و تعلیمات اگر نظریات کی حیثیت سے پر امن حالات میں عیسائی دنیا میں پہنچتے تو بھی نسلی، مذہبی، لسانی اور سیاسی اختلافات کے پیشِ نظر اس قدر متنازع ہوتے کہ عیسائی دنیا کا سکون درہم برہم ہو کر رہتا۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو باب اوّل میں؛ 'مغرب کا معاشرہ'، 'باشندے' اور 'اختلافی عقائد')۔ اور معاشرتی بقا کے لیے ان عقائد کی مخالفت ناگزیر ہی ٹھہرتی۔

تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام اور عالمِ عیسائیت کا تعارف ہی میدانِ جنگ میں ہوا۔ دورِ نبوی میں اسلام جزیرہ نمائے عرب سے باہر نہ پہنچا تھا۔ وصال نبوی کے وقت جیشِ اسامہؓ قبائل بنو غستان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہونے کو تیار تھا، جو وصال کے فوراً بعد عہدِ صدیقی کے ابتدائی ایام میں روانہ ہوا۔

غستان کی حمایت کے لیے شہنشاہ ہرقل کی افواج کا اجتماع اسلامی مملکت کی سرحدوں پر ہونے لگا۔ جلد ہی سرحدی جھڑپیں باقاعدہ جنگ میں تبدیل ہوگئیں اور معرکۂ یرموک میں (۶۳۵ء) حضرت خالدؓ بن ولید نے رومی شہنشاہ ہرقل کی افواج کو فیصلہ کن شکست دے کر شام پر قبضہ کر لیا۔ پھر فتوحات کا مستقل سلسلہ بندھ گیا۔ یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر (۷۳۲ء) مسلمان افریقہ اور اسپین سے بڑھ کر مغرب کے قلب فرانس پر حملہ

کر رہے تھے۔(تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو باب دوم، 'ریاستِ اسلامیہ کی توسیع اور عہدِ وسطیٰ کا مغرب')۔ آٹھویں صدی تک عیسائی دنیا نہ صرف اپنا نصف برّی علاقہ کھو چکی تھی بلکہ بحرِروم پر سے اسکی ہزار سالہ اجارہ داری بھی ختم ہو چکی تھی۔اس طرح عیسائی دنیا نے اسلام کو محض اپنے دشمن کا عقیدہ تصوّر کیا۔

مہذّب اقوام شکست کھانے کے باوجود غیر مہذّب اقوام کی برتری قبول نہیں کرتیں، لہٰذا ایک ایسی قوم جو ہزار سال سے بحرِ روم سے متصل دنیا پر حکومت کر رہی تھی، جو تہذیب وتمدن کے اوجِ کمال پر تھی، جس نے وحشی اقوام کی متعدد یلغاروں کو دیکھا تھا اور ان کی حربی برتری، اپنی تہذیبی برتری کے ذریعے ختم کر چکی تھی، کس طرح [اپنی دانست میں غیر مہذّب] عربوں کی برتری قبول کر سکتی تھی۔اس کا عقیدہ تھا کہ روم کا اقتدار ابدی اور لازوال ہے۔عربوں کی حربی برتری کے بارے میں بھی وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہی کہ بالآخران پر بھی اس کی تہذیبی برتری غالب آجائے گی۔لیکن عیسائی توقعات کے برخلاف اسلام نے خود ایک عظیم تر تہذیب کو جنم دیا جو نہ صرف روز افزوں تھی بلکہ عیسائی دنیا پر گوناگوں دباؤ بھی ڈال رہی تھی۔(ملاحظہ ہو باب دوم، 'مسلم فتوحات کے دوررس اثرات'، سیاسی معاشرتی مذہبی اقتصادی دباؤ)۔

ساتویں صدی کا عالمِ عیسائیت دو دھڑوں میں بٹا ہوا تھا۔مغرب کا لاطینی معاشرہ، مشرق کے یونانی معاشرے سے جداگانہ خطوط پر استوار ہو رہا تھا۔شدید اختلافات نے دونوں میں افتراق پیدا کر دیا تھا۔ اختلافات کی خلیج آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔مسلمانوں کی ابتدائی جنگیں مشرقی معاشرے سے ہو رہی تھیں اور مغربی معاشرہ ان جنگوں میں تماشائی تھا۔مشرقی معاشرے (بازنطین) کی شکستیں اس کے لیے رقیب کی شکستیں تھیں۔لیکن جب ان شکستوں کے گوناگوں اثرات خود مغرب پر مرتّب ہونے لگے تو اس کا اوّلین ردِّعمل یہ ہوا کہ مغربی کلیسا نے کمزور بازنطین سے خود کو الگ کر کے ایک آزاد مغربی شہنشاہیت قائم کر لی۔(ملاحظہ ہو بابِ اوّل، مغرب کا پس منظر)

مغربی معاشرہ کلیسا کا قائم کردہ تھا۔کلیسا کی اپنی سیاسی اور اقتصادی پالیسی کوئی نہیں تھی۔اس کا تجربہ محض مذہب تک محدود تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کے سوا ہر میدان میں مغربی معاشرہ حقیقی رہنمائی سے محروم تھا۔ کلیسا نے مذہبی پالیسی کو معاشرے کا مطمحِ نظر بنا دیا۔یہ معاشرہ ہر طرف سے طاقتور مخالفین میں گھرا ہوا تھا۔ مشرق میں بازنطین، جنوب اور مغرب میں سلطنتِ اسلامیہ اور شمال میں یورپ کی بت پرست وحشی اقوام تھیں۔ ان کے خلاف مدافعت کے لیے مغرب کے وسائل قطعاً ناکافی تھے اور اسکی اقتصادی حالت باقاعدہ افواج کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔کلیسا نے دفاعی مقاصد کے لیے ان تمام طاقتوں کے خلاف شدید پروپیگنڈہ کر کے اپنے دائرۂ اثر میں ہر فرد کو برسرِ پیکار کر دیا۔شمالی اقوام سے حفاظت کے لیے معاشرے کو نہ صرف غیر کیتھولک عناصر سے پاک کر دیا گیا بلکہ آس پاس سے غیر عیسائی اقوام کا وجود تک مٹا دیا گیا۔بازنطینی عیسائیوں کو بدعتی قرار دیکر ان کا اثر ورسوخ ختم کیا۔شہنشاہِ بازنطین نے بھی مذہبی عصبیّت کے پیشِ نظر کبھی مغرب کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس طرح دو مخالفین کی جانب سے اطمینان ہونے کے بعد کلیسا کی تمام توانائیاں صرف اسلام کے خلاف

وقف ہو گئیں۔ اس نے اسلام اور بانیِ اسلام ﷺ کے خلاف شعوری طور پر نفرت پیدا کی۔ مذہب کے نام پر پیدا کی گئی نفرت رفتہ رفتہ جزوِ فطرت بن گئی۔

پروپیگنڈے کی قوت سے کلیسا پوری طرح واقف تھا۔ یہ کلیسا کا پروپیگنڈہ ہی تھا جس نے رومن دنیا کو مسیحی بنایا اور مغرب کو بازنطین سے جدا کیا۔ اسی پروپیگنڈے کے بل پر مغرب کا اقتدارِ اعلیٰ کلیسا کو میسر آیا۔ یہ اقتدار کیتھولک نظریات کا مرہونِ منت تھی۔ اس کے نظریات سے اسلام متصادم تھا۔ اسلام کی مزید وسعت کلیسا اور اسکے اقتدار کے حق میں سمِ قاتل تھا۔ کلیسا کے پاس مدافعت کے لیے مالی وسائل نہ تھے۔ اس نے اسی قدیم آزمودہ پروپیگنڈے کی قوت سے اپنی بقا کے لیے بھرپور طریقے سے کام لیا۔

باہر سے عالمِ اسلام کا شدید دباؤ اور اندر سے کلیسا کی نفرت انگیزی ایسے عناصر تھے جنہوں نے مغرب کو اسلام کے حقیقی خدّ و خال سے واقف ہی نہ ہونے دیا۔ (ملاحظہ ہو باب سوم 'چرچ کا کردار' اور 'نظریاتی محاذ')۔ اوّل تو انہیں مسلم فاتحین سے دشمنی کے باعث اسلام سے دشمنی رہی۔ ثانیاً اسلام کی تعلیمات اور عیسائیت کی تعلیمات میں اس قدر تضاد تھا کہ تجاہل میں ہی مصلحت تھی۔ ورنہ اسلام مغرب کے گرد و پیش تھا اور جہاں مغرب نے مسلمانوں کے دیگر علوم پر دسترس حاصل کر لی تھی وہیں اسلام کے بارے میں بھی صحیح معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ ایک طرف علوم طب، ریاضی، فلسفہ اور فلکیات پوری صحت کے ساتھ مغربی زبانوں میں منتقل ہو رہے تھے، دوسری طرف اسلام کا نفرت انگیز تصوّر عام کیا جا رہا تھا۔ (ملاحظہ ہو باب چہارم 'عالمِ اسلام سے علمی استفادہ')۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب نے سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر عمداً اسلام کا ایک فرضی ہیولیٰ ترتیب دیا۔ ان کی تحریروں کے خاص اغراض و مقاصد تھے۔ انہی اغراض و مقاصد کے تحت حقائق کو مسخ کیا گیا اور صرف نفرت کو ہوا دینے کے لیے بے بنیاد الزامات و اتہامات عائد کیے گیے۔ بیڈے کی انا جیلی تاویلات ہوں کہ عامیوں کی غیر ذمّہ دارانہ اشتعال انگیز اور گمراہ کن تحریریں، صلیبی وقائع نگاروں کی تعلّی ہو کہ مقدّس پادریوں کے رشحاتِ قلم، مورّخین کی دقیق نظری ہو کہ شعراء کی پروازِ خیال، ہر فکر افراط و تفریط میں ملوّث، مسخِ عمد کا شکار، خود ساختہ مفروضوں پر مبنی اور حقائق سے مبرّا ہے۔ لطف یہ ہے کہ کذب بیانی کے اس میدان کے تمام شہسوار ارکانِ کلیسا ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی تک یہ بے سر و پا پروپیگنڈہ بے ترتیب اور غیر منظّم تھا۔ حروب صلیبیہ کی ناکامی اور یورپ میں ترک پیش قدمیوں نے ارکانِ کلیسا کے اس پروپیگنڈے کو باقاعدہ، منظّم اور موثر بنانے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اب تک جو کچھ تھا، اس میں محض لغویات، جھنجلاہٹ، طعن و تشنیع کے سوا کچھ نہ تھا۔ چودھویں صدی میں ضرورت محسوس کی گئی کہ اسلام پر نظریاتی حملے کر کے اس کی بیخ کنی کی جائے۔ ریمنڈ لل اور راجر بیکن نے بیخ کنی کی تجاویز پیش کیں۔ (ملاحظہ ہو باب سوم، 'نظریاتی محاذ')۔ پندرھویں صدی عیسوی میں نظریاتی حملوں کی منصوبہ بندی کی گئی اور سولہویں صدی عیسوی میں اس پر باقاعدہ عمل درآمد شروع ہوا۔

مستشرقین کا گروہ اسی پندرہویں صدی کی طویل المیعاد منصوبہ بندی کی پیداوار تھا۔ اس کی آفرینش کا مقصد خدمت اسلام یا علمی پیش رفت نہ تھا، بلکہ اسلام کی خامیاں تلاش کرنا، کمزوریوں کو دریافت کرنا اور نظریاتی حملوں کے لیے مواد بہم پہنچانا تھا۔ مختصراً یہ کہ اسلام کی بیخ کنی ان کا فرض منصبی تھا۔ جب تک مغرب کو عالمِ اسلام سے سیاسی خطرہ رہا اس وقت تک مستشرقین کی تحریریں شدید تر عناد میں ڈوبی رہیں۔ جیسے جیسے سیاسی خطرہ کم ہوتا گیا اس عناد کی شدّت میں بھی کمی آتی گئی۔ اور جب مغرب کو خود عالمِ اسلام پر غلبہ حاصل ہو گیا اور سیاسی خطرہ باقی نہ رہا تب انہیں اسلام کو سمجھنے کی توفیق میسّر ہوئی۔ انداز کی یہ تبدیلی غمازی کرتی ہے کہ مستشرقین کی حیثیت سیاسی آلہ کار کی تھی اور ان کی تحریریں محض جنگی اور سیاسی پروپیگنڈہ تھیں۔

سترہویں صدی کی تحریروں کی زبان تلخ، بیان پُر عناد اور اسلوب جارحانہ ہے۔ تاہم اس صدی کے لٹریچر سے وضعی مواد (مثلاً بت پرستی کا مضحکہ خیز تصور، معلق تابوت، کبوتر، بیل یا کنوئیں کی من گھڑت کہانیاں وغیرہ) خارج کیا جانے لگا، کیونکہ یہ بے سروپا اور بے بنیاد افسانے پروپیگنڈے کو تقویت نہ دے سکتے تھے۔ لیکن غلیظ بازاری زبان کے استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس صدی کا پروپیگنڈہ محض مقامی اغراض و مقاصد کا حامل تھا۔ اسکے مقاصد ابھی عالمی سطح کے نہیں ہوئے تھے۔

اٹھارویں صدی میں ترکوں کی فوجی قوّت کمزور ہونے لگی۔ مغرب کے لیے عالمِ اسلام سیاسی یا فوجی خطرہ نہ رہ گیا۔ نپولین بونا پارٹ کی افواج اٹھارویں صدی کے اواخر (۱۷۹۸ء) میں عالمِ اسلام کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ حالات کا رخ تبدیل ہو چکا تھا۔ قوّت کا توازن مغرب کے حق میں تھا۔ خوف اور دباؤ کا رخ مغرب سے ہٹ کر عالمِ اسلام کی طرف ہو چکا تھا۔ ان سیاسی تبدیلیوں کا واضح اثر اٹھارویں صدی کے لٹریچر پر نظر آتا ہے۔ غلیظ زبان کی جگہ متانت اور سنجیدگی نے لے لی۔ کمزور فریق کے مضبوط دلائل صورتحال کو بدل نہ سکتے تھے لہٰذا بے خطر مختلف علمی موضوعات پر گفتگو ہونے لگی۔ منافرت کے باوجود اسلام کے معاشرتی اثرات کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے کردار کے تابناک پہلو قابلِ تحسین قرار پانے لگے۔ تاریخ کا افق وسیع ہونے لگا۔ مسلمانوں کے تاریخی کارناموں کو مغربی تاریخ میں جگہ ملنے لگی۔ سائمن اوکلے نے اپنی تاریخِ سراسین کی ابتداء وصالِ نبوی سے کی جبکہ اس کے پیشرو تاریخِ اسلام کے ابتدائی دور کو یکسر نظر انداز کر کے اس کی ابتداء ترکوں کے عہد سے کیا کرتے تھے۔ سائمن اوکلے نے عہدِ نبوی سے گریز کر کے اسے سترہویں صدی کے مورّخین کی ڈگر پر چھوڑا۔ اسلام اس کی نظر میں توہّم پرستی، اور داعیِ اسلام (ﷺ) نعوذ باللہ غیر مخلص ہی رہے۔ گبن نے بھی عربی زبان سے ناواقفیت کے بہانے کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں کی۔ تاہم اس نے نہ تو نازیبا زبان استعمال کی اور نہ ہی تاریخی مواد کو مسخ کیا۔ کردارِ نبوی ﷺ کو سرگرمی اور جوش و جذبات کا مرقّع قرار دیا اور اسلام کے بارے میں جو طرزِ بیان اختیار کیا وہ آج بھی اس کے لیے طرّۂ امتیاز ہے۔ واشنگٹن گو حضور ﷺ کی نبوّت کے اعتراف سے محروم رہا کہ اس نے بھی سترہویں صدی کے عدمِ خلوص کے الزام کو دہرایا، تاہم ان کے کارناموں کی عظمت کا قائل اور کردارِ نبوی، خصوصاً آپ کی شجاعت کا

مدّاح نظر آتا ہے۔ جرمن شاعر گوئٹے اپنے معاشرے کی روائتی روش کے برخلاف یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو سکا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کسی طور غیر مخلص بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ تبدیلی واضح کرتی ہے کہ اٹھارویں صدی کے اہلِ قلم کی رائے میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ زبان کی متانت اور غیر جانبداری کا دکھاوا یہ باور کراتا ہے کہ پروپیگنڈہ محض مقامی نوعیت کا نہیں رہ گیا تھا بلکہ اس میں بین الاقوامی شعور پیدا ہونے لگا تھا۔ کڑوی بات میٹھی زبان میں کی جانے لگی تھی۔

انیسویں صدی عالمِ اسلام کے لیے ابتلاء کی صدی تھی۔ اس صدی میں مغرب نے عالمِ اسلام کو اپنے سیاسی اور اقتصادی شکنجے میں جکڑ لیا۔ تاریخ کا نا قابلِ شکست عالمِ اسلام، اسیرِ کمندِ مغرب ہو گیا۔ لے دے کر ایک عثمانی پرچم تھا جو حوادث کے مقابلے میں سرنگوں نہ ہوا تھا لیکن اس میں بھی بوسیدگی کی علامات پیدا ہو چکی تھیں۔ عالمی غلبے نے مغرب کو قدیم رومن احساسِ برتری پھر سے عطا کیا۔ سیاسی، اقتصادی، تیکنیکی، علمی، معاشرتی اور حربی برتری نے باقی دنیا کو نا قابلِ اعتناء بنا دیا۔ انیسویں صدی کے مستشرقین کی تحریریں اس احساسِ برتری سے لبریز ہیں۔ طعن و تشنیع، استہزاء، نعرۂ فاتحانہ، دل آزاری اور انتقامی انداز عام پایا جاتا ہے۔

اس صدی میں مغربی اقدار کو بنیاد بنا کر اسلام کے بارے میں فیصلے کیے گئے۔ ہر فیصلے کی بنیاد میں یہ احساس موجود ہے کہ مغربی تہذیب اور مذہبِ عیسائیت افضل اور برتر ہے۔ مسلم تہذیب کو ثانوی درجہ دے کر اسلام کو عیسائیت کی ایک ثانوی اور کمتر شکل قرار دیا گیا۔ مغربی قدروں پر حیاتِ طیّبہ کو پرکھا گیا۔ اور بعینہٖ اسی انداز میں فیصلہ دیا گیا جس انداز میں رومن عدالت نے اپنا پر رعونت فیصلہ حضرت مسیحؑ کے خلاف پہلی صدی عیسوی میں دیا تھا۔ مغرب دوسروں کے فعل و عمل کو اپنی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر نیک و بد قرار دیتا ہے۔ یہ احساسِ برتری مغرب کے لیے کتنا ہی حقیقی کیوں نہ ہو حجت نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔

انیسویں صدی کا پروپیگنڈہ عالمی پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں تبدیلی صرف یہ پیدا ہوئی کہ اخلاصِ نبوی کو تسلیم کیا گیا۔ اخلاص کی بنیاد پر کردار اور تعلیماتِ نبوی کا جائزہ لیا گیا۔ جس کے سبب لغویات کم ہوئیں اور الزامات سمٹ کر محدود ہو گئے۔ صرف وہ عناصر شدّت سے زیرِ بحث آنے لگے جو مغربی قدروں سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ ٹوئن بی ہو کہ برنارڈ شا، ڈیون پورٹ ہو کہ لین پول، میور ہو کہ اسپرنگر، کائتانی ہو کہ گولڈزیہر، سب کے سب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ گویا مغربی اقدار کے پابند ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ اور ان کی تعلیمات کے بارے میں مستشرقین کی تحریریں بے لوث یا علمی نوعیت کی نہیں تھیں بلکہ قومی اور علاقائی اغراض و مقاصد کے تحت وجود میں آئی تھیں۔ غرض، مفاد یا عصبیت سے آلودہ تحریریں مسخ بالعمد کا شکار ہوتی ہیں۔ ان میں دیانت اور نیک نیّتی کا وجود نہیں ہوتا۔ ایسا علم جو بد دیانتی پر مبنی ہو فریب ہے جس پر انسانیت اعتماد نہیں کر سکتی۔

مستشرقین کی تحریریں مغربی سرد جنگ کا ایک حصہ ہیں۔ یہ یک طرفہ سوچی سمجھی سرد جنگ گزشتہ پانچ صدیوں سے جاری ہے۔ اس کا ازالہ تو کجا، ابھی اس کے بیشتر گوشے پردۂ راز میں مستور ہیں۔ مغربی ذرائع

ابلاغ اپنا پروپیگنڈہ دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا چکے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ اس قدر طاقتور ہے کہ خود مسلم معاشرے کے بعض طبقات اس سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ ان میں نظریاتی بے چینی کروٹ لے رہی ہے۔ مغربی ممالک میں روزگار حاصل کرنے والے افراد کی اکثریت نظریاتی بے یقینی کا شکار ہے۔ نظریاتی بے یقینی معاشروں کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے۔ لہٰذا انتہائی ضروری ہے کہ اس گھناؤنی مہم کو بے نقاب کیا جائے تاکہ نہ صرف رسول اقدس ﷺ کی تعلیمات کی حقانیت مامون رہے اور اسلامی معاشرے نظریاتی بے یقینی سے محفوظ رہیں بلکہ غیر جانبدار معاشروں کی وہ غلط فہمیاں دور ہوں جو مغربی پروپیگنڈے کے باعث عام ہیں۔

دنیا تیزی سے عالمی برادری کی شکل اختیار کر رہی ہے۔ عالمی قوانین کے بعد عالمی ضوابطِ اخلاق اور عالمی معاشرتی قدروں کی ضرورت جلد ہی محسوس ہوگی۔ یہ ضابطے اور قدریں مذاہب عالیہ ہی فراہم کر سکیں گے۔ اسلام سے عالمی برادری کو صحیح طور پر روشناس کرانا اور کردار سازی کے لیے رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے تعارف کرانا صرف مسلمانوں کی ہی ذمہ داری ہے۔

اگر عالمِ اسلام مغرب کی پیدا کردہ کدورت کو دور کر کے اسلام کو کما حقہٗ نہ پیش کر سکا تو یہ کوتاہی تاریخِ اسلام کا عظیم ترین سانحہ ہوگی۔ مستقبل میں مغرب کی جانب سے ایک عالمی ضابطۂ اخلاق اور معاشرتی اقدار کی تدوین و ترتیب ہو جانے کے بعد یہ تصور کرنا کہ مسلمان اس میں خوشگوار تبدیلی پیدا کر لیں گے محض ایک خواب ہوگا جو بمشکل شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

[یہ تحریر ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ لکھی گئی تھی، اور ۲۰۰۵ء میں شائع ہو رہی ہے۔ مصنف کا پیش دیدہ عالمی ضابطۂ اخلاق تقریباً تشکیل پا چکا ہے۔]

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اختتامِ متنِ کتاب

کتابیات

Bibliography

English Books

Ansari, Dr. F. R.; Islam and Christianity in the Modern World

Arnold, Sir Thomas ; The Legacy of Islam

Asquith, H.H.; Legacy of Rome, article 'Introduction'

Barker, Earnest; Legacy of Rome, article 'The Conception of Empire'

Barker, Earnest; The Legacy of Islam, article 'The Crusades'

Bernard, Lewis ; The Legacy of Islam, 1975 ed., article 'Politics and War'

Bucaille, Maurice; The Bible, The Quran and Science

Bowl, John; A New Outline of World History

Buckles; Civilization in England

Budges, W.; The Monks of Kublai Khan

Bailey, Cyril ; Legacy of Rome, essay 'Religion and Philosophy'

Bowle, John; A New Outline of World History

Brandon, S.G.F.; Man and his Destiny in the Great Religions, article 'Christianity'

Bury , J. B.; History of the Later Roman Empire

Carlyle, Thomas; On Heros, Hero- Worship, and the Heroic in the History

Castro, A.; The Structure of Spanish History

Cook, M. A.; Legacy of Islam, 1974 ed., article 'Economic Development'

Craemer, Hendrik; The Christian Message in a Non-Christian World

Dandini, Father Jerom; A Voyage to Mount Libanes

Daniel, Norman; The Arabs and Mediaeval Europe

Davenport, John; An Apology for Mohammed and Quran

Dozy, R.; Spanish Islam

Earl, Nick; 1967, Cúlture and Creed, London

Ethinghausen, Richard; The Legacy of Islam, 1960 ed., article 'The Impact of Muslim Decoration on the Art of Europe'

Folingo, Cesare; The Legacy of Rome, article 'The Transmission of the Legacy'

Fouard, Abbe Constant; The Christ The Son Of God

Frazer, G. B. Sir; Golden Bough

Francesco, Gabrieli; The Legacy of Islam, 1960 ed., article 'Islam in the Mediterranean World'

Fuller, J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World

Gibbon, Edward; The Decline and Fall of Roman Empire

Glubb, Sir John; The Lost Centuries

Goldziher, Ignas; Muslim Studies

Goldziher, Ignas; The Religion of the Iranian People

Griffith, Taylor; 1927,Environment and Race, Oxford Univ. Press

Grunebaum, G.E. von; 1969,Mediaeval Islam, Oxford

Grutheric, W.K.C.; The Greeks and their Gods

Guillaum, Alfred; The Legacy of Israel, article 'The Jewish Factor in Medieaval Thought'

Guillaum, Alfred; The Legacy of Islam, article 'Philosophy and Theology'

Hallam; Constitutional History of England

Halle; 1988, Muhammedaneche Studien

Hankle, L.; Aristotle and theAmerican Indians

Hapgoog C.C.; 'Encyclopedia of Islam', article on 'Musa Shakir'

Hardy, P.; The Muslims of British India

Hill, Christofer; The Century of Revolution

Hill, Michael; The Sociology of Religion

Hitti, Phillips K.; History of Arabs

Heylyn, Peter; A Little Description of the Great World

Inge, W.R. Dean; The Church in the World

Phillips, K. Hitti; Islam and the West

James, M.R.; Apocryphal New Testament

Jones, A.H.M.; The Decline of the Ancient World

Kirk G.S.; The Nature of Greek Myths, p.76

Klein F. A.; The Religion of Islam

Krammer, H.; 'The Christian Message in the Non-Christian World

Lake, K.; Earlier Epistles of St. Paul

Lanepoole, Stanley; Introduction to Selection from Quran

Lee, J.; The Life of Mahomet , the Famous Oriental Imposter

Lecky; History of Nationalism in Europe

Lloyd, Ludowik; Consent of Time

Maqbool, S.; 'Encyclopedia of Islam', 2nd Ed., article 'Ibn Majid'

Margoltouth, David G.; The Origins of Arab Poetry

Maundeville, John; Travels

Mayer, F.E.; The Religious Bodies of America

Miles, G. C., The Circulation of Islamic Coinage of 8th to 12th Century in Greece

Milis,C.H.; History of Crusades

Miller, J.C.; The Works of Henry Smith, edited by, Nicholl's Series of Standard Devine

Millman, Latin Christianity

Mourret, F.; A History of the Catholic Church

Muir, William; 1858, Life of Mohammed

Muir, William; 1891, The Caliphate, Its Rise, Decline and Fall

Naudxus; History of Magic

Neil, Kennith Cameron; Humanity and Society

Nicholson, R. A.; History of Arabs

Nicholson, R. A.; Introduction to W.H. Palmer's translation of 'The Koran'

Nock, A.D.; Saint Paul

Noldeke; Dictionary of Islam

Ookley, Simon; The History of Saracens, 5th ed.

Palmer, E. H.; Translation of Koran

Paris, Mathew; English History

Pearson, George; Towards One World

Peron, Cardinal; Luther's Al-Coran

Pollard, G.E.; Objections to the Roman Catholicism

Pirenne, Henry; A History of Europe

Predeaux, Humphery; The True Nature of Imposture Fully Displayed in the Life of Mohemet, 8th ed.

Proctor S. & Velyn E.; Alfonso X of Castile, Patron of Literature and Learning

Radhakrishnan; Religion in a Changing World

Rodinson, Maxime; Mohammed

Rodinson, Maxime; 'The Western Image and Western Studies of Islam' in 'Legacy of Islam'

Rodrigues, D. Cabanelas; Juan de Segovia

Rodwell; The Quran

Roshdall; Universities

Rosinthal, Franz; The Legacy of Islam, 1974 ed., article 'Literature'

Ross; A Needful Caveat, appendix to translation of 'Al-Koran of Mahomet'

Sale, George; Essays on Islam

Sale, George; The Quran

Schacht, J.; Ibn Al-Nafis, Servetus & Columbo

Shakespeare, William; Play 'Henry VI'

Shaw, Bernard; Shaw on Religion, edited by Warner S. Smith

Sheffield, John; A dialogue between Mahomet and the Duke of Guise

Smith, Boswarth; Muhammed and Muhammedanism

Smith, Lucy T.; York Plays

Southern, R.W.; Western Views of Islam in the Middle Ages

Springer; Life of Mohammed

Stark, Warner; The Sociology of Religion

Strecter, B.N.; The Four Gospels

Stubb, Henry; Rise and Fall of Muhammetanism

Sybil, von; 'History and Literature of the Crusades, edited by Lady Duff Gordon

Taylor; Gospel according to Mark

Tesdall, Dr.; Sources of Quran

Torrey, C.C.; The Jewish Foundation of Islam

Toynbee, A.J.; A Study of History

Toynbee, A.J.; Change and Habit

Trend, J.B.; 1960, Legacy of Islam, article 'Spain, Portugal', Oxford University Press

Turner, Bryan S.; Understanding Islam

Turner, Bryan S.; Weber and Islam

Turpin, Bishop; History of Charles the Great, Translated by Rodd,T.

Vernet, Juan; 1974, Legacy of Islam, article 'Science'

Waqdi, Kitab-ul-Maghazi, chapter 'Uhad', translated by Welhousen, Kolkata, 1856

Watt, W. Montgomery; Mohammed at Mecca

Watt, W. Montgomery; Mohammed at Medina

Watt, W. Montgomery; Truth in the Religions

Watt, W. Montgomery; What is Islam?

Weber, Max; Economy and Society

Weber, Max; The Sociology of Religion

Westfall, James; History of Historical Writings

White, Joseph; Sermons Preached before University of Oxford in the Year 1784

Willman; Constitutional History of England

Windover, Roger of; Flowers of History

Other English References

Bales Select Works, Parker Society, 1849

Bayl's Dictionary

Bible

Chronicles, Globe Edition, 1899

Ecclesiastical History of England and Harmony

Encyclopedia Americano, essay 'Paul'

Encyclopedia Btitanica, 1979

Encyclopedia of Islam; edited by Babinger, F.

English History, Bohns Ed., 1854

Islamic Quarterly; 1955, Vol. II, Robert of Kitton,
Litergical Services of the Reign of Queen Elizabeth
Our World Through Ages
'Prophecies of Christopher Kotterus', 2nd Ed., Hazlit 1664
Quran
Shorter Encyclopedia of Islam
Strange and Miraculous News from Turke', London 1642
The Concise Encyclopedia of the Living Faiths
The Consice Encyclopedia of the Ancient World
'The Coventry Mystries', Play XXII
The Siege of Milan and the Romance of Roland, N.E. Text Society, 1880
Translation of Koran in English
'The Great Vision sun in Turkey Land', 1702, Bib-Coll., W.C.Hazlit
'True News from Turkey', London 1664
'The Prophecies of a Turk', London, 1687, Guild Hall Library
Wiliam of Malmsbury's Chronicles; Bohn, Bohn's ed.
Works of Francis Bacon

اردو کتب

سیرۃِ ابنِ ہشام[اردو]، ۱۹۶۵ء، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، صفحہ۲۱۹، لاہور
'سیاسی وثیقہ جات'' از ڈاکٹر حمید اللہ خان، صفحہ۱۹، لاہور، ۱۹۶۰ء
مقبول بیگ، تاریخِ ایران، صفحہ-۲۲۷، لاہور، ۱۹۶۷ء

اشاریہ

ا

غ

ف

تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ اسلام اور عیسائیت کا باہمی تعارف حرب وضرب کی اس صلیبی رزمگاہ میں ہوا، جس میں مسلمان ہمیشہ فاتح رہے۔ عیسائی مبلغین نے پندرھویں صدی عیسوی تک مسلسل ہزیمت کے بعد اپنی جنگ کا نیا میدان افکار ونظریات کی معرکہ آرائیوں میں تلاش کرلیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مسلمانوں کے علمی مصادر کا تحقیقی مطالعہ معاندانہ نیت سے کیا جس کے نتیجے میں اسلام، قرآن، پیغمبر اسلام اور اسلامی تہذیب کے خلاف اتہامات والزامات کی بوچھاڑ کردی۔ اہل مغرب کے اس تحقیقی رویے کو استشراق اور ان مطالعات میں مصروف حضرات کو مستشرقین کہتے ہیں۔ گزشتہ چار صدیوں میں اسلامی لٹریچر کے بارے میں ان کا جو ذخیرہ سامنے آیا ہے وہ سیکڑوں معاندانہ کتابوں اور ہزاروں مخاصمانہ مقالات کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ پیش نظر علمی مقالے میں مستشرقین کے اسی اندازِ فکر کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس ذخیرے میں ہمارے بعض علمی مصادر کو انہوں نے جس تحقیقی جانفشانی سے مرتب ومدوّن کیا ہے، وہ لائق داد ہے۔

اس تحقیقی مقالے کے محقق ڈاکٹر سید عبدالقادر جیلانی مرحوم بنیادی طور پر ایک انجینئر تھے مگر انہوں نے جامعہ کراچی سے اس موضوع پر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل کی جس میں استشراق کی جملہ سلبی، تخریبی اور منفی کارروائیوں کے آغاز وارتقاء کو بڑے سلیقے اور فنی پختگی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس مقالے کو ان کے فرزندار جمند آصف اکبر صاحب نے بڑی علمی متانت اور تحقیقی ذمہ داری کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد عربی زبان سے ناواقفیت کے باعث تراجم پر انحصار کرتی ہے نیز وہ قرآن وحدیث کے اساسی مصادر کی بجائے تاریخی روایات کو ترجیح دیتی ہے۔ تاریخی روایات کے اس پلندے سے انہوں نے بڑی محنت اور بدنیتی کی خوردبین لگا کر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہرزہ سرائیاں کی ہیں۔ قدرت کا یہ عجیب فیصلہ ہے کہ اس مخاصمت کی لَے اُن کے ہاں جتنی بڑھتی چلی گئی، اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وعظمت میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، نیز قبولیت اسلام کی لہر روز افزوں ہے۔ اسلام اور مستشرقین کے حوالے سے اس تحقیقی مقالے کی اشاعت بیت الحکمت کے لیے وجہ افتخار اور باذوق قارئین کے لیے باعثِ طمانیت ہوگی۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر
ڈائریکٹر بیت الحکمت، لاہور

ڈسٹری بیوٹرز

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318
ای میل: hikmat100@hotmail.com

SBN 969-8773-36-3